خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک

ڈاکٹر ذاکر نائیک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک

مکمل اور مستند ترجمہ کے ساتھ

سیّد امتیاز احمد

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۱۴۲۹ ہجری ۲۰۰۸ء

کتاب	:	خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک
مصنف	:	ڈاکٹر ذاکر نائیک
مترجم	:	سید امتیاز احمد
اہتمام	:	دار النوادر، لاہور
مطبع	:	میٹرو پرنٹرز، لاہور
صفحات	:	۸۳۲
قیمت	:	۳۵۰ روپے

ترتیب

حصہ اوّل

حصہ دوم

☆..........☆..........☆

خطاب

ڈاکٹر ولیم کیمپبل

سب سے پہلے تو میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کو خوش آمدید کہنا چاہوں گا کہ وہ اتنی دور تشریف لائے۔ میں سہیل احمد، محمد نائیک اور منتظمہ کمیٹی کے اراکین کو بھی خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کے مکالمے کو ''The Ultimate Dialogue'' کا عنوان دینا تو خیر مبالغہ ہوگا، لیکن بات یہ ہے کہ اس طرح ذرا مشہوری اچھی ہو جاتی ہے۔ میں جملہ حاضرین کو بھی اس تقریب میں خوش آمدید کہتا ہوں۔

میں ''یہوواہ'' کے نام پر خوش آمدید کہتا ہوں، جو ہمارا عظیم خالق ہے اور ہم سب سے محبت کرتا ہے۔

سب سے پہلے میں ''الفاظ'' کے بارے میں گفتگو کرنا چاہوں گا۔ آج ہم سب یہاں الفاظ ہی کے بارے میں بات کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بائبل کے الفاظ کے بارے میں اور قرآن کے الفاظ کے بارے میں......

جدید علم لسانیات کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ کسی لفظ، فقرے یا جملے کے معانی وہی ہوتے ہیں جو بولنے والا مراد لیتا ہے یا جو سننے والا فرد یا افراد مراد لیتے ہیں۔

گویا قرآن کے الفاظ کے معانی وہی ہوں گے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد لیتے تھے یا ان کی بات سننے والے مراد لیتے تھے۔ بائبل کے معاملے میں ''الفاظ'' کے معنی وہی ہوں گے جو حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے نزدیک تھے یا ان کے مخاطبین مراد لیتے تھے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے اور پرکھنے کے لیے پوری بائبل اور پورا قرآن دونوں کتب

ایک تناظر فراہم کرتے ہیں، مزید برآں اس دور کے ادب اور شاعری سے بھی مدد ملتی ہے۔ یعنی انجیل کے معاملے میں پہلی صدی عیسوی کا ادب اور قرآن کے معاملے میں پہلی صدی ہجری کا ادب اور شاعری ہماری مدد کرتے ہیں۔

اگر ہم حقیقت کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم سچائی کے متلاشی ہیں تو ہمیں الفاظ کو نئے معانی پہنانے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر ہم حقیقت کی تلاش میں سنجیدہ ہیں تو کسی ''جائز غلط بیانی'' کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

میں ایک مثال کی مدد سے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میرے پاس دو ڈکشنریاں ہیں، ایک کا سنہ اشاعت ۱۹۵۱ء ہے اور دوسری کا ۱۹۹۱ء۔ یہ دونوں لغات میرے گھر میں موجود ہیں۔ میں ان دونوں میں ایک لفظ ''Pig'' کے معانی دیکھتا ہوں۔

پہلا معنی ہے ''کسی بھی جنس کا جوان خنزیر'' اور یہ معنی دونوں لغات میں موجود ہے۔

دوسرا معنی ''کسی بھی نوع کا جنگلی یا پالا ہوا خنزیر'' بھی دونوں جگہ موجود ہے۔

تیسرا معنی ''خنزیر کا گوشت'' بھی دونوں لغات میں موجود ہے۔

چوتھے معانی ''سور جیسی عادات والا شخص یا بہت زیادہ کھانے والا شخص'' بھی دونوں لغات میں پائے جاتے ہیں۔

لیکن آخر میں اس لفظ کے ایک نیا معنی بھی موجود ہے جو صرف نئی چھپنے والی لغت میں ہی موجود ہے۔ اور وہ ہے ''پولیس والا''۔ گویا جدید لغت کے مطابق یہ لفظ پولیس والوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تورات میں کہا گیا...... "You can not eat Pigs."

تو اگر میں اس جملے کا یہ معنی مراد لوں کہ یہاں Pig سے مراد پولیس والا ہے اور یہ کہ یہاں پولیس والوں کا گوشت کھانے سے منع کیا جا رہا ہے تو کیا یہ درست ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ اسی طرح قرآن میں بھی لحم خنزیر کھانے سے منع کیا گیا ہے، کیا وہاں میں یہ کہہ

سکتا ہوں کہ Pig سے مراد ''پولیس والا'' ہے؟ نہیں کیوں کہ ایسا کہنا غلط ہوگا، احمقانہ ہوگا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ ایک سفید جھوٹ ہوگا۔ کیوں کہ محمد ﷺ یا موسیٰ علیہ السلام اس لفظ سے کبھی بھی ''پولیس والا'' مراد نہیں لے سکتے تھے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں الفاظ کے نئے معانی مراد لینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ انجیل کے معاملے میں الفاظ کے وہی معانی سامنے رکھنے چاہئیں جو پہلی صدی عیسوی میں تھے۔ اسی طرح قرآن کے الفاظ کو بھی انھی معانی میں استعمال ہونا چاہیے جن معانی میں یہ پہلی صدی ہجری کے دوران میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ''علم جنینیات'' Embryology کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنین کے مختلف مراحل میں ارتقا کا نظریہ ایک جدید نظریہ ہے اور یہ کہ قرآن ہمیں ان مراحل کی خبر دیتا ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور اپنے کتابچے ''Highlights of Human Embryology'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ حقیقت کہ جنین کا ارتقا مختلف مراحل میں ہوتا ہے، پندرھویں صدی عیسوی تک واضح نہیں ہوئی تھی۔''

ہم اس دعوے کو پرکھنے کے لیے ایک تو قرآن میں استعمال ہونے والے عربی لفظ کا تجزیہ کریں گے اور دوسرا ہم قرآن سے وابستہ تاریخی حالات کا جائزہ لیں گے۔ ہم شروع کرتے ہیں عربی کے لفظ ''علقہ'' سے جو قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ واحد علقۃ اور جمع ''علق'' دونوں صورتوں میں چھ بار استعمال ہوا ہے۔

سورۂ قیامۃ میں ہم پڑھتے ہیں:

﴿أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ۝ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝﴾

[القیامۃ: ۳۶۔۳۹]

’’کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔‘‘

اسی طرح سورۂ مومن میں تحریر ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

[المؤمن: ٦٧]

’’وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔‘‘

سورۂ حج میں کہا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِى الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ﴾

[الحج: ٥]

’’لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم

ہو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

اور پھر سورۂ مومنون میں یہ بیان بھی موجود ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ۝﴾ [المومنون: ۱۲-۱٤]

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

اور یہاں وہ مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، یہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں:

نُطْفَةٌ	نطفہ
عَلَقَةٌ	لوتھڑا
مُضْغَةٌ	بوٹی

عِظٰمًا ہڈیاں

اور آخری مرحلہ ہڈیوں پر گوشت چڑھنے کا۔

گزشتہ سو سال کے عرصے میں لفظ ''علقہ'' کے بہت سے تراجم ہوئے ہیں، دس ترجمے یہاں موجود ہیں۔ تین فرانسیسی ترجمے، پانچ انگریزی ترجمے، ایک انڈونیشین زبان میں اور ایک پارسی زبان میں۔ ان تراجم میں لفظ علقہ کا ترجمہ لوتھڑا یا خون کا لوتھڑا یا جونک کی طرح کا لوتھڑا کیا گیا ہے۔

ان تراجم سے ہر وہ قاری جس نے انسانی افزائش نسل کے عمل کا مطالعہ کر رکھا ہے، اندازہ کر سکتا ہے کہ جنین کی تشکیل کے دوران ایسا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا جہاں جنین کی صورت لوتھڑے کی مانند ہو۔ لہٰذا یہ ایک نہایت اہم سائنسی مسئلہ ہے۔ اس لفظ کو اگر آپ لغت میں دیکھیں تو اس کے معنی صرف لوتھڑا یا جونک ہو سکتے ہیں۔ شمالی افریقہ میں یہ لفظ انہی معنوں میں آج بھی مستعمل ہے۔ میرے پاس ایسے مریض آتے رہے ہیں جو یہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ایسی خواتین بھی آتی رہیں جو کہتی تھیں کہ حیض کا آغاز وقت پر نہیں ہوا۔ میں انھیں کہتا تھا کہ میں آپ کو حیض جاری کرنے والی ادویات نہیں دے سکتا کیوں کہ میرے خیال میں یہ حمل ہے۔

وہ کہتی تھیں کہ نہیں ''ابھی خون ہی ہے''۔ یعنی وہ اس قرآنی تصور کو سمجھ رہی تھیں۔ آخر میں ہمیں قرآن کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ جو (حضرت) محمد ﷺ پر مکہ میں نازل ہوئیں۔ یہ آیات قرآن کی سورۃ نمبر ۹۶ میں موجود ہیں۔ اس سورۃ کا نام ہی سورۃ العلق ہے۔ یعنی وہ لفظ جس کا ہم یہاں مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سورۃ میں کہا گیا ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝﴾

[العلق: ۲-۱]

''پڑھو (اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔''

لفظ کی اس صورت یعنی ''علق'' کے دیگر معانی بھی ممکن ہیں۔ مثلاً چپکنا، لٹکنا، چمٹنا وغیرہ۔ لیکن مذکورہ بالا دس تراجم میں سے کسی ایک میں بھی یہ معانی مراد نہیں لیے گئے۔ ان سب نے اس آیت میں بھی لفظ ''علق'' کا ترجمہ لوتھڑا یا ''جما ہوا خون'' ہی کیے ہیں۔

ان مترجمین کی تعداد اور صلاحیتوں کے باوجود فرانسیسی ڈاکٹر مورس بوکائیے ان کے لیے سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''......ایک اور چیز جو قاری کو گمراہ کرسکتی ہے، وہ لفظوں کا انتخاب ہے۔ مثال کے طور پر مترجمین کی اکثریت انسان کی پیدائش کی وضاحت کرتے ہوئے خون کے لوتھڑے کا ذکر کرتی ہے۔ ''انسانی افزائش نسل'' کے شعبے میں مہارت رکھنے والے ماہرین کے لیے اس قسم کا بیان ناقابل قبول ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افزائش سے متعلقہ قرآنی آیات کی درست تفہیم کے لیے زبان کے علم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم سے کام لینا کس قدر ضروری ہے۔''

گویا بالفاظِ دیگر ڈاکٹر بوکائیے کہنا چاہتے ہیں کہ:

''آج تک قرآن کے جتنے تراجم ہوئے، سب غلط تھے اور اب میرا نقطہ نظر درست ہے۔''

ڈاکٹر بوکائیے نے یہ کس طرح فرض کرلیا کہ ترجمہ وہ ہونا چاہیے جو وہ خود کر رہے ہیں۔ وہ ''علق'' کا ترجمہ بجائے ''لوتھڑے'' کے ''چپکنے والی چیز'' کرتے ہیں۔ اور اس سے مراد جنین لیتے ہیں جو آنول نال کے ذریعے رحم سے جڑا ہوتا ہے۔ لیکن جو خواتین صاحب اولاد ہیں، وہ میری اس بات کی تائید کریں گی کہ جو چیز چپکی ہوئی ہوتی ہے وہ ساڑھے آٹھ ماہ تک چپکی ہی رہتی ہے، یعنی چپکی ہوئی چیز تبدیل ہو کر ''چبائے ہوئے گوشت'' نما کسی چیز میں تبدیل نہیں ہوتی۔ تیسری بات ان آیات میں یہ کہی گئی ہے کہ:

''بوٹی ہڈیوں میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔''

اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ پہلے ڈھانچا تیار ہوتا ہے اور پھر اس پر گوشت چڑھایا جاتا

ہے۔ ڈاکٹر بوکائیے بہ خوبی جانتے ہیں کہ ایسے نہیں ہوتا۔ پٹھے اور ہڈیاں ایک ہی وقت میں بننا شروع ہوتے ہیں، آٹھویں ہفتے کے اختتام تک بہت کم ہڈیوں کی تشکیل ہوئی ہوتی ہے لیکن پٹھے حرکت کے قابل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر T.W.Sadler جو کہ Embryo Anatomy کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ Longman's Medical Embryology کے مصنف ہیں، ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''آٹھویں ہفتے تک پسلیاں وغیرہ اپنی ابتدائی حالت میں ہوتی ہیں اور انھوں نے ہڈیوں کی صورت اختیار نہیں کی ہوتی، جب کہ پٹھے بن چکے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ہڈیوں کی تشکیل کا آغاز ہی ہوا ہوتا ہے جب کہ پٹھے حرکت بھی کر سکتے ہیں۔''

دو گواہیاں ہمیشہ ایک سے بہتر ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہم دوسری گواہی ڈاکٹر کیتھ مور کی کتاب The Developing Human سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب کے باب نمبر ۱۵ اور ۱۷ سے ہمیں یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

(یہاں کچھ سائنسی تفاصیل بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر ولیم کہتے ہیں:)

ایک ملاقات کے دوران میں نے ڈاکٹر مور کو ذاتی طور پر ڈاکٹر ساڈلر کا بیان دکھایا اور انھوں نے اسے بالکل درست قرار دیا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا جس میں ہڈیاں بن چکی ہوں اور پھر ان کے اوپر پٹھے بن رہے ہوں۔ پٹھے تو ہڈیوں کے بننے سے کئی دن پیش تر ہی موجود ہوتے ہیں اور ہڈیوں کے بننے کے بعد نہیں بنتے جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ قرآن کا بیان یہاں بالکل غلط ہے۔[1] گویا مسئلہ ابھی حل ہونے سے بہت دور ہے۔

ہم دوبارہ لفظ ''علق'' کی طرف لوٹتے ہیں۔ ڈاکٹر مور، یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کی ایک

(۱) نقل کفر، کفر نہ باشد۔

دوسری آیت میں جونک نما شکل کا ذکر کیا گیا ہے اور چبائی ہوئی شکل کا۔ وہ اس سے ۲۳ دن اور ۳۰ دن عمر کا جنین مراد لیتے ہیں۔ ۲۳ دن کے جنین کا سائز ۳ ملی میٹر ہوتا ہے یعنی ایک انچ کا آٹھواں حصہ۔ اس کی تصویر ڈاکٹر مور کی کتاب میں دی گئی ہے...... مجھے تو یہ کسی طرح بھی جونک نما معلوم نہیں ہوتی۔

لفظ ''علقہ'' کے ان معانی کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ کوئی ایسی مثال عربی زبان سے پیش نہیں کی گئی جس سے اس لفظ کا ان معنوں میں استعمال ثابت ہوتا ہو۔ ابتدائی ہجری صدیوں سے ایسی مثال پیش کی جانی چاہیے۔ یہ ثابت کرنے کا کہ لفظ عَلَق کا مطلب ایک تین ملی میٹر طویل جنین ہوتا ہے جو کہ چپکا ہوا ہوتا ہے، ایک ہی طریقہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کے دور کے زبان وادب میں سے خصوصاً اس عربی سے جو قریش بولتے تھے، کوئی مثال پیش کی جائے۔

ایسی مثال پیش کرنا آسان نہیں ہوگا۔ قریش کی عربی پر بہت سی تحقیقات ہو چکی ہیں۔ دور اوّل کے مسلمانوں کے لیے عربی زبان پر تحقیق ضروری تھی کیوں کہ وہ قرآنی الفاظ کے درست معانی جاننا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے اپنی زبان اور شاعری کی طرف بہت توجہ دی۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۵ء میں ہونے والی ایک کانفرنس میں پیرس کی جامع مسجد کے سابق امام ابوبکر نے یہ سوال اٹھایا تھا:

''کیا قرآن کی تفہیم پیغمبر اسلام ﷺ کے دور سے آج تک ہمیشہ یکساں طور پر ہوتی رہی ہے؟''

اور ان کا جواب تھا:

''دورِ جاہلیت کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ، ہاں!''

اس سے ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر وہ آیات، جو ہمیشہ مسلمانوں کو روحانی سکون اور امید فراہم کرتی رہی ہیں، آج بھی اسی طرح ہیں تو پھر ان آیات میں موجود سائنسی

بیانات بھی اسی طرح برقرار ہیں۔ جب تک کوئی نیا ثبوت سامنے نہ آجائے۔ یہ بات نہایت اہم ہے، کیوں کہ بعض آیات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ معلومات ایک نشانی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا، سورۂ مومنون میں کہا گیا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝﴾[المومنون: ۱۴۔۱۲]

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنادیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

اسی طرح سورۂ حج میں کہا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا﴾

[الحج: ۵]

''لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم

اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔"

اگر مکہ اور مدینہ کے رہنے والے لوگوں کے لیے یہ ایک واضح آیت تھی تو "علقة" کے لفظ کے ان کے لیے کیا معنی تھے؟ جو انھیں زندگی بعد موت پر ایمان لانے کے لیے قائل کرتے؟

جواب جاننے کے لیے ہمیں حضرت محمد ﷺ کے دور کی تاریخی صورت حال کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ محمد ﷺ اور ان کے دور کے لوگ علم الجنین کے حوالے سے کیا خیالات رکھتے تھے۔ ہم Hypocrites سے آغاز کریں گے۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ ۴۶۰ قبل مسیح میں یونانی جزیرے Kuss میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہ "مراحل" یا Stages کا نظریہ رکھتا ہے، جو کچھ یوں ہے:

اس کے خیال میں مادہ منویہ پورے بدن سے اخذ ہوتا ہے۔ یعنی ماں اور باپ دونوں کے پورے جسم سے۔ جسم کے قوی حصوں سے قوی مادہ حاصل ہوتا ہے اور ضعیف حصوں سے ضعیف مادہ۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھتا ہے اور ماں کے جسم میں خون کے جمنے کی بات کرتا ہے۔ اس سے جنین بنتا ہے جو ایک جھلی میں لپٹا ہوتا ہے۔ مزید برآں وہ کہتا ہے کہ جنین کی پرورش ماں کے خون کے ذریعے ہوتی ہے جو ماں کے رحم تک پہنچتا ہے کیوں کہ حاملہ ہونے کے بعد حیض کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ گوشت بننے کا ذکر کرتا ہے اور آخر میں ہڈیوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جیسے جیسے اعضا بنتے ہیں ان کے اندر ہڈیاں بھی بنتی چلی جاتی ہیں، درخت کی شاخوں کی مانند۔

اب ہم ارسطو کی جانب آتے ہیں۔ تقریباً ساڑھے تین سو قبل مسیح میں لکھی گئی اپنی

کتاب میں ''ارتقائے جنین'' کے مراحل کا ذکر کرتا ہے۔ وہ مادۂ منویہ، حیض کے خون وغیرہ کا ذکر بھی کرتا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں وہ نر کے مادۂ منویہ کو ''خالص'' قرار دیتا ہے۔ یعنی مادہ سے حاصل ہونے والا مادۂ منویہ وہ لوازمہ فراہم کرتا ہے جو نر کے مادۂ منویہ کو درکار ہوتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر مادہ منویہ ماہواری کے خون کو جمانے کا باعث بنتا ہے اور پھر اس سے گوشت بنتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ فطرت خالص ترین اجزا سے گوشت اور باقی ماندہ اجزا سے ہڈیاں تشکیل دیتی ہے۔ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان کے گرد گوشت بنتا ہے۔ بالکل یہی بات ہمیں قرآن میں بھی ملتی ہے۔ مادۂ منویہ اور خون سے لوتھڑا بنتا ہے، اس سے ہڈیاں اور پھر ہڈیوں پر گوشت۔

اب ہم ہندوستانی علم الادویہ کی طرف آتے ہیں۔ ۱۲۳ء میں Sharaka اور Shushruta کا کہنا تھا کہ:

''نر اور مادہ دونوں تخم ریزی میں حصہ لیتے ہیں۔ نر کا مادۂ منویہ Sukra اور مادہ کا Artava کہلاتا ہے۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ جنین کی تشکیل مادۂ منویہ اور خون سے ہوتی ہے۔''

اب ہم گالن کے نقطہ نظر کی طرف آتے ہیں۔ گالن کا سنہ پیدائش ۱۳۱ عیسوی ہے اور وہ اس علاقے میں پیدا ہوا تھا جو آج کل ترکی میں شامل ہے۔ گالن کا کہنا تھا کہ وہ لوازمہ جس سے جنین کی تشکیل ہوتی ہے خون اور نر و مادہ دونوں طرح کے مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن یہاں گالن سے متفق ہے۔ قرآن میں کہا گیا:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ﴾ [الدھر : ۲]

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔''

اب ہم آتے ہیں گالن کے بیان کردہ مراحل کی جانب کیوں کہ وہ بھی جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل بیان کرتا ہے۔

پہلا مرحلہ مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

اس لیے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔"

اگر مکہ اور مدینہ کے رہنے والے لوگوں کے لیے یہ ایک واضح آیت تھی تو "علقة" کے لفظ کے ان کے لیے کیا معنی تھے؟ جو انھیں زندگی بعد موت پر ایمان لانے کے لیے قائل کرتے؟

جواب جاننے کے لیے ہمیں حضرت محمد ﷺ کے دور کی تاریخی صورت حال کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ محمد ﷺ اور ان کے دور کے لوگ علم الجنین کے حوالے سے کیا خیالات رکھتے تھے۔ ہم Hypocrites سے آغاز کریں گے۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ ۴۶۰ قبل مسیح میں یونانی جزیرے Kuss میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہ "مراحل" یا Stages کا نظریہ رکھتا ہے، جو کچھ یوں ہے:

اس کے خیال میں مادہ منویہ پورے بدن سے اخذ ہوتا ہے۔ یعنی ماں اور باپ دونوں کے پورے جسم سے۔ جسم کے قوی حصوں سے قوی مادہ حاصل ہوتا ہے اور ضعیف حصوں سے ضعیف مادہ۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھتا ہے اور ماں کے جسم میں خون کے جمنے کی بات کرتا ہے۔ اس سے جنین بنتا ہے جو ایک جھلی میں لپٹا ہوتا ہے۔ مزید برآں وہ کہتا ہے کہ جنین کی پرورش ماں کے خون کے ذریعے ہوتی ہے جو ماں کے رحم تک پہنچتا ہے کیوں کہ حاملہ ہونے کے بعد حیض کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ گوشت بننے کا ذکر کرتا ہے اور آخر میں ہڈیوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جیسے جیسے اعضا بنتے ہیں ان کے اندر ہڈیاں بھی بنتی چلی جاتی ہیں، درخت کی شاخوں کی مانند۔

اب ہم ارسطو کی جانب آتے ہیں۔ تقریباً ساڑھے تین سو قبل مسیح میں لکھی گئی اپنی

کتاب میں ''ارتقائے جنین'' کے مراحل کا ذکر کرتا ہے۔ وہ مادۂ منویہ، حیض کے خون وغیرہ کا ذکر بھی کرتا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں وہ نر کے مادۂ منویہ کو ''خالص'' قرار دیتا ہے۔ یعنی مادہ سے حاصل ہونے والا مادۂ منویہ وہ لوازمہ فراہم کرتا ہے جو نر کے مادۂ منویہ کو درکار ہوتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر مادہ منویہ ماہواری کے خون کو جمانے کا باعث بنتا ہے اور پھر اس سے گوشت بنتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ فطرت خالص ترین اجزا سے گوشت اور باقی ماندہ اجزا سے ہڈیاں تشکیل دیتی ہے۔ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان کے گرد گوشت بنتا ہے۔ بالکل یہی بات ہمیں قرآن میں بھی ملتی ہے۔ مادۂ منویہ اور خون سے لوتھڑا بنتا ہے، اس سے ہڈیاں اور پھر ہڈیوں پر گوشت۔

اب ہم ہندوستانی علم الادویہ کی طرف آتے ہیں۔ ۱۲۳ء میں Sharaka اور Shushruta کا کہنا تھا کہ:

''نر اور مادہ دونوں تخم ریزی میں حصہ لیتے ہیں۔ نر کا مادۂ منویہ Sukra اور مادہ کا Artava کہلاتا ہے۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ جنین کی تشکیل مادۂ منویہ اور خون سے ہوتی ہے۔''

اب ہم گالن کے نقطہ نظر کی طرف آتے ہیں۔ گالن کا سنہ پیدائش ۱۳۱ عیسوی ہے اور وہ اس علاقے میں پیدا ہوا تھا جو آج کل ترکی میں شامل ہے۔ گالن کا کہنا تھا کہ وہ لوازمہ جس سے جنین کی تشکیل ہوتی ہے خون اور نر و مادہ دونوں طرح کے مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن یہاں گالن سے متفق ہے۔ قرآن میں کہا گیا:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾ [الدھر: ۲]

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔''

اب ہم آتے ہیں گالن کے بیان کردہ مراحل کی جانب کیوں کہ وہ بھی جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل بیان کرتا ہے۔

پہلا مرحلہ مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

دوسرا مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں مادہ منویہ اور خون یکجا ہوتے ہیں، یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں مختلف اعضا نے ابھی واضح شکل اختیار نہیں کی ہوتی۔ قرآن میں یوں کہا گیا ہے:

﴿مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ [الحج: ۵]

''پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔''

تیسرا مرحلہ وہ بیان کرتا ہے، جس میں ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا قرآن بھی یہ مرحلہ بیان کرتا ہے:

﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا﴾ [المومنون: ١٤]

''پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔''

گالن کو اس زمانے میں کس قدر اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہلی ہجری صدی کے آغاز کے قریب اسکندریہ میں چار افراد نے علم طب کا ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا نصاب گالن کی ۱۶ کتابوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ کتابیں تیرھویں صدی عیسوی تک نصاب میں شامل رہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کے دور میں خطۂ عرب کی سیاسی، معاشی اور طبی صورت حال کیا تھی؟

اس زمانے میں یمن سے تجارتی قافلے مکہ اور مدینہ سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جایا کرتے تھے۔ توارۃ کا عبرانی سے Cyriac زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا جو آرامی زبان کی ایک قسم ہے اور عربی سے مشابہ ہے۔ یہ ترجمہ سنہ ۴۶۳ء میں ہی ہو چکا تھا۔ برٹش میوزیم میں اس کی ایک نقل موجود ہے۔ سنہ ۵۰۰ء کے بعد عرب کے شمالی صحراؤں میں یہی زبان بولی جاتی تھی۔ اور ان علاقوں میں رہنے والے عیسائی اور یہودی قبائل کے پاس توارۃ اسی زبان میں دستیاب تھی۔

اسی زمانے میں Cynie Cyrra Syrgies [؟] نے، جو ۵۳۶ء میں قسطنطنیہ

میں فوت ہوا، علم طب کی کئی کتابوں کا یونانی سے Cyraic زبان میں ترجمہ کیا۔ ان میں گالن کی ۲۶ کتابیں بھی شامل تھیں۔ اس طرح یہ کتابیں خسرو اوّل کی عجمی سلطنت اور قبیلہ غسان کے علاقوں میں دستیاب تھیں۔ اس قبیلے کا علاقہ اس زمانے میں مدینے کے قریب تک پہنچ چکا تھا۔ شہنشاہِ ایران کسریٰ اول کو خسرِو اعظم کہا جاتا تھا۔ اس کی افواج کی فتوحات یمن تک جا پہنچی تھیں۔ وہ علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے کئی مدارس بھی قایم کیے۔ ان میں جندی شاپور کا مدرسہ بھی شامل تھا۔ جو خسرِو اول کے طویل ۴۸ سالہ دور اقتدار کے دوران میں اپنے وقت کا عظیم ترین علمی مرکز بن گیا تھا۔

جندی شاپور کے مدرسے میں یونانی، یہودی، نسطوری، ایرانی اور ہندی افکار پر آزادانہ تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ تعلیم و تدریس زیادہ تر Syriac زبان میں ہوتی تھی۔ تراجم کے ذریعے انھیں ارسطو، گالن اور Hypocrites کے خیالات و افکار جندی شاپور کے مدرسے میں آسانی سے دستیاب تھے۔

اگلے مرحلے میں فاتح عربوں نے نسطوریوں کو مجبور کیا کہ وہ ان کتابوں کو Syriac زبان سے عربی میں ترجمہ کریں۔ ترجمہ مشکل بھی نہیں تھا کیوں کہ دونوں زبانوں کی گرامر یکساں ہے۔ جہاں تک علم طب کی مقامی صورت حال کا تعلق ہے، ہم جانتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس خطے میں طبیب موجود تھے۔ حارث ان میں سب سے مشہور تھا۔ وہ اپنے وقت کا سب سے ماہر طبیب تھا۔ اس کا تعلق طائف کے قبیلۂ بنی ثقیف سے تھا۔ وہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے یمن اور پھر ایران کا سفر کیا اور جندی شاپور کے مدرسے میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ اس طرح وہ ارسطو اور گالن کے نظریات سے آگاہ ہوا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے ایران میں ہی حکمت شروع کی۔ اس دوران نے خسرو کے دربار میں بھی طلب کیا گیا۔ جہاں اس نے شہنشاہ سے طویل گفتگو کی۔

تقریباً اسلام کے آغاز کے وقت وہ خطۂ عرب میں واپس آیا اور طائف میں آباد ہوگیا۔ اس دوران یمن کا ایک بادشاہ ابوخیر کسی بیماری کے سلسلے میں اس کے پاس

طائف آیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے حارث کو بہت سی دولت اور ایک کنیز انعام میں عطا کی۔

اگرچہ حارث نے علم طب پر کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن کئی طبی معاملات پر اس کے خیالات خسرو سے اس کی گفتگو کی صورت میں محفوظ ہیں۔ آنکھ کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ چربی سے بنی ہوتی ہے یعنی آنکھ کی سفیدی، جب کہ سیاہ حصے کو وہ پانی قرار دیتا ہے اور نظر کو وہ "ہوا" قرار دیتا ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ یہ تمام باتیں غلط ہیں لیکن یونانی خیالات یہی تھے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حارث کو یونانی علما کے افکار سے آگاہی حاصل تھی۔ اس صورت حال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے "Dr. Lucaine la Clerk" اپنی کتاب "Eastword Delamitry Arabs" میں لکھتے ہیں:

> "حارث نے علم طب جندی شاپور میں حاصل کیا اور محمد ﷺ کو علم طب کے بارے میں معلومات جزوی طور پر حارث سے حاصل ہوئیں تھیں۔ لہٰذا دونوں کے ہاں یونانی خیالات کے آثار مل جاتے ہیں۔ محمد ﷺ بعض اوقات مریضوں کا علاج خود کرتے تھے لیکن پیچیدہ امراض کی صورت میں وہ حارث کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ علم طب کا ایک اور عالم لادن بن حارث بھی تھا۔ اگرچہ اس کا طبیب حارث سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ محمد ﷺ کا رشتہ دار تھا اور خسرو کے دربار میں حاضر ہو چکا تھا۔ بہر حال اسے محمد ﷺ سے ہمدردی نہیں تھی۔ اور وہ قرآن کے بعض بیانات پر معترض تھا۔ محمد ﷺ نے اسے معاف نہیں کیا اور جب وہ جنگ بدر میں گرفتار ہوا تو اسے سزائے موت دی گئی۔"

گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے:

- ۶۰۰ ء میں مکہ اور مدینہ میں رہنے والے عربوں کے روابط حبشہ، یمن، فارس اور بازنطینی سلطنت کے ساتھ قائم تھے۔

- محمد ﷺ کا ایک رشتہ دار فارسی زبان اتنی اچھی جانتا تھا کہ موسیقی کے حوالے سے اس زبان میں تحقیق کر سکے۔
- غسانی قبیلہ جو صحرائے عرب کے ایک حصے پر حکمران تھا اور جس کی سرحدیں مدینہ سے ملتی تھیں، وہی زبان بولتا تھا جو جندی شاپور کے مدرسے میں طب کی تعلیم دینے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یمن کا ایک بادشاہ اپنے علاج کے سلسلے میں طائف آیا تھا۔ اور طائف کے طبیب حارث کے زیر علاج رہا جس نے طب کی تعلیم جندی شاپور کے مدرسے میں حاصل کی تھی جو اس دور میں دنیا بھر میں طب کی تعلیم کا بہترین ادارہ تھا۔ محمد ﷺ بھی بعض اوقات علاج کے لیے مریضوں کو حارث کے پاس بھیجا کرتے تھے۔
- محمد ﷺ کے دور میں ہی اسکندریہ میں ایک نیا مدرسہ بھی طب کی تعلیم کے لیے قائم ہوا تھا، جس کے نصاب میں گالن کی سولہ کتابیں شامل تھیں۔ اس ذریعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس بات کے وافر امکانات موجود تھے کہ محمد ﷺ اور ان کے اصحاب ارسطو اور گالن وغیرہ کے تولیدی نظریات سے آگاہ ہو سکتے۔ جس کا ذریعہ حارث اور دیگر طبیبوں کی صورت میں موجود تھا۔

لہٰذا جب قرآن مکی دور کی آخری سورتوں میں سے ایک سورۃ میں کہتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ مِن قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾

[المؤمن: ٦٧]

”وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے

کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔"

اور پھر سورۂ حج میں بھی کہا گیا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّى وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ط﴾

[الحج: ٥]

"لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔"

یہاں ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اُن سے کیا مطالبہ کیا جا رہا تھا؟ کس بات پر غور کرنے کی دعوت دی جا رہی تھی؟ جواب بالکل واضح ہے۔ وہ وہی سمجھ رہے تھے اور اسی بات پر غور کر رہے تھے جو اس دور کا علم تھا یعنی وہ تولیدی مراحل جن کی تعلیم یونانی حکما نے دی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ محمد ﷺ کے مخاطبین ان یونانی حکما کے نام بھی جانتے تھے۔ لیکن وہ جنین کے ارتقا کے ان مراحل کے بارے میں ضرور جانتے تھے جن کے

بارے میں ان یونانی حکمانے بتایا تھا۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ نر کا مادہ منویہ حیض کے خون کے ساتھ مل کر اسے جما دیتا ہے اور پھر اس سے بچہ بنتا ہے۔ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ ایک ایسا مرحلہ بھی ہوتا ہے جس میں جنین نیم تشکیلی حالت میں ہوتا ہے۔ اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھتا ہے۔ اللہ ان کی معلومات کو ہی ایک نشانی کے طور پر برت رہا تھا۔ اور یوں سامعین اور قارئین کو اپنی طرف رجوع کی دعوت دے رہا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ معلومات درست نہیں تھیں۔

اب ہمیں محمد ﷺ کے بعد کے ادوار کے اطبا پر توجہ دینی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ اطباء قرآن پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے لیکن یہ ماہرین سولھویں صدی عیسوی تک ارسطو اور گالن وغیرہ کے تصورات ہی کی پیروی کرتے رہے۔

اگر ''علقہ'' کا درست ترجمہ ''جونک نما شے'' ہے جیسا کہ بعض جدید مسلمان مفکرین مثلاً شبیر علی وغیرہ دعویٰ کرتے ہیں تو پھر ان اطبا کو بھی یہی کہنا چاہیے لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یونانی اطبا کے نظریات کی مدد سے قرآنی بیانات کی وضاحت کی جارہی تھی اور قرآن کے ایسے معانی بیان کیے جاتے تھے جو یونانی نظریات کی تائید کرتے ہوں۔

مثلاً ابن سینا کے بقول جنین کی تشکیل دو اجزا سے ہوتی ہے۔ مردانہ مادۂ منویہ، جو عامل کا کردار ادا کرتا ہے اور دوسرے زنانہ مادۂ منویہ جو پہلے حیض کے خون کا جزو ہوتا ہے اور جو ایسا لوازمہ فراہم کرتا ہے جس سے مادہ منویہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن سینا زنانہ مادۂ منویہ کو وہی کردار دیتا ہے جو ارسطو نے حیض کے خون کو دیا تھا۔ ابن سینا کو جو اہمیت اور استناد قدیم یورپ میں سائنس اور فلسفے کے حوالے سے حاصل تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اب ہم ابن قیم الجوزیہ کی طرف آتے ہیں۔ ابن قیم نے یونانی طب اور قرآنی بیانات کی مطابقت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا...... وہ اپنی تصنیف ''کتاب الاجنہ'' کے تیسرے باب میں کہتا ہے:

''مادۂ منویہ ایک جھلی میں ہوتا ہے، اس کی بڑھوتری کا سبب ماں کا خون ہوتا ہے جو رحم میں پہنچتا ہے۔ کچھ جھلیاں ابتدا میں بن جاتی ہیں، کچھ دوسرے مہینے میں اور کچھ تیسرے مہینے میں۔''

جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا، ماں کے خون کے رحم میں جانے کی بات Hippocrates نے بھی کی ہے۔ یہی بات قران بھی کہتا ہے:

﴿يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ [الزمر: ٦]

''وہ تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمھیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔''

اس کے بعد ابن قیم اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہر جھلی کی اپنی تاریکی ہوتی ہے اور قرآن میں خدا جب ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک ارتقا کا ذکر کرتا ہے تو ان تین تاریک پردوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔

بیش تر مفسرین اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ پہلی تاریکی پیٹ کی، دوسری رحم مادر کی اور تیسری جنین پر لپٹی ہوئی جھلی کی ہوتی ہے۔

اب ہم دوسری مثال دیکھتے ہیں:

''Hippocrates کا کہنا ہے کہ منہ اچانک کھل جاتا ہے، ناک اور کان بن جاتے ہیں پھر کان کھل جاتے ہیں اور پھر آنکھیں جو ایک شفاف سیال سے بھری ہوتی ہیں......''

جب کہ محمد ﷺ کہتے ہیں کہ:

''میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس نے میرا چہرہ بنایا اور مجھے سماعت بخشی اور بینائی عطا کی......''

مماثلت بالکل واضح ہے۔ ابن قیم بھی Hippocrates ہی کی بات کر رہا ہوتا ہے،

جب وہ ماں کے خون کے رحم میں جنین تک پہنچنے کا ذکر کرتا ہے۔

اور وہ ایسا کر سکتے تھے کیوں کہ، جیسا کہ ہم نے دیکھا، محمد ﷺ کے دور میں پڑھے لکھے لوگ یونانی علم الادویہ سے ناواقف نہیں تھے۔ البتہ ہمارے لیے آج کے تناظر میں اہم بات یہ ہے کہ قرآن کسی بھی جگہ یونانی علم طب کی اصلاح نہیں کرتا ہے۔ ابن قیم کسی جگہ یہ اعلان نہیں کرتا کہ ''نہیں، تم سب غلط کہہ رہے ہو، علقہ کا مطلب تو چپکنے والی چیز یا جونک نما چیز ہوتا ہے۔'' بلکہ اس کے برعکس وہ قرآن اور یونانی علم طب کی مطابقت اور مشابہت ہی ثابت کرتا ہے۔ اور ان کی یہ مطابقت غلطی پر ہے۔ یعنی وہ ایک غلطی پر متفق ہیں۔ ایک قطعی مثال بیضاوی کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر ۱۲۰۰ء میں لکھی گئی۔ اور یہاں اس تفسیر میں ہم دیکھتے ہیں کہ علقہ کا مطلب ''جما ہوا خون'' بتایا گیا ہے۔ پھر گوشت کی بوٹی، جس کی جسامت بس اس قدر ہوتی ہے کہ جسے چبایا جا سکے، اور اسی طرح آگے بات چلتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنین کے مختلف مراحل میں ارتقا کا نظریہ ایک جدید نظریہ ہے۔ اور یہ کہ قرآن نے ان مراحل کا ذکر کر کے جدید علم الجنین کی معلومات چودہ سو برس پیش تر ہی پیش کر دی تھیں۔ لیکن اس مطالعے کے دوران میں ہم نے دیکھا کہ ارسطو، قدیم ہندو اور گالن وغیرہ بھی ان مراحل کے بارے میں جانتے تھے اور انھوں نے ان مراحل پر گفتگو بھی کی ہے اور یہ قرآن سے بہت پہلے کی بات ہے۔

قرآن کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہی نظریات جو یونانی علما نے اور قرآن نے بیان کیے تھے، ابن سینا اور ابن قیم تک پہنچے اور بعینہٖ اسی طرح پہنچے جس طرح ان کی تعلیم گالن نے دی تھی۔

جہاں تک ہڈیوں کا تعلق ہے، اس حوالے سے بھی ہم نے بات کی اور جیسا کہ ڈاکٹر مور نے بڑی وضاحت سے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ پہلے پٹھے بنتے ہیں اور بیک وقت ہڈی بھی اپنی ابتدائی صورت میں تشکیل پانا شروع کر دیتی ہے۔ ایسا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا جس

میں ہڈیوں کا ڈھانچہ تو بن چکا ہو لیکن ابھی اس پر گوشت نہ چڑھا ہو۔

اسی طرح یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ لفظ ''علقہ'' کے معنی ''لوتھڑا'' ہوتے ہیں اور یہ کہ محمد ﷺ نے قریش سے جو یہ کہا کہ جنین کے ارتقا میں عورت کا حصہ حیض کے خون کی صورت میں ہوتا ہے تو یہ بات ان کے لیے قابل فہم تھی۔

لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قرآن کا یہ بیان کہ انسان نطفے سے اور پھر خون کے لوتھڑے سے بنتا ہے، پہلی صدی ہجری کی سائنسی صورت حال کے عین مطابق تھا۔ یعنی جس وقت قرآن سامنے آیا، اس وقت کی علمی سطح کے مطابق تھا۔ لیکن جب مقابلہ بیسویں صدی عیسوی کے ساتھ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہپوقریطس غلطی پر ہے، ارسطو غلطی پر ہے، گالن غلطی پر ہے اور قرآن بھی غلطی پر ہے۔[1] یہ سب ایک بہت بڑی غلطی کر رہے تھے۔

اب ہم تھوڑا ذکر ''چاندنی'' کا کریں گے۔ کیا قرآن واقعی یہ بتاتا ہے کہ ''چاند کی روشنی، سورج کی روشنی کا انعکاس ہوتا ہے۔'' اور اس دور میں بتاتا ہے جب لوگوں کو ابھی اس بات کا علم نہیں ہوا تھا؟

سورۂ نوح میں کہا گیا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَٰوَٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝﴾ [نوح: ۱۶-۱۵]

''کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بر تہہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟''

یہاں چاند کو ''نور'' اور سورج کو چراغ یعنی ''سراج'' کہا گیا ہے۔ کچھ مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ چوں کہ قرآن سورج اور چاند کی روشنی کے لیے مختلف الفاظ استعمال کرتا ہے لہٰذا اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سورج اور چاند کی روشنی مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ سورج اپنی روشنی خارج کرتا ہے جب کہ چاند سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ یہ دعویٰ شبیر علی نے

(۱) نقل کفر، کفر نہ باشد۔

اپنے کتابچے میں اور ڈاکٹر ذاکر نے اپنی تقریر میں بڑے زور وشور سے کیا ہے۔ اپنی ویڈیو ''کیا قرآن کلامِ الٰہی ہے؟'' میں ذاکر نائیک واضح طور پر کہتے ہیں:

''...... چاند سے آنے والی روشنی آتی کہاں سے ہے؟ پہلے ہمارا خیال تھا کہ یہ چاند کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن آج سائنسی ترقی کی وجہ سے ہم جانتے ہیں کہ چاند کی روشنی اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ سورج کی روشنی کا انعکاس ہوتی ہے۔ یہاں میں ایک سوال پوچھوں گا۔ قرآن مجید کی سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَبَارَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٦١]

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

عربی میں چاند کے لیے لفظ قمر استعمال ہوتا ہے اور اس کی روشنی کے لیے منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ منعکس روشنی یا ''نور'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا قرآن یہ کہتا ہے کہ چاند کی روشنی منعکس روشنی ہے، تم کہتے ہو کہ تم نے یہ بات آج دریافت کی ہے تو پھر قرآن نے یہ بات ۱۴۰۰ برس پہلے ہی کس طرح بیان کردی تھی؟......''

ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر نے یہاں بتایا کہ چاند کو عربی میں قمر کہتے ہیں اور اس کی روشنی کے لیے منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ نور یا منعکس روشنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نے واضح طور پر نور کو منعکس روشنی قرار دیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ نہ صرف سائنسی حقائق کے مطابق ہونا چاہیے بلکہ اس کا ایک معجزاتی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ بات کہ چاند کی روشنی منعکس ہوتی ہے نسبتاً حال ہی میں دریافت ہوئی ہے۔

روشنی کا انعکاس ہوتی ہے لیکن یہ بات محمد ﷺ کے دور سے ایک ہزار برس پہلے ہی معلوم تھی۔ اور یہ کوئی جدید دریافت نہیں ہے۔ ارسطو نے ۳۶۰ ق م میں ہی چاند پر زمین کا سایہ پڑنے کی بات کی تھی اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ زمین گول ہے۔ اور چاند پر سایہ پڑنے کی بات وہ اسی صورت میں کر سکتا تھا اگر اسے یہ علم تھا کہ چاند سے روشنی خارج نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس کے باوجود اسے معجزہ قرار دینے پر مصر ہیں تو پھر ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ خود قرآن سے بھی اس دعوے کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟

سب سے پہلے ہم لفظ ''سراج'' پر غور کریں گے۔

یہ لفظ سورۂ نوح میں استعمال ہوا ہے جس کا حوالہ پہلے دیا گیا۔ پھر سورۂ فرقان میں، جہاں اس کا مطلب چراغ ہے اور سورج کے لیے استعمال ہوا ہے۔ پھر سورۂ النبا میں جہاں ﴿ سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی ''نہایت روشن اور گرم چراغ''۔

لفظ ''نور'' اور ''منیر'' ایک ہی مادے سے نکلے ہیں۔ لفظ منیر قرآن میں چھ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران، سورۂ حج، سورۂ لقمان اور سورۂ فاطر میں۔ ایک اصطلاح استعمال ہوئی ''کتاب المنیر'' جس کا ترجمہ پکتھال نے ''The Scripture giving Light'' اور عبداللہ یوسف علی نے ''A Book of Enlightment'' کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں مراد علم کی روشنی پھیلانے والی کتاب ہے اور ''منعکس روشنی'' کا کوئی ذکر نہیں۔ نور کا لفظ سورۂ نوح اور سورۂ یونس میں استعمال ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''وہی ہے جس نے چاند کو نور بنایا''۔ یہاں خود چاند کو روشنی بتایا جا رہا ہے اور یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ چاند روشنی کو منعکس کرتا ہے۔

مزید برآں بعض دیگر آیات میں خود اللہ کو نور قرار دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر سورۂ نور میں قرآن کا ایک خوبصورت بیان ہے جس میں کہا گیا ہے:

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ

﴿ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ﴾ [النور: ٣٥]

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔ اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو اور نہ غربی۔ جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے اس کو آگ نہ لگے۔''

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''نور'' کا لفظ چاند کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اللہ کے لے بھی۔ تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اللہ کا نور بھی منعکس نور ہے؟ میرے خیال میں تو نہیں۔ لیکن اگر آپ اس پر مصر ہیں کہ ''نور'' منعکس یا ''مانگی ہوئی روشنی'' ہی کو کہتے ہیں تو پھر ہم متذکرہ بالا آیت میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ تو پھر اس روشنی کا ''سراج'' یا اصل منبع کیا ہے جس کا نور اللہ ہے؟

ذرا سوچیے؟

اگر اللہ کو ''نور'' کہا گیا ہے تو پھر یہ کس روشنی کا، کس ''سراج'' کا عکس ہے؟

دیکھیے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ''سراج'' کون ہے؟ لیکن قرآن کا جواب آپ کو حیران کر دے گا۔ سورۂ احزاب میں ہم دیکھتے ہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ○ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ○ ﴾ [الاحزاب: ٤٦-٤٥]

''اے نبیؐ! ہم نے تمھیں بھیجا ہے، گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔''

اس آیت میں محمد ﷺ کو ''روشن چراغ'' کہا گیا ہے۔ عربی میں ﴿ سِرَاجًا

مُّنِيْرًا﴾ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ لسانی اور روحانی ہر دو لحاظ سے یہاں بحث کا اختتام ہو جاتا ہے۔ لسانی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں ''سراج'' اور ''منیر'' کے الفاظ بیک وقت استعمال ہوئے ہیں اور ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں یعنی محمد ﷺ کی روشن شخصیت کے لیے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ منیر کا لفظ اس آیت میں ''منعکس روشنی'' کے لیے استعمال نہیں ہوا، بلکہ کسی بھی آیت میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ اس کا مطلب صرف ''روشن'' ہے۔ محمد ﷺ کے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے کہ چاند روشن ہے اور درست سمجھتے تھے، اسی طرح جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے لوگ سورج کو بڑی روشنی اور چاند کو چھوٹی روشنی سمجھتے تھے اور وہ بھی ٹھیک سمجھتے تھے۔

لیکن اگر آپ اپنی بات پر اصرار کریں گے کہ عربی لفظ ''نور'' کا مطلب ''منعکس روشنی'' ہی ہوتا ہے تو پھر قرآن میں ان الفاظ کے استعمال سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ محمد ﷺ سورج کی طرح اور اللہ چاند کے مانند ہے۔ کیا ڈاکٹر ذاکر نائیک واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محمد ﷺ روشنی کا اصل ذریعہ ہیں اور اللہ اس روشنی کا عکس ہے؟

اس قسم کے نام نہاد ''سائنسی دعوے'' کیے ہی کیوں جاتے ہیں جن کا دفاع کوئی مسلمان خود قرآن کی روشنی میں بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کے مکالمے میں ایماندارانہ بحث مباحثے کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتے ہیں۔

اب ہم آگے چلتے ہیں اور آبی چکر ''Water Cycle'' کا جائزہ لیتے ہیں۔ بعض مسلمانوں کا کہنا ہے کہ قرآن ہمیں جدید سائنس سے پہلے ہی آبی چکر کے بارے میں معلومات فراہم کر چکا تھا۔

آبی چکر ہوتا کیا ہے؟

آبی چکر کے چار مراحل ہوتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں سمندروں اور زمین پر موجود پانی سے بخارات اٹھتے ہیں۔ دوسرے

مرحلے میں یہ بخارات بادلوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ تیسرے مرحلے میں بادلوں سے بارش ہوتی ہے اور چوتھے مرحلے میں اس بارش کی وجہ سے نباتات اگتی ہیں۔ یہ سب کچھ بڑا سیدھا سادا معلوم ہوتا ہے اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے مرحلے کے بارے میں تو ہر کوئی جانتا ہے۔ شہروں میں رہنے والے لوگ بھی بہ خوبی جانتے ہیں کہ بادل آتے ہیں پھر بارش ہوتی ہے اور پھر پودے بڑھتے ہیں۔ البتہ بات پہلے مرحلے کی ہے یعنی بخارات اٹھنے کی، کیوں کہ یہ عمل ہمیں نظر نہیں آتا، یہی مرحلہ مشکل ہے اور اسی مرحلے کا ذکر قرآن میں موجود نہیں۔ اب ہم بائبل کی طرف دیکھتے ہیں، بائبل میں ایک پیغمبر جس کا تعلق ۷۰۰ ق م سے ہے، کہتا ہے:

''وہی ثریا اور جبار ستاروں کا خالق ہے جو موت کے سایہ کو مطلعِ نور اور روزِ روشن کو شبِ دیجور بنا دیتا ہے اور سمندر کے پانی کو بلاتا اور روئے زمین پر پھیلاتا ہے۔ جس کا نام خداوند ہے۔'' [عاموس ۸:۲]

یہاں پہلے اور تیسرے مرحلے کا ذکر موجود ہے۔

ایک اور نبی ایوب علیہ السلام ہیں جن کا زمانہ سنہ ہجری کے آغاز سے کم از کم ایک ہزار سال قبل کا ہے، وہ کہتے ہیں:

''دیکھ خدا بزرگ ہے اور ہم اسے نہیں جانتے۔

اس کے برسوں کا شمار دریافت سے باہر ہے۔

کیوں کہ وہ پانی کے قطروں کو اوپر کھینچتا ہے۔

جو اسی کے ابخرات سے بارش کی صورت میں ٹپکتے ہیں۔

جن کو افلاک انڈیلتے اور انسان پر کثرت سے برساتے ہیں۔''

[ایوب ۲۸۔۳۶:۲۶]

سو یہاں، بائبل میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے یعنی سب سے مشکل مرحلے کا بیان قرآن سے ہزار سال پہلے سے موجود ہے۔ اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور پہاڑوں کے ذکر کا جائزہ

لیتے ہیں۔قرآن میں کوئی درجن بھر آیات ایسی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے پہاڑوں کو زمین پر مضبوطی سے قایم کیا ہے۔ اور ان میں چند آیاتِ میں پہاڑوں کو ایمان والوں کے لیے رحمت اور کافروں کے لیے یاددہانی قرار دیا گیا ہے۔

اس کی ایک مثال سورۂ لقمان میں موجود ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ○ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ○ ﴾ [لقمٰن: ۱۱-۱۰]

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں، اس نے زمین میں پہاڑ جمادیے تاکہ وہ تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اُگا دیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔''

اس آیت میں پہاڑ چھ یاددہانیوں میں سے ایک ہے۔اسی طرح سورۂ انبیاء میں کہا گیا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ○ ﴾ [الانبیاء: ۳۱]

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جمادیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنادیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کرلیں۔''

سورۂ نحل میں کہا گیا:

﴿ وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ

تَهۡتَدُوۡنَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۵]

''اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے، اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''

اگلی دو آیات میں ایک اور تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

سورۃ النباء میں کہا گیا:

﴿ اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۝ وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۝ ﴾ [النباء: ۷۔۶]

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔''

﴿ اَوۡتَادًا ﴾ وہ میخیں ہوتی ہیں جو خیمہ گاڑنے کے کام آتی ہیں۔ اسی طرح سورۃ غاشیہ میں کہا جاتا ہے:

﴿ اَفَلَا يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ ۝ وَاِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ ۝ ﴾ [الغاشیہ: ۱۹۔۱۷]

'' (یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اُٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟''

ایک تیسری تصویر لفظ ''رواسی'' کے استعمال سے سامنے آتی ہے، یہ لفظ اسی مادے سے نکلا ہے جس سے وہ لفظ نکلا ہے جو عربی میں ''لنگر'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا یہاں بھی وہی تصور موجود ہے، زمین کو کانپنے سے بچانے کا۔ ان سب تصورات سے یہ بات واضح ہے کہ محمد ﷺ کے ماننے والے یہی یقین رکھتے تھے کہ پہاڑ دراصل زمین میں لنگر یا میخوں کی طرح پھینکے گئے ہیں تاکہ یہ زمین کو قایم رکھیں جس طرح لنگر جہاز کو روکے رکھتا ہے یا میخیں خیمے کو روکے رکھتی ہے۔ تاکہ زمین حرکت نہ کرے یا بالفاظ دیگر زلزلے نہ آئیں۔

لیکن درحقیقت یہ بات غلط ہے، کیوں کہ پہاڑوں کی تشکیل تو زلزلوں کا سبب بنتی

ہے۔ لہٰذا یہ آیات یقیناً ایک مسئلہ پیش کرتی ہیں۔ ڈاکٹر موریس بوکائیے کو بھی اس بات کا اندازہ تھا اور انھوں نے اپنی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' میں اس حوالے سے بحث بھی کی ہے۔ پہاڑوں کے بارے میں مذکورہ بالا آیات درج کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ جدید ماہرین ارضیات کہتے ہیں کہ یہ سطح ارضی کے نقائص پہاڑوں کو بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ اور سطح ارضی کی مضبوطی کا سبب یہی نقائص ہوتے ہیں۔

جب اس بارے میں ارضیات کے پروفیسر Dr. David A. Young سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا:

''اگرچہ یہ بات درست ہے کہ بہت سے پہاڑی سلسلے چٹانوں کی تہوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ تہیں بہت عظیم الشان ہوتی ہیں لیکن یہ بات درست نہیں کہ ان تہوں کی وجہ سے سطح ارضی مستحکم ہوتی ہے۔ بلکہ ان تہوں کی موجودگی بذاتِ خود چٹانوں کے عدم استحکام کی نشانی ہوتی ہے۔''

گویا بہ الفاظِ دیگر پہاڑ زمین کے استحکام کا باعث نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس پہاڑوں کی تشکیل زمین کے کانپنے کا سبب بنتی رہی ہے اور آج بھی بنتی ہے۔ دورِ جدید کے ارضیاتی نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے تو سطح ارضی کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ٹھوس ارضی سطح دراصل مختلف تہوں اور حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ تہیں ایک دوسرے کے لحاظ سے حرکت بھی کرتی ہیں۔ بعض اوقات تو یہ تہیں علیحدہ بھی ہو جاتی ہیں۔ جس کی مثال شمالی اور جنوبی امریکہ کی یورپ اور جنوبی افریقہ سے علیحدگی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ یہ تہیں ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، جس کے نتیجے میں زلزلے آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال مشرقِ وسطیٰ میں ملتی ہے جہاں عرب علاقے کی ایران کی جانب حرکت کے نتیجے میں ایک پہاڑی سلسلے نے تشکیل پائی۔

اسی طرح دنیا بھر میں سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایسے مشاہدات ہوتے ہیں کہ کچھ ریتلی پہاڑیاں، جن کی شکل پہلے مختلف تھی اب بدل چکی ہے۔ ان کی حالت تبدیل ہونے کا

سبب بھی زلزلے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ تہیں ایک دوسرے سے رگڑ کھانا شروع کر دیتی ہیں۔ اس دوران بہت بڑے پیانے پر قوت پیدا ہوتی ہے، اس قوت کے نتیجے میں ایک بہت بڑی لہر پیدا ہوتی ہے اور پھر فوراً ہر چیز ساکن ہو جاتی ہے۔

میکسیکو میں آنے والے ایک حالیہ زلزلے کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ جب زلزلہ آیا تو ایک تہہ پورے تین میٹر تک اچھلی تھی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر آپ کا گھر اچانک تین میٹر اچھلے تو کیا قیامت برپا ہوگی؟ ایک دوسری طرح کے پہاڑ وہ ہوتے ہیں جو آتش فشاں کے ذریعے بنتے ہیں۔ زمین کے اندر سے لاوا اور راکھ قوت کے ساتھ یوں برآمد ہوتے ہیں کہ ان سے ایک پہاڑ بن جاتا ہے۔ ایسا پہاڑ سمندر کی تہہ سے بھی برآمد ہو سکتا ہے۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ لاوے کے دباؤ سے ایک سطح ابھرتی ہے مگر پھٹتی نہیں ایسی جگہ پر جب دباؤ بڑھتا ہے تو یہ پھٹ جاتی ہے جسے آتش فشاں کا پھٹنا کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسا ایک واقعہ جنوبی بحر الکاہل میں کریکاٹو کے مقام پر ۱۸۸۳ء میں ہوا تھا۔ اس واقعہ میں ایک پورا جزیرہ ہی پھٹ گیا تھا۔ اسی طرح ماؤنٹ سینٹ ہیلینا کے واقعے میں بھی ایک پورا پہاڑ ہی پھٹ گیا تھا۔

مندرجہ بالا معلومات کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پہاڑوں کی تشکیل پہلے بھی سطح زمین کی حرکت اور زلزلوں کے باعث ہوئی تھی اور آج بھی اسی طرح ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ زلزلوں کی صورت میں سامنے آتا ہے سطح ارضی کی تہیں جب ایک دوسرے سے رگڑ کھاتی ہیں تو زلزلے آتے ہیں۔ اسی طرح آتش فشاں بھی زلزلے کا سبب بنتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ محمد ﷺ کے پیروکاروں کے لیے ان آیات کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے پہاڑوں کو زمین میں گاڑا ہے، میخوں کی مانند یا لنگر کی طرح، تاکہ زمین حرکت نہ کرے اور مستحکم رہے۔ پہاڑوں کو زمین میں گاڑے جانے کی بات تو شاید شاعرانہ ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ پہاڑ زمین کو کانپنے سے بچاتے ہیں، یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کیوں کہ یہ

بات جدید سائنس کی رُو سے غلط ہے۔

اب ہم مختصراً اس بات کا جائزہ لیں گے کہ قرآن سورج کے بارے میں ہمیں کیا بتاتا ہے؟

سورۂ کہف میں کہا گیا ہے:

﴿ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ○ ﴾ [الکہف: ۸۶]

”حتیٰ کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی حد تک پہنچ گیا، تو اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا اور وہاں اسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے۔“

پھر سورۂ فرقان میں یہ بھی کہا گیا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ○ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ○ ﴾

[الفرقان: ۴۶-۴۵]

”تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا، پھر (جیسے جیسے سورج اٹھتا جاتا ہے) ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے جاتے ہیں۔“

اگر ہم اس طرح سوچیں کہ جب سورج ہمارے سر پر ہوتا ہے تو سایہ نہیں ہوتا یا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے لیکن جوں جوں سورج آگے بڑھتا ہے اس کے مخالف سمت میں سایہ طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

لیکن بات یہ ہے کہ سورج تو زمین کے لحاظ سے ساکن ہے۔ زمین کی گردش درحقیقت سائے کے گھٹنے یا بڑھنے کا سبب بنتی ہے۔ گویا زمین کی حرکت سائے کو گھٹانے بڑھانے کا

سبب بنتی ہے۔

اب میں ایک مختلف موضوع کی طرف آتا ہوں۔ قرآن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا واقعہ بیان ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی وفات کا جنوں کو پتہ اس وقت چلا جب ان کے عصا کو گھن لگ گیا۔ اور وہ گر پڑے۔

گویا صورتِ حال یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں لیکن ان کا جسم عصا کے سہارے کھڑا ہے۔ کوئی باورچی ان کے پاس نہیں آتا کہ پوچھے؛ حضرت آج کیا کھائیں گے۔ کوئی جنرل احکامات لینے نہیں آتا۔ کوئی درباری آ کر یہ نہیں کہتا کہ شکار پر چلیں۔ میرے لیے یہ کہانی ناقابل یقین ہے کیوں کہ بادشاہ کو کبھی بھی اس طرح اکیلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔

اب ہم ذرا ''دودھ'' کا جائزہ لیتے ہیں۔ سورۂ نحل میں کہا گیا ہے:

﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ ﴾ [النحل: ٦٦]

''اور تمھارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم تمھیں ایک چیز پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔''

پیٹ میں سے؟ جہاں آنتیں ہوتی ہیں؟ معاف کیجیے گا۔ بیسویں صدی کے علم طب کے مطابق Mammary Glands جن میں دودھ بنتا ہے، ان کا آنتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اب ہم آتے ہیں ایک اور موضوع کی جانب۔ سورۂ انعام میں کہا گیا ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ ﴾

[الانعام: ٣٨]

''زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی

پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

اس آیت میں یہ کہا جارہا ہے کہ ہر جانور اور ہر پرندے کا تعلق ہم انسانوں جیسی انواع سے ہے۔ بعض مکڑیوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ نر مکڑی کو مادہ مکڑی کھا جاتی ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میری بیوی مجھے نہیں کھائے گی۔ اسی طرح شہد کی مکھیوں میں بھی ضرورت سے زاید نر مکھیوں کو چھتے سے نکال دیا جاتا ہے۔ شکر ہے کہ میری بیوی نے مجھے گھر سے باہر نہیں نکال دیا۔ اسی طرح شیروں میں جب ایک نر شیر بوڑھا ہوجاتا ہے تو جوان شیر اسے بھگا دیتے ہیں۔ اور اس کے بچوں کو مار دیتے ہیں۔

لہٰذا میں یہ نہیں سمجھتا کہ دیگر تمام جانور بھی نوعِ انسانی کی طرح رہتے ہیں۔

نتیجتاً میں کہوں گا کہ یہ واضح ہے کہ قرآن میں بہت سی سائنسی غلطیاں موجود ہیں۔ [1] عموی طور پر قرآن اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق ہے اور اس کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ یعنی ساتویں صدی عیسوی کی علمی سطح۔

ہم آج یہاں حق کی تلاش میں جمع ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی استطاعت کی حد تک مصدقہ معلومات پیش کی ہیں۔ اگر آپ مکمل حوالے دیکھنا چاہیں تو وہ میری کتاب:

"The Quran and the Bible, in the light of History & Science."

میں موجود ہیں۔

سچائی کا خدا آپ کی رہنمائی کرے۔

شکریہ

☆............☆............☆

(۱) نقل کفر، کفر نہ باشد۔

خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

محترم ڈاکٹر ولیم کیمپبل صاحب، ڈاکٹر مارکوس، ڈاکٹر جمال، سیموئیل نعمان، ڈاکٹر محمد نائیک اور میرے عزیز بھائیو اور بہنو، میں آپ سب کو اسلامی طریقہ سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

میں دعا کرتا ہوں کہ آپ سب پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔

ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے:

''قرآن اور بائبل جدید سائنس کی روشنی میں''

قرآنِ مجید وحی کی آخری اور مکمل صورت ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ ہر وہ کتاب جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہے اسے وقت کی آزمائش پر پورا اترنا چاہیے۔

دور گزشتہ کو دیکھا جائے تو وہ زمانہ معجزات کا زمانہ تھا۔ الحمد للہ قرآنِ پاک معجزوں کا معجزہ ہے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جسے ادب اور شاعری کا دور کہنا چاہیے اور کیا مسلم کیا غیر مسلم، سب اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن روئے زمین پر عربی ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ لیکن آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن جدید سائنس سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟

البرٹ آئن سٹائن نے کہا تھا:

"مذہب سائنس کے بغیر لنگڑا ہے اور سائنس مذہب کے بغیر اندھی ہے۔"

سب سے پہلے تو میں آپ کو یاد کرانا چاہوں گا کہ قرآن مبین سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ گویا یہ سائنس (Science) کی کتاب نہیں ہے بلکہ نشانیوں (Signs) کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں چھ ہزار سے زیادہ نشانیاں یعنی آیات ہیں جن میں تقریباً ایک ہزار ایسی ہیں جن کا تعلق سائنس سے ہے۔

سائنس اور قرآن کے حوالے سے جہاں تک میری گفتگو کا تعلق ہے تو میں اسے صرف ایسے سائنسی حقائق تک محدود رکھوں گا جو ثابت شدہ ہوں۔ میں ان سائنسی نظریات کے بارے میں بات نہیں کروں گا جن کی حیثیت محض مفروضوں اور اندازوں سے زیادہ نہیں، جن کا کوئی ثبوت موجود نہیں، کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس بعض اوقات پلٹا بھی کھا جاتی ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے ڈاکٹر موریس بوکائیے کی کتاب "بائبل، قرآن اور سائنس" کے جواب میں "بائبل اور قرآن، تاریخ اور سائنس کی روشنی میں" لکھی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ دو طریقہ ہائے کار موجود ہیں۔ ایک تطبیق کا طریقہ کار ہے جس کے تحت ایک شخص سائنسی نظریات اور مذہبی بیانات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا طریقہ کار اختلاف کا ہے یعنی سائنس اور مذہب کے مابین اختلاف کو سامنے لایا جائے۔ (اور ایک کی روشنی میں دوسرے کو غلط قرار دیا جائے۔)

جیسا کہ محترم ڈاکٹر کیمپبل نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔

لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس سے قطع نظر کہ کوئی شخص تطبیق کا طریقہ اختیار کرتا ہے یا تردید کا، اگر آپ منطقی دلائل کی روشنی میں اور منطقی طریقہ کار کے تحت آگے بڑھتے ہیں تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جو قرآن کے کسی ایک بیان کو بھی جدید سائنس کی روشنی میں غلط ثابت کر سکے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے جدید سائنس کی روشنی میں قرآن میں متعدد نام نہاد غلطیوں کی

نشان دہی کی ہے، جن کا جواب مجھے تقریب کے دوسرے حصے میں یعنی ...... جوابی خطاب میں دینا ہے۔ لیکن چوں کہ انھوں نے پہلے گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا ان کے چند نکات کا جواب میں اسی گفتگو کے دوران دوں گا۔ ان کی گفتگو کا بیش تر حصہ علم الجنین اور ارضیات سے متعلق تھا، لہٰذا اس حوالے سے ان کے اعتراضات کا جواب میں ابھی دے دوں گا جب کہ باقی ماندہ اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش میں ان شاء اللہ اپنی جوابی گفتگو میں کروں گا۔

بات یہ ہے کہ ہمارا موضوع ''قرآن اور بائبل، سائنس کی روشنی میں'' ہے۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں ہے کہ میں ایک ہی کتاب مقدسہ کے بارے میں بات کروں۔ یہ موضوع سے انصاف نہیں ہوگا۔ میں قرآن اور بائبل دونوں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے بائبل کے بارے میں مشکل سے ایک دو باتیں ہی کی ہیں۔ انشاء اللہ میں اس بارے میں مفصل بات کروں گا۔ کیوں کہ میں موضوع سے انصاف کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک قرآن اور جدید سائنس کا تعلق ہے، ہم بات کا آغاز فلکیات سے کریں گے۔ چند دہائیاں پیش تر سائنسدانوں اور ماہرین فلکیات نے ہمیں بتایا کہ کائنات کس طرح وجود میں آئی۔ وہ اس نظریے کو ''عظیم دھماکہ'' یا Big Bang کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ ایک Primary Nebula بہت بڑے دھماکے کے ساتھ پھٹا اور اس کے نتیجے میں کہکشائیں اور اجرام فلکی وجود میں آئے۔ یعنی ستارے، سورج، چاند اور وہ زمین بھی جس پر آج ہم رہ رہے ہیں۔ یہ ساری معلومات قرآن میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں۔

سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء ۲۱: ۳۰]

''کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کردیا ہے

غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟''

ذرا تصور کیجیے، یہ بات حال ہی میں ہمارے علم میں آئی ہے لیکن قرآن میں یہ بات آج سے چودہ سو سال پہلے ہی بیان کی جا چکی تھی۔ جب میں سکول میں تھا تو ہمیں بتایا جاتا تھا کہ سورج ساکن ہے جب کہ زمین اور چاند اپنے مداروں میں سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ یعنی چاند اور زمین تو اپنے مداروں میں متحرک ہیں مگر سورج ایک مقام پر ساکن ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کی ایک آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۳۳]

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

یعنی ہر کوئی اپنے اپنے فلک میں، اپنے اپنے مدار میں حرکت کر رہا ہے۔ الحمد للہ آج جدید سائنس بھی اس آیت قرآنی کی تصدیق کر چکی ہے۔ قرآن میں اس مقام پر جو عربی لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے ﴿ يَسْبَحُوْنَ ﴾۔ یہ لفظ ایک ایسے جسم کی حرکت ظاہر کرتا ہے جو اپنے مقام پر بھی متحرک ہو۔ گویا جہاں اجرامِ فلکی کا ذکر ہو وہاں یہ لفظ اپنے مرکز کے گرد حرکت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

پس قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ چاند اور سورج اپنے مرکز کے گرد بھی گھومتے ہیں اور اپنے اپنے مداروں میں بھی تیر رہے ہیں۔ آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سورج تقریباً ۲۵ دن میں اپنے مرکز کے گرد ایک چکر پورا کر لیتا ہے۔

ایڈون ہبل وہ سائنس دان تھا جس نے پہلی بار یہ حقیقت دریافت کی کہ ہماری کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کی سورۂ ذاریات میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴾ [الذّٰریٰت: ٤٧]

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اسے وسیع کرنے والے ہیں۔''

یہاں کائنات کے پھیلنے کا ذکر ہے، عربی کے لفظ ﴿ مُوْسِعُوْنَ ﴾ کا مطلب ہے وسعت دینے والا، وسیع کرنے والا۔

فلکیات کے حوالے سے جن باتوں کا ذکر ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے کیا ہے ان کا جواب میں اپنی جوابی گفتگو کے دوران میں ہی دوں گا۔ ان شاء اللہ۔

جہاں تک ''آبی چکر'' کا تعلق ہے ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی گفتگو میں چار مراحل کا حوالہ دیا ہے۔ جب کہ اپنی کتاب میں وہ چوتھے مرحلے کا (a) اور (b) دو حصوں میں ذکر کرتے ہیں۔ آخری مرحلے کا ذکر انھوں نے اپنی گفتگو میں نہیں کیا۔ پتہ نہیں کیوں......

یہ مرحلہ Driplination کہلاتا ہے، شاید انھوں نے اس لیے اس کو نظر انداز کر دیا ہوگا کہ اس کا ذکر بائبل میں موجود نہیں ہے۔

وہ کہتے ہیں قرآن کی کسی آیت میں بھی بخارات بننے کے عمل کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن آبی چکر کے بارے میں ہمیں بڑی وضاحت سے بتاتا ہے۔ سورۃ الطارق میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴾ [الطارق: ١١]

''اور قسم ہے پلٹانے والے آسمان کی۔''

تقریباً تمام مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں اس آیت میں جو رجوع یا پلٹانے کی بات کی گئی ہے اس سے مراد بارش کو پلٹانے یا بخارات کی صورت میں پانی کے بادلوں میں تبدیل ہونے کی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل جو عربی جانتے ہیں، اس موقع پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بات واضح الفاظ میں بیان کیوں نہیں کی؟ صاف صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہا کہ آسمان بخارات کو بارش کی صورت میں پلٹا دیتا ہے؟

لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یوں کیوں نہیں فرمایا؟ اسی میں حکمت تھی کیوں کہ آج ہمیں یہ علم ہوا ہے کہ زمین کے اوپر موجود فضائی سطح (Ozonosphere) نہ صرف بخارات اور بادلوں کو بارش کی صورت میں زمین کی طرف پلٹاتی ہے بلکہ زمین سے اوپر جانے والی فایدہ مند حرارت اور قوت کو بھی واپس پلٹاتی ہے جو کہ انسانیت کے لیے فایدہ مند ہیں۔

آج ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سطح ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کی نشریاتی لہروں کو پلٹانے کا بھی سبب بنتی ہے۔

مزید برآں یہ سطح یعنی Ozonosphere بیرونی خلا سے آنے والی نقصان دہ شعاعوں کو روکنے اور پلٹانے کا سبب بھی بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر سورج سے آنے والی بالابنفشی شعاعیں، جنھیں اوزون کی سطح جذب کر لیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین پر حیات ختم ہوسکتی ہے۔

لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ عظیم ہے اور بالکل بجا طور پر ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ ﴾ [الطارق: ۱۱]

”اور قسم ہے پلٹانے والے آسمان کی۔“

دیگر باتیں جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے، وہ بھی قرآن میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لیے آپ میری ویڈیو کیسٹ دیکھ سکتے ہیں۔[1] قرآن تو آبی چکر کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ کرتا ہے۔

جہاں تک بائبل میں آبی چکر کے ذکر کا تعلق ہے، تو انھوں نے پہلے تو آبی چکر کے پہلے اور تیسرے مرحلے کا حوالہ دیا اور بعد ازاں پہلے، تیسرے اور دوسرے مرحلے کا۔ انھوں نے کہا کہ پانی اوپر جاتا ہے اور بارش کی صورت میں دوبارہ زمین پر آتا ہے۔ یہ ملی ٹس کا فلسفہ ہے جو کہ ساتویں صدی قبل مسیح کا فلسفی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سمندر کی سطح سے بخارات

---

(۱) ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر کا اُردو ترجمہ ”قرآن اور سائنس“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (ناشر)

کو ہوا اٹھا کر لے جاتی ہے جو بعد ازاں بارش کی صورت میں برستے ہیں۔ اس فلسفے میں بادلوں کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

دوسرا حوالہ جو ڈاکٹر کیمپبل نے دیا، اس میں پہلی بات یہ کی گئی کہ پانی بخارات میں تبدیل ہوتا ہے، ہم اس بات سے اتفاق کرتے ہیں، ہمیں بائبل کے ساتھ تطبیق کا رویہ اختیار کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس کے بعد بارش کا ذکر ہے اور پھر دوبارہ بادلوں کا۔ یہ سب بجا لیکن یہ مکمل آبی چکر نہیں ہے۔

الحمدللہ قرآن اس آبی چکر کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور وہ بھی متعدد مقامات پر۔ بادلوں کا بننا، ان کی حرکت، ان کا برسنا اور پھر پانی کی دوبارہ بخارات میں تبدیلی، ان سب مراحل کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔

مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی میں ہمیں آبی چکر کا ذکر ملتا ہے۔

سورۂ نور، آیت: ۴۳	سورۂ روم، آیت: ۴۸
سورۂ الزمر، آیت: ۲۱	سورۂ مومنون، آیت: ۱۸
سورۂ روم، آیت: ۲۴	سورۂ حجر، آیت: ۲۲
سورۂ اعراف، آیت: ۵۷	سورۂ رعد، آیت: ۱۷
سورۂ الفرقان، آیات: ۴۹-۴۸	سورۂ فاطر، آیت: ۹
سورۂ جاثیہ، آیت: ۵	سورۂ ق، آیت: ۹
سورۂ واقعہ، آیات: ۶۸ تا ۷۰	سورۂ الملک، آیت: ۳۰

قرآنِ مجید کی مندرجہ بالا تمام آیاتِ کریمہ میں آبی چکر Water Cycle کا ذکر موجود ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی گفتگو کا بیشتر وقت علم الجنین Embryology کے حوالے سے گفتگو میں صرف کیا ہے۔ میں نے نوٹ کیا تھا۔ ان کی تقریباً نصف گفتگو علم الجنین سے متعلق تھی۔ اس کے بعد انھوں نے ارضیات کے حوالے سے نسبتاً زیادہ گفتگو کی اور پھر چھ

دیگر موضوعات کے حوالے سے سرسری گفتگو کی۔

جہاں تک ارضیات کا تعلق ہے، جدید ماہرین ارضیات ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا قطر تقریباً تین ہزار سات سو پچاس میل ہے، زمین کی سب سے باہری سطح ٹھنڈی ہے لیکن اندرونی پرتیں انتہائی گرم اور پگھلی ہوئی حالت میں ہیں، جہاں زندگی کا کوئی امکان موجود نہیں۔ اور یہ کہ زمین کی سب سے بیرونی پرت جس پر ہم آباد ہیں، نسبتاً انتہائی باریک ہے، اس کی موٹائی ایک میل سے لے کر ۳۰ میل تک ہے، چند حصے نسبتاً زیادہ موٹے ہو سکتے ہیں لیکن عموماً یہ پرت ایک سے تیس میل کے درمیان ہی ہوتی ہے۔

اس پرت یا سطح کے ''ہلنے'' کے قوی امکانات موجود رہتے ہیں جس کی ایک وجہ ''بل پڑنے کا عمل'' ہے، جس کے نتیجے میں پہاڑ بنتے ہیں اور زمین کی سطح کو استحکام ملتا ہے۔

قرآن کی سورۂ نبا میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ ﴾ [النباء : ۷-۶]

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخیں۔''

قرآن یہ نہیں کہتا کہ پہاڑوں کو میخوں کی طرح زمین میں اوپر سے گاڑا گیا ہے بلکہ یہ کہ پہاڑوں کو میخوں کی طرح بنایا گیا ہے۔ اوتاداً کا مطلب خیمے گاڑنے والی میخیں ہی ہوتا ہے۔ آج جدید علم ارضیات بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ پہاڑوں کی جڑیں زمین میں گہرائی تک ہوتی ہیں۔ یہ بات انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں سامنے آئی تھی کہ پہاڑ کا بیشتر حصہ زمین کے اندر ہوتا ہے اور صرف تھوڑا سا حصہ ہمیں نظر آتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے زمین میں گڑی ہوئی میخ کا بیشتر حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یا جس طرح ''آئس برگ'' کی صرف چوٹی ہمیں نظر آتی ہے جب کہ ۹۰ فی صد حصہ پانی کے اندر ہوتا ہے۔

سورۂ غاشیہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ ﴾ [الغاشیہ : ۱۹]

''اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟''

ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۝ ﴾ [النازعات : ۳۲]

''اور پہاڑ اس میں کھڑے کر دیے۔''

جدید ارضیاتی نظریے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ پہاڑی سلسلے سطحِ زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ تمام ماہرین ارضیات نہیں لیکن کئی ماہرین یہی کہتے ہیں۔ میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ علم ارضیات کی کسی ایک مستند کتاب میں وہ بات دکھا دیں جو انھوں نے کی۔ اور میں مستند کتاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان کی ''ذاتی خط و کتابت'' کا نہیں۔ دستاویزی ثبوت مانگ رہا ہوں۔

دوسری طرف ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ''زمین'' (Earth)۔ یہ کتاب بیش تر یونیورسٹیوں کے ارضیات کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کے مصنفین میں ڈاکٹر فرینک پریس بھی شامل ہیں جو سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے مشیر رہ چکے ہیں اور امریکہ کی اکیڈمی آف سائنسز کے بھی صدر رہے ہیں۔ وہ اس کتاب میں کہتے ہیں کہ پہاڑ مثلث نما ہوتے ہیں، زمین کے اندر گہرائی تک ان کی جڑیں ہوتی ہیں اور یہ کہ پہاڑ زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔

جب قرآن کہتا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء : ۳۱]

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔''

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ ﴾ [لقمٰن : ۱۰]

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے، تا کہ وہ تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔''

﴿ وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَاَنْھٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ﴾ [النحل: ۱۵]

''اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تا کہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے، اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے، تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

گویا قرآن میں بھی پہاڑوں کا مقصد یہی بتایا گیا ہے کہ وہ سطح زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ قرآن کی ان آیات میں یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی کتاب میں یہ بات لکھی ہے اور اپنی گفتگو میں بھی کہا ہے کہ پہاڑی علاقوں میں زلزلے زیادہ آتے ہیں اور یہ کہ پہاڑ زلزلوں کا باعث بنتے ہیں۔

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں یہ تو کہیں نہیں کہا گیا کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں۔ عربی میں زلزلے کے لیے ''زلزال'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کیمپبل چوں کہ عربی جانتے ہیں لہٰذا یہ بات ان کے بھی علم میں ہوگی۔ لیکن ان تینوں آیات میں، جن کا میں نے حوالہ دیا، کہیں بھی زلزلے کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ ان میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے ''تَمِیْدَا'' جس کے معنی ''ڈھلکنے'' یا ''جھولنے'' کے ہوتے ہیں اور قرآن ان تینوں آیات میں یہی لفظ استعمال کرتا ہے کہ زمین تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، جھول نہ پڑے۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین حرکت کرتی۔ یہی بات قرآن میں کہی گئی ہے اور یہی بات ڈاکٹر فرینک پریس کر رہے ہیں۔ یہی بات ڈاکٹر نجات لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نجات کا تعلق سعودی عرب سے ہے اور انھوں نے قرآن کے ارضیاتی تصورات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اور یہ کتاب ڈاکٹر ولیم کیمپبل کے جملہ اعتراضات کے تفصیلی جوابات فراہم کر دیتی ہے۔

یعنی ڈاکٹر ولیم کیمپبل کا کہنا یہ تھا کہ اگر پہاڑ زمین کو کانپنے سے روکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ پہاڑی علاقوں میں زلزلے زیادہ آتے ہیں؟

اور میرا جواب یہ ہے کہ نہیں، قرآن میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں؟ زلزلے کو عربی میں زلزال کہتے ہیں۔ آکسفرڈ ڈکشنری میں زلزلے کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

Earthquake is due to convulsion of the superficial crust of the earth, due to relief of compressed siesmic waves, due to a crack in the rock or due to volcanic reaction.

زلزلے یا بھونچال کا ذکر قرآن سورۂ زلزال میں کرتا ہے، لیکن یہاں زلزال کا لفظ استعمال نہیں ہو رہا بلکہ تمید بکم کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی ڈولنے یا ڈھلکنے کا ذکر ہے۔

اسی طرح جہاں تک اس بیان کا تعلق ہے:

''اگر پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں تو پھر پہاڑی علاقوں میں ہی زیادہ زلزلے کیوں آتے ہیں؟''

تو اس بات کا جواب دینے کے لیے میں ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ فرض کیجیے میں کہتا ہوں کہ ڈاکٹر حضرات انسانوں کو لاحق ہونے والی بیماریوں اور امراض کا علاج کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص مجھ پر اعتراض کرتے ہوئے کہے کہ اگر ڈاکٹر بیماریوں کو ٹھیک کرتے ہیں تو پھر زیادہ مریض ہسپتالوں میں کیوں پائے جاتے ہیں جہاں زیادہ تعداد میں ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں، بہ نسبت گھروں کے، جہاں ڈاکٹر نہیں ہوتے؟ تو کیا اس معترض کا استدلال درست ہوگا؟

اب ہم سمندروں کے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ

﴿وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا﴾ [الفرقان : ۵۳]

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں دوسرا تلخ وشور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈ مڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

اسی طرح قرآن مجید کی سورۂ رحمان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ○﴾

[الرحمن : ۱۹، ۲۰]

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

قدیم مفسرین قرآن کے اس مقام کی وضاحت کرتے ہوئے بڑے پریشان ہوتے تھے کہ اس آیت کا کیا مفہوم بیان کریں۔ انھیں کڑوے اور میٹھے پانی کا تو علم تھا لیکن یہ کہ ایسی کوئی رکاوٹ ہے یا پردہ ہے جو انھیں آپس میں حل نہیں ہونے دیتا، اس بات کی وضاحت ان کے لیے مشکل تھی۔

لیکن آج علم بحریات ترقی کر چکا ہے، لہٰذا ہم جانتے ہیں کہ جب ایک قسم کا پانی دوسری قسم کے پانی کے ساتھ ملتا ہے تو دونوں کے اجزاء ایک دوسرے میں حل ہوتے ہیں اور یوں ایک طرح کا محلول تیار ہوتا ہے، یہ یکساں محلول، جس میں دونوں طرح کے پانی کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں، لیکن یہ دونوں طرح کے پانیوں کو الگ الگ بھی رکھتا ہے۔ قرآن اس کے لیے ''برزخ'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس بات پر متعدد بڑے سائنس دانوں کا اتفاق رائے ہے۔ جن میں امریکہ کے ایک سائنس دان Dr, Hay بھی شامل ہیں جو کہ بحری علوم کے ماہر ہیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ اور اُس دور کے ماہی گیر بھی جانتے تھے کہ دو طرح کا پانی ہوتا ہے میٹھا اور کڑوا۔ اور حضرت محمدؐ اپنے سفر

شام کے دوران میں سمندری سفر کے ذریعے یا ان ماہی گیروں کے ساتھ گفتگو کے ذریعے اس صورت حال سے آگاہ ہو سکتے تھے۔

اب ہم آتے ہیں علم الجنین والے معاملے کی جانب۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی گفتگو کا نصف سے زیادہ حصہ اسی موضوع سے متعلق تھا۔ وقت مجھے اتنی اجازت نہیں دیتا کہ میں ان کی ہر غیر منطقی بات کا جواب دے سکوں۔ لہٰذا میں مختصر جواب دوں گا، مزید تفصیل کے لیے آپ میری کتاب ''قرآن اور جدید سائنس'' اور اس موضوع پر میری تقاریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل چند عربوں نے علم الجنین سے متعلق قرآن مجید اور احادیث نبویہ کو اکٹھا کیا اور یہ سارا لوازمہ انھوں نے کینیڈا ڈاکٹر کیتھ مور کو پیش کر دیا جو یونیورسٹی آف ٹورانٹو، کینیڈا میں اس شعبہ کے سربراہ ہیں اور دورِ حاضر میں ان کا شمار علم الجنین کے بڑے ماہرین میں ہوتا ہے۔ ان آیات واحادیث کے تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد جب ان سے تبصرے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ ان میں سے بیش تر آیات اور احادیث تو جدید ترین تحقیقات سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں۔ البتہ چند باتیں ایسی ہیں جنھیں نہ وہ درست قرار دے سکتے ہیں اور نہ ہی غلط کہہ سکتے ہیں کیوں کہ جدید سائنس نے ابھی تک ان کی مکمل وضاحت ہی نہیں کی۔ یعنی انھوں نے کہا کہ وہ خود ان کے بارے میں مکمل علم نہیں رکھتے۔ اور ان میں دو آیات وہ تھیں جو ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن کی اوّلین آیات ہیں:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝﴾

[العلق: ۲،۱]

''پڑھو! (اے نبیؐ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا جس نے ''علقہ'' سے انسان کی تخلیق کی۔''

''علق'' سے مراد کوئی چپکنے والی چیز یا جونک نما چیز ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ولیم کیمپبل کے اس بیان کا تعلق ہے کہ ہمیں کسی کتاب کا مطالعہ

کرتے ہوئے الفاظ کے وہی معنی سامنے رکھنے چاہئیں جو اس وقت مراد لیے جاتے تھے جب کتاب تحریر ہوئی تھی۔ یا وہی معنی قبول کرنے چاہئیں جو معنی اوّلین مخاطبین کے نزدیک درست تھے۔

میں ڈاکٹر کیمپبل کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن صرف بائبل کے معاملے میں۔ بائبل کے حق میں تو ان کی یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ بائبل ایک ایسی کتاب ہے جس کے مخاطبین صرف اس دور کے لوگ تھے۔ بلکہ صرف بنی اسرائیل تھے۔ یہ بات بائبل میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔ بارہ حواریوں کے نام بیان کرنے کے بعد تحریر ہے:

> ''ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور ان کو حکم دے کر کہا: ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' [متی۔ باب ۱۰۔ ۶،۷]

یہاں انھیں غیر قوموں کی طرف جانے سے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام منع کر رہے ہیں۔ غیر قوموں سے کیا مراد ہے؟ غیر قوموں سے مراد ہندو ہیں، مسلمان ہیں، تمام غیر یہودی اقوام ہیں۔ اس طرح متی کی انجیل میں دوبارہ کہا گیا ہے:

> ''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' [متی۔ باب ۱۵۔ ۲۴]

گویا بائبل اور حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کا پیغام ہدایت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھا اور چونکہ یہ پیغام صرف ایک قوم تک محدود تھا لہٰذا یہاں وہ معانی مراد لینا درست ہوگا جو ان لوگوں کے نزدیک تھے۔

لیکن قرآن کا معاملہ مختلف ہے۔ قرآن صرف اس دور کے عربوں کے لیے نازل نہیں ہوا تھا۔ قرآن کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ تو پوری انسانیت کے لیے پیغام ہدایت ہے۔ اور ہر زمانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

سورۂ ابراہیمؑ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾ [ابراھیم: ۵۲]

''یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے۔''

اسی طرح سورۂ بقرہ میں کہا گیا:

﴿الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ [البقرہ: ۱۸۵]

''قرآن انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔''

سورۂ زمر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ [الزمر: ۴۱]

''(اے نبیؐ!) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے۔''

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کا پیغام پوری بنی نوع انسانیت کے لیے ہے۔ اور حضرت محمد ﷺ کو صرف عربوں کے لیے ہدایت دے کر نہیں بھیجا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ سورۂ انبیاء میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [الانبیاء: ۱۰۷]

''(اے نبیؐ!) ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

لہٰذا جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، آپ قرآنی الفاظ کے معانی کو قطعاً اس دور تک محدود نہیں کر سکتے جس دور میں یہ نازل ہوا تھا۔ کیونکہ اس کتاب کا پیغام کسی زمانے تک محدود نہیں ہے۔

(اب ہم سابقہ گفتگو کی طرف لوٹتے ہیں) عَلَق کا ایک مطلب جونک نما چیز یا چپکنے والی چیز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور کہتے ہیں کہ مجھے علم نہیں تھا کہ جنین کی ابتدائی مرحلے میں جونک سے کوئی مشابہت ہوتی ہے یا نہیں۔'' لہٰذا موصوف اپنی تجربہ گاہ میں گئے اور جنین کے ابتدائی مرحلے کا خوردبین سے جائزہ لینے کے بعد اس کا تقابل جونک کی تصویر سے کیا اور وہ دونوں کے درمیان موجود حیرت انگیز مشابہت کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے آپ کو بالکل مختلف تناظر دکھایا ہے۔ان کی کتاب میں جو تصویر ہے وہ مختلف رُخ سے ہے۔اور آپ جانتے ہیں کہ ایک ہی چیز کو جب مختلف تناظر میں دیکھا جائے تو وہ خاصی مختلف محسوس ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور سے ۸۰ سوالات کیے گئے۔ڈاکٹر کیتھ میور نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ ۸۰ سوالات ان سے ۳۰ سال قبل کیے جاتے تو شاید وہ پچاس فی صد سوالات کا بھی جواب نہ دے پاتے۔کیوں کہ گزشتہ تیس سال کے عرصے میں علم الجنین نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔اور یہ بات ڈاکٹر کیتھ مور نے ۱۹۸۰ء کی دھائی میں کی تھی۔

اب صورت یہ ہے کہ ڈاکٹر کیتھ مور کا یہ بیان تحریری صورت میں بھی دستیاب ہے اور ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔آپ ویڈیو کیسٹ میں خود بھی دیکھ سکتے ہیں۔تو اب یہ بتایئے کہ ان کے اس بیان پر یقین کیا جائے گا یا ڈاکٹر کیمپبل کے ساتھ ان کی نجی گفتگو پر؟

ڈاکٹر کیتھ مور نے یہ تحقیقات ایک کتاب کی صورت میں بھی پیش کی تھیں جس کا عنوان تھا ''The Developing Human''۔اس کتاب کو اس سال کسی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔اس کتاب کا اسلامی ایڈیشن ڈاکٹر عبدالمجید الزندانی نے شایع کیا تھا جس پر ڈاکٹر مور کی تصدیق بھی موجود ہے۔

قرآن مجید کی سورہ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ﴾ [المؤمنون : ۱۳]

''پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔''

سورۂ حج میں بلکہ قرآن میں گیارہ مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ انسان کی تخلیق نطفے سے ہوئی ہے۔اور نطفہ عربی زبان میں ''مایع کی انتہائی قلیل مقدار'' کو کہتے ہیں۔مثال کے طور پر وہ مقدار جو پیالے کی تہہ سے لگی رہ جاتی ہے یعنی قلیل ترین مقدار۔

آج ہم جانتے ہیں کہ مادہ منویہ میں موجود کروڑوں جرثوموں میں سے کوئی ایک بھی

جنین کی تشکیل کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور یہ ایک نہایت ہی چھوٹی سی مقدار ہوتی ہے جس کے لیے قرآن ''نطفہ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ [السجدہ: ۸]

''پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔''

''ست یا سلالۃ'' سے مراد ہے کسی چیز کا جوہر، کسی شے کا بہترین حصہ۔ یا یوں کہیے کہ کروڑوں جرثوموں میں سے وہ ایک جرثومہ جو بیضے کو بارآور کرنے کا باعث بنتا ہے۔ قرآن اسی لیے تو یہاں لفظ ''سلالۃ'' یعنی بہترین حصہ استعمال کرتا ہے۔

سورۂ الدھر میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ [الدھر: ۲]

''ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔''

یہاں قرآن ''نطفۃِ امشاج'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یعنی مخلوط نطفہ۔ گویا یہاں اشارہ بیضوں اور مادہ منویہ کی طرف ہے۔ کیونکہ جنین کی تشکیل کے لیے ان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کا ذکر قرآن بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ کرتا ہے۔

سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝﴾ [المومنون: ۱۲-۱۴]

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

مندرجہ بالا آیات میں بتایا گیا کہ انسان کی تخلیق ہوئی نُطفَةٌ سے جو مائع کی انتہائی قلیل مقدار ہے۔

پھر اسے ''قرارِ مَّکِیْنٍ'' میں رکھا گیا یعنی محفوظ جگہ پھر وہ ''علقه'' میں تبدیل ہوا یعنی ''جونک نما شے'' یا ''چپکنے والی شے'' یا ''خون کا لوتھڑا۔''

پھر علقه کو تبدیل کیا گیا ''مضغة'' میں، یعنی چبائی ہوئی شے یا بوٹی۔

پھر مضغة سے ''عظاماً'' یعنی ہڈیاں بنائی گئیں۔

پھر ''لحم'' یعنی گوشت کی تشکیل ہوئی۔

ان تین آیات قرآنی میں جنین کے ارتقائی مراحل بڑی وضاحت سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو نطفه، قرار مکین میں پہنچتا ہے یعنی رحم مادر میں اور پھر وہ علقة میں تبدیل ہوتا ہے۔ لفظ ''علقة'' کے تین معانی ہیں: پہلا معنی تو ''چپکنے والی چیز'' ہے اور یہ معنی بالکل درست ہے کیونکہ جنین رحم کی دیوار کے ساتھ چپکا رہتا ہے۔ دوسرے معنی ''جونک نما شے'' ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ جنین اپنے ابتدائی مراحل میں واقعی جونک سے مشابہ ہوتا ہے۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی اور کچھ اس لحاظ سے بھی کہ جونک کی طرح اس کی پرورش بھی خون سے ہو رہی ہوتی ہے۔

تیسرے معانی ''خون کا لوتھڑا'' بھی ہوتے ہیں اور انھی معانی پر ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اعتراض کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ یہاں قرآن غلطی پر ہے۔ لیکن میں عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن ہرگز غلطی پر نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل غلطی پر ہیں۔ کیونکہ آج، جب علم

طب اس قدر ترقی کر چکا ہے، آج بھی ڈاکٹر کیتھ مور، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جنین ابتدائی مراحل میں خون کے لوتھڑے کی مانند بھی نظر آتا ہے۔ آپ تصاویر کی مدد سے بھی اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ علقہ تین سے چار ہفتے کی عمر میں لوتھڑے سے مشابہ نظر آتا ہے یا نہیں؟

ڈاکٹر کیمپبل کے تمام اعتراضات کا جواب ایک جملے میں بھی دیا جا سکتا ہے اور وہ جملہ یہ ہے کہ:

''قرآن میں جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کو ان کی شباہت کی بنا پر نام دیے گئے ہیں۔''

جنین بظاہر اسی طرح نظر آتا ہے جس طرح قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں واقعی اس کی شباہت لوتھڑے، جونک یا چپکنے والی چیز کی طرح ہوتی ہے۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ علقہ کو مضغہ میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ کسی چبائی ہوئی شے کی مانند ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی درست ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور نے پلاسٹک کے ایک ٹکڑے کو دانتوں سے دبا کر دیکھا۔ ڈاکٹر مور لکھتے ہیں کہ علقہ کے مضغہ میں تبدیل ہونے کے بعد بھی ''چپکاؤ'' موجود رہتا ہے تقریباً ساڑھے آٹھ ماہ کی عمر تک۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن کا بیان غلط ہے۔ قرآنی بیان بالکل درست ہے کیونکہ ''جیسا کہ میں نے پہلے کہا، قرآن نے یہ نام جنین کی ظاہری صورت کی بنا پر دیے ہیں، بے شک جنین تقریباً آخر تک ''چپکنے والی شے'' رہتا ہے لیکن اس کی ظاہری شباہت ''جونک نما چیز'' کی بجائے ''چبائی ہوئی چیز'' جیسی ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ''عِظَامًا'' یعنی ہڈیاں اور پھر ''لَحْمًا'' یعنی گوشت کی تشکیل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کیمپبل کا کہنا ہے کہ ہڈیوں اور پٹھوں کی تشکیل بیک وقت ہوتی ہے۔ میں ان سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی اسی طرح ہوتا ہے۔

آج علم الجنین کی جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ہڈیوں اور پٹھوں کی ابتدائی تشکیل

پچیسویں سے چالیسویں دن کے درمیان ہوتی ہے۔ اور بظاہر ایک ڈھانچے کی صورت نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن پٹھوں یعنی گوشت کی تشکیل مکمل نہیں ہوئی ہوتی۔ یہ ساتویں اور آٹھویں ہفتے میں مکمل ہوتی ہے۔ جب کہ ہڈیاں بیالیسویں دن تک مکمل ہو چکی ہوتی ہیں، ڈھانچہ بن چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآنی ترتیب بالکل درست ہے۔

یعنی سب سے پہلے **علقه** پھر **مضغة** پھر **عظاماً** اور پھر **لحماً** قرآن کی بیان کردہ ترتیب ہی درست ترتیب ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور کا کہنا ہے کہ جدید علم الجنین کے بیان کردہ مراحل یعنی پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں مرحلہ اور ان کی تفاصیل انتہائی پیچیدہ اور عسیر الفہم ہیں۔ جب کہ صورت اور شباہت کی بنیاد پر بیان کردہ قرآنی مراحل سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر کیتھ مور کہتے ہیں کہ ''مجھے یہ بات ماننے پر کوئی اعتراض نہیں کہ محمدؐ خدا کے پیغمبر تھے کیونکہ قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہی ہو سکتی ہے۔'' یعنی یہ معلومات کسی ایسی کتاب میں ہی ہو سکتی ہیں جو منزل من اللہ ہو۔

قرآن مجید کی سورۂ نساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ [النساء: ٥٦]

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔''

اس آیت کا تعلق ''درد کے احساس'' سے ہے۔ پہلے ڈاکٹر حضرات کا خیال تھا کہ درد کے احساس کا تعلق صرف دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن آج ہم یہ جانتے ہیں کہ درد کا

احساس صرف دماغ کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ ہماری جلد میں بھی ایسے ''Recepters'' موجود ہوتے ہیں جو درد اور تکلیف کا احساس پیدا کرتے ہیں، انھیں Pain Recepters کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انکار کرنے والوں یعنی کفار کو آگ کے حوالے کیا جائے گا اور جب ان کی کھال جل جائے گی تو ان کے جسم پر نئی کھال پیدا کر دی جائے گی تاکہ انھیں دوبارہ درد کا احساس ہو سکے۔

اس آیت سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ جلد میں ایسی کوئی خصوصیت موجود ہے جس کی وجہ سے درد کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی قرآن اس آیت میں Pain Recepters کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

تھائی لینڈ کی چانگ مائی یونیورسٹی کے شعبہ اناٹومی کے سربراہ پروفیسر تھاگاڈا شان صرف اس ایک آیت کی وجہ سے مسلمان ہو چکے ہیں۔ ریاض، سعودی عرب میں ہونے والی آٹھویں میڈیکل کانفرنس میں انھوں نے اعلان کیا:

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰهِ

''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ تعالیٰ کے پیغام بر ہیں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌo﴾ [حٰم السجدہ: ۵۳]

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

ڈاکٹر تھاگاڈا کے لیے ایک ہی نشانی حق کی نشان دہی کے لیے کافی ہو گئی۔ یعنی اس بات پر ایمان لانے کے لیے کہ قرآن کلام خداوندی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنھیں

دس نشانیاں درکار ہوں گی اور کچھ ایسے جنھیں سو نشانیاں درکار ہوں گی۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ایک ہزار نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ۝﴾ [البقرہ: ۱۸]

''یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔''

بائبل بھی متی کی انجیل میں ان کے بارے میں یہی کہتی ہے۔

''میں ان سے تمثیلوں میں اس لیے باتیں کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے۔'' [متی باب ۱۳-۱۳]

جہاں تک علم الجنین سے متعلق دیگر نکات کا تعلق ہے، ان کا ذکر میں ان شاء اللہ اپنی جوابی تقریر میں کروں گا لیکن مجھے موضوع کے دوسرے حصے سے بھی انصاف کرنا ہے یعنی ''بائبل، سائنس کی روشنی میں''

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے:

﴿لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ۝ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ أُمُّ الْكِتٰبِ۝﴾ [الرعد: ۳۸-۳۹]

''ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے، قایم رکھتا ہے، ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے بہت سی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ لیکن نام صرف چار کا مذکور ہے۔ تورات، زبور، انجیل اور قرآن۔ تورات بھی وحی خداوندی ہے اور زبور بھی۔ انجیل وہ وحی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور قرآن اللہ تعالیٰ کی وہ وحی ہے جو اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری وحی ہے۔

یہاں ایک بات میں واضح طور پر بیان کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جس انجیل کو آج کل مسیحی حضرات اپنی کتاب مقدسہ قرار دیتے ہیں، ہم مسلمانوں کے نزدیک یہ وہ انجیل نہیں

جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ ہمارے خیال میں یہ ممکن ہے کہ اس انجیل میں کلامِ خداوندی بھی شامل ہو۔ لیکن اس میں دیگر کئی چیزیں بھی شامل ہیں۔ اس میں حواریوں کا کلام بھی شامل ہے۔ تاریخ دانوں کے بیانات بھی شامل ہیں اور کچھ بے معنی اور مہمل باتیں بھی۔ مزید برآں اس میں کچھ فحش بیانات اور لاتعداد سائنسی اغلاط بھی موجود ہیں۔ اگر بائبل میں کچھ باتیں سائنسی طور پر درست ہیں تو اس کا امکان موجود ہے کیونکہ بائبل میں کلامِ الٰہی کے شامل ہونے کا امکان ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اغلاط کے بارے میں کیا کیا جائے؟

کیا آپ یہ پسند کرتے ہیں کہ ان اغلاط کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے؟

میں یہ بات اپنے مسیحی بہن بھائیوں کے سامنے بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری گفتگو کا مقصد کسی کی دلآزاری نہیں ہے۔ اگر بائبل اور سائنس پر گفتگو کرتے ہوئے میری کسی بات سے آپ کی دلآزاری ہو تو میں اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

ہماری گفتگو کا مقصد تو صرف یہ بتانا ہے کہ کلامِ خداوندی میں غلطی نہیں ہوسکتی۔ اس میں سائنسی غلطیوں کا امکان ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی فرماتے تھے کہ سچائی کو تلاش کرو۔

دیکھیے ہمارے پاس عہد نامہ قدیم ہے، عہد نامہ جدید ہے اور خدا کی آخری وحی بھی ہمارے پاس قرآن کی صورت میں موجود ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ولیم کیمپبل کا تعلق ہے، ان کے ساتھ میں خاصی بے تکلفی برت سکتا ہوں کیونکہ وہ ایک کتاب لکھ چکے ہیں جس کا عنوان ہے ''قرآن اور بائبل تاریخ اور سائنس کی روشنی میں۔''

وہ ایک بیان دے چکے ہیں اور ویسے بھی وہ ایک ڈاکٹر ہیں لہٰذا ان کے معاملے میں مجھے تکلف برتنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن جہاں تک دوسرے مسیحی بہن بھائیوں کا تعلق ہے اگر دورانِ گفتگو ان کے جذبات مجروح ہوں تو ان سے میں معذرت خواہ ہوں۔

آیئے! اب ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل، سائنس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟

آغاز ہم فلکیات سے کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ بائبل ہمیں علم فلکیات کے بارے میں کیا بتاتی ہے۔ بائبل میں تخلیق کائنات کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ بائبل کے آغاز میں ہی تخلیق کائنات کا ذکر موجود ہے یعنی پہلی کتاب، پیدائش میں بتایا گیا ہے:

''خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا، اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی سو پہلا دن ہوا۔'' [پیدائش، باب ا......۵۔ا]

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا اور بائبل صبح اور شام کا بھی ذکر کرتی ہے یعنی چوبیس گھنٹے والے دن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سائنس دان ہمیں بتاتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے والے چھ دنوں میں کائنات کی تشکیل ممکن ہی نہیں ہے۔

قرآن بھی اس حوالے سے چھ ایام کا ذکر کرتا ہے۔ عربی لفظ ایام ہے جس کا واحد یوم ہوتا ہے۔ لفظ یوم کا مطلب چوبیس گھنٹے کا ایک دن بھی ہوتا ہے اور اس سے مراد طویل عرصہ بھی ہوسکتا ہے یعنی ''ایک زمانہ۔'' اور یہ بات تسلیم کرنے میں کسی سائنس دان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ دنیا چھ ''طویل وقفوں'' یا ''زمانوں'' میں تخلیق ہوئی ہو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ بائبل اپنی بالکل ابتدائی آیات یعنی آیات ۳ تا ۵ میں یہ بتاتی ہے کہ روشنی پہلے دن تخلیق ہوئی جب کہ روشنی کے اسباب سورج اور ستارے وغیرہ چوتھے دن تخلیق ہو رہے ہیں۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ روشنی کے اسباب و ذرائع چوتھے دن تخلیق ہوں جب کہ روشنی پہلے ہی دن تخلیق ہو چکی ہو۔ یہ ایک بالکل غیر سائنسی بات ہے۔ مزید برآں تیسرا نکتہ یہ ہے کہ آیات نمبر ۹ تا ۱۳ میں بتایا جا رہا ہے کہ زمین تخلیق ہوئی تو اگر زمین اس مرحلے میں تخلیق ہو رہی ہے تو صبح اور شام پہلے دن کس طرح تخلیق ہو گئے تھے۔ دن اور رات کا انحصار ہی زمین کی گردش پر ہے اور اگر زمین نہیں بنی تھی تو دن اور رات کا تصور ہی

ممکن نہیں تھا۔

چوتھا نکتہ یہ کہ کتاب پیدائش، پہلے باب کی آیات ۹ تا ۱۳ ہمیں بتاتی ہیں کہ زمین کی تشکیل تیسرے دن ہوئی تھی جب کہ آیات ۱۴ تا ۱۹ سے پتہ چلتا ہے کہ سورج اور چاند چوتھے دن بنائے گئے۔ لیکن جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ زمین دراصل سورج ہی کا ایک حصہ ہے، لہٰذا اس کا سورج سے پہلے تخلیق ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ غیر سائنسی بات ہے۔

پانچواں نکتہ یہ ہے کہ کتاب پیدائش پہلے باب کی آیات نمبر ۹ تا ۱۳ ہمیں بتاتی ہیں کہ زمین پر گھاس اور بوٹیاں اور درخت تیسرے دن تخلیق ہوئے جب کہ سورج کی تشکیل چوتھے دن ہوئی جیسا کہ آیات ۱۴ تا ۱۹ میں درج ہے۔ سائنس کا سوال یہ ہے کہ سورج کی روشنی کے بغیر نباتات کی نشوونما اور بقا کس طرح ممکن ہے؟

چھٹا نکتہ یہ کہ کتاب پیدائش باب ۱، آیت ۱۷ میں کہا گیا ہے کہ:

> ''سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے۔ ایک نیر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا۔''

اس آیت اور آیات ما قبل و مابعد سے پتہ چلتا ہے کہ چاند اور سورج دونوں روشن اجسام ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ بات مسلمہ سائنسی حقائق کے خلاف جاتی ہے۔

کچھ لوگ مطابقت پیدا کرنے کے لیے یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ بائبل میں بیان کردہ چھ دن بھی درحقیقت چھ زمانے ہیں لیکن ان کی یہ بات بھی غیر منطقی ہے۔ کیوں کہ آپ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ بائبل میں صبح کا بھی ذکر ہو رہا ہے اور شام کا بھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں چوبیس گھنٹے والا دن ہی مراد ہے۔ لیکن بالفرض میں یہ غیر منطقی دلیل تسلیم کر بھی لوں تو اس طرح زیادہ سے زیادہ پہلے دو نکات کا جواب ملتا ہے جب کہ باقی ماندہ چار سوالات پھر بھی جواب طلب ہی رہ جاتے ہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہاں عام دن ہی مراد ہے تو پھر نباتات چوبیس گھنٹے روشنی کے بغیر بھی گزار سکتی ہیں۔ میں کہتا ہوں چلیے آپ کی یہ بات تسلیم کیے لیتے ہیں لیکن

اس طرح نباتات والا مسئلہ تو حل ہوتا ہے دیگر مسائل پھر جواب طلب رہ جاتے ہیں۔آپ ''چت بھی میری، پٹ بھی میری'' والا رویہ نہیں اپنا سکتے۔

لہٰذا اب میں یہ بات ڈاکٹر ولیم کیمپبل پر چھوڑ دیتا ہوں۔ان کے پاس دو صورتیں ہیں:

یا تو وہ یہ تسلیم کرلیں کہ دن سے مراد ایک طویل زمانہ ہے تو آپ پہلا اور تیسرا نکتہ حل کرلیں گے لیکن دوسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا نکتہ حل طلب رہ جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ دن کو ۲۴ گھنٹے کا عام دن ہی فرض کریں، اس صورت میں وہ صرف پانچویں نکتے کا جواب مہیا کردیں گے لیکن باقی تمام نکات حل طلب رہ جائیں گے۔

اب جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس بارے میں متعدد سائنسی نظریات موجود ہیں۔یہ نظریات محض مفروضے ہیں جو درست بھی ہوسکتے ہیں اور غلط بھی۔لیکن یا تو زمین بالآخر فنا ہوجائے گی اور یا ہمیشہ موجود رہے گی۔ان میں سے کوئی ایک نظریہ ہی درست ہوسکتا ہے دونوں باتیں بیک وقت درست نہیں ہوسکتیں۔یہ ایک غیر سائنسی بات ہوگی۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بائبل یہی کہتی ہے یعنی دونوں باتوں کا ذکر کرتی ہے۔عبرانیوں کے نام پولس رسول کے خط کے پہلے باب کی گیارھویں اور بارھویں آیت میں کہا گیا ہے:

''اے خداوند!

تو نے ابتدا میں زمین کی نیو ڈالی

اور آسمان تیرے ہاتھ کی کاریگری ہیں

وہ نیست ہوجائیں گے مگر تو باقی رہے گا

اور وہ سب پوشاک کی مانند پرانے ہوجائیں گے۔''

اسی طرح کتاب زبور کے باب نمبر ۱۰۲ میں کہا گیا:

''تو نے قدیم سے زمین کی بنیاد ڈالی

آسمان تیرے ہاتھ کی صنعت ہے

وہ نیست ہو جائیں گے پر تو باقی رہے گا۔''

لیکن دوسری طرف اس کے بالکل برعکس اور متضاد بیانات بھی بائبل میں موجود ہیں۔

''انسان کو اس ساری محنت سے جو وہ کرتا ہے کیا حاصل ہے؟

ایک پشت جاتی ہے اور دوسری پشت آتی ہے پر زمین ہمیشہ قایم رہتی ہے۔''

[واعظ، باب ا......۳،۴]

اسی طرح زبور میں کہا گیا:

''اور اپنے مقدس کو پہاڑوں کی مانند تعمیر کیا اور زمین کی مانند

جسے اس نے ہمیشہ کے لیے قایم کیا ہے۔'' [زبور، باب ۷۸۔۶۹]

اب میں یہ بات ڈاکٹر ولیم کیمپبل پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ خود انتخاب کرلیں کہ کون سی بات غلط ہے کیونکہ دونوں باتیں بیک وقت تو درست نہیں ہوسکتیں۔ دنیا بیک وقت فانی اور غیر فانی نہیں ہوسکتی ہے۔

اب ہم آسمان کی طرف آتے ہیں۔ بائبل میں کہا گیا ہے:

''اور آسمان کے ستون کانپتے ہیں

اور اس کی جھڑکی سے حیران ہوتے ہیں۔'' [ایوب، باب ۲۶۔۱۱]

جب کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِغَيْرِ عَمَدٍ﴾ [لقمٰن: ۱۰]

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے۔''

بائبل کہتی ہے کہ آسمان کے ستون ہیں، قرآن کہتا ہے کہ آسمان بغیر ستونوں کے ہے، کیا آپ خود نہیں دیکھ سکتے کہ آسمان کے ستون موجود ہیں یا نہیں؟

بائبل نہ صرف یہ کہتی ہے کہ آسمان کے ستون ہیں بلکہ وہ تو زمین کے بارے میں بھی یہی بات کرتی ہے:

''زمین کے ستون خداوند کے ہیں

اس نے دنیا کو ان ہی پر قایم کیا ہے۔'' [سیموئیل ن۔ا، باب ۲۔۸]

'' زمین اور اس کے سب باشندے گداز ہو گئے ہیں

میں نے اس کے ستونوں کو قایم کر دیا ہے۔'' [زبور، باب ۷۵۔۳]

'' وہ زمین کو اس کی جگہ سے ہلا دیتا ہے

اور اس کے ستون کانپنے لگتے ہیں۔'' [ایوب، باب ۹۔۶]

اب ہم آتے ہیں غذائیات کی طرف۔ کتاب پیدائش میں کہا گیا:

'' اور خدا نے کہا دیکھو میں تمام روئی، زمین کی کل بیج دار سبزی اور ہر درخت جس میں اس کا بیج دار پھل ہو، تم کو دیتا ہوں، یہ تمہارے کھانے کو ہوں۔''

[پیدائش، باب ۱، ۲۹]

آج ایک عام آدمی بھی بخوبی جانتا ہے کہ کچھ بیج دار نباتات اس قدر زہریلی ہوتی ہیں کہ انھیں کھانے والا لایقینی طور پر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ جب کہ بائبل کہتی ہے کہ ایسے تمام پھل کھانے کے لیے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ڈاکٹر کیمپبل اپنے مریضوں کو یہ پھل نہیں دیتے ہوں گے۔

بائبل میں ایک ایسا طریقہ کار بتایا گیا ہے جس کی مدد سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون حقیقی ایماندار ہے۔

'' اور ایمان لانے والوں کے درمیان یہ معجزے ہوں گے۔

وہ میرے نام سے بدروحوں کو نکال لیں گے۔

نئی نئی زبانیں بولیں گے۔

سانپوں کو اُٹھا لیں گے۔

اور اگر کوئی ہلاک کرنے والی چیز پئیں گے تو انھیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا، وہ بیماروں پر ہاتھ رکھیں گے تو اچھے ہو جائیں گے۔'' [مرقس، باب ۱۶۔۱۸۔۱۷]

یہ ایک سائنسی ٹسٹ ہے۔ سائنس کی اصطلاح میں ہم اسے ایک Confirmatory

Test کہہ سکتے ہیں۔ جس کے ذریعے ایک حقیقی مسیحی کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

اپنی زندگی کے گزشتہ دس سالوں کے دوران میں، مجھے بلا مبالغہ ہزاروں عیسائیوں سے واسطہ پڑا ہے جن میں عیسائیت کے مبلغین بھی شامل تھے۔ لیکن میں نے آج تک کوئی ایک بھی ایسا عیسائی نہیں دیکھا جو انجیل کے اس امتحان میں کامیاب ہو سکے۔ میں نے کوئی ایک بھی عیسائی نہیں دیکھا جو زہر کھائے لیکن اس پر زہر کام نہ کرے۔ سائنسی اصطلاح میں ہم اس امتحان کو Falsification Test بھی کہہ سکتے ہیں یعنی اگر کوئی غلط آدمی یہ امتحان دے گا تو وہ ناکام ہو جائے گا۔ اگر غلط آدمی زہر کھائے گا تو مر جائے گا۔ کوئی غلط آدمی یہ امتحان دینے کی جرأت ہی نہیں کرے گا۔ اگر آپ ایک حقیقی عیسائی نہیں ہیں تو آپ کبھی یہ امتحان نہیں دیں گے۔

میں نے ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی کتاب "The Quran & The Bible , In the Light of History & Science" پڑھی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ ایک حقیقی مسیحی ہیں۔ اور میری خواہش ہے کہ کم از کم وہ یہ امتحان ضرور دیں۔ میں ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی خطرناک زہر کھا کر دکھائیں کیونکہ اس طرح تو ہمارا یہ مباحثہ ہی خراب ہو جائے گا۔ میں ان سے صرف یہ درخواست کروں گا کہ وہ ہمیں نئی زبانیں بول کر دکھائیں۔ آپ میں سے بہت سے لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ ہندوستان میں ایک ہزار سے زیادہ مختلف زبانیں اور لہجے موجود ہیں۔ ان میں سے ۱۷ زبانیں ایسی ہیں جنھیں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ صرف تین الفاظ ان ۱۷ زبانوں میں بول کر دکھائیں یعنی "ایک سو روپے"

ڈاکٹر صاحب کی مدد کے لیے میں انھیں سو روپے کا نوٹ بھی پیش کر دیتا ہوں۔ اس نوٹ پر یہ سترہ زبانیں موجود ہیں۔ انگریزی اور ہندی سمیت۔ انگریزی میں One Hundered Rupees تو وہ پڑھ ہی لیں گے۔ ہندی میں انہیں بتا دیتا ہوں "ایک سو روپے"

اب باقی پندرہ زبانوں میں یہ تین الفاظ وہ بول دیں۔ میں جانتا ہوں کہ انجیل کے بیان کے مطابق انہیں یہ زبانیں بغیر کسی کی مدد کے بولنی چاہئیں لیکن میں ان کی مدد کر رہا ہوں کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ کوئی تو یہ ٹسٹ پاس کرے۔ میں نے تو آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو یہ امتحان پاس کر سکے۔

لہٰذا میں یہ نوٹ انھیں پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ تین الفاظ پندرہ زبانوں میں پڑھ دیں۔ ''ایک سو روپے۔''

اب ہم آبیات یا ''علم الآب'' Hydrology کا ذکر کرتے ہیں۔ بائبل میں کہا گیا ہے:

''میں اپنی کمان کو بادل میں رکھتا ہوں

وہ میرے اور زمین کے درمیان عہد کا نشان ہوگی

اور ایسا ہوگا کہ جب میں زمین پر بادل لاؤں گا

تو میری کمان بادل میں دکھائی دے گی

اور میں اپنے عہد کو جو میرے اور تمہارے

اور ہر طرح کے جاندار کے درمیان ہے، یاد کروں گا

اور تمام جان داروں کی ہلاکت کے لیے پانی کا طوفان پھر نہ ہوگا

اور کمان بادل میں ہوگی اور میں اس پر نگاہ کروں گا

تاکہ اس ابدی عہد کو یاد کروں جو خدا کے

اور زمین کے سب طرح کے جاندار کے درمیان ہے

پس خدا نے نوح سے کہا

کہ یہ اس عہد کا نشان ہے

جو میں اپنے اور زمین کے کل جانداروں کے درمیان قایم کرتا ہوں۔''

[پیدائش، باب ۹۔ ۱۷۔۱۴]

مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کے اترنے کے بعد یہ عہد خدا اور حضرت نوح علیہ السلام کے مابین ہوا اور اس کی نشانی کے طور پر فلک میں قوس قزح نظر آئی۔ یعنی اس سے پہلے قوس قزح نہیں ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ ایک غیر سائنسی بیان ہے۔ یہ بات کیوں کر تسلیم کی جا سکتی ہے کہ طوفانِ نوح علیہ السلام سے قبل بادل تو ہوتے تھے۔ بارش تو برستی تھی لیکن قوس قزح نہیں بنتی تھی۔ کیا اس وقت Law of Refraction موجود نہیں تھا؟ یقیناً حضرت نوح علیہ السلام کے دور سے پہلے بھی بے شمار مرتبہ قوس قزح بنتی رہی ہوگی۔

اب ہم آتے ہیں علم طب کی جانب۔ انجیل میں گھر کو کوڑھ کی وبا سے محفوظ کرنے کے لیے ایک طریقہ بتایا گیا ہے، جو کچھ یوں ہے:

"اور وہ اس گھر کو پاک قرار دینے کے لیے
دو پرندے اور دیودار کی لکڑی اور سرخ کپڑا اور زوفا لے
اور وہ ان پرندوں میں سے ایک کو مٹی کے کسی برتن میں
بہتے ہوئے پانی پر ذبح کرے
پھر وہ دیودار کی لکڑی اور زوفا اور سرخ کپڑے
اور اس زندہ پرندے کو لے کر
ان کو اس ذبح کیے ہوئے پرندے کے خون
میں اور بہتے ہوئے پانی میں غوطہ دے
اور سات بار اس گھر پر چھڑکے
اور اس پرندے کے خون سے
اور بہتے ہوئے پانی
اور زندہ پرندے، دیودار کی لکڑی اور زوفا اور
سرخ کپڑے سے اس گھر کو صاف کرے
اور اس زندہ پرندے کو شہر کے باہر

کھلے میدان میں چھوڑ دے

یوں وہ گھر کے لیے کفارہ دے تو گھر پاک ٹھہرے گا۔'' [احبار، باب ۱۴۔۵۳،۴۹]

یعنی گھر کو کوڑھ کے جراثیم سے پاک کرنے کے لیے اس میں خون چھڑکا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ خون جراثیم کو پھیلانے کا بہترین ذریعہ ہے نہ کہ جراثیم کو ختم کرنے کا۔ مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر کیمپبل اس طریقہ سے اپنے آپریشن تھیٹر کی صفائی نہیں کرتے ہوں گے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ نفاس کا خون، وہ خون جو بچے کی پیدائش کے دوران یا اس کے بعد آتا ہے ناپاک ہوتا ہے لیکن بائبل اس بارے میں کہتی ہے:

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا

بنی اسرائیل سے کہہ کہ

اگر کوئی عورت حاملہ ہو اور اس کا لڑکا ہو

تو وہ سات دن ناپاک رہے گی

جیسے حیض کے ایام میں رہتی ہے

اور آٹھویں دن لڑکے کا ختنہ کیا جائے

اس کے بعد تینتیس دن تک وہ طہارت کے خون میں رہے اور جب تک اس کی

طہارت کے ایام پورے نہ ہوں تب تک نہ تو کسی مقدس چیز کو چھوئے

اور نہ مقدس مقام میں داخل ہو۔

اور اگر اس کے لڑکی ہو

تو وہ دو ہفتے ناپاک رہے گی

جیسے حیض کے ایام میں رہتی ہے

اس کے بعد چھیاسٹھ دن تک وہ طہارت کے خون میں رہے۔''

[احبار۔ باب ۱۲۔ ۱،۶]

یعنی اگر وہ بیٹے کو جنم دیتی ہے تو چالیس دن ناپاک رہے گی لیکن اگر وہ بیٹی کو جنم دیتی ہے تو پورے اسّی دن تک ناپاک رہے گی۔ میں ڈاکٹر کیمپبل سے درخواست کروں گا کہ وہ وضاحت فرمائیں کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ سائنسی طور پر عورت بیٹی پیدا ہونے کی صورت میں دگنے عرصے تک کیوں ناپاک رہتی ہے۔

انجیل میں کسی عورت کی بدکرداری ثابت کرنے کے لیے بھی ایک امتحان بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل گنتی کے باب نمبر ۵ کی آیات ۱۱ تا ۳۱ میں موجود ہے۔ میں اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

> ''اگر کسی کی بیوی گمراہ ہو کر اس سے بے وفائی کرے...... پر نہ تو کوئی شاہد ہو اور نہ وہ عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہو...... تو وہ شخص اپنی بیوی کو کاہن کے پاس لائے...... اور کاہن مٹی کے ایک برتن میں مقدس پانی لے...... اور مسکن کے فرش کی گرد لے کر اس پانی میں ڈالے...... اور وہ کڑوا پانی اس عورت کو پلائے...... جب وہ اس کو پانی پلا چکے گا تو ایسا ہوگا کہ اگر وہ ناپاک ہوئی...... تو وہ پانی جو لعنت کو لاتا ہے اس کے پیٹ میں جا کر کڑوا ہو جائے گا، اس کا پیٹ پھول جائے گا، اس کی ران سڑ جائے گی...... پر اگر وہ ناپاک نہیں ہوئی بلکہ پاک ہے تو بے الزام ٹھہرے گی اور اس سے اولاد ہوگی۔''
>
> [گنتی۔ باب نمبر ۵۔ ۱۱، ۳۱]

آپ جانتے ہیں آج کل عدالتوں میں اس قسم کے بے شمار کیس پوری دنیا میں فیصلے کے منتظر ہیں۔ جن میں عورت پر اس شک کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ بدکردار ہے۔ بلکہ مجھے اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ اس عظیم ملک امریکہ کے صدر جناب بل کلنٹن پر بھی چند سال پہلے اس قسم کے الزامات لگائے گئے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ امریکی عدالتیں ایسے مواقع پر انجیل میں بتایا گیا یہ امتحان کیوں نہیں لیتیں؟

ریاضی بھی سائنس کا ایک شعبہ ہے اور انتہائی اہم شعبہ ہے۔ اس حوالے سے دیکھا

جائے تو بائبل میں ہمیں سینکڑوں تضادات نظر آتے ہیں۔ میں ان میں سے صرف چند ہی کا ذکر کروں گا۔

جب بنی اسرائیل کو بابل سے رہائی ملی تو وہ واپس آئے۔ ان کی فہرست بائبل میں موجود ہے۔ عزرا کے دوسرے باب کی آیات نمبر ۲ تا ۶۴ اور نحمیاہ باب نمبر ۷ آیات ۷ تا ۶۵۔ ان آیات میں مکمل فہرست دی گئی ہے۔ لیکن ان دونوں فہرستوں میں کم از کم ۱۸ جگہ تضادات موجود ہیں۔

مزید برآں کتاب عزرا میں کل تعداد بیالیس ہزار تین سو ساٹھ بتائی گئی ہے جب کہ نحمیاہ میں بھی کل تعداد یہی بتائی گئی ہے یعنی بیالیس ہزار تین سو ساٹھ لیکن جب میں نے خود اس تعداد کو جمع کیا تو جواب بالکل مختلف تھا۔

یعنی عزرا میں بیان کی گئی تعداد انتیس ہزار آٹھ سو اٹھارہ بنتی ہے۔ اسی طرح نحمیاہ میں بیان کی گئی تعداد کو جمع کیا جائے تو وہاں بھی میزان اکتیس ہزار انانوے (۳۱،۰۸۹) آئے گا۔

اگر بائبل کا مصنف سیدھا سادا میزان بھی نہیں کر سکتا تھا تو کیا اس کتاب کو خدا کی جانب سے نازل کردہ تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ نعوذ باللہ

آگے چلیے۔ عزرا میں کہا گیا ہے کہ:

''ان کے ساتھ دو سو گانے والے اور گانے والیاں تھیں۔''

جب کہ نحمیاہ میں کہا جا رہا ہے:

''اور ان کے ساتھ دو سو پینتالیس گانے والے اور گانے والیاں تھیں۔''

اب آپ ہی بتایئے کہ یہ تعداد دو سو تھی یا دو سو پینتالیس؟ کیوں کہ بات ایک ہی سیاق و سباق میں ہو رہی ہے لیکن ریاضیاتی تضاد موجود ہے۔ اسی طرح سلاطین ۲ کے باب نمبر ۲۴ میں تحریر ہے:

''اور یہویاکین جب سلطنت کرنے لگا تو اٹھارہ برس کا تھا اور یروشلم میں اس

نے تین مہینے سلطنت کی۔" [آیت نمبر ۸]

لیکن تواریخ۔۲ کے باب نمبر ۳۶ میں کہا جارہا ہے:

"یہویاکین آٹھ برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے تین مہینے دس دن حکومت کی۔" [آیت نمبر ۹]

تضاد بالکل واضح ہے۔ میں ڈاکٹر کیمپبل سے پوچھنا چاہوں گا کہ جب یہویاکین نے سلطنت شروع کی تو اس کی عمر آٹھ برس تھی یا اٹھارہ برس؟ اور یہ بھی کہ اس نے حکومت ۳ مہینے کی یا تین مہینے اور دس دن؟

مزید برآں بائبل میں ہیکل سلیمانی کا ذکر کرتے ہوئے سلاطین۔۱ کے باب ۷ کی آیت نمبر ۲۶ میں تحریر ہے:

"اور دل اس کا چار انگل تھا اور اس کا کنارہ پیالہ کے کنارہ کی طرح گلِ سوسن کے مانند تھا اور اس میں دو ہزار بت کی سمائی تھی۔"

دوسری جگہ یعنی تواریخ۔۲، باب ۴، آیت ۵ میں ہیکل سلیمانی ہی کے ذکر میں یہ بات اس طرح مذکور ہے:

"اور اس کی موٹائی چار انگل کی تھی اور اس کا کنارہ پیالہ کے کنارہ کی طرح اور سوسن کے پھول سے مشابہ تھا۔ اس میں تین ہزار بت کی سمائی تھی۔"

اب میں ڈاکٹر کیمپبل پر چھوڑتا ہوں۔ وہ ہمیں بتائیں کہ وہاں تین ہزار بت کی سمائی تھی یا دو ہزار بت کی؟

یہاں ایک واضح ریاضیاتی تضاد ہمارے سامنے موجود ہے۔

آگے چلیے، سلاطین۔۱ کے باب نمبر ۱۵ کی آیات ۳۳، ۳۴ پڑھیے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہِ یہوداہ آسا کے چھبیسویں سال بعشا مر گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ایلہ حکومت کرنے لگا۔

لیکن تواریخ۔۲ کا سولھواں باب پڑھنا شروع کیجیے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ آسا کے

چھتیسویں برس بعشا نے یہوداہ پر حملہ کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعشا اپنی موت کے دس سال بعد کس طرح یہوداہ پر چڑھائی کرسکتا ہے؟ یہ ایک بالکل غیر سائنسی بات ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی آسانی کے لیے میں اپنی گفتگو کا خلاصہ بیان کر دیتا ہوں تاکہ وہ اس کا جواب دے سکیں۔

پہلا نکتہ یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق کائنات چھ دنوں میں یعنی چوبیس گھنٹے والے دنوں میں تخلیق ہوئی جو کہ ظاہر ہے کہ غیر سائنسی بات ہے۔

دوسرا یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق روشنی کی تخلیق سورج اور ستاروں سے پہلے ہوئی تھی، یہ بات بھی غیر منطقی ہے۔

تیسرا نکتہ یہ تھا کہ دن اور رات کی تشکیل زمین کے تخلیق ہونے سے قبل ممکن نہیں لیکن بائبل ایسا ہی ظاہر کرتی ہے۔

چوتھا نکتہ میں نے یہ بیان کیا تھا کہ بائبل کے مطابق نباتات کی تخلیق سورج سے قبل ہو گئی تھی۔ یہ غیر سائنسی بیان ہے کیوں کہ پودوں کو اپنی نشو ونما کے لیے سورج کی روشنی درکار ہوتی ہے۔

پانچویں بات میں نے یہ کی کہ زمین کی تخلیق سورج سے قبل بتائی گئی ہے اور یہ بات سائنس کی روشنی میں بالکل درست نہیں۔

چھٹا نکتہ یہ تھا کہ بائبل کے بیان کے مطابق چاند کی روشنی اس کی اپنی روشنی ہے۔

ساتواں نکتہ یہ تھا کہ زمین ہمیشہ قایم رہے گی یا فنا ہو جائے گی؟

آٹھواں نکتہ یہ کہ بائبل میں زمین کے ستون بیان کیے گئے ہیں۔

نوواں یہ کہ آسمان کے بھی ستون بتائے گئے ہیں۔

دسواں یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق تمام بیج دار پھل انسان کے کھانے کے لیے بنائے گئے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان میں کئی انتہائی زہریلے بھی ہوتے ہیں۔

گیارھویں بات میں نے یہ کی تھی کہ بائبل میں ایک امتحان بتایا گیا ہے جس سے ایک سچے مسیحی کا ایمان معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کیا کوئی مسیحی یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہے؟

بارھواں نکتہ یہ تھا کہ بیٹی کی پیدائش کی صورت میں ماں دگنے عرصے تک کیوں ناپاک رہتی ہے؟

تیرھواں نکتہ یہ تھا کہ بائبل میں مکان کو کوڑھ کی دبا سے محفوظ رکھنے کے لیے خون چھڑکنے کا مشورہ دیا گیا ہے جو کہ قطعاً غیر سائنسی ہے۔

چودھواں نکتہ یہ کہ بدکرداری معلوم کرنے کے لیے جو کڑوے پانی کا امتحان بیان کیا گیا ہے اس کی وضاحت کی جائے۔

پندرھواں نکتہ یہ کہ بائبل میں ایک ہی جگہ ساٹھ سے بھی کم آیات میں اٹھارہ تضادات موجود ہیں۔ اور میں اسے ایک ہی نکتہ یا ایک ہی سوال گن رہا ہوں، حالانکہ یہ اٹھارہ نکات ہیں۔

سولھواں نکتہ یہ کہ مندرجہ بالا معاملے میں دونوں جگہ تعداد مختلف ہے یعنی ایک تو بیان کردہ کل تعداد غلط ہے اور دوسرے دونوں ابواب میں میزان مختلف نکلتا ہے۔

سوال نمبر سترہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا موقع پر یعنی بابل سے بنی اسرائیل کی رہائی کے موقع پر گانے والوں اور گانے والیوں کی تعداد دو سو تھی یا دو سو پینتالیس؟

اٹھارواں سوال یہ کہ جب یہویاکین نے سلطنت شروع کی تو اس کی عمر اٹھارہ سال تھی یا آٹھ سال؟

انیسواں سوال یہ ہے کہ اس نے حکومت تین ماہ کی تھی یا تین ماہ اور دس دن؟

بیسواں نکتہ یہ کہ ہیکل سلیمانی میں ''دو ہزار بت کی سمائی تھی'' یا ''تین ہزار بت'' کی؟

اکیسواں سوال یہ کہ بعشا اپنی موت کے دس سال بعد کیوں کر یہوداہ پر چڑھائی کر سکتا تھا؟

بائیسواں نکتہ یہ تھا کہ قوس قزح کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ طوفان نوح کے بعد خدا کے وعدے کی نشانی کے طور پر ظاہر ہوئی۔

میں نے بائبل میں موجود سینکڑوں سائنسی اغلاط میں سے صرف بائیس کی نشان دہی کی ہے۔ میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے درخواست کروں گا کہ وہ ان کا جواب دیں۔ وہ منطقی اور سائنسی طور پر ان ۲۲ نکات کا جواب کبھی نہیں دے سکیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ انھیں انجیل عطا کی گئی تھی۔ لیکن یہ وہ انجیل نہیں ہے۔ شاید اس میں جزوی طور پر وحی خداوندی موجود ہو لیکن مجموعی طور پر وہ انجیل ہرگز نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اس کا غیر سائنسی اور غیر منطقی حصہ ہرگز منزل من اللہ نہیں ہے۔

میں اپنی گفتگو کا اختتام اس آیت قرآنی پر کرنا چاہوں گا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾ [البقرہ: ۷۹]

”پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے۔ تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فایدہ حاصل کرلیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔“

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆............☆............☆

جوابی خطاب

ڈاکٹر ولیم کیمپبل

دیکھیے، ڈاکٹر ذاکر نائیک کچھ حقیقی نوعیت کے مسائل سامنے لائے ہیں۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے میں ان کے جواب سے اتفاق نہیں کرتا۔ یعنی جہاں تک "علقة" اور "مضغة" کے الفاظ کا تعلق ہے، میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان کا ایک نقطۂ نظر ہے اور میرا بھی ایک نقطہ نظر ہے۔ دونوں نقطہ ہائے نظر سننے کے بعد ہر کسی کو گھر جا کر خود اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔

جہاں تک زہر والے امتحان کا تعلق ہے، میں کسی ایسے شخص کو تو آپ کے سامنے پیش نہیں کرسکتا جو یہ امتحان دے چکا ہو، کیوں کہ وہ شخص فوت ہو چکا ہے لیکن میں اس کا واقعہ آپ کے سامنے بیان کرسکتا ہوں۔

میرے ایک دوست جن کا نام ہیری رینکلف تھا، وہ مراکش کے جنوبی علاقے کے ایک قصبے میں رہائش پذیر تھے۔ اسی قصبے کے ایک شخص نے جسے وہ اپنا دوست سمجھتے تھے، ان کی دعوت کی۔ اس نے ان کی بیوی اور بیٹے کو بھی اس دعوت میں مدعو کیا۔ ہیری نے یہ دعوت قبول کر لی۔ لیکن بعد میں کسی شخص نے آ کر انھیں بتایا کہ وہ شخص انھیں زہر دینا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس دعوت میں گئے۔ ہیری نے مذکورہ آیت کی روشنی میں فیصلہ کیا کہ اسے وہاں جانا چاہیے۔ لہٰذا وہ دعوت میں گئے۔ انھوں نے کوشش کی کہ اگر موقع ملے تو وہ پلیٹیں تبدیل کر دیں۔ لیکن انھیں یہ موقع نہ مل سکا۔ البتہ اپنے بیٹے کو وہ اچھی طرح کھانا کھلا کر لے گئے تھے۔ ان کی بیوی نے بھی زیادہ کھانا نہیں کھایا۔ لیکن ہیری کو کھانا ہی پڑا۔

اس رات ہیری کے معدے میں تکلیف ہوئی اور کچھ دیگر مسائل بھی ہوئے لیکن وہ

زندہ رہا۔ دو دن بعد ہیری اُس شخص کے گھر گیا، دروازے پر دستک دی۔ جب وہ باہر آیا تو ہیری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ لیکن ہیری دعوت کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔

چوں کہ یہ واقعہ مجھے یاد آ گیا تھا، لہٰذا میں نے سوچا آپ کو سنا ہی دیا جائے۔

اچھا، ایک بات آپ نے یہ کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف یہودیوں کی طرف بھیجا گیا تھا اور دیگر اقوام کی طرف نہیں۔

لیکن خود قرآن میں کہا گیا ہے:

﴿وَلِنَجْعَلَهُۥٓ ءَايَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝﴾

[مریم: ۲۱]

''اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت۔'' [مریم:۲۱]

اسی طرح انجیل میں کہا گیا ہے:

''یسوع نے پاس آ کر ان سے باتیں کیں اور کہا آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور ان کو باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔'' [متی باب ۲۸۔ ۱۹، ۱۸]

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو صرف یہودیوں کی طرف جانے کے لیے بھی کہا تھا اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیوں کہ یہودیوں کو ایک یقینی موقع دیا جانا تھا۔

انجیل میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے...... بلکہ شاید مجھے ''کہانی'' کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے، یہ تو تاریخ ہے...... ہاں تو حکایت کچھ یوں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک انجیر کے درخت کے پاس آئے۔ اس درخت پر تین سال سے پھل نہیں آیا تھا۔ جب پوچھا گیا کہ کیا اس درخت کو اُکھاڑ پھینکا جائے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ ''نہیں'' ایک سال مزید انتظار کرو اور دیکھو، شاید یہ درخت پھل لے آئے۔

یہ ایک تمثیل تھی، بنی اسرائیل کے بارے میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تین سال تک انھیں تبلیغ کی تھی اور چھ ماہ تک مزید تبلیغ کرنی تھی۔ اسی طرح مزید تمثیلات بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت ان سے لے کر غیر اقوام کے حوالے کر دی جائے گی۔

ڈاکٹر نائیک نے ''دن'' کے ضمن میں ''زمانوں'' کے بارے میں بھی بات کی ہے۔ بائبل میں ''دن'' کے لفظ سے مراد ایک طویل زمانہ بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے چوبیس گھنٹے والا دن ہی مراد ہو جیسا کہ ڈاکٹر موریس بوکائیے نے اپنی کتاب میں ثابت کرنا چاہا ہے۔ میرا خیال یہی ہے کہ اس سے طویل زمانے مراد ہیں۔ دیگر مسائل بھی ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر نائیک نے کیا ہے، میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مسائل موجود ہیں اور ان کے مناسب جوابات میرے پاس نہیں ہیں۔

لیکن میں یہاں اس حوالے سے بات ضرور کرنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب نے دو طرح کے پانی کا ذکر کیا، نمکین یا کھاری پانی اور میٹھا پانی۔ میں اس سلسلے میں ان کی وضاحت سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ دو طرح کے پانی ہیں جو اکٹھے ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک روک ہوتی ہے جو انھیں ملنے نہیں دیتی۔ یہاں روک یا رکاوٹ کے لیے قرآن نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ ہے برزخ، برزخ کے معانی وقفہ، رکاوٹ، فاصلہ وغیرہ ہوتے ہیں۔

یہی بات سورۂ فرقان میں بھی کہی گئی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ [الفرقان: ۵۳]

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور، اور دونوں کے درمیان، ایک پردہ حائل ہے، ایک رکاوٹ ہے جو دونوں کو گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

یہاں عربی کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کا مادہ ایک ہی ہے اور ایسا عربی

زبان میں اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی بات پر زور دیا جانا مقصود ہو۔ تاکید مطلوب ہو لہٰذا یہاں ترجمہ یہی ہونا چاہیے کہ کوئی باقاعدہ روک ہے جو کہ دونوں طرح کے پانیوں کے مابین موجود ہے۔

لیکن میرے دوست نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں طرح کے پانی الگ الگ رہتے ہیں۔ یعنی نمکین پانی اور تازہ پانی ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے ہیں۔ ڈاکٹر بوکائیے نے بھی اس حوالے سے کافی بحث کی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ سمندر میں آگے جا کر بالآخر پانی آپس میں مل جاتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ اتنی زیادہ مقدار میں پانی کو حل ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔

ایک چھوٹی سی مثال میں ذاتی طور پر بھی پیش کر سکتا ہوں۔ تیونس میں میرا ایک دوست ہے جو آکٹوپس پکڑتا ہے۔ ایک دفعہ میں اس سے ملنے گیا۔ میں پانی میں تیر رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پانی اوپر سے ٹھنڈا اور نیچے سے گرم ہے۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے۔

غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ قریب ہی ایک ندی آ کر سمندر میں گر رہی تھی۔ ٹھنڈا پانی ندی کا تھا اور گرم پانی سمندر کا۔ سمندری پانی چوں کہ نمکین ہونے کی وجہ سے بھاری ہوتا ہے، لہٰذا وہ نیچے تھا اور تازہ پانی ہلکا ہونے کی وجہ سے اوپر تھا۔ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ رکاوٹ کوئی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب نے زبانوں کی بات کی اور ظاہر ہے میں ہندوستانی زبانیں نہیں بول سکتا بلکہ میں امریکی ہندیوں (Red Indians) کی زبانیں بھی نہیں بول سکتا لہٰذا امریکہ اور ہندوستان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ انجیل کے جس مقام کے بارے میں وہ بات کر رہے ہیں وہاں بات حواریوں کے بارے میں ہو رہی ہے جنہیں یہ صلاحیت ایک معجزے کے طور پر دی گئی تھی۔ لیکن یہ وہ زبانیں تھیں جو وہاں کے موجود لوگ بولا کرتے تھے۔ اس سے مراد دنیا بھر کی چھوٹی چھوٹی اور گمنام زبانیں نہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ اگر کوئی شخص

سپین سے آیا ہے تو حواری اس کے ساتھ سپین کی زبان میں گفتگو کرتا تھا، اگر کوئی دوسرا شخص ترکی سے آیا ہے تو اس کے ساتھ اس کی زبان میں گفتگو کی جاتی تھی۔

.... اب ہم بات کریں گے پیش گوئیوں کے بارے میں۔ ایک سچے نبی کو پہچاننے کا طریقہ یہ بھی ہے کہ کیا اس کی پیش گوئیاں سچ ثابت ہوئیں؟ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیش گوئیاں پوری ہوئیں؟ کیا، ان سے معجزات کا صدور ہوا؟

ہم پیش گوئیوں کا ریاضیاتی تجزیہ کریں گے۔ اس نظریے کو Theory of Probabilities بھی کہتے ہیں۔ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

فرض کیجیے ڈاکٹر ذاکر نائیک کے پاس دس قمیصیں ہیں اور ان میں سے ایک کا رنگ سرخ ہے۔ اب میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ''کل ڈاکٹر ذاکر نائیک سرخ قمیص پہنیں گے۔'' اور فرض کیجیے اگلے دن واقعی ڈاکٹر نائیک سرخ قمیص پہنتے ہیں۔ اگر میں اپنی اس پیش گوئی کی بنیاد پر نبوت کا دعویٰ کروں تو کیا ہوگا؟ میرا ہر دوست کہے گا کہ نہیں نہیں، یہ تو محض اتفاق ہے۔

لیکن فرض کیجیے میں ایسی ہی پیش گوئی ڈاکٹر سمویل نعمان کے بارے میں بھی کر دیتا ہوں کہ وہ اپنی تین جوتیوں میں سے کل کون سی جوتی پہنیں گے، اسی طرح ڈاکٹر سہیل احمد کے بارے میں بھی پیش گوئی کر دیتا ہوں کہ وہ اپنی پانچ ٹوپیوں میں سے کل کون سی ٹوپی پہنیں گے تو میری ان تین پیش گوئیوں کے بیک وقت درست ثابت ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟

یہ امکان ڈیڑھ سو میں ایک ہے۔ ہم یہاں دس پیش گوئیوں کا ذکر کریں گے۔ ہمارے پاس وقت محدود ہے، اس لیے صرف دس پیش گوئیوں کا ذکر کیا جائے گا۔

پہلی پیش گوئی یرمیاہ کی ہے۔ ۶۰۰ قبل مسیح میں پیش گوئی کر دی گئی کہ مسیح کا تعلق داؤد کی نسل سے ہوگا۔ یرمیاہ میں بتا دیا گیا کہ داؤد کی نسل سے ایک بادشاہ کے آنے کا وقت

آ رہا ہے جو یہوداہ کہلائے گا۔ یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل میں اولادِ داؤد کا تناسب میرے خیال میں دو سو میں ایک تھا۔ یعنی اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان دو سو میں ایک ہی تھا۔

دوسری پیش گوئی کہ دائمی حکومت کرنے والا بیت اللحم میں پیدا ہوگا۔ یہ بات میکاہ میں کی گئی یعنی ۷۵۰ ق م میں۔ اب یہ دیکھیے کہ بیت اللحم میں پیدا ہونے کے امکانات کیا ہیں، اگر حساب لگایا جائے تو.......... تقریباً ۲۸۰ میں سے ایک امکان یہ ہے۔

تیسری پیش گوئی ملاکی کے تیسرے باب میں کی گئی ہے:

"دیکھو میں رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے راہ درست کرے گا اور خداوند جس کے تم طالب ہو، ناگہاں اپنی ہیکل میں آ موجود ہوگا، ہاں عہد کا رسول جس کے تم آرزو مند ہو۔"

یہ بات ۴۰۰ ق م کی ہے۔ یحییٰ ابن زکریا نے بھی یہی پیش گوئی کی۔ قرآن بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں کہا گیا ہے:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ۝ وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ

یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۝﴾ [آل عمران: ۳۹ تا ۴۵]

''فرشتوں نے آواز دی جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ'' اللہ تجھے یحییٰ علیہ السلام کی خوش خبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہو گی۔ کمال درجے کا ضابط ہو گا۔ نبوت سے سرفراز ہو گا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا۔'' زکریا علیہ السلام نے کہا ''پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہو گا؟ میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔'' جواب ملا: ''ایسا ہی ہو گا، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' عرض کیا ''مالک، پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے۔'' کہا ''نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سوا کوئی بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کر سکو گے)۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح شام اس کی تسبیح کرتے رہنا۔''

پھر وہ وقت آیا جب مریم علیہا السلام سے فرشتوں نے آ کر کہا ''اے مریمؑ! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ اے مریمؑ! اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ۔ اس کے آگے سر بسجود ہو، اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک جا۔''

اے نبیؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریمؑ کا سرپرست کون ہو؟ اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے، اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔

اور جب فرشتوں نے کہا: ''اے مریمؑ! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوش خبری

دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہو گا۔ اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا۔"

چوتھی پیش گوئی یہ کہ مسیح علیہ السلام سے معجزات کا صدور ہوگا۔ ہم انجیل میں پڑھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی پیش گوئی میں کہا گیا ہے کہ مسیح علیہ السلام سے بہت سے معجزات صادر ہوں گے۔ وہ اندھوں، بہروں اور گونگے لوگوں کو ٹھیک کردے گا۔

ہم انجیل اور قرآن دونوں میں دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کس قدر معجزات کا صدور ہوا۔ بعض اوقات ان کے پاس آنے والے سبھی لوگ شفایاب ہو جاتے تھے۔

بہت سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ انبیائے کرام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان ۱۲۴۰۰۰ انبیاءٔ میں سے واحد پیغمبر تھے، جن پر یہ پیش گوئی صادق آتی ہے۔

پانچویں پیش گوئی یہ کہ ان کے بھائی ان کی مخالفت کریں گے۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کے امکانات کتنے تھے؟ چوں کہ بہت سے رہنماؤں کے رشتہ دار ان کی مخالفت کرتے ہیں، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پانچ میں سے ایک امکان تھا۔

چھٹی پیش گوئی جو کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے ۵۲۰ ق م میں کی، اور وہ یہ کہ مسیح گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوگا۔ کتنے حکمران ہیں جو گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوں گے۔ آج کل تو ظاہر ہے لوگ مرسڈیز کاروں میں ہوتے ہیں، اس وقت بھی میرے خیال میں سو میں ایک چانس تھا۔

ساتویں پیش گوئی ہیکل کی تباہی سے متعلق ہے جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود کی تھی۔ ۳۰ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش گوئی کی اور چالیس سال بعد یہ پیش گوئی پوری ہوئی، جب رومی جرنیل ٹائی ٹس نے طویل محاصرے کے بعد یروشلم پر قبضہ کیا۔

اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان پانچ میں سے ایک تھا۔ کیوں کہ یہودیوں کی بغاوت اور پھر ان کا کچلا جانا کچھ ایسا غیر متوقع نہیں تھا۔

آٹھویں پیش گوئی یہ کہ مسیح کو مصلوب کیا جائے گا۔

کتنے لوگ مصلوب ہوئے ہیں؟ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس پیش گوئی کے پورے ہونے کا امکان دس ہزار میں سے ایک تھا۔

نویں پیش گوئی یہ کہ لوگ اس کے کپڑے آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان، میرے خیال میں، سو میں سے ایک تھا۔

بے گناہ ہونے کے باوجود وہ اپنی موت کے لحاظ سے، گناہ گاروں اور امیر لوگوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ڈاکوؤں کے ساتھ مصلوب کیا گیا تھا۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان ہزار میں سے ایک تھا۔

آخری پیش گوئی یہ کہ مصلوب ہونے کے بعد وہ دوبارہ جی اُٹھے گا۔ اس پیش گوئی کے ساتھ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی قدر وابستہ کی ہی نہیں جا سکتی۔

اب ہم ذرا ان تمام پیش گوئیوں کے پورا ہونے کے امکانات کا حساب لگاتے ہیں...... یہ امکان ۲۸،۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میں سے ایک ہے۔

ایک آسان مثال یہ ہے کہ فرض کر لیجیے پوری ریاست ٹیکساس میں ایک ایک ڈالر کے سکوں کی ایک میٹر اونچی تہہ بچھا دی جائے اور پھر آپ کو اس میں سے ایک نشان زدہ سکہ ڈھونڈنے کو کہا جائے تو جس قدر امکان آپ کے وہ سکہ ڈھونڈ لینے کا ہے، اسی قدر امکان ان پیش گوئیوں کے پورا ہونے کا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں کوئی امکان نہیں ہے۔

ایسی بہت سی دیگر پیش گوئیاں بھی ہیں اور یہ ثبوت ہیں اس بات کا کہ انجیل برحق ہے اور یہوواہ الوہیم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

انجیل ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہ ایک اچھی خبر ہے جب کہ قرآن ہمیں بُری خبر سناتا ہے، سورۂ نحل میں تحریر ہے:

﴿وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا

يَسْتَقْدِمُوْنَ۝﴾ [النحل: ٦١]

''اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا تو روئے زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ سب کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے پھر جب وہ وقت آ جاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔''

مسئلہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنی پوری کوشش کر لیں، ان کے بارے میں بھی قرآن محض ایک امکان ہی پیش کرتا ہے، یعنی ''شاید۔''

مثلاً سورۂ قصص میں کہا گیا:

﴿فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ۝﴾ [القصص: ٦٧]

''البتہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے، وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔''

یعنی وہ بھی یقین نہ رکھے، بلکہ محض توقع ہی رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح سورۂ تحریم میں کہا گیا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾

[التحریم: ٨]

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ، بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔''

سورۂ توبہ میں تحریر ہے:

﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ۝﴾ [التوبہ: ١٨]

''اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر کو مانیں اور نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ انہی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔''

یعنی بالآخر تنہائی ہے۔ اگر ایک شخص ایمان نہیں لاتا تو وہ یقینی طور پر جہنم میں جائے گا۔ لیکن اگر وہ ایمان لے بھی آتا ہے تو روزِ حشر وہ یک و تنہا خدا کے سامنے کھڑا ہوگا۔ نہ کوئی دوست ہوگا نہ سفارشی۔ اور محض توقع ہی کر سکتا ہے، امید ہی رکھ سکتا ہے کہ شاید وہ بخشے جانے والوں میں شامل ہو جائے۔ اور یہ بڑی سخت خبر ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں لفظ ''عسیٰ'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے ''شاید، ہو سکتا ہے، امکان ہے'' وغیرہ۔

دوسری طرف انجیل میں ہمیں اچھی خبر ملتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

''میں خدمت کروانے کے لیے نہیں بلکہ خدمت کرنے کے لیے آیا ہوں تاکہ اپنی زندگی، بہت سی زندگیوں کے کفارے میں دے سکوں۔''

اسی طرح بائبل میں مزید کہا گیا ہے:

''اگر تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاؤ اور دل سے یہ یقین رکھو کہ خدا نے انھیں زندہ کر دیا تھا تو تمہاری نجات یقینی ہے۔''

یہ ایک حیرت انگیز طور پر خوش کن خبر ہے۔ آپ پوری ہونے والی پیش گوئیوں کو ثبوت کے طور پر پڑھیں۔ ۵۰۰ لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب ہونے کے بعد، زندہ دیکھا تھا۔ بہت سے آثارِ قدیمہ بھی ایسے دریافت ہوئے ہیں جو بائبل کی تائید کرتے ہیں۔

میں آپ سب کو یہ دعوت دیتا ہوں کہ آپ بائبل کا مطالعہ کریں۔ آپ کو اپنی روح کے لیے بہت سی خوش خبریاں ملیں گی۔ خدا آپ پر رحم کرے۔

بہت بہت شکریہ

جوابی خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

محترم ڈاکٹر ولیم کیمپبل صاحب، سٹیج پر تشریف فرما دیگر معززین، میرے بزرگو، بھائیو اور بہنو! میں آپ سب کو دوبارہ اسلامی طریقے سے خوش آمدید کہتا ہوں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے میرے بیان کردہ بائیس نکات میں سے صرف دو نکات کو چھیڑا ہے۔ جی ہاں، صرف دو نکات کو۔

پہلا نکتہ جس کا انھوں نے جواب دینے کی کوشش کی وہ یہ تھا کہ بائبل میں کائنات کی تشکیل چھ دنوں میں ہونے کا بتایا گیا ہے، ان دنوں سے کیا مراد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ان دنوں سے مراد طویل زمانے ہیں۔ اس بات کا جواب میں اپنی گفتگو میں پہلے ہی دے چکا ہوں کہ اگر آپ ''دن'' سے مراد ایک طویل زمانہ لیتے ہیں تو آپ چھ میں سے صرف دو مسائل حل کرتے ہیں، باقی چار مسائل حل طلب ہی رہ جاتے ہیں۔ آفرینش کائنات کے حوالے سے وہ ان مسائل کو تسلیم کرتے ہیں، یہ اچھی بات ہے۔

دوسرا نکتہ جس کا انھوں نے ذکر کیا، وہ مرقس کی انجیل میں بتائے گئے امتحان کے بارے میں تھا۔ اس حوالے سے انھوں نے بتایا کہ ان کے ایک دوست نے جس کا نام ہیری تھا یا جو کچھ بھی اس کا نام تھا، مراکش میں اس نے زہر کھایا اور اس پر اثر نہیں ہوا۔ لیکن انجیل تو کہتی ہے کہ:

''اور اگر کچھ ہلاک کرنے والی چیز پئیں گے تو انھیں کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔''

[مرقس، باب ۱۶، ۱۸]

یہاں واضح طور پر پینے کا ذکر ہے، کھانے کا نہیں۔ لیکن پھر بھی میں ان کی بات مانے لیتا ہوں کہ کھانے یا پینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی زہر پینے کی بجائے کھالے تو بھی وہ اس امتحان میں پورا اُترے گا۔ لیکن ذرا تصور کیجیے ایک شخص، وہ بھی مراکش میں، وہ بھی فوت ہو چکا ہے، مجھے تو بتایا گیا ہے کہ دنیا میں دو ارب مسیحی ہیں۔ ان دو ارب لوگوں میں سے کوئی بھی آگے نہیں آئے گا؟

اور میرا تو خیال تھا کہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل خود ایک صاحب ایمان مسیحی ہیں، وہ خود یہ امتحان دینے کے لیے آگے بڑھیں گے، نہ کہ ان کا دوست جو پہلے ہی فوت ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ وہ نئی نئی زبانیں بولیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اس وقت وہ لوگ یہ زبانیں بولتے تھے۔ یہ امتحان دینا ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ آخر آپ کو ان چند زبانوں میں ایک ایک جملہ ہی بولنا تھا۔ ان زبانوں کو سمجھنے والے یہاں موجود ہوں گے۔

لیکن بات یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہزاروں مسیحیوں سے مل چکا ہوں اور ان میں سے کوئی ایک بھی اس امتحان میں پورا نہیں اُترا۔ اگر آج تک اس امتحان میں ناکام رہنے والوں کی تعداد ایک ہزار تھی تو آج ایک ہزار ایک ہوگئی ہے، کیوں کہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے بھی ملاقات ہوگئی ہے۔

میرے بیان کردہ بائیس نکات میں سے ڈاکٹر ولیم نے انہی دو نکات کو چھیڑا اور باقی ماندہ بیس نکات کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس کی بجائے انھوں نے پیش گوئیوں کی بحث شروع کر دی۔ پیش گوئیوں کا زیر بحث موضوع، یعنی ''بائبل اور جدید سائنس'' سے کیا تعلق ہے؟

اگر پیش گوئیاں ہی معیار ہیں تو پھر ناسٹراڈیمس کی کتاب بہترین کتاب ہے۔ اس بنا پر تو اسے کلامِ خداوندی تسلیم کر لیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر ولیم نے Theory of Probability کا ذکر کیا اور اس کا اطلاق بائبل کی پیش گوئیوں پر کیا۔ اگر آپ اس تھیوری کا درست اطلاق دیکھنا چاہتے ہیں تو میری کتاب ''قرآن اور سائنس'' ● کا مطالعہ کیجیے۔

● ناشر دار النوادر اُردو بازار، لاہور

اگر میں چاہوں تو انجیل کی انہی پیش گوئیوں کو غلط بھی ثابت کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ جتنی پیش گوئیوں کا ذکر انہوں نے کیا وہ سب مکمل طور پر درست ہیں لیکن ان کے طرزِ استدلال سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر انجیل کی ایک بھی پیش گوئی غلط ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ یہ کتاب منزل من اللہ نہیں ہے۔ اور میں ایسی پیش گوئیوں کی پوری فہرست آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔

مثال کے طور پر کتاب پیدائش کے چوتھے باب کی بارھویں آیت میں قائن سے کہا گیا کہ:

''جب تو زمین کو جوتے گا تو وہ اب تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہو گا۔''

لیکن چند ہی سطروں کے بعد آیت نمبر ۱۷ میں پتہ چلتا ہے:

''اور اس نے ایک شہر بسایا اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر حنوک رکھا۔''

یعنی پیش گوئی بالکل غلط ثابت ہوئی۔

اسی طرح یرمیاہ کے باب ۳۶ کی آیت ۳۰ میں ہم پڑھتے ہیں:

''اس لیے شاہ یہوداہ یہویقیم کی بابت خداوند یوں فرماتا ہے کہ اس کی نسل میں سے کوئی باقی نہ رہے گا جو داؤد کے تخت پر بیٹھے اور اس کی لاش پھینکی جائے گی تاکہ دن کو گرمی میں، رات کو پالے میں پڑی رہے۔''

لیکن اگر آپ سلاطین۔۲ کے چوبیسویں باب کی چھٹی آیت کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ:

''اور یہویقیم اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا اور اس کا بیٹا یہویاکین اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔''

یعنی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

اگرچہ ایک ہی پیش گوئی کا غلط ہونا یہ ثابت کر دیتا ہے کہ موجودہ انجیل کلامِ خداوندی

نہیں ہے، لیکن میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔

حزقی ایل، باب ۲۶، کی آیت نمبر ۸ میں بتایا گیا ہے کہ بنوکدرضر، شاہ بابل، صور کے شہر کو تباہ کرے گا لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ اس شہر کو سکندر اعظم نے تباہ کیا تھا۔ گویا یہ پیش گوئی بھی درست ثابت نہیں ہوئی۔

یسعیاہ، باب نمبر ۷، آیت ۱۴ میں کہا گیا ہے:

''دیکھو، ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اس کا نام عمانوایل رکھے گی۔''

اوّل تو یہاں غلط ترجمہ کیا جا رہا ہے کیوں کہ جو اصل عبرانی لفظ یہاں استعمال ہوا ہے، اس کا مطلب ''کنواری'' نہیں ہوتا بلکہ اس کے معنی ''جوان عورت'' ہیں۔ لیکن مسیحی حضرات کا کہنا ہے کہ یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کی جا رہی ہے۔ لہٰذا ہم ان کی مان لیتے ہیں کہ واقعی یہاں لفظ کنواری استعمال ہوا ہے لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ اس کا نام عمانوایل ہوگا اور پوری بائبل میں کسی بھی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عمانوایل کے نام سے نہیں پکارا گیا۔ لہٰذا بہر صورت یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

میں بہت سی مثالیں مزید بھی پیش کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ایک ہی مثال یہ ثابت کرنے کے لیے کفایت کرتی ہے کہ بائبل کلامِ خداوندی نہیں ہے۔ میں نے تو بہت سی مثالیں پیش کر دی ہیں۔ لہٰذا آپ کے پیش کردہ نظریے کے مطابق بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بائبل کلامِ خداوندی نہیں ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے میرے اُٹھائے ہوئے نکات کا جواب دینے کے علاوہ بھی چھ سات باتیں کی ہیں جن کا میں ان شاء اللہ اختصار کے ساتھ جواب ضرور دوں گا۔

انھوں نے ایک بات، میرے حوالے سے اور برادر شبیر علی کے حوالے سے یہ کی کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے مطابق چاند کی روشنی منعکس روشنی ہوتی ہے۔ جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

میں دوبارہ عرض کرتا ہوں، سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝﴾ [الفرقان: ٦١]

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

اس آیت میں سورج کو چراغ قرار دیا گیا ہے۔ اور چاند کے لیے لفظ قمر استعمال ہوا ہے۔ قمر کے ساتھ ہمیشہ منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی منعکس یا مستعار روشنی کے ہیں۔ سورج کے لیے شمس کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور سورج کو ہمیشہ روشن چراغ ہی قرار دیا گیا ہے۔ میں حوالے پیش کر سکتا ہوں۔ مثال کے طور پر:

سورۂ نور، آیات ۱۵ اور ۱۶

سورۂ یونس، آیت ۵

اور اسی طرح متعدد دیگر آیات۔

انھوں نے مزید یہ کہا کہ اگر ''نور'' سے مراد منعکس روشنی ہے تو یہ لفظ سورۂ نور میں خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہی زمین وآسمان کا نور ہے۔

آپ پوری آیت کا مطالعہ کیجیے اور پھر دیکھیے کہ یہاں کیا کہا جا رہا ہے؟

﴿اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ [النور: ۳۵]

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی

ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، وہ چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) ۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے، رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔"

اس آیت کے مطالعہ سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس مثال میں اگر اللہ تعالیٰ نور یعنی منعکس روشنی ہے تو اس روشنی کا منبع یا چراغ بھی وہ خود ہے۔ یعنی اس آیت میں جو مثال پیش کی گئی ہے اس میں روشنی بھی وہ خود ہے اور اس روشنی کا عکس بھی وہ خود۔ فانوس کی مثال دی گئی ہے جس کے اندر روشنی کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور یہ روشنی کو منعکس بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر ولیم نے کہا کہ قرآن بھی نور ہے۔ تو کیا یہ بھی عکس ہے؟ یقیناً قرآن اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ہدایات کی روشنی اور عکس ہے۔

مزید برآں انھوں نے حضرت محمد ﷺ کے سراج ہونے کا ذکر کیا۔ یقیناً وہ سراج ہیں جن کی روشنی کا عکس احادیث کی صورت میں ہم تک پہنچ رہا ہے۔ اور چونکہ وہ احکامات الٰہیہ ہم تک پہنچانے کا سبب ہیں لہٰذا اس لحاظ سے وہ نور بھی ہیں۔

لہٰذا آپ کسی بھی لحاظ سے دیکھیں، نور یا منیر کا مطلب منعکس، منعطف یا مستعار روشنی ہی بنتا ہے۔

دوسری بات ڈاکٹر ولیم نے سورۂ کہف کی آیت ۸۶ کے حوالے سے کی کہ ذوالقرنین نے سورج کو گدلے پانی میں ڈوبتا دیکھا۔ سورج کا گدلے پانی میں ڈوب جانا یقیناً غیر سائنسی بات ہے۔ لیکن یہاں عربی لفظ وَجَدَ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے نظر آنا۔ سو اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہاں فرمارہے ہیں کہ ذوالقرنین کو ایسا نظر آیا۔

اگر میں کہوں کہ دوسری جماعت کے ایک بچے نے کہا کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ ''ذاکر کہتا ہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔'' یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ آپ کو بتا رہا ہوں کہ بچہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں غلط نہیں کہہ رہا بلکہ وہ بچہ غلط کہہ رہا ہے۔

اس آیت کو سمجھنے کے متعدد طریقے ہیں۔ ایک تو یہی کہ وَجَدَ کے معانی پر غور کیا جائے، جو کہ ہیں ''نظر آیا'' اور محمد اسد کے بقول دوسرا طریقہ یہ کہ لفظ مغرب کے معانی پر غور کیا جائے۔ عربی کے لفظ مغرب کے دو معانی ہیں۔ ایک تو سمت کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی مغرب کی سمت (West) اور دوسرے وقت کے لیے یعنی غروب آفتاب کا وقت۔

لہٰذا اگر زیر نظر آیت میں غروب آفتاب کے مقام کی بجائے غروب آفتاب کا وقت مراد لیا جائے مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ متعدد طریقوں سے اس آیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر ولیم اس پر اعتراض کریں اور کہیں کہ ہم باتیں فرض کر رہے ہیں اور ہمیں الفاظ کو ان کے ظاہری معانی میں ہی قبول کرنا چاہیے۔ چلیے اس نہج پر تجزیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جب ہم روزمرہ گفتگو میں سورج کے نکلنے اور غروب ہونے کا ذکر کرتے ہیں تو کیا ہم واقعی سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں؟ اخبارات میں ہم سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات دیکھتے ہیں تو کیا اخبارات واقعی سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں؟ سائنسی طور پر ہم سب جانتے ہیں کہ سورج نہ تو نکلتا ہے اور نہ ڈوبتا ہے، دراصل یہ زمین کی گردش ہوتی ہے جس کے سبب ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے تو کیا یہ اخبارات غلط بیانی کر رہے ہوتے ہیں؟

جب میں لفظ Disaster استعمال کرتا ہوں تو میری مراد ایک بڑا حادثہ ہوتی ہے، یہ لفظ انھی معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے لغوی معانی ''ایک منحوس ستارے'' کے ہوتے ہیں تو کیا جب یہ لفظ استعمال کیا جائے تو ہمیں اس کے لغوی معانی ہی مراد لینے چاہئیں؟

میں اور ڈاکٹر ولیم دونوں بعض اوقات پاگل شخص کے لیے ایک لفظ استعمال کرتے ہیں

Lunatic، اس لفظ کے لغوی معانی ہوتے ہیں ''Struck by the Moon'' تو کیا ہم اس لفظ کو اس کے لغوی معانی ہی میں استعمال کرتے ہیں؟

لیکن بات یہ ہے کہ زبان کا ارتقا اسی طرح ہوا ہے۔ سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کو بھی اسی طرح دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سورۂ کہف کی اس آیت میں سورج کے ڈوبنے سے کیا مراد ہے؟ یہاں کوئی بات سائنس کے خلاف نہیں ہے۔

انھوں نے سورۂ فرقان کا بھی حوالہ دیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًاۙ﴾ [الفرقان: ٤٥]

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔''

ڈاکٹر ولیم اپنی کتاب میں اس آیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''سورج کہاں حرکت کرتا ہے؟'' لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس آیت میں کہیں بھی سورج کی حرکت کا ذکر ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی گفتگو میں بھی اور اپنی کتاب میں بھی یہی سوال اٹھاتے ہیں کہ سورج حرکت نہیں کرتا لیکن اس آیت مبارکہ میں تو صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ سورج کو سائے کی حرکت پر دلیل بنایا گیا ہے۔ اور یہ بات تو وہ شخص بھی جانتا ہے جس نے کبھی مدرسے کا منہ بھی نہیں دیکھا، کہ سائے کا سبب سورج کی روشنی ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن کی بات بالکل درست ہے۔ کیوں کہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ سورج کی حرکت کی وجہ سے سایہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ یہ بات ڈاکٹر صاحب خود قرآن سے وابستہ کر رہے ہیں۔ سورج سائے پر دلیل ہے کیوں کہ سورج کی روشنی کی وجہ سے ہی سایہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ اگر روشنی نہ ہو تو سایہ بھی نہیں ہوگا۔ سایہ تو ظاہر ہے دیگر روشنی کے ذرائع کی وجہ سے بھی بن سکتا ہے لیکن یہاں خاص سائے کی بات ہو رہی ہے جو گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے اور یہ سایہ سورج کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کیمپبل نے سلیمانؑ کی وفات کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے سورۂ سبا کی آیت کا حوالہ دیا ہے:

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ﴾ [سبا: ۱۴]

''پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا، اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔''

اس آیت کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص چھڑی کے سہارے کھڑا ہو، وہ فوت ہو جائے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔

اس آیت کریمہ کی وضاحت بھی متعدد طریقوں سے ممکن ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور یہ ان کا ایک معجزہ ہو سکتا ہے۔ جب بائبل یہ کہتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور یہ کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو یہ بات حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ناقابل یقین ہوتی ہے۔ آپ خود بتایئے کسی مردے کا زندہ کر دینا اور بغیر باپ کے پیدا ہونا زیادہ حیرت انگیز ہے یا کسی مردہ شخص کا چھڑی کے سہارے کھڑے رہنا؟

سو اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے معجزات ظاہر فرما سکتا ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعے کیوں نہیں فرما سکتا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر میں راستہ بن سکتا ہے، ان کا عصا اژدھے میں تبدیل ہو سکتا ہے، بائبل یہ بتاتی ہے، قرآن بھی یہی بتاتا ہے، سو اگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام والا واقعہ کیوں ممکن نہیں ہے؟

متعدد دیگر تاویلات بھی ممکن ہیں کیوں کہ قرآن یہ تو کہہ ہی نہیں رہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ''بہت طویل عرصے'' تک چھڑی کے سہارے کھڑے رہے تھے...... سورۂ نسا میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴾ [النساء: ۸۲]

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔''

آپ کسی بھی نقطہ نظر سے قرآن کا مطالعہ کریں۔ اگر آپ کا طریقہ کار منطقی ہے تو آپ قرآن میں کہیں بھی تضاد اور اختلاف نہیں پائیں گے، اور نہ ہی قرآن کی کوئی آیت مصدقہ سائنسی حقایق کے خلاف ہوگی۔

میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے اتفاق کرتا ہوں، حضرت سلیمان علیہ السلام طویل عرصہ تک کھڑے رہے ہوں گے اور اس کی وجہ بھی اسی جگہ بیان کر دی گئی ہے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام گرے ہیں اور جنوں کو ان کی وفات کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں غیب کا علم ہوتا تو ہم اتنا عرصہ مشقت نہ کرتے۔ دراصل ان جنات کو اپنی طاقت کا بہت زعم تھا، جسے ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر واضح فرمایا کہ انھیں علم غیب حاصل نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے دودھ بننے کے عمل کا بھی ذکر کیا ہے۔ سورۂ النحل کی آیت کے حوالے سے انھوں نے اعتراض کیا ہے۔

سب سے پہلا شخص جس نے دورانِ خون کا عمل دریافت کیا وہ ابن نفیس تھا۔ اس نے یہ دریافت نزولِ قرآن کے چھ سو سال بعد کی تھی اور ابن نفیس کے بھی چار سو سال بعد ولیم ہاروی کے ذریعے یہ بات اہلِ مغرب کے علم میں آئی۔ یعنی نزولِ قرآن کے ایک ہزار سال بعد۔

جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ معدے اور آنتوں میں ہضم ہوتی ہے۔ ہضم کے بعد خوراک

کے اجزا دورانِ خون کے ذریعے جسم کے مختلف اعضا تک پہنچتے ہیں۔ جگر کا فعل بھی اس عمل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ دورانِ خون کے اس عمل کے ذریعے ہی غذائی اجزا دودھ پیدا کرنے والے غدودوں تک بھی پہنچتے ہیں۔

جدید سائنس کی فراہم کردہ یہ تمام معلومات اجمال واختصار کے ساتھ اس آیت قرآنی میں بیان کر دی گئی ہیں:

﴿وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ٥﴾ [النحل: ٦٦]

''اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار ہے۔''

حمد وثنا اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں قرآن کے ذریعے چودہ سو سال پہلے ہی ان حقایق کا علم دیا، جن کے بارے میں جدید سائنس آج انکشافات کر رہی ہے۔ سورۂ مومنون میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ٥ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ٥﴾

[المومنون: ٢١،٢٢]

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے، اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فایدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔''

ڈاکٹر ولیم نے حیوانوں کے گروہوں میں رہنے کے حوالے سے بھی ایک نکتہ اُٹھایا ہے۔ متعلقہ آیت کریمہ قرآن مجید کی سورۂ انعام میں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝﴾

[الانعام: ۳۸]

''زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

قرآن مجید تو یہ کہہ رہا ہے اور ڈاکٹر ولیم کہہ رہے ہیں کہ مکڑی اپنے نر کو ہلاک کر دیتی ہے اور شیر یوں کرتا ہے اور ہاتھی یوں کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

وہ رویوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں، قرآن رویے کی بات ہی نہیں کر رہا۔ اگر ڈاکٹر ولیم کیمپبل قرآن کی بات نہیں سمجھ پائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن کی بات غلط ہے۔

قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ انواع ہیں تمہاری طرح۔ یعنی جانوروں اور پرندوں کے بھی انسانوں کی طرح گروہ ہوتے ہیں۔ قرآن ان کے رویوں کی بات نہیں کر رہا۔

اور آج جدید سائنس بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ جانور اور پرندے بھی ہماری طرح گروہوں کی صورت میں ہی رہتے ہیں۔

میں علم الجنین کے حوالے سے تفصیلی گفتگو نہیں کر سکا تھا کیوں کہ وقت محدود تھا۔ ڈاکٹر ولیم کے اُٹھائے ہوئے تمام نکات کا جواب میں نے دے دیا ہے۔ اب ہم علم الجنین کے حوالے سے ذرا تفصیل سے بات کریں گے۔ جن نکات کا جواب میں دے چکا ہوں ان کے علاوہ ڈاکٹر ولیم نے کچھ باتیں کی ہیں۔ ایک بات انھوں نے یہ کی کہ جنین کی نشو ونما کے مراحل کا ذکر Hippocritus اور گالن وغیرہ نے بھی کیا ہے۔ یہاں ایک بنیادی نکتہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ اگر کسی نے کوئی ایسی بات کی ہے جس سے قرآن کو اتفاق ہے تو اس سے

یہ مراد لینا ہرگز درست نہ ہوگا کہ وہ بات قرآن نے اس شخص سے اخذ کی ہوگی۔ مثال کے طور پر میں ایک بیان دیتا ہوں اور فرض کیجیے کہ وہ بیان درست ہے۔ اب اگر وہی بیان مجھ سے پہلے بھی کوئی دے چکا ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ میں نے لازماً اس شخص کی نقل کی ہے یا اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس کا امکان ضرور ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ صورتِ حال کا تجزیہ کریں۔

قرآن گالن اور بقراط وغیرہ کی ہر بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ جنین کے ارتقا کے حوالے سے قرآن اور گالن وغیرہ کے نظریات میں مکمل یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اگر قرآن نے (نعوذ باللہ) ان سائنس دانوں کی نقل کی ہوتی تو دونوں میں مکمل یکسانیت پائی جاتی۔ یہ ایک منطقی بات ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ کچھ چیزوں کی تو نقل کر لی جاتی اور کچھ چیزیں جو غلط ہیں، وہ چھوڑ دی جاتیں۔ گالن اور بقراط وغیرہ ''جونک نما مرحلے'' کا ذکر نہیں کرتے۔ ان کے ہاں ''مضغة'' کا تصور پایا ہی نہیں جاتا۔

مزید برآں ان سائنس دانوں نے یہ بھی کہا کہ عورت میں بھی مادۂ منویہ ہوتا ہے۔ اور یہی بات بائبل میں بھی کی گئی ہے۔ لہٰذا گالن اور بقراط سے استفادہ دراصل انجیل میں کیا گیا ہے۔

بائبل میں ہم پڑھتے ہیں:

''کیا تو نے مجھے دودھ کی طرح نہیں اُنڈیلا اور پنیر کی طرح نہیں جمایا؟''

[ایوب۔ باب ۱۰۔۱۰]

یہ دودھ اور جمے ہوئے پنیر کا تذکرہ کیا ہے؟ سیدھی سیدھی گالن کی نقل ہے۔ نقل کیوں؟ کیوں کہ یہ جملہ کلامِ الٰہی نہیں ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ دراصل یہ گالن، بقراط اور دیگر یونانیوں کا خیال تھا کہ جنین کی تشکیل جمے ہوئے پنیر کی طرح ہوتی ہے۔ اور بائبل میں یہ بات بعینہٖ نقل کر لی گئی ہے۔ قرآن میں ہرگز ایسا نہیں ہے۔

اگر آپ علم الجنین کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کریں، مثال کے طور پر

ڈاکٹر کیتھ مور کی کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ گالن، ہپو کریٹس اور ارسطو وغیرہ نے اس موضوع پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ اُن کی کچھ باتیں درست ہیں تو بہت سی باتیں غلط بھی ہیں۔

ڈاکٹر مور مزید لکھتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ یا اس وقت کے عربوں کے لحاظ سے قرآن ہمیں اضافی معلومات فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور اپنی کتاب میں قرآن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ وہ ارسطو اور ہپو کریٹس کا بھی اعتراف کرتے ہیں لیکن یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کی باتیں غلط بھی ہیں۔ قرآن کے کسی بیان کے بارے میں وہ ایسا نہیں کہتے۔ یہی اِس بات کا کافی ثبوت ہے کہ قرآن، یونانی نظریات کی نقل نہیں کر رہا۔

رہی بات چاند کی روشنی اور زمین کی گردش کی، تو مجھے فیثا غورث کے بارے میں بھی پتہ ہے اور یہ بھی کہ زمانہ قبل مسیح میں ہی بعض یونانیوں کا خیال تھا کہ زمین گردش میں ہے، چاند کی روشنی دراصل سورج کی روشنی کا عکس ہے۔

لیکن.......... اگر رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) ان نظریات کی نقل کر رہے ہوتے تو پھر وہ ان کے اس نظریے کو بھی قبول کرتے کہ سورج ساکن ہے اور پوری کائنات کا مرکز ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ درست باتیں قبول کر لی گئیں اور غلط باتیں چھوڑ دی گئیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل ایک طویل فہرست پیش کر دیتے ہیں۔ یونانی زبان سے Cyriac میں ترجمہ ہوا، اس سے عربی میں ہوا، لیکن قرآن کی ایک آیت اس طرزِ استدلال کی نفی کر دینے کے لیے کفایت کرتی ہے۔

سورۂ عنکبوت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۝﴾ [العنکبوت: ۴۸]

”(اے نبی ﷺ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے، اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔“

رسول اللہ ﷺ اُمی تھے وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ یہ تاریخی حقیقت یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے کہیں سے، کسی سے نقل نہیں کی۔ دیکھیے، تصور کیجیے، ایک سائنس دان، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی یہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر بھی حکمت کے تحت رسول اللہ ﷺ کو اُمی رکھا، تاکہ لوگوں کو، متکبر لوگوں کو، اسلام کے خلاف کتابیں لکھنے والے لوگوں کو، منہ کھولنے کا موقع نہ ملے۔

میں بائبل کے حوالے سے بہت سی باتیں کر سکتا ہوں۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے میں ڈاکٹر ولیم کی جانب سے اُٹھائے گئے تمام نکات کا جواب دے چکا ہوں، الحمد للہ۔ کوئی ایک نکتہ بھی ایسا نہیں بچا جس سے قرآن کا سائنس کے خلاف ہونا ثابت ہو۔

انھوں نے میرے اُٹھائے ہوئے ۲۲ نکات میں سے صرف دو نکات کو چھیڑا اور انہیں بھی ثابت نہیں کر سکے۔ لہٰذا یہ بائیس کے بائیس نکات ثابت کرتے ہیں کہ بائبل جدید سائنس سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اب نکتہ نمبر ۲۲ پیش خدمت ہے۔ یہ نکتہ علم الحیوانات سے متعلق ہے۔

کتاب احبار، باب ۱۱ کی چھٹی آیت دیکھیں:

''اور خرگوش کو کیوں کہ وہ جگالی تو کرتا ہے لیکن اس کے پاؤں الگ نہیں۔ وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔''

یہاں واضح طور پر کہا جا رہا ہے کہ خرگوش جگالی کرتا ہے۔ حالاں کہ آج ہم سب جانتے ہیں کہ خرگوش جگالی نہیں کرتا، اور نہ ہی اس کے معدے کی بناوٹ جگالی کرنے والے جانوروں کی سی ہوتی ہے۔ دراصل اس کے منہ کی مسلسل حرکت کی وجہ سے زمانۂ قدیم میں ایسا سمجھا جاتا تھا۔

اسی طرح امثال، باب ۶، آیت ۷ میں کہا گیا کہ چیونٹیوں کا نہ کوئی سردار ہے، نہ ناظر اور نہ حاکم۔ آج ہم جانتے ہیں کہ چیونٹیاں نہایت منظم مخلوق ہیں۔ ان کے ہاں ایک باقاعدہ نظام پایا جاتا ہے جس کے مطابق وہ محنت کرتی اور خوراک جمع کرتی ہیں۔ ان میں

باقاعدہ سردار چیونٹی بھی ہوتی ہے اور نیچے درجہ بدرجہ کارکن چیونٹیاں ہوتی ہیں۔
یہ ایک سائنسی حقیقت ہے جسے بائبل نظرانداز کرتی ہے، لہٰذا بائبل کا بیان غیر سائنسی ہے۔

کتاب پیدائش، باب ۳، آیت ۱۴ اور پھر یسعیاہ، باب ۶۵، آیت ۲۵ میں کہا گیا ہے کہ سانپ کی خوراک خاک ہے۔ حیاتیات کی کوئی کتاب ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ سانپ کی خوراک خاک ہے۔

مزید برآں بائبل میں ایسے جانوروں کا ذکر بھی موجود ہے جو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتے مثلاً ایک دیومالائی جانور Unicorn۔ یہ ایک سینگ والا گھوڑا ہے جو صرف اساطیر میں پایا جاتا ہے، حقیقی دنیا میں وجود نہیں رکھتا۔

میرا وقت ختم ہونے والا ہے۔ اگر میری کسی بات سے کسی مسیحی بھائی کے جذبات مجروح ہوئے ہیں تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میری نیت کسی کے جذبات مجروح کرنے کی نہیں تھی۔ مجھے تو ڈاکٹر کیمپبل کا جواب دینا ہے اور ان کی کتاب کا رد کر کے یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن اور جدید سائنس میں مکمل مطابقت پائی جاتی ہے۔

اور جہاں تک بائبل کا تعلق ہے، اس کے ایک حصے کے بارے میں تو ہم یہ امکان تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کلامِ خداوندی ہو سکتا ہے لیکن مجموعی طور پر، اس کی موجودہ صورت میں ہم بائبل کو منزل من اللہ نہیں سمجھتے۔

اب میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ میں اپنی بات قرآن کریم کی اس آیت پر ختم کرنا چاہوں گا:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا٥﴾

[بني اسرائيل : ۸۱]

"اور اعلان کر دو کہ "حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔"

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

حصہ دوئم
سوالات وجوابات

سوال:......میرا سوال ڈاکٹر کیمپبل سے ہے۔ کتاب پیدائش میں کہا گیا ہے کہ طوفان نوح پوری دنیا میں آیا تھا۔ دنیا کی ہر چیز، ہر پہاڑ اس میں ڈوب گیا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ پانی پندرہ ہاتھ اونچا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کا بلند ترین پہاڑ پندرہ ہاتھ اونچا نہیں تھا۔ پھر اس بات کا کیا مطلب ہے؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:......سوال کے لیے شکریہ۔ میرے خیال میں بائبل یہ کہہ رہی ہے کہ بلند ترین پہاڑ سے بھی پانی پندرہ ہاتھ اونچا تھا۔ یعنی اگر بلند ترین پہاڑ تین ہزار میٹر بلند تھا تو پانی کی بلندی تین ہزار میٹر اور پندرہ ہاتھ تھی۔

اور میرا خیال ہے کہ قرآن بھی طوفانِ نوح کا بیان اسی طریقے سے کرتا ہے:

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ وَاَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ وَمَنۡ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيۡلٌ‏﴾ [هود: ٤٠]

"یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور اُبل پڑا تو ہم نے کہا کہ ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو، اور اپنے گھر والوں کو بھی، سوائے ان اشخاص کے جن کی نشان دہی پہلے کی جا چکی ہے، اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔"

اس کے بعد قرآن مختلف علاقوں کا ذکر کرتا ہے اور انبیائے کرام کی فہرست دیتا ہے، جس میں نوح سے پہلے کا کوئی نبی شامل نہیں۔ حالاں کہ حضرت آدم علیہ السلام بھی نبی ہو سکتے تھے۔ بہر حال میرے خیال میں قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ یہ طوفان پوری دنیا میں آیا تھا۔

سوال:......ڈاکٹر ذاکر صاحب! آپ نے اپنی گفتگو کے دوران میں کہا کہ اللہ نور ہے، میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ وضاحت کر دیجیے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے یہ سوال اس لیے کیا ہے کہ وہ ڈاکٹر ولیم

کے جواب میں میری گفتگو کو سمجھ نہیں پائے جو اللہ اور نور کے حوالے سے تھی۔ قرآن مجید کی سورۂ نور کی پینتیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [النور: ۳۵]

''اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔''

نور کا مطلب منعکس یا مستعار روشنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ کی روشنی بھی مستعار ہے؟ اس سوال کے جواب میں کہا گیا تھا کہ اگر آپ اس آیت کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں فانوس کی مثال دی گئی ہے۔ فانوس میں ایک چراغ ہوتا ہے جو اپنی روشنی رکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی روشنی رکھتا ہے۔ فانوس روشنی منعکس بھی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اس روشنی کو نور کہنا بھی روا ہے۔

آپ یہاں یہ ہیلوجن لیمپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے راڈ کو آپ سراج یا وہاج یا چراغ کہہ سکتے ہیں۔ جب کہ اس کے Reflecter کو منیر کہا جا سکتا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس روشنی سے مراد عام روشنی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی روحانی روشنی ہے۔ لیکن ظاہر ہے ڈاکٹر ولیم کیمپبل کو جواب دینے کے لیے جتنی ضرورت تھی میں نے اتنی ہی بات کی۔

البتہ چونکہ میرے پاس جواب کے لیے پانچ منٹ ہیں لہٰذا میں ایک اور بات بھی کرنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے حضرت نوحؑ کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے میں بائبل کے حق میں Conflict Approch اور قرآن کے حق میں Concordance Approch استعمال کر رہا ہوں کیوں کہ الحمد للہ کسی بھی صورت میں قرآن برحق ہی ثابت ہوتا ہے۔

اگر میں ڈاکٹر ولیم کی بات مان بھی جاؤں اور یہ بات تسلیم کر بھی لوں کہ طوفانِ نوحؑ کا پانی دنیا کے بلند ترین پہاڑ سے بھی پندرہ ہاتھ بلند تھا تو ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے۔ کتاب پیدائش کے، باب نمبر ۷ آیت نمبر ۱۹ اور ۲۰ میں کہا گیا ہے:

''اور پانی زمین پر چڑھتا ہی گیا اور بڑھا اور کشتی پانی کے اوپر تیرتی رہی اور

پانی زمین پر بہت ہی زیادہ چڑھا اور سب اونچے پہاڑ جو دنیا میں ہیں پانی میں چھپ گئے۔"

اگر آپ طوفانِ نوحؑ کے وقت کا تعین انجیل کی مدد سے کریں تو یہ اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح کا دور بنتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب بابل میں تیسرے اور مصر میں گیارھویں خاندان کی حکومت چل رہی تھی۔ لیکن وہاں اس طوفان کا کوئی اثر نہیں ملتا۔ یعنی یہ علاقے طوفان سے بالکل محفوظ رہے۔ پس آثارِ قدیمہ کی شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ طوفانِ نوحؑ کا عالم گیر ہونا یعنی پوری زمین پر محیط ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن تاریخ کا تعین نہیں کرتا۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ سیلاب بائیسویں صدی قبل مسیح میں آیا تھا یا پچاسویں صدی قبل مسیح میں آیا تھا۔

دوسری بات یہ کہ قرآن کہیں یہ نہیں کہتا کہ سیلاب عالم گیر تھا اور ساری زمین اس میں ڈوب گئی تھی۔ قرآن صرف حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا ذکر کرتا ہے جو ایک چھوٹی قوم بھی ہو سکتی ہے اور بڑی بھی۔

آج ماہرین آثارِ قدیمہ یہ امکان تو تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کا ایک مخصوص علاقہ زیرِ آب آ گیا ہو لیکن عالم گیر سیلاب کا نظریہ کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا الحمد للہ قرآن تو جدید ترین علوم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، لیکن بائبل نہیں۔

مزید برآں اگر آپ کتاب پیدائش کے چھٹے باب کی پندرھویں اور سولھویں آیت کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ خدا حضرت نوحؑ کو حکم دیتا ہے:

"اور ایسا کرنا کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ، اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی اونچائی تیس ہاتھ ہو۔"

اگر آپ حساب لگائیں تو پتہ چلتا ہے کہ کشتی کا کل حجم ڈیڑھ لاکھ مکعب فٹ سے زیادہ نہیں بنتا اور رقبہ بھی تقریباً ۳۳،۷۵۰ مربع فٹ بنتا ہے۔ بائبل کہتی ہے کہ کشتی تین منزلہ تھی

یعنی کل رقبہ تقریباً ایک لاکھ مربع فٹ تھا۔ یہ کل دستیاب جگہ تھی۔ ذرا تصور کیجیے، دنیا کے ہر جاندار کا ایک جوڑا اس ایک لاکھ مربع فٹ میں آنا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے؟

دنیا میں لاکھوں اقسام کے جاندار ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس آڈیٹوریم میں ایک لاکھ لوگ آئے تو کیا آپ تسلیم کرلیں گے؟ مجھے یاد ہے، پچھلے سال میں نے کیرالہ میں ایک خطاب کیا تھا۔ وہاں دس لاکھ لوگ آئے تھے۔ وہ میری زندگی کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ تاحد نظر لوگ ہی لوگ تھے۔ میں آخر تک دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ لیکن وہ ایک ملین لوگ کسی آڈیٹوریم میں نہیں تھے۔ یہ لوگ ساحل سمندر پر جمع ہوئے تھے۔ میں سامنے کے چند لوگوں کے علاوہ باقی لوگوں کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر آپ اس اجتماع کی ویڈیو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک لاکھ لوگ کس قدر ہوتے ہیں۔ اسی طرح عرفات کے اجتماع سے بھی آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے جہاں ڈھائی ملین لوگ جمع ہوتے ہیں۔

لہٰذا ایک لاکھ مربع فٹ رقبے میں لاکھوں جانداروں کا رہنا بالکل ناممکن ہے جب کہ انھوں نے اسی جگہ میں چالیس دن رہنا بھی ہو کھانا پینا بھی ہو اور حوائج ضروریہ سے بھی فارغ ہونا ہو۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی بائبل کی سائنسی اغلاط میں سے ہے۔

سوال:...... ڈاکٹر ولیم کیمپبل، آپ بائبل میں دیا گیا امتحان خود کیوں نہیں دیتے تاکہ یہاں موجود حاضرین پر یہ بات ثابت ہو جائے کہ آپ ایک حقیقی مسیحی ہیں؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... مجھے ڈاکٹر ذاکر نائیک کی تاویل سے اتفاق نہیں ہے۔ دیکھیے، خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بھٹکانے کی کوشش کی گئی تھی۔ شیطان نے ان سے کہا کہ اگر آپ ابن اللہ ہیں تو ہیکل سے نیچے چھلانگ لگا دیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ خدا کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ میں بھی خدا کا امتحان لینے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں یہاں آپ کے سامنے معجزہ دکھانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میرے دوست ہیری نے دعوت میں جانے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ لیکن وہ صورت حال مختلف تھی۔ میں خدا کی تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں۔

سوال:...... مسیحی حضرات عقیدہ تثلیث کی سائنسی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ جس طرح پانی کی تین طبعی صورتیں ٹھوس، مایع اور گیس ہوسکتی ہیں یعنی وہ برف، پانی اور بھاپ کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ اسی طرح خدا بھی باپ، بیٹے اور روح القدس کی تثلیث کی صورت میں ہے۔ کیا آپ اس تاویل کو درست سمجھتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں ایک وضاحت چاہوں گا۔ یہ بات درست ہے کہ ہمیں خدا کا امتحان لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے لیکن یہ کوشش کون کر رہا ہے؟ ہم تو ڈاکٹر ولیم کا امتحان لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ صاحب ایمان پر یہ خطرناک زہر اثر نہیں کرے گا اور وہ نئی نئی زبانیں بولیں گے۔ ہم خدا کا امتحان نہیں لے رہے۔ خدا پر ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر صاحب ایمان کو اس امتحان میں کامیاب کرے گا۔ ہم تو آپ کا امتحان لے رہے ہیں کہ آپ صاحب ایمان مسیحی ہیں یا نہیں؟

اب میں بہن کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ ان کا سوال یہ ہے کہ مسیحی حضرات عقیدۂ تثلیث کی سائنسی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ ”جس طرح پانی تین صورتوں یعنی ٹھوس، مایع اور گیس میں پایا جاتا ہے، اسی طرح خدا بھی باپ، بیٹے اور روح القدس کی صورت میں موجود ہے۔

سائنسی لحاظ سے مجھے اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ پانی کی تین طبعی حالتیں ہوتی ہیں۔ ٹھوس، مایع اور گیس یا برف، پانی اور بخارات۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اپنے اجزا کے لحاظ سے یہ ایک ہی چیز رہتی ہے۔ پانی کا کیمیائی فارمولا H_2O ہے یعنی دو ایٹم ہائیڈروجن کے اور ایک ایٹم آکسیجن کا۔ یہ اجزا اسی طرح رہتے ہیں، ان کا تناسب یہی رہتا ہے صرف طبعی حالت تبدیل ہوتی ہے۔

اب ہم عقیدۂ تثلیث کا جائزہ لیتے ہیں۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ کیا یہاں بھی صرف حالت ہی تبدیل ہوتی ہے؟ چلیے ہم مان لیتے ہیں کہ یہاں بھی صرف حالت کا فرق

پڑتا ہے، کیا یہاں بھی اجزا وہی رہتے ہیں؟

باپ اور روح القدس کا وجود روحانی ہے جب کہ انسان گوشت پوست کی مخلوق ہے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ خدا ان ضرورتوں سے پاک ہے۔ دونوں مختلف ہیں دونوں ایک جیسے کس طرح ہو سکتے ہیں؟

اور یہ بات خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان سے بھی ثابت ہوتی ہے، وہ لوقا کی انجیل میں فرماتے ہیں:

''اس نے ان سے کہا ''تم کیوں گھبراتے ہو؟ اور کس واسطے تمہارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں؟ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں وہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو کیوں کہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی جیسا کہ مجھ میں دیکھتے ہو، یہ کہہ کر اس نے انھیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا کیا یہاں تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ انہوں نے اسے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اس نے لے کر ان کے روبرو کھایا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہاں خود فرما رہے ہیں کہ روح گوشت اور ہڈیاں نہیں رکھتی۔ سائنسی طور پر یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ وہ خدا نہیں ہیں، انھوں نے ان کے روبرو مچھلی کا ٹکڑا کھایا اور اس طرح باپ بیٹے اور روح القدس کے ایک ہونے یعنی تثلیث کے عقیدے کو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رد کر دیا۔

پوری بائبل میں تثلیث (Trinity) کا لفظ ہی موجود نہیں ہے۔ لیکن قرآن میں اس کا ذکر موجود ہے۔

سورۂ نسا میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

[النساء: ۱۷۱]

"اور نہ کہو کہ تین ہیں۔ باز آ جاؤ یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔"

سورۂ مائدہ میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝﴾ [المائدہ: ۷۳]

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے، اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خدا ہیں۔ بائبل میں بھی تثلیث کا تصور موجود نہیں ہے۔

واحد بیان جو تثلیث کے قریب ترین ہو سکتا ہے، یہ ہے:

"اور جو گواہی دیتا ہے وہ روح ہے کیوں کہ روح سچائی ہے۔ اور گواہی دینے والے تین ہیں، روح، پانی اور خون۔ اور یہ تینوں ایک ہی بات پر متفق ہیں۔"

[یوحنا کا پہلا خط۔ باب ۵۔ ۷]

اور اس آیت کے بارے میں بائبل کے Revised Standard Version میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ آیت الحاقی ہے۔ یعنی اسے بائبل سے نکال ہی دیا گیا ہے، گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی دعویٰ الوہیت نہیں کیا۔

پوری بائبل میں کوئی ایک بیان بھی ایسا موجود نہیں جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہو کہ میں خدا ہوں۔ یا یہ کہا ہو کہ میری عبادت کرو۔ بلکہ اگر آپ بائبل کا مطالعہ کریں تو آپ کو اس قسم کی آیات ملیں گی:

"اگر تم مجھ سے محبت رکھتے تو اس بات سے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں

خوش ہوتے کیوں کہ باپ مجھ سے بڑا ہے۔" [یوحنا۔ باب ۱۴۔ ۲۸]

"میرا باپ سب سے بڑا ہے۔" [یوحنا۔ باب ۱۰۔ ۲۹]

"میں خدا کی روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں۔" [متی۔ باب ۱۲۔ ۲۹]

"میں بدروحوں کو خدا کی قدرت سے نکالتا ہوں۔" [لوقا۔ باب ۱۱۔ ۲۲]

"میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کرسکتا۔" [یوحنا۔ باب ۵۔ ۳۰]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کرسکتا۔ یعنی جو کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی مرضی سے کرتا ہوں۔ اور یہی اسلامی عقیدہ ہے۔ مسلمان ہوتا ہی وہ ہے جو اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کردے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمان تھے اور اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبروں میں سے ایک تھے۔

ہمارا ایمان ہے کہ ان کی پیدائش ایک معجزہ تھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کردیتے تھے، اندھوں اور کوڑھیوں کو ٹھیک کردیتے تھے۔ ہم ایک عظیم الشان پیغمبر کے ہونے کی حیثیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن وہ خدا نہیں ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾

سوال:...... ڈاکٹر ولیم کیمپبل، کیا آج کی گفتگو کے بعد آپ کو کوئی فائدہ ہوا ہے؟ کیا اسلام کی حقانیت کی جانب آپ کو کوئی اشارہ ملا ہے؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... دیکھیے، میں گزشتہ سوال کو آپ کے سوال کا جواب دینے کے لیے استعمال کروں گا۔ ڈاکٹر نائیک کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہیں یہ نہیں کہا کہ وہ خدا ہیں۔ حالاں کہ مرقس کی انجیل میں ارشاد ہوتا ہے:

"سردار کاہن نے اس سے پھر سوال کیا اور کہا کیا تو اس ستودہ کا بیٹا مسیح ہے؟ یسوع نے کہا ہاں میں ہوں اور تم ابن آدم کو قادر مطلق کے دائیں طرف بیٹھے آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے۔" [مرقس۔ باب ۵۔ ۶۱]

یہاں وہ خود کو واضح طور پر خدا کا بیٹا اور الوہی قرار دے رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر نائیک صرف انہی آیات کا حوالہ دے رہے ہیں جن کا حوالہ وہ دینا چاہتے ہیں۔ یعنی جن آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بشری پہلو کا ذکر ہے۔ لیکن دیگر آیات میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اور باپ ایک ہی ہیں۔

خدا گوشت پوست کی صورت اختیار کر کے ہمارے بیچ رہا.......... رہا میرے دوست کا سوال کہ کیا میں نے آج کی گفتگو سے کچھ سیکھا ہے؟ تو یقیناً ہم نے کئی باتیں سیکھی ہیں، اور میں ہمیشہ سیکھنے کے لیے تیار رہتا ہوں۔ لیکن میرا خیال یہی ہے کہ جن پانچ سو گواہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا، ان کی گواہی میرے لیے زیادہ مضبوط ہے بہ نسبت چھ سو سال بعد آنے والے محمدؐ کی تنہا گواہی کے۔

سوال:...... ڈاکٹر ذاکر، اپنی گفتگو کے دوران ڈاکٹر کیمپبل نے قرآن کے تصورِ کائنات کے حوالے سے کچھ غلط باتیں کیں، جن کا جواب آپ نے دیا۔ لیکن بائبل جو کچھ زمین کی ساخت وغیرہ کے بارے میں کہتی ہے اس کا ذکر آپ نے نہیں کیا؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن نے پوچھا ہے کہ میں نے اس بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی کہ بائبل زمین کی ساخت کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ میرے پاس وقت محدود تھا۔ میں ایسے سو نکات مزید بیان کر سکتا ہوں جنھیں میں نے وقت کی کمی کی وجہ سے نہیں چھیڑا۔

بہر حال بہن جاننا چاہتی ہے کہ بائبل زمین کی ساخت کے بارے میں کیا کہتی ہے۔

بائبل میں کہا گیا ہے:

"پھر ابلیس اسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی۔" [متی۔ باب ۴۔ ۸]

اب بات یہ ہے کہ آپ دنیا کے بلند ترین پہاڑ پر ہی کیوں نہ چلے جائیں۔ آپ ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر ہی کیوں نہ چلے جائیں اور فرض کیجیے آپ بہت دُور تک دیکھ بھی

سکتے ہوں، ہزاروں میل تک دیکھ سکتے ہوں، پھر بھی آپ دنیا کی تمام سلطنتیں نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ آدھی دنیا زمین کے دوسری طرف ہوگی۔ کسی اونچے مقام سے پوری دنیا کو دیکھنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین چپٹی ہو۔ اور یہی بائبل بتاتی ہے کہ زمین چپٹی ہے۔ پھر زمین کے بارے میں اسی طرح کا بیان بائبل میں ایک اور جگہ بھی موجود ہے:

''میں نے نگاہ کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ زمین کے وسط میں ایک نہایت اونچا درخت ہے۔ وہ درخت بڑھا اور مضبوط ہوا اور اس کی چوٹی آسمان تک پہنچی اور وہ زمین کی انتہا تک دکھائی دینے لگا۔'' [دانی ایل۔ باب ۴۔۱۰]

مندرجہ بالا صورتِ حال بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین چپٹی ہو۔ کیوں کہ اگر زمین گول ہے تو پھر زمین کی دوسری طرف سے اس درخت کو کبھی نہیں دیکھا جا سکے گا۔

لیکن آج یہ بات ایک طے شدہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ زمین گول ہے۔ مزید برآں تواریخ۔ ا، باب ۱۶، آیت ۳۰ میں کہا گیا ہے کہ:

''جہان قایم ہے اور اسے جنبش نہیں۔''

یہ بات بائبل میں دوسری جگہ بھی کی گئی ہے کہ زمین حرکت نہیں کرتی۔

ایک بات ڈاکٹر کیمپبل کے اس بیان کے حوالے سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ کہا ہے کہ میں خدا ہوں۔ آپ میری کتاب ''مذاہب عالم میں تصور خدا'' ● میں تمام حوالہ جات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ جو حوالے ڈاکٹر کیمپبل نے دیے ہیں انھی کو سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔

سوال:...... ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب! آپ کہتے ہیں کہ قرآن میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں گرامر کی ۲۰ غلطیاں دکھا سکتا ہوں، مثال کے طور پر سوۂ بقرہ میں، سورۂ حج میں، سورہ طٰہٰ میں، کیا آپ ان غلطیوں کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے بڑا اچھا سوال پوچھا ہے۔ انھوں نے

● ناشر دار النوادر، اُردو بازار، لاہور

قرآن میں گرامر کی بیس غلطیوں کی بات کی ہے۔ جس کتاب کے حوالے سے وہ بات کر رہے ہیں وہ عبدالفادی کی کتاب ہے "Is Quran Infalbible" میں ان ۲۰ غلطیوں کی وضاحت اکٹھی ہی کردوں گا۔ میں یہ کتاب بھی پڑھ چکا ہوں اور میرے بھائی میں ان سب غلطیوں کا جواب دیتا ہوں۔

پہلی بات تو سمجھنے کی یہ ہے کہ عربی زبان کی تمام تر گرامر لی ہی قرآن سے گئی ہے۔ قرآن عربی زبان وادب کا اعلیٰ ترین معیار اور حوالہ ہے۔ عربی گرامر کی نصابی کتاب ہی قرآن مجید ہے۔ جب قرآن ہی نصاب ہے اور قرآن ہی سے گرامر اخذ کی گئی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ گرامر کی کوئی غلطی قرآن میں ہو ہی نہیں سکتی۔

آپ کے پاس پیمائش کے لیے ایک آلہ ہے۔ اسی آلے سے پیمائش کر کے آپ نے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس پیمانے کو آپ کس طرح غلط کہہ سکتے ہیں۔ یہ غیر منطقی بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مختلف عرب قبائل کی زبان میں فرق موجود ہے۔ ڈاکٹر ولیم بھی جانتے ہوں گے کہ زبان میں تبدیلی مختلف قبائل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ ایک لفظ کو ایک قبیلہ مونث سمجھتا ہے تو دوسرے لوگ اسے مذکر قرار دیتے ہیں۔ تذکیر و تانیث کا اختلاف بھی موجود ہے اور گرامر کا بھی۔

اس صورت حال میں آپ ان عرب قبائل کی زبان اور گرامر کو معیار بنا کر قرآن کی زبان کے بارے میں کوئی فیصلہ کس طرح صادر کر سکتے ہیں؟ قرآن کا معیار فصاحت و بلاغت اتنا بلند ہے کہ قرآن پر کوئی اعتراض اس حوالے سے ہو ہی نہیں سکتا۔

کیا آپ جانتے ہیں، اس حوالے سے متعدد کتابیں موجود ہیں۔ انٹرنیٹ پر کوئی بارہ غلطیاں گنوا رہا ہے اور کوئی بیس غلطیاں۔ آپ کا کیا خیال ہے، یہ غلطیاں تلاش کرنے والے کون ہیں؟ کیا یہ غیر مسلم ہیں؟ نہیں یہ مسلمان ہی ہیں۔ زامک شریف جیسے لوگ۔ یہ لوگ کرتے کیا ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ قرآن کا معیار اس قدر بلند ہے کہ بعض اوقات قرآن

گرامر کے عام اُصولوں سے بلند ہو کر بات کرتا ہے۔ اور قرآن کے اسی بلند معیار کو ثابت کرنے کے لیے ایسی مثالیں علما پیش کرتے ہیں۔

انھی مثالوں کو بعض لوگ غلطیاں بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ میں ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور آپ کو ہیں کی ہیں غلطیوں کا جواب مل جائے گا۔

حضرت لوط علیہ السلام کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ انھوں نے پیغمبروں کا انکار کیا، اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے حوالے سے بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے پیغمبروں کا انکار کیا لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان اقوام کی طرف ایک ایک پیغمبر کو مبعوث کیا گیا تھا۔ کیا قرآن کو واحد کا صیغہ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ ایک عام آدمی کے لحاظ سے یہ بھی گرامر کی غلطی ہے لیکن جو لوگ عربی ادب سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی قرآنی اسلوب کا حُسن ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ تمام انبیائے کرام کا بنیادی پیغام ایک ہی تھا۔ لہٰذا ایک کا انکار درحقیقت سب کا انکار ہے۔

آپ نے قرآن کی بلاغت اور حسن ملاحظہ فرمایا۔ کوئی کہتا رہے کہ یہ غلطی ہے لیکن یہ غلطی ہرگز نہیں ہے۔

اسی طرح انیس شورش جیسے لوگ کہتے ہیں کہ "کن فیکون" غلط ہے کیونکہ صیغہ ماضی کے لحاظ سے کن فکان ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں بھی وہ قرآنی بیان کے حُسن کو نہیں سمجھ پائے۔ یہاں جان بوجھ کر ماضی کا صیغہ نہیں استعمال کیا گیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ماضی میں ایسا کیا اور وہ حال اور مستقبل میں بھی ایسا کر سکتا ہے۔

سوال:...... ڈاکٹر کیمبل، اپنی گفتگو کی ابتدا میں آپ نے فرمایا کہ ذوالقرنین، سکندر اعظم تھا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ ذوالقرنین دراصل سکندر اعظم تھا؟

ڈاکٹر ولیم کیمبل:...... میں نے یہ بات عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن کے حواشی میں پڑھی تھی۔ لیکن اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ذوالقرنین اصل میں سکندر اعظم ہی تھا یا کوئی اور۔ اصل بات یہ ہے کہ سورج گدلے پانی میں نہیں ڈوبتا جب کہ قرآن

کی آیت یہی کہہ رہی ہے۔

سوال:...... بائبل میں کہا گیا ہے کہ یونس علیہ السلام تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین دن اور تین رات زمین کے پیٹ میں رہیں گے، کیا یہ پیش گوئی پوری ہوئی؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن جس آیت کا حوالہ دے رہی ہے وہ متی کی انجیل کے بارھویں باب میں ہے:

"اس پر بعض فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں اس سے کہا کہ اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے جواب دے کر ان سے کہا اس زمانہ کے برے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے علاوہ کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ کیوں کہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔"

دیکھیے اس پیش گوئی میں واضح طور پر حضرت یونس علیہ السلام کی مثال دی گئی ہے کہ جس طرح وہ تین راتیں اور تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین راتیں اور تین دن زمین کے پیٹ میں رہیں گے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کی جو داستان ہمیں بائبل سناتی ہے اس کے مطابق تو انھیں جمعہ کے دن مصلوب کیا گیا۔ رات گئے دفن کیا گیا اور اتوار کو قبر خالی تھی۔ یہ دو دن بھی نہیں بنتے بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک دن اور دو راتیں بنتی ہیں۔ تین دن اور تین راتیں نہیں۔

ڈاکٹر ولیم اپنی کتاب میں اس بات کا جواب دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دن کے ایک حصے کو پورا دن شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک مریض ہفتے کی شب بیمار ہوا ہو، اگر پیر کے دن میں اس سے پوچھوں کہ وہ کتنے دن سے بیمار ہے تو وہ یہی جواب دے گا کہ تین دن سے۔

ہم ان کی بات مان لیتے ہیں، ٹھیک ہے۔ اسی طرح ہو گا لیکن پیر کے دن کوئی

مریض یہ ہرگز نہیں کہے گا کہ تین دن اور تین راتیں۔ میں چیلنج کرتا ہوں۔ میں نے الحمد للہ بہت مریض دیکھے ہیں اور ان میں مسیحی مریض بھی شامل تھے۔ لیکن کسی بھی مریض نے جو گزشتہ پرسوں رات کو بیمار ہوا ہو یہ کبھی نہیں کہا کہ میں تین دنوں اور تین راتوں سے بیمار ہوں۔ جب کہ بائبل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں تین دن اور تین راتیں۔ لہٰذا یہ ایک ریاضیاتی غلطی ہے۔

سائنسی لحاظ سے تقابل حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ کیا جائے تو یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ تین دن مچھلی کے پیٹ میں کیسے رہے؟ زندہ یا مردہ؟ جواب ہوگا زندہ۔ مچھلی تین دن انہیں زندہ لے کر سمندر میں پھرتی رہی۔ وہ زندہ تھے، جب انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ جب مچھلی نے انھیں ساحل پر اُگلا تو وہ زندہ تھے۔ زندہ، زندہ، زندہ۔

لیکن جب پوچھا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین دن زمین میں کیسے رہے تو جواب کیا ہوگا؟ زندہ یا مردہ؟

اگر وہ مردہ تھے تو پیش گوئی پوری نہیں ہوئی، اگر زندہ تھے تو پھر وہ مصلوب ہی نہیں ہوئے۔ میں اپنے ایک خطاب میں اس موضوع پر گفتگو کر چکا ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام مصلوب ہوئے تھے یا نہیں؟ اور درست بات وہی ہے جو قرآن بتاتا ہے یعنی:

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ [النساء: ۱۵۷]

''حالانکہ فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ صلیب پر چڑھایا۔ بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔''

سوال:......ڈاکٹر ولیم کیمپبل، آپ ایک ڈاکٹر ہیں، کیا آپ بائبل کے طبی بیانات کی وضاحت کریں گے، کیوں کہ آپ نے اپنے جوابی خطاب میں ان چیزوں کا جواب نہیں دیا۔ مثال کے طور پر خون کا جراثیم کش کے طور پر استعمال؟ یا بیٹی کی پیدائش کی صورت میں عورت کا دگنے عرصے تک ناپاک رہنا؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:......شکریہ میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ لیکن

ہو یہ رہا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک سے وہ سوالات کیے جا رہے ہیں جو ایک مسیحی سے کیے جانے چاہئیں۔ بائبل کا اگر آپ مطالعہ کریں تو اس میں تین دن اور تیسرے دن کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان تمام الفاظ کا ایک ہی مطلب ہے۔

دوسری بات یہ کہ جب جمعرات کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میرا وقت آچکا ہے۔ لہٰذا میں تین دن اور تین رات کو اس وقت سے گنتا ہوں۔

یہ میرا کام نہیں کہ وضاحت کروں کہ خدا نے ان آیات میں کیا کہا ہے لیکن یہ میرا ایمان ہے کہ بائبل میں یہ باتیں خدا کی طرف سے ہیں۔

سوال:...... اسلام ہمیں ارتقا کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... اس سوال کے مکمل جواب کے لیے آپ میری کتاب ''قرآن اور سائنس'' ● سے رجوع کر سکتے ہیں۔ جب آپ ڈارون کے نظریہ ارتقا کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو ڈارون کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک جہاز میں، جس کا نام ایچ، ایم، ایچ بیگل تھا، ایک سفر پر نکلا، جزائر میں گیا، وہاں اس نے مشاہدات کیے اور اس کے نتیجے میں قدرتی چناؤ کا نظریہ وضع کیا۔

لیکن اس نے اپنے ایک دوست تھامس تھامپٹن کو ایک خط لکھا جس میں اس نے کہا کہ میں ''قدرتی چناؤ کے نظریے کے لیے کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکتا لیکن چوں کہ اس سے مجھے مدد ملتی ہے لہٰذا میں نے اسے اپنا لیا ہے۔''

ڈارون کا نظریہ محض ایک نظریہ ہے، کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ اور میں نے اپنی گفتگو کی ابتدا میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ قرآن نظریات اور مفروضوں کے خلاف تو ہو سکتا ہے، کیوں کہ یہ نظریات بعض اوقات بالکل ہی اُلٹے ہو جایا کرتے ہیں، لیکن آپ قرآن اور کسی ثابت شدہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں پائیں گے۔

● ناشر دار النوادر، اردو بازار، لاہور

ہمارے سکولوں میں ڈارون کا نظریہ اس طرح پڑھایا جا رہا ہے جیسے یہ کوئی ثابت شدہ حقیقت ہو، حالاں کہ یہ نظریہ ہرگز ثابت شدہ نہیں۔ اس کا کوئی سائنسی ثبوت موجود نہیں اور پھر یہ کہ بہت سی کڑیاں گم شدہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے کسی دوست سے مذاق کرنا ہو یا اس کی تضحیک کرنی ہو تو کہتے ہیں کہ ''اگر تم ڈارون کے وقت میں ہوتے تو اس کا نظریہ درست ثابت ہو جاتا۔'' جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بندر نما ہے۔

میں ان چاروں طرح کے فوسلز کے بارے میں جانتا ہوں جو دستیاب ہیں لیکن اس کے باوجود کئی کڑیاں گم شدہ ہیں۔

حیاتیات کے بارے میں قرآن ہمیں بتاتا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ [الانبیاء: ۳۰]

''اور (ہم نے) پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔''

آج ہم جانتے ہیں کہ ہر زندہ مخلوق کی بنیادی اکائی خلیہ ہے اور خلیہ جس تر سائٹو پلازم پر مشتمل ہوتا ہے جو کہ تقریباً نوے فی صد پانی ہوتا ہے۔ ہر زندہ مخلوق پچاس فی صد سے نوے فی صد پانی پر مشتمل ہوتی ہے۔ کیا عرب کے صحراؤں میں کسی کو یہ اندازہ ہو سکتا تھا یا ایسا خیال بھی آ سکتا تھا کہ ہر زندہ چیز پانی سے بنی ہے۔

اور قرآن یہ حقیقت ۱۴۰۰ برس پہلے بیان کر چکا ہے۔

سوال:...... اگر ڈاکٹر کیمبل بائبل میں موجود تضادات کی وضاحت نہیں کر سکتے تو کیا انھیں تسلیم نہیں کر لینا چاہیے کہ بائبل غیر سائنسی ہے اور منجانب اللہ نہیں ہے؟

ڈاکٹر ولیم کیمبل:...... میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس حوالے سے مجھے کچھ مسائل درپیش ہیں لیکن میرا ایمان ہے کہ رسولوں کی پیش گوئیاں درست ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی اصل بنیاد ہیں جن کے گرد یہ ساری عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ حواریوں نے یہ انجیلیں انھی پیش گوئیوں کے پورا ہونے پر تحریر کیں۔

میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے سوال کا جواب نہیں ہے۔ لیکن میرا ایمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہے۔

سوال:...... کیا متن اور ترجمہ ایک ہی چیز ہے؟ اگر نہیں تو کیا موجودہ انگریزی بائبل وہی انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... ''متن'' اور ''ترجمہ'' دو مختلف الفاظ ہیں۔ جو دو مختلف معانی رکھتے ہیں، لہٰذا سائنسی طور پر آپ ایک متن اور اس کے ترجمے کو ایک ہی چیز نہیں قرار دے سکتے۔

کیا حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر وحی انگریزی زبان میں نازل ہوئی تھی؟ یہ ایک بہت اچھا سوال ہے کہ کیا متن اور ترجمہ ایک ہی چیز ہو سکتے ہیں؟ جواب ہے ''نہیں'' متن اور ترجمہ کبھی ایک چیز نہیں ہو سکتے۔ ترجمہ متن کے قریب ترین ہو سکتا ہے لیکن متن کا نعم البدل کبھی نہیں ہو سکتا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے کہا تھا کہ ترجمے کے لحاظ سے دنیا کی سب سے مشکل کتاب قرآن مجید ہے کیونکہ قرآن کی زبان اس قدر بلیغ ہے، اس قدر بلند ہے، اس قدر عظیم ہے کہ اس کا ترجمہ مشکل ترین کام ہے۔ ایک ایک لفظ کے متعدد معانی ہیں۔ اگر ترجمے میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو یہ انسانی کام ہے لہٰذا وہ انسانی غلطی ہوگی۔ اور ترجمہ کرنے والا اس کے لیے مورد الزام ہوگا نہ کہ اللہ تعالیٰ۔

بائبل انگریزی میں نازل نہیں ہوئی تھی۔ عہد نامہ قدیم عبرانی زبان میں تحریر ہوا تھا جب کہ عہد نامہ جدید یونانی زبان میں۔

اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام عبرانی زبان بولتے تھے لیکن انجیل کا مسودہ یونانی زبان میں ہے۔ اصل عبرانی مسودہ دستیاب نہیں ہے۔ بلکہ کیا آپ جانتے ہیں کہ عہد نامہ قدیم کا عبرانی متن بھی دراصل یونانی زبان سے دوبارہ عبرانی ترجمہ ہے۔ یعنی عہد نامہ قدیم کا اصل عبرانی متن بھی دستیاب نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں دوہرا مسئلہ ہے۔ چنانچہ اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے

کہ اس میں بہت سی اغلاط موجود ہیں۔

لیکن قرآن کا معاملہ الحمد للہ یہ ہے کہ اصل عربی متن ہی محفوظ ہے۔ آپ سائنسی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ اصل متن ہے۔

لیکن ہمارا یقین اسی بات پر ہے جو قرآن میں کر دی گئی ہے:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ﴾[الرعد: ۳۸]

''تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں۔''

ان رسولوں پر کتابیں بھی نازل ہوئی تھیں۔ جن میں سے چار کے ناموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے یعنی توراۃ، زبور، انجیل اور قرآن۔ توراۃ سے مراد وہ وحی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جب کہ قرآن حضرت محمد ﷺ پر۔ لیکن موجودہ بائبل ہرگز وہ انجیل نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

سوال:...... کیا موجودہ بائبل وہی انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... موجودہ انجیل وہی ہے جو ہمیشہ سے تھی۔ ہمارے پاس متون موجود ہیں۔ ۷۵ فی صد متن تو ایسا ہے جو ۱۸۰ء سے موجود ہے۔ یعنی تحریر کیے جانے کے تقریباً سو برس بعد کے وقت سے یہ متن موجود ہیں۔ یوحنا نے اپنی زندگی میں یہ متن تحریر کیا۔ جب وہ متن تحریر کر رہے تھے تو اُس وقت کے بہت سے لوگ ابھی زندہ تھے۔ وہ اور ان کے باپ دادا یوحنا کے ذریعے ایمان لائے تھے۔ یہ متن کی صحت کا کافی ثبوت ہے۔ انجیل کی ایک مصدقہ تاریخ موجود ہے۔

باقی خدا ہر چیز پر قادر ہے .... جو چاہے کر سکتا ہے .... اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو منتخب کیا .... اصل بات یہ ہے کہ پیش گوئیوں کے پورا ہونے کا کس قدر امکان تھا؟ شکریہ

سوال:...... سائنس تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اگر قرآن اور سائنس میں اتنی ہی مطابقت ہے جتنی آپ بتا رہے ہیں تو پھر اس صورت میں کیا ہوگا، اگر سائنسی نظریات تبدیل

ہو جائیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:......سوال بہت اہم ہے، کہ قرآن اور جدید سائنس کے درمیان مطابقت ثابت کرنے کے لیے اتنی محنت کی جاتی ہے۔ اگر جدید سائنس غلط ثابت ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا سائنس میں ہونے والی تبدیلیوں کے لحاظ سے قرآن بھی بدل جاتا ہے۔ یہ ایک بہت اچھا سوال ہے۔ اور قرآن کی مطابقت جدید سائنس کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

اسی لیے میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ہی یہ بات واضح کر دی تھی کہ صرف اور صرف مصدقہ حقائق کے بارے میں ہی بات کروں گا، سائنسی نظریات اور مفروضوں کے بارے میں نہیں۔ کیوں کہ مصدقہ حقائق، ثابت شدہ حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر یہ حقیقت کہ دنیا گول ہے۔ ثابت شدہ حقائق یوٹرن نہیں لیتے۔ لیکن غیر ثابت شدہ، غیر مصدقہ نظریات کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یوٹرن بھی لے سکتے ہیں۔

میں ایسے علما کے بارے میں بھی جانتا ہوں جو ڈارون کے نظریہ ارتقا کا ثبوت قرآن سے دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک نامعقول بات ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ رویہ قطعاً نہیں اپنانا چاہیے کہ ہر چیز کو، جدید سائنس کے ہر نظریے کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیں۔ ہمیں پہلے دیکھنا چاہیے کہ نظریے کی حیثیت ایک ثابت شدہ حقیقت کی ہے یا محض مفروضے کی۔ مفروضہ درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔

مثال کے طور پر بگ بینگ کے نظریے (Big Bang Theory) ہی کو دیکھیے۔ آج اس کی حیثیت کی حقیقت کیا ہے لیکن کل یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ جب مفروضہ حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ نسل انسانی کا ارتقا جینز کے ایک جوڑے سے ہوا ہے اور جینز ہی آدم وحوا تھے۔ لیکن میں اس نظریے کو کبھی اپنی گفتگو میں زیر بحث نہیں لاتا کیونکہ یہ نظریہ ابھی تک محتاج ثبوت ہے۔

چنانچہ قرآن اور سائنس کی مطابقت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ آپ مصدقہ حقائق کی بنیاد پر گفتگو کریں مفروضوں کی بنیاد پر نہیں۔

قرآن سائنس سے بدرجہا برتر ہے۔ لہٰذا جدید سائنس کے ذریعے قرآن کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت جدید سائنس سے فراہم نہیں کر رہا، ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو صرف یہ کرتا ہوں کہ چونکہ ایک مسلمان کے برعکس ایک غیر مسلم اور دہریے کے لیے شاید اصل معیار جدید سائنس ہو لہٰذا میں انھی کے معیار، انھی کے پیمانے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن کی برتری کا ثبوت فراہم کرتا ہوں، تاکہ وہ قرآن پر ایمان لائیں۔

سوال:...... اگر ڈاکٹر کیمبل ان اعتراضات کا جواب دینے سے معذور ہیں جو ڈاکٹر ذاکر نائیک نے پیش کیے ہیں تو کیا وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بائبل میں اغلاط موجود ہیں؟

ڈاکٹر ولیم کیمبل:...... یہ وہی سوال ہے جو پہلے بھی پوچھا جا چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ بائبل میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی وضاحت کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں فوری طور پر ان باتوں کا جواب نہیں دے سکتا لیکن میں انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے ان باتوں کا جواب مل جائے۔ بہت سی باتوں کے حوالے سے بائبل کی حقانیت آثار قدیمہ کی دریافت سے ثابت ہوئی ہے۔ یعنی علاقوں اور بادشاہوں وغیرہ کے حوالے سے بائبل کے بیانات کی حقانیت ثابت ہوئی ہے اور یہ بائبل کی صداقت کا ایک بہترین ثبوت ہے۔

سوال:...... کیا بائبل اور قرآن میں تضادات موجود ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... اس سوال کی مجھے مکمل طور پر سمجھ تو نہیں آئی۔ آپ قرآن کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں یا بائبل کے بارے میں؟ بہر حال میں دونوں سوالات کا جواب دے دیتا ہوں۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا﴾ [النساء: ۸۲]

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔''

لہٰذا قرآن میں تو تضاد کی کوئی ایک بھی مثال موجود نہیں ہے اور جہاں تک سوال ہے بائبل کا تو صورت یہ ہے کہ بائبل کے تضادات گنوانے کے لیے پانچ منٹ کا وقت بہت تھوڑا ہے۔ بلکہ اگر مجھے پانچ دن بھی دے دیے جائیں تو پھر بھی یہ وقت تھوڑا ہے............!!

☆............☆............☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن اور سائنس

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

علیم احمد

ایڈیٹر ماہنامہ گلوبل سائنس، کراچی

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۱۴۲۹ ہجری ۲۰۰۸ء

کتاب : قرآن اور سائنس

مصنف : ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم : مترجم

اہتمام : دارالنوادر، لاہور

مطبع : موٹر وے پریس، لاہور

قیمت : ۴۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ترتیب

تعارف

جب سے اس سیارہ زمین پر نوعِ انسانی کا ظہور ہوا ہے، تب سے انسان نے ہمیشہ یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ نظامِ فطرت (نظامِ قدرت) کیسے کام کرتا ہے، تخلیقات ومخلوقات کے تانے بانے میں اس کا اپنا مقام کیا ہے اور یہ کہ آخر خود زندگی کا کیا مقصد ومصرف ہے۔ سچائی کی اسی تلاش میں، جو صدیوں کی مدت اور متنوع تہذیبوں پر پھیلی ہوئی ہے، منظّم مذاہب نے انسانی طرزِ حیات کی تشکیل کی ہے اور، ایک وسیع تر تناظر میں تاریخ کے دھارے کا تعین بھی کیا ہے۔ بعض مذاہب کی بنیاد تحریر شدہ عبارات وفرمودات پر رہی ہے، جن کے بارے میں ان کے پیروکاروں کا دعویٰ ہے کہ وہ خدائی یا الوہی ذرائع سے ملنے والی تعلیمات کا حاصل ہیں، جبکہ بعض دیگر مذاہب کا دارومدار خالصتاً انسانی تجربے پر رہا ہے۔

قرآن پاک، جو اسلامی عقیدے کا مرکزی ماخذ بھی ہے، ایک ایسی کتاب ہے جسے (اسلام کی) پیروی کرنے والے لوگ، یعنی مسلمان، مکمل طور پر خدائی یا الوہی (یا آسمانی) ذرائع سے نازل شدہ تسلیم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، قرآن پاک کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اس میں رہتی دنیا تک تمام بنی نوع انسان کے لیے ہدایت موجود ہے۔ چونکہ قرآن پاک کا پیغام ہر زمانے، ہر عہد اور ہر دَور کے لوگوں کے لیے ہے، لہٰذا اسے ہر دور کی مطابقت میں ہونا چاہیے۔ لیکن کیا قرآن پاک اس کسوٹی پر پورا اُترتا ہے؟

اس مختصر سی کتاب میں مسلمانوں کے اس عقیدے کا خارجی تجزیہ (Objective analysis) پیش کیا جائے گا جو وہ قرآن پاک کے الہامی ذریعے سے ہونے کے بارے میں رکھتے ہیں۔ اس امر کا جائزہ بطورِ خاص ثابت شدہ سائنسی دریافتوں کی روشنی میں پیش کیا جائے گا۔

انسانی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب ''معجزہ'' یا وہ چیز جو معجزہ تصور کی جاتی تھی،

اپنے زمانے کے انسانی علم، دلیل اور منطق سے آگے ہوا کرتی تھی۔ معجزے کی عمومی تعریف بھی یہی ہے کہ ایسی کوئی چیز جو عام انسانی زندگی کے برخلاف ہو اور جس کی عقلی وضاحت انسان کے پاس نہ ہو۔

تاہم، کسی بھی چیز کو معجزے کے طور پر قبول کرنے سے پہلے ہمیں بہت محتاط ہونا پڑے گا۔ مثلاً ۱۹۹۳ء میں ''ٹائمز آف انڈیا'' بمبئی میں ایک خبر شائع ہوئی، جس میں ''بابا پائلٹ'' نامی ایک سادھو نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ پانی سے بھرے ایک ٹینک میں لگاتار تین دن اور تین راتوں تک زیرآب رہا ہے۔ البتہ جب رپورٹروں نے اُس ٹینک کی تہہ کا جائزہ لینے کی کوشش کی جس میں اس نے یہ ''معجزاتی کارنامہ'' دکھایا تھا تو اس نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ جوابی دلیل کے طور پر اس نے صحافیوں سے یہ کہا کہ کسی کو یہ اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ وہ رحم مادر (Womb) کا تجزیہ کرے کہ جس سے بچہ جنم لیتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ''سادھوجی'' کچھ نہ کچھ چھپانا چاہ رہے تھے! اُن کا یہ دعویٰ محض شہرت حاصل کرنے کی ایک چال تھی۔ یقیناً جدید دور کا کوئی بھی شخص جو معقولیت پسندانہ سوچ (Ratinonal Thinking) کی جانب تھوڑا سا رجحان بھی رکھتا ہوگا، ایسے کسی نام نہاد ''معجزے'' کو قبول نہیں کرے گا۔ اگر ایسے جھوٹے اور بے بنیاد معجزے ہی ''من جانب اللہ'' ہونے کا پیمانہ ہیں تو (نعوذ باللہ) ہمیں دنیا کے سارے مشہور جادوگروں کو جن کی وجہ شہرت ہی ان کے شعبدے اور بصری دھوکے ہیں، خدا کے اصل نمائندوں کے طور پر قبول کرنا پڑے گا۔

ایک ایسی کتاب جس کے آسمانی ذریعے سے نازل شدہ (یعنی من جانب اللہ) ہونے کا دعویٰ کیا جارہا ہے، اسی بنا پر ایک معجزہ ہونے کی دعویدار بھی ہے۔ اس دعوے کو کسی بھی زمانے میں اُسی زمانے کے (عقلی) معیارات کی مطابقت میں باآسانی قابل توثیق (Verifiable) ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری اور حتمی کتاب ہے، جو تمام تر معجزات سے بھی بڑھ کر معجزہ ہے، جسے بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ لہٰذا اب ہم اس عقیدے کی درستگی کا عقلی جائزہ لیتے ہیں۔

قرآن پاک کا چیلنج:

تمام تہذیبوں میں انسانی قوتِ بیان اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے اہم ذرائع میں ادب اور شاعری سرِ فہرست رہے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے زمانے بھی گزرے ہیں جب شاعری اور ادب کو (معاشرے میں) ویسا ہی اعلیٰ وارفع مقام حاصل تھا جیسا کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کو حاصل ہے۔

غیر مسلم ماہرین لسانیات تک کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی ادب کا سب سے بلند پایہ نمونہ قرآن پاک ہی ہے، یعنی اس روئے زمین پر عربی ادب کی بہترین سے بھی کہیں بڑھ کر بہترین مثال صرف قرآن پاک ہے۔ نوعِ انسانی کو قرآن پاک کا چیلنج ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی کے ہم پلہ کچھ بنا کر دکھائے۔

﴿ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲، آیت ۲۳ تا ۲۴)

"اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہو کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اُتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر دکھاؤ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔ جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔"

قرآن پاک واضح الفاظ میں (تمام انسانوں کو) چیلنج کر رہا ہے کہ وہ ویسی ہی ایک سورۃ بنا کر تو دکھائیں جیسی کہ قرآن پاک میں موجود ہیں یہ چیلنج قرآن پاک میں کئی مقامات پر دیا گیا ہے۔ صرف ایک ایسی سورۃ بنانے کا چیلنج، جو اپنی خوبصورتی، خوش بیانی، معانی کی وسعت

اور فکر کی گہرائی میں قرآن پاک کی برابری کر سکے، آج تک پورا نہیں کیا جا سکا ہے۔

تاہم جدید دور کا معقولیت پسند آدمی ایسے کسی مذہبی صحیفے کو قبول نہیں کرے گا، جو بہترین ادبی و شاعرانہ زبان استعمال کرنے کے باوجود یہ کہتا ہو کہ زمین چپٹی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم ایک ایسے زمانے میں جی رہے ہیں جہاں انسان کے عقلی دلائل، منطق اور سائنس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو قرآن پاک کے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں اس کی غیر معمولی اور بلند پایہ ادبی زبان کو بطور ثبوت کافی خیال نہیں کریں گے۔ کوئی بھی ایسا صحیفہ، جو آسمانی (اللہ کی طرف سے) ہونے کا دعویدار ہو، اسے اپنے دلائل اور منطقی استدلال کی مضبوطی کی بنیاد پر بھی قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

مشہور ماہر طبیعیات اور نوبل انعام یافتہ سائنسدان البرٹ آئن اسٹائن کے بقول ''مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے۔ سائنس کے بغیر مذہب اندھا ہے۔'' لہٰذا اب ہم قرآن پاک کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا جدید سائنس اور قرآن پاک میں باہمی مطابقت ہے یا عدم مطابقت؟

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قران پاک کوئی سائنسی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ یہ ''نشانیوں'' (Signs) کی کتاب ہے۔ یعنی آیات کی کتاب ہے۔ قرآن پاک میں چھ ہزار سے زاید ''نشانیاں'' (آیات) ہیں، جن میں ایک ہزار سے زاید خالصتاً سائنس سے (یعنی سائنسی موضوعات سے) بحث کرتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ کئی مواقع پر سائنس ''یوٹرن'' لیتی ہے (یعنی سابقہ مؤقف کے بالکل اُلٹ بات کہنے لگتی ہے) لہٰذا میں نے اس کتاب میں صرف اور صرف تسلیم شدہ (ثابت شدہ) سائنسی حقائق ہی کو منتخب کیا ہے جب کہ ایسے تصورات ونظریات پر بات نہیں کی ہے جو محض مفروضات ہوں یا جن کی پشت پر کوئی (سائنسی) ثبوت نہ ہو۔

فلکیات

کائنات کی تخلیق: ''بگ بینگ''

فلکی طبیعیات کے ماہرین ابتدائے کائنات کی وضاحت ایک ایسے مظ
(Phenomenon) کے ذریعے کرتے ہیں جسے وسیع طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ اور جس
جانا پہچانا نام ''بگ بینگ'' (Big Bang) ہے۔ بگ بینگ کے ثبوت میں گزشتہ کئی عشرو ا
کے دوران مشاہدات و تجربات کے ذریعے ماہرین فلکیات و فلکی طبیعیات کی جمع کردہ معلوما
موجود ہیں۔ بگ بینگ نظریے کے مطابق ابتدا میں یہ ساری کائنات ایک بڑی کمیت
(Primary Nebula) کی شکل میں تھی۔ پھر ایک عظیم دھماکہ یعنی ''بگ بینگ
(Secondary Separation) ہوا جس کا نتیجہ کہکشاؤں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ پھر
کہکشائیں تقسیم ہو کر ستاروں، سیاروں، سورج، چاند وغیرہ کی صورت میں آئیں۔ کائنات ک
ابتداء اس قدر منفرد اور اچھوتی تھی کہ ''اتفاق'' (Chance) سے اس کے وجود میں آنے
احتمال (Probability) صفر (کچھ بھی نہیں) تھا۔

قرآن پاک کی درج ذیل آیات میں ابتدائے کائنات کے متعلق بتایا گیا ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۱ آیت ۳۰)

''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا۔''

اس قرآنی آیت اور ''بگ بینگ'' کے درمیان حیرت انگیز مماثلت سے انکار ممکن ہی

نہیں! یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کتاب جو آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے عرب کے ریگستانوں میں ظاہر ہوئی، اپنے اندر ایسی غیر معمولی سائنسی حقیقت لیے ہوئے ہو؟

کہکشاؤں کی تخلیق سے پہلے، ابتدائی گیسی کمیت

سائنسدان اس پر متفق ہیں کہ کائنات میں کہکشائیں بننے سے بھی پہلے، کائنات کا سارا مادہ ایک ابتدائی گیسی حالت میں تھا، مختصر یہ کہ کہکشاؤں کی تشکیل سے پہلے، وسیع و عریض (گیسی) بادلوں کی شکل میں وہ مادہ موجود تھا جسے کہکشاؤں کی شکل میں آنا تھا۔ اس ابتدائی کائناتی مادے کی وضاحت میں گیس سے زیادہ موزوں لفظ ''دھواں'' ہے۔ درج ذیل آیت قرآن میں کائنات کی اسی حالت کا حوالہ ''دخان'' یعنی دھوئیں کا لفظ استعمال کر کے دیا گیا ہے۔

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴾

(القرآن: سورۃ ۴۱، آیت ۱۱)

''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا، اس نے آسمان اور زمین سے کہا: ''وجود میں آ جاؤ، خواہ تم چاہو، یا نہ چاہو'' دونوں نے کہا: ہم آ گئے فرماں برداروں کی طرح۔''

ایک بار پھر، یہ حقیقت بھی ''بگ بینگ'' کی عین مطابقت میں ہے جس کے بارے میں حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت سے پہلے کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ (بگ بینگ کا نظریہ بیسویں صدی کی یعنی عہدِ نبویؐ کے ۱۳۰۰ سال بعد کی پیداوار ہے، مترجم) اگر اس زمانے میں کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا تو پھر اس علم کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟

زمین کی کروی (گولا نمایا Spherical) ساخت

ابتدائی زمانوں کے لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں تک انسان صرف اسی وجہ سے دُور دراز کا سفر کرنے سے خوفزدہ رہا کہ کہیں وہ زمین کے

کناروں سے گر نہ پڑے! سر فرانسس ڈریک وہ پہلا آدمی تھا جس نے ۱۵۹۷ء میں زمین کے گرد (سمندر کے راستے) چکر لگایا اور عملاً یہ ثابت کیا کہ زمین گول (کروی) ہے۔

یہ نکتہ ذہن میں رکھتے ہوئے ذرا درج ذیل قرآنی آیت پر غور فرمایئے جو دن اور رات کے آنے اور جانے سے متعلق ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۱، آیت ۲۹)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔''

یہاں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کے بتدریج دن میں ڈھلنے، اور دن کے بتدریج رات میں ڈھلنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب زمین کی ساخت کسی گولے جیسی یعنی کروی ہو۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو دن کی رات میں یا رات کی دن میں تبدیلی بالکل اچانک ہوتی۔ ذیل میں ایک اور آیت مبارک ملاحظہ ہو۔ اس میں بھی زمین کی کروی ساخت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۹، آیت ۵)

''اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔''

یہاں استعمال کیے گئے عربی لفظ ''کوّر'' کا مطلب ہے کسی ایک چیز کو دوسری پر منطبق (Overlap) کرنا یا (ایک چیز کو دوسری چیز پر) چکر دے کر (کوائل کی طرح) باندھنا دن اور رات کو ایک دوسرے پر منطبق کرنا یا ایک دوسرے پر چکر دینا صرف اسی وقت ممکن ہے جب زمین کی ساخت کروی ہو۔

زمین کسی گیند کی طرح بالکل ہی گول نہیں بلکہ ''ارضی کروی'' (Geo-Sperical)

ہے، یعنی قطبین (Poles) پر سے تھوڑی سے پچکی ہوئی ہے۔ درج ذیل آیت مبارک میں زمین کی ساخت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے:

﴿ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴾ (القرآن: سورۃ۷۹، آیت ۳۰)

''اور پھر زمین کو اس نے بچھایا۔''

یہاں عربی عبارت '' دَحٰهَا'' استعمال ہوئی ہے جس کا مطلب ہے ''شتر مرغ کا انڈا'' شتر مرغ کے انڈے کی شکل، زمین کی ارضی کروی ساخت ہی سے مشابہت رکھتی ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ قرآن پاک میں زمین کی ساخت بالکل ٹھیک بیان کی گئی ہے، حالانکہ نزولِ قرآنِ پاک کے وقت مقبول عام تصور یہی تھا کہ زمین چپٹی ہے۔

چاند کی روشنی، منعکس شدہ روشنی ہے

قدیم تہذیبوں میں یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ چاند اپنی روشنی خود خارج کرتا ہے (یعنی از خود روشن ہے) سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ چاند کی روشنی، منعکس شدہ روشنی ہے۔ تاہم یہ حقیقت آج سے چودہ سو سال پہلے، قرآن پاک کی درج ذیل آیت مبارکہ میں بیان کر دی گئی ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴾ (القرآن، سورۃ ، ۲۵، آیت ۶۱)

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

قرآن پاک میں سورج کے لیے عربی لفظ ''شمس'' استعمال ہوا ہے۔ البتہ اسے (سورج کو) ''سراج'' بھی کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے مشعل (ٹارچ) جب کہ بعض مواقع پر اسے ''وہاج'' بمعنی جلتا ہوا چراغ یا جلتا ہوا دیا کے الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے جس کا مفہوم ''چمکتی ہوئی شان و عظمت'' ہے مذکورہ تینوں وضاحتیں سورج کے لیے بالکل مناسب ہیں کیونکہ اس کے اندر احتراق (Combustion) کا زبردست عمل ہر وقت جاری رہنے کی وجہ سے شدید حرارت اور روشنی خارج ہوتی رہتی ہے۔

چاند کے لیے قرآن پاک میں عربی لفظ ''قمر'' استعمال کیا گیا ہے اور اسے بطور ''منیر'' بیان کیا گیا ہے ایک ایسا جسم جو ''نور'' دیتا ہو۔یعنی منعکس شدہ روشنی دیتا ہو۔ایک بار پھر، قرآن پاک کی پیش کردہ وضاحت چاند کی اصل نوعیت سے پوری طرح میل کھاتی ہے کیونکہ، بلاشبہ، چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہے بلکہ یہ سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے، اور ہمیں روشن دکھائی دیتا ہے،قرآن پاک میں ایک مرتبہ بھی چاند کے لیے سراج، وہاج یا دیا جیسے الفاظ استعمال نہیں ہوئے اور نہ ہی سورج کو نور یا منیر کہا گیا ہے،اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں سورج اور چاند کی روشنی کے درمیان بہت واضح فرق رکھا گیا ہے جو قرآن پاک میں آیات مبارکہ کے مطالعے سے واضح طور پر نظر آتا ہے۔

درج ذیل آیات میں سورج اور چاند کی روشنی کا فرق دیکھا جاسکتا ہے:

﴿ هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا ﴾

(القرآن:سورة ۱۰ ، آیت، ۵)

''وہی ہے جس نے سورج کو اُجالا بنایا اور چاند کو چمک دی۔''

﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴾(القرآن:سورة ۷۱ ، آیات ۱۵ تا ۱۶)

''کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ برتہہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔''

اِن آیات مبارکہ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن عظیم اور جدید سائنس میں دھوپ اور چاندنی کی ماہیت کے بارے میں مکمل اتفاق رائے ہے۔

سورج گھومتا ہے

ایک لمبے عرصے تک یورپی فلسفیوں اور سائنس دانوں کا یقین یہ رہا کہ زمین، کائنات مرکز میں ساکن کھڑی ہے اور سورج سمیت، کائنات کی ہر چیز اس کے گرد چکر لگا رہی ہے یہ نظریہ جسے ارض ساکن یا ''ارض مرکزی نظریہ'' (جیو سینٹرک تھیوری) بھی کہا جاتا ہے، بطلیموس

کے زمانے (دوسری صدی قبل از مسیح) سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک سب سے زیادہ تسلیم کیا جانے والا ''سائنسی نظریہ'' رہا۔ پھر ۱۵۱۲ء میں نکولس کوپرنیکس نے سیاروی حرکت کا شمس مرکزی نظریہ (Heliocentric Theory of Planetary Motion) پیش کیا، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ سورج، نظامِ شمسی کے مرکز میں ساکن ہے اور تمام سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ۱۶۰۹ء میں ایک جرمن سائنسدان، جوہانس کیپلر نے ''آسٹرونومیا نووا'' کے نام سے ایک کتاب شائع کروائی۔ اس کتاب میں کیپلر نے صرف یہی ثابت نہیں کیا کہ نظامِ شمسی کے سیارے بیضہ نما (Elliptical) مداروں میں سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ بلکہ اس نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ سیارے اپنے اپنے محوروں (Axes) پر غیر مستقل نوعیت کی رفتاروں سے گردش بھی کرتے ہیں۔ اس علم کی بدولت یورپی سائنسدانوں کے لیے نظامِ شمسی کے کئی ایک نظاموں کی درست وضاحت کرنی ممکن ہوگئی۔ بشمول رات اور دن کے تسلسل کے، ان دریافتوں کے بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ سورج ساکن ہے اور زمین کی طرح اپنے محور پر گردش نہیں کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے اسکول کے دنوں میں جغرافیہ کی کئی ایک کتابوں میں اسی غلط فہمی کا پرچار کیا گیا تھا۔ اب ذرا قرآن پاک کی درج ذیل آیت مبارکہ ملاحظہ فرمایئے:

﴿ وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۱، آیت ۳۳)

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

غور فرمایئے کہ مذکورہ بالا آیت میں عربی لفظ '' یَسْبَحُوْنَ '' استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ بذاتِ خود ''سبحا'' سے ماخوذ ہے، جس کے ساتھ ایک ایسی حرکت کا تصور وابستہ ہے جو کسی جسم کے متحرک ہونے سے پیدا ہوئی ہو۔ اگر آپ یہ لفظ زمین پر کسی شخص کے لیے استعمال کریں گے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ لڑھک رہا ہے۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ شخص دوڑ رہا ہے یا چل رہا ہے۔ اگر یہ لفظ پانی میں کسی شخص کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا

مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ (پانی پر) تیر رہا ہے بلکہ اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ شخص پانی میں تیراکی (Swimming) کر رہا ہے۔

اسی طرح جب آپ یہ لفظ " یُسبِح "کسی آسمانی جسم (جرم فلکی) سورج کے لیے استعمال کریں گے تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہوگا کہ وہ جسم خلا میں حرکت کر رہا ہے، بلکہ اس کا پورا مطلب کوئی ایسا جسم ہوگا جو خلا میں حرکت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے محور پر بھی گھوم رہا ہے۔آج اسکولوں کی بیشتر نصابی کتابوں نے اپنی معلومات درست کرتے ہوئے یہ حقیقت شامل کر لی ہے۔کہ سورج اپنے محور پر گردش بھی کر رہا ہے۔سورج کی محوری گردش کی تصدیق کسی ایسے مشاہداتی سازوسامان کی مدد سے بہ آسانی کی جاسکتی ہے جو سورج کا عکس کسی میز جتنی بڑی جگہ پر پھیلا کر دکھا سکے، اسی طرح نابینا پن کے خطرے سے دوچار ہوئے بغیر سورج کے عکس کا مشاہدہ کیا جاسکے گا۔یہ دیکھا گیا ہے کہ سورج کی سطح پر دھبے ہیں جو اپنا ایک چکر تقریباً پچیس دن میں مکمل کر لیتے ہیں۔مطلب یہ کہ سورج کو اپنے محور کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں تقریباً پچیس دن لگ جاتے ہیں۔علاوہ ازیں سورج تقریباً ۲۴۰ کلومیٹر فی سیکنڈ (جی ہاں! ۲۴۰ کلومیٹر فی سیکنڈ) کی رفتار سے (اپنے سیاروں سمیت) خلا میں سفر کر رہا ہے۔ اس رفتار سے یہ تقریباً بیس کروڑ سال میں ہماری ملکی وے کہکشاں کے مرکز کے گرد اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔

﴿ لاَ الشَّمْسُ يَنۢبَغِي لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلاَ الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۶ ، آیت ۴۰)

”نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے یہ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔“

یہ آیت مبارکہ ایک ایسی بنیادی اور اہم حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے جسے جدید فلکیات نے قدرے حال ہی میں دریافت کیا ہے، یعنی چاند اور سورج کے انفرادی مداروں (Orbits) کی موجودگی اور حرکت کرتے ہوئے خلا میں ان کا سفر کرنا۔

وہ ''ساکن جگہ'' (Fixed Place) جس کی سمت ہمارا سورج اپنے تمام تر نظام (نظام شمسی) سمیت عازمِ سفر ہے۔ جدید فلکیات کی بدولت ٹھیک شناخت کر لی گئی ہے۔ اسے ''سولر اپیکس'' کا نام دیا گیا ہے پورا نظام شمسی درحقیقت خلا میں اس مقام کی سمت حرکت کر رہا ہے۔ جو ہرکولیس نامی برج (ایلفا لیرائی) میں واقع ہے اور جس کی درست جگہ آج ہمیں معلوم ہو چکی ہے۔

چاند اپنے محور پر اتنی ہی مدت میں گردش پوری کرتا ہے کہ جتنی دیر میں وہ زمین کے گرد ایک چکر پورا کرتا ہے۔ چاند کو اپنی ایک محوری گردش پوری کرنے میں تقریباً ۲۹،۵ دن لگ جاتے ہیں۔ قرآن پاک کی آیات مبارکہ میں سائنسی حقائق کی درستگی پر حیران ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ کیا ہمارے ذہنوں میں یہ سوال مچل نہیں اٹھتا، ''قرآن میں پیش کیے گئے علم کا ماخذ، علم کا منبع آخر کیا ہے؟''

سورج بجھ جائے گا

سورج کی روشنی ایک کیمیائی عمل کی مرہونِ منت ہے جو اس کی سطح پر گذشتہ پانچ ارب سال سے جاری ہے۔ مستقبل میں کسی موقع پر یہ عمل رک جائے گا، اور تب سورج مکمل طور پر بجھ جائے گا جس کی وجہ سے زمین پر زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ سورج کے وجود کی بے ثباتی کے بارے میں قرآن پاک فرماتا ہے:

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۶، آیت ۳۸)

''اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔''

(نوٹ: کم وبیش اسی نوعیت کی باتیں قرآن پاک کی سورۃ ۱۳، آیت ۲؛ سورۃ ۳۵ آیت ۱۳؛ سورۃ ۳۹، آیت ۵؛ اور سورۃ ۳۹، آیت ۲۱ میں بھی بیان کی گئی ہیں۔) یہاں عربی لفظ ''مستقر'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے پہلے سے متعین کیا ہوا وقت یا جگہ یعنی اس آیت

مبارکہ میں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہا ہے کہ سورج پہلے سے طے شدہ ایک مقام کی طرف جارہا ہے اور یہ کہ وہ ایسا پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق ہی کرے گا۔ مطلب یہ کہ سورج بھی ختم ہو جائے گا، یا بجھ جائے گا۔

بین النجمی مادہ

پچھلے زمانوں میں منظم فلکیاتی نظاموں سے باہر کی خلا (بیرونی خلا) کو مکمل طور پر "خالی خلا" (Vacum) تصور کیا جاتا تھا بعدازاں ماہرین فلکی طبیعیات نے اسی خالی خلا یعنی بین النجمی خلا میں مادے کے پل (Bridges) دریافت کیے، مادے کے ان "پلوں" کو پلازما (Plasma) کہا جاتا ہے جو مکمل طور پر آئن شدہ (Ionized) گیس پر مشتمل ہوتے ہیں جس میں مثبت چارج والے آئن اور آزاد الیکٹرونوں کی مساوی تعداد ہوتی ہے۔ مادے کی تین جانی پہچانی حالتوں، یعنی ٹھوس، مائع اور گیس کو چھوڑ کر پلازما کو بسا اوقات مادے کی "چوتھی حالت" بھی کہا جاتا ہے۔ درج ذیل آیات مبارکہ میں قرآنِ پاک بین النجمی مادے (انٹر اسٹیلر میٹریل) کی جانب اشارہ کرتا ہے:

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۹)

"وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمان اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں۔"

کسی کے لیے بطور قیاس بھی یہ کہنا مضحکہ خیز ہوگا کہ بین النجمی کہکشانی مادے کی موجودگی آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے ہمارے علم میں تھی۔

پھیلتی ہوئی کائنات

۱۹۲۵ء میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے اس امر کا مشاہداتی ثبوت فراہم کیا کہ تمام کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہٹ رہی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ کائنات پھیل رہی ہے یہ بات آج مسلمہ سائنسی حقائق میں شامل ہے ملاحظہ فرمایے کہ

قرآنِ پاک میں کائنات کی ماہیت کے حوالے سے کیا ارشاد ہوا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴾

(القرآن: سورۃ ۵۱، آیت ۴۷)

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں (یا اسے وسعت دے رہے ہیں)''

عربی لفظ ''واسعون'' کا صحیح ترجمہ ''اسے پھیلا رہے ہیں'' بنتا ہے اور یہ ایک ایسی کائنات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی وسعتیں مسلسل پھیلتی جا رہی ہوں۔

عصرِ حاضر کا مشہور ترین فلکی طبیعیات داں اسٹیفن ہاکنگ اپنی تصنیف ''اے بریف ہسٹری آف ٹائم'' میں لکھتا ہے: ''یہ دریافت کہ کائنات پھیل رہی ہے، بیسویں صدی کے عظیم علمی وفکری انقلابات میں سے ایک ہے'' غور فرمایے کہ قرآن پاک نے کائنات کے پھیلنے کو اس وقت بیان فرما دیا ہے جب انسان نے دوربین تک ایجاد نہیں کی تھی! اس کے باوجود، متشکک ذہن رکھنے والے بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں فلکیاتی حقائق کا موجود ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں، کیونکہ عرب اس علم میں بہت ماہر تھے۔ فلکیات میں عربوں کی مہارت کی حد تک تو اُن کا خیال درست ہے لیکن اس نکتے کا ادراک کرنے میں وہ ناکام ہو چکے ہیں کہ فلکیات میں عربوں کے عروج سے بھی صدیوں پہلے ہی قرآنِ پاک کا نزول ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں، اوپر بیان کردہ بہت سے سائنسی حقائق، مثلاً بگ بینگ، سے کائنات کی ابتدا وغیرہ سے تو عرب اُس وقت بھی واقف نہیں تھے جب وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے عروج پر تھے۔ لہٰذا قرآنِ پاک میں بیان کردہ سائنسی حقائق کسی بھی طرح سے فلکیات میں عربوں کی مہارت کا نتیجہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ درحقیقت اس کے برعکس بات سچ ہے، عربوں نے فلکیات میں اس لیے ترقی کی کیونکہ فلکیاتی وکونیاتی مباحث کو قرآنِ پاک میں اہم مقام دیا گیا ہے۔

طبیعیات

ایٹم بھی تقسیم کیے جاسکتے ہیں:

قدیم زمانوں میں ''ایٹم ازم (Atomism) کا نظریہ'' کے عنوان سے ایک مشہور نظریے کو وسیع پیانے پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ نظریہ یونانیوں نے بالخصوص دیموقریطس نامی ایک یونانی فلسفی نے پیش کیا تھا، جو آج سے ۲۳ صدیاں پہلے (۲۳۰۰ سال پہلے) گزرا ہے۔ دیموقریطس اور بعدازاں اس کے ہم خیال لوگوں کا یہ تصور تھا کہ مادے کا مختصر ترین یونٹ (اکائی) ایٹم ہے۔ قدیم عرب بھی اسی تصور کو تسلیم کیا کرتے تھے۔ عربی لفظ ''ذرّہ'' کا عمومی مفہوم وہی ہوا کرتا تھا جو یونانیوں کے یہاں ایٹم کا تھا۔ حالیہ تاریخ ہی میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ ایٹم تک کو تقسیم کرنا (شق کرنا) ممکن ہے۔ ایٹم کے قابلِ تقسیم ہونے کا تصور بھی بیسویں صدی کی سائنسی پیش رفت میں شامل ہے۔ چودہ صدیاں پہلے خود عربوں کے لیے بھی یہ تصور نہایت غیر معمولی ہوتا۔ ان کے نزدیک ''ذرّہ'' وہ حد تھی جس سے آگے مزید تقسیم ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن درج ذیل آیت مبارکہ میں قرآنِ پاک نے واضح طور پر اس حد کو ماننے سے انکار کیا ہے:

﴿ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَ لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۴، آیت ۳)

''منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے، کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آ کر رہے گی۔ اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ

آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں۔ نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی۔ یہ سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے۔"

(نوٹ: اسی طرح کا پیغام قرآن پاک کی سورۃ ۱۰، آیت ۶۱ میں بھی دیا گیا ہے۔)

یہ آیتِ مبارکہ ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے عالم الغیب ہونے، یعنی ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز سے باخبر ہونے کے بارے میں بتاتی ہے۔ پھر یہ مزید آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے، چاہے وہ ایٹم سے چھوٹی یا بڑی ہی کیوں نہ ہو۔ تو ثابت ہوا کہ یہ آیتِ مبارکہ واضح طور پر بتاتی ہے کہ ایٹم سے مختصر اشیا بھی وجود رکھتی ہے...... اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو حال ہی میں جدید سائنس نے دریافت کی ہے۔

آبیات

پانی کا چکر (آبی چکر)

آج ہم جس تصور کو ''آبی چکر'' (واٹر سائیکل) کے نام سے جانتے ہیں، اسے پہلے پہل ۱۵۸۰ء میں برنارڈ پیلیسی نامی ایک شخص نے پیش کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ سمندروں سے کس طرح پانی کی تبخیر (Evaporation) ہوتی ہے اور کس طرح وہ سرد ہو کر بادلوں کی شکل میں آتا ہے۔ پھر یہ بادل خشکی پر آگے کی طرف بڑھتے ہیں، بلند تر ہوتے ہیں، ان میں پانی کی تکثیف (Condensation) ہوتی ہے اور بارش برستی ہے۔ یہ پانی جھیلوں، جھرنوں، ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں آتا ہے اور بہتا ہوا واپس سمندر میں چلا جاتا ہے اس طرح پانی کا یہ چکر جاری رہتا ہے۔ ساتویں صدی قبل از مسیح میں تھیلو نامی ایک یونانی فلسفی کو یقین تھا کہ سطح سمندر پر باریک باریک آبی قطروں کی پھوار (اسپرے) پیدا ہوتی ہے نیز ہوا اسی پھوار کو اُٹھا لیتی ہے اور خشکی کے دور افتادہ علاقوں پر لے جا کر برسا دیتی ہے۔ یہی بارش ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں، پرانے وقتوں میں لوگ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ زیرِ زمین پانی کا ماخذ کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہوا کی زبردست قوت کے زیرِ اثر سمندر کا پانی براعظموں (خشکی) میں اندرونی حصوں تک در آتا ہے۔ انہیں یہ یقین بھی تھا کہ پانی ایک خفیہ راستے یا ''عظیم تاریکی'' (Greet Abyss) سے آتا ہے، سمندر سے ملا ہوا یہ تصوراتی راستہ افلاطون کے زمانے سے ''ٹارٹارس'' کہلاتا تھا، حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے عظیم مفکر، ڈیکارتے (Descartes) نے بھی انہی خیالات سے اتفاق کیا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی تک ارسطو کا نظریہ ہی زیادہ مقبول و معروف رہا۔ اس نظریے کے مطابق، پہاڑوں کے سرد غاروں میں پانی کی تکثیف (Condensation) ہوتی ہے اور وہ

زیرِ زمین جھیلیں بناتا ہے جو چشموں کا باعث بنتی ہیں۔ آج ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ بارش کا پانی زمین پر موجود دراڑوں کے راستے رِس رِس کر زیرِ زمین پہنچتا ہے اور چشموں کی وجہ بنتا ہے، درج ذیل آیاتِ قرآنی میں اس نکتے کی وضاحت فرمائی گئی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۹، آیت ۲۱)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔''

﴿ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۰ آیت ۲۴)

''آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۳، آیت ۱۸)

''اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔''

کوئی دوسری کتاب، جو ۱۴۰۰ سال قدیم ہو، آبی چکر کی اتنی درست وضاحت بیان نہیں کرتی۔

تبخیر (Evaporation)

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۸۶، آیت ۱۱)

''قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی۔''

بادلوں کو بار آور (Impregnate) کرتی ہوائیں

﴿ وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۵، آیت ۲۲)

"اور ہم ہی ہواؤں کو بار آور بنا کر چلاتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے اور تم کو اس سے سیراب کرتے ہیں۔"

یہاں عربی لفظ "لواقح" استعمال کیا گیا ہے، جو "لاقح" کی جمع ہے اور "لاقحہ" سے مشتق ہے، جس کا مطلب "بار آور" کرنا یا "بھر دینا" ہے، اسی سیاق وسباق میں، بار آور سے مراد یہ ہے کہ ہوا، بادلوں کو (ایک دوسرے کے) قریب دھکیلتی ہے جس کی وجہ سے ان پر تکثیف کا عمل بڑھتا ہے جس کا نتیجہ بجلی چمکنے اور بارش ہونے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی توضیحات، قرآنِ پاک کی دیگر آیات مبارکہ میں بھی موجود ہیں:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۴، آیت ۴۳)

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے اور پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں اور وہ آسمان سے ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں اولے برساتا ہے پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچا لیتا ہے اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔"

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ

مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۰، آیت ۴۸)

''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اُٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے، جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش وخرم ہو جاتے ہیں۔''

آبیات (ہائیڈرولوجی) پر دستیاب، جدید معلومات بھی قرآنِ پاک میں بیان کردہ متعلقہ وضاحتوں کی پوری طرح تائید کرتی ہیں۔ قرآنِ عظیم کی متعدد آیات مبارکہ میں آبی چکر کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

مثلاً ملاحظہ ہوں: سورۃ ۷، آیت، ۵۷؛ سورۃ ۱۳، آیت ۱۷؛ سورۃ ۲۵، آیات ۴۸ تا ۴۹ ؛ سورۃ ۳۵، آیت ۹؛ سورۃ، ۳، آیت ۳۴؛ سورۃ ۴۵، آیت ۵؛ سورۃ ۵۰؛ آیات ۹ تا ۱۱؛ سورۃ ۵۶، آیات ۶۸ تا ۷۰؛ اور سورۃ ۶۷، آیت ۳۰.
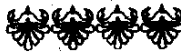
ارضیات

خیموں کی میخوں کی مانند پہاڑ:

ارضیات میں ''بل پڑنے'' (Folding) کا مظہر حالیہ دریافت شدہ حقیقت ہے۔ قشرِ ارض (Crust) میں بل پڑنے ہی کی وجہ سے پہاڑی سلسلے وجود میں آئے ہیں۔ قشرِ ارض، جس پر ہم رہتے ہیں، کسی ٹھوس چھلکے کی طرح ہے، جب کہ کرہ زمین کی اندرونی پرتیں، (Layers) نہایت گرم اور مائع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کا اندرون کسی بھی قسم کی زندگی کے لیے قطعاً غیر موزوں ہے۔ آج ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ پہاڑوں کی قیام پذیری (Stability) کا تعلق، قشرِ ارض میں بل پڑنے کے عمل سے بہت گہرا ہے، کیونکہ یہ قشرِ ارض پر پڑنے والے بل (Folds) ہی ہیں جو پہاڑوں کا کام کرتے ہیں۔

ماہرین ارضیات کا کہنا ہے کہ زمین کا رداس (Radius) یعنی نصف قطر تقریباً ۶،۰۳۵ کلومیٹر ہے اور قشرِ ارض، جس پر ہم رہتے ہیں، اس کے مقابلے میں بہت ہی پتلی ہے، جس کی موٹائی ۲ کلومیٹر سے لے کر ۳۵ کلومیٹر تک ہے۔ چونکہ قشرِ ارض بہت پتلی ہے، لہٰذا اس کے تھرتھرانے یا ہلنے کا امکان بھی بہت قوی ہے، ایسے میں پہاڑ کسی خیمے کی میخوں کی طرح کام کرتے ہیں جو قشرِ ارض کو تھام لیتے ہیں اور اسے قیام پذیری عطا کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی عین یہی کہا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًاo وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴾

(القرآن: سورۃ ۷۸، آیات ۶ تا ۷)

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔''

یہاں عربی لفظ ''اوتاد'' کا مطلب بھی میخیں ہی نکلتا ہے، ویسی ہی میخیں جیسی کہ خیمے کو باندھے رکھنے کے لیے لگائی جاتی ہیں۔ ارضیاتی بلوں، (Folds) یا سلوٹوں کی گہری پوشیدہ بنیادیں بھی یہی ہیں۔

Earth نام کی ایک کتاب ہے جو دنیا بھر کی کئی جامعات میں ارضیات کی بنیادی حوالہ جاتی نصابی کتاب کا درجہ بھی رکھتی ہے، اس کتاب کے مصنفین میں ایک نام ڈاکٹر فرینک پریس کا بھی ہے، جو ۱۲ سال تک امریکہ کی اکیڈمی آف سائنسز کے سربراہ رہے ہیں جبکہ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے زمانے میں صدارتی مشیر برائے سائنس بھی تھے اس کتاب میں وہ پہاڑوں کی وضاحت، کلہاڑی کے پھل جیسی شکل (Wedge Shape) سے کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پہاڑ بذاتِ خود ایک وسیع تر وجود کا ایک چھوٹا حصہ ہوتا ہے۔ جس کی جڑیں زمین میں بہت گہرائی تک اُتری ہوتی ہیں۔

(ملاحظہ ہو: Earth از: پریس اور سلور، صفحہ ۴۳۵ مزید دیکھیے: Earth Science از: ٹاربک اور لٹلکنز، صفحہ ۱۵۷)

ڈاکٹر فرینک پریس کے مطابق، قشرِ ارض کی پائیداری اور قیام پذیری میں پہاڑ نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

پہاڑوں کے کاموں کی وضاحت کرتے ہوئے، قرآن پاک واضح طور پر یہ فرماتا ہے کہ انہیں اس لیے بنایا گیا ہے تا کہ یہ زمین کو لرزتے رہنے سے بچائیں:

﴿ وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَبِهِمْ ﴾

(القرآن: سورۃ ۲۱، آیت ۳۱)

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تا کہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔''

اسی طرح کے ارشادات سورۃ ۳۱، آیت ۱۰؛ اور سورۃ ۱۶، آیت ۱۵ میں بھی وارد ہوئے ہیں، لہٰذا قرآنِ پاک کے فراہم کردہ بیانات جدید ارضیاتی معلومات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔

پہاڑوں کومضبوطی سے جما دیا گیا ہے

سطح زمین متعدد ٹھوس ٹکڑوں، یعنی ''پلیٹوں'' میں ٹوٹی ہوئی ہے جن کی اوسط موٹائی تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر ہے۔ یہ پلیٹیں، جزوی طور پر پگھلے ہوئے حصے کے اوپر گویا تیر رہی ہیں، اس حصے کو (Aesthenosphere) کہا جاتا ہے۔ پہاڑ عموماً پلیٹوں کی بیرونی حدود پر پائے جاتے ہیں۔ قشرِ ارض، سمندروں کے نیچے ۵ کلومیٹر موٹی ہوتی ہے، جب کہ خشکی پر اس کی اوسط موٹائی ۳۵ کلومیٹر تک ہوتی ہے البتہ پہاڑی سلسلوں میں قشرِ ارض کی موٹائی ۸۰ کلومیٹر تک جا پہنچتی ہے، یہی وہ مضبوط بنیادیں ہیں جن پر پہاڑ کھڑے ہیں۔ پہاڑوں کی مضبوط بنیادوں کے بارے میں قرآنِ پاک نے درج ذیل آیت مبارکہ میں کچھ یوں بیان فرمایا ہے:

﴿ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۹، آیت ۳۲)

''اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے۔''

اسی طرح کا پیغام سورۃ ۸۸، آیت ۱۹ میں بھی دیا گیا ہے۔ پس، یہ ثابت ہوا کہ قرآن پاک میں پہاڑوں کی ماہیئت اور نوعیت کے بارے میں دی گئی معلومات بھی پوری طرح دورِ جدید کی ارضیاتی دریافتوں سے ہم آہنگ ہیں۔

بحریات

میٹھے اور نمکین پانیوں کے درمیان ''آڑ''

﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ٥ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۵۵، آیت ۱۹ تا ۲۰)

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان آیات مبارکہ کے عربی متن میں لفظ ''برزخ'' استعمال ہوا جس کا مطلب رکاوٹ یا آڑ (پارٹیشن) ہے۔ تاہم اسی تسلسل میں ایک اور عربی لفظ ''مرج'' بھی وارد ہوا ہے۔ جس کا مطلب ''وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے اور آپس میں ہم آمیز ہوتے ہیں'' بنتا ہے۔ ابتدائی ادوار کے مفسرین قرآن کے لیے یہ وضاحت کرنا بہت مشکل تھا کہ پانی کے دو مختلف اجسام سے متعلق دو متضاد مفاہیم سے کیا مراد ہے۔ مطلب یہ کہ دو طرح کے پانی ہیں جو آپس میں ملتے بھی ہیں اور ان کے درمیان آڑ (رکاوٹ) بھی ہے۔ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ جہاں جہاں دو مختلف بحیرے (Seas) آپس میں ملتے ہیں، وہاں وہاں ان کے درمیان ''آڑ'' بھی ہوتی ہے۔ دو بحیروں کو تقسیم کرنے والی رکاوٹ یہ ہے کہ ان میں سے ایک بحیرہ کا درجہ حرارت، شوریدگی (Salinity) اور کثافت دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

(بحوالہ: پرنسپلز آف اوشنوگرافی، ڈیوس، صفحہ ۹۲ تا ۹۳)

آج ماہرین بحریات مذکورہ آیات مبارکہ کی بہتر وضاحت کر سکتے ہیں۔ دو بحیروں کے درمیان پانی ہی کی ایک نازک اور غیر مرئی رکاوٹ (طبعی قوتوں کی وجہ سے) قائم ہوتی ہے جس سے گزر کر ایک بحیرے کا پانی دوسرے میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن جب ایک بحیرے کا پانی،

دوسرے بحیرے میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنی امتیازی خصوصیات کھو دیتا ہے اور دوسرے کے پانی کے ساتھ ہم جنس آمیزہ (Homogeous Mixture) بنا لیتا ہے، گویا ایک طرح سے یہ رکاوٹ کسی عبوری ہم آمیزی والے علاقے کا کام کرتی ہے، جو دونوں بحیروں کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ یہ مظہر درج ذیل آیتِ قرآنی میں بھی بیان کیا گیا ہے:

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن، سورۃ ۲۷، آیت ۶۱)

"اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔"

یہ مظہر متعدد مقامات پر وقوع پذیر ہوتا ہے جن میں جبل الطارق (جبرالٹر) کے علاقے میں بحیرۂ روم اور بحیر اوقیانوس کے ملنے کا مقام نمایاں طور پر قابل ذکر ہے اسی طرح کیپ پوائنٹ اور کیپ پینسولا (Cape Peninsula) جنوبی افریقہ میں بھی (پانی کے بیچ) ایک سفید پٹی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں جہاں بحرِ اوقیانوس اور بحرِ ہند کا ایک دوسرے سے ملاپ ہوتا ہے۔

لیکن جب قرآن پاک تازہ اور کھارے پانی کے درمیان رکاوٹ (آڑ) کا تذکرہ کرتا ہے تو اس آڑ کے ساتھ ایک "ممنوعہ علاقے" کے بارے میں بھی بتاتا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۳)

"اور وہی جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور

اور ان دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈ مڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔"

جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ ساحل کے نزدیکی (سمندری) مقامات پر جہاں (دریا کا) تازہ (میٹھا) اور (سمندر کا) نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں وہاں کی کیفیت اُن مقامات سے قدرے مختلف ہوتی ہے جہاں دو سمندروں کے نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں یہ دریافت ہوا ہے کہ کھاڑیوں (Estuaries) میں تازہ پانی کو کھاری پانی سے جو چیز جدا کرتی ہے وہ۔ "پکنو کلائن زون" (Pycnocline Zone) ہے جس کی کثافت غیر مسلسل ہوتی (گھٹتی بڑھتی رہتی) ہے جو (کھاری اور تازہ پانی کی) مختلف پرتوں (Layers) کو ایک دوسرے سے الگ رکھتی ہے۔ (بحوالہ: اوشنوگرافی، ازگروس صفحہ ۲۴۲ مزید دیکھئے: انٹروڈکٹری اوشنوگرافی، ازتھرمین صفحہ ۳۰۰ تا ۳۰۱) اس رکاوٹ (یعنی علاقہ امتیاز) کے پانی میں نمک کا تناسب (شوریت) تازہ پانی اور کھاری پانی، دونوں ہی سے مختلف ہوتا ہے۔ (بحوالہ: اوشنوگرافی، صفحہ ۲۴۴ انٹروڈکٹری اوشنوگرافی، صفحہ ۳۰۰ تا ۳۰۱) اس مظہر کا مشاہدہ بھی متعدد مقامات پر کیا گیا ہے جن میں مصر بطور خاص قابلِ ذکر ہے کہ جہاں دریائے نیل، بحیرۂ روم میں گرتا ہے۔

قرآن پاک میں بیان کیے گئے ان سائنسی مظاہر کی تصدیق "ڈاکٹر ولیم ہے" نے بھی کی ہے جو کولوراڈو یونیورسٹی امریکہ کے مشہور ماہر بحریات اور علومِ ارضی کے پروفیسر ہیں۔

سمندر کی گہرائیوں میں اندھیرا

پروفیسر درگا راؤ دنیا کے جانے پہچانے ماہر بحری ارضیات ہیں اور وہ شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ (سعودی عرب) میں پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ ان سے درج ذیل آیت مبارکہ پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا:

﴿ اَوْ كَظُلُمَاتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰهَا وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۴ آیت ۴۰)

''یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اس کے اوپر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ اللہ جسے نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔''

پروفیسر راؤ نے کہا کہ سائنس دان صرف حال ہی میں جدید آلات کی مدد سے یہ تصدیق کرنے کے قابل ہوئے ہیں کہ سمندر کی گہرائیوں میں تاریکی ہوتی ہے۔ یہ انسان کے بس سے باہر ہے کہ وہ ۲۰ یا ۳۰ میٹر سے زیادہ گہرائی میں اضافی ساز و سامان اور آلات سے لیس ہوئے بغیر غوطہ لگا سکے۔ علاوہ ازیں، انسانی جسم میں اتنی قوت برداشت نہیں کہ جو ۲۰۰ میٹر سے زیادہ گہرائی میں پڑنے والے آبی دباؤ کا سامنا کرتے ہوئے زندہ بھی رہ سکے۔ یہ آیتِ مبارک تمام سمندروں کی طرف اشارہ نہیں کرتی کیونکہ ہر سمندر کو پرت در پرت تاریکی کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا، البتہ یہ آیتِ مبارک بطور خاص گہرے سمندروں کی جانب متوجہ کرتی ہے کیونکہ قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ''وسیع اور گہرے سمندر کی تاریکی'' کا حوالہ دیا گیا ہے، گہرے سمندر کی یہ تہہ در تہہ تاریکی دو اسباب کا نتیجہ ہے۔

اوّل: عام روشنی کی ایک شعاع سات رنگوں سے مل کر بنتی ہے۔ یہ سات رنگ بالترتیب بنفشی، کاسنی، نیلا، سبز، پیلا، نارنجی، سرخ (Vibgyor) ہیں۔ روشنی کی شعاع جب پانی میں داخل ہوتی ہے تو انعطاف (ریفریکشن) کے عمل سے گزرتی ہے اوپر کے دس سے پندرہ میٹر کے دوران پانی میں سرخ رنگ جذب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غوطہ خور پانی میں پچیس میٹر کی گہرائی تک جا پہنچے اور زخمی ہو جائے تو وہ اپنے خون میں سرخی نہیں دیکھ پائے گا کیونکہ سرخ رنگ کی روشنی اتنی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی طرح ۳۰ سے ۵۰ میٹر تک کی گہرائی آتے آتے نارنجی (اورنج) روشنی بھی مکمل طور پر جذب ہو جاتی ہے پیلی روشنی ۵۰ سے ۱۱۰ میٹر تک، سبز روشنی ۱۰۰ سے ۲۰۰ میٹر تک، نیلی روشنی ۲۰۰ میٹر سے کچھ زیادہ تک جب کہ کاسنی اور بنفشی روشنی اس سے بھی کچھ زیادہ گہرائی تک پہنچتے پہنچتے مکمل طور پر جذب ہو جاتی ہیں، پانی میں رنگوں کے

اس طرح ترتیب وار غائب ہونے کی وجہ سے سمندر بھی تہہ در تہہ کر کے تاریک ہوتا چلا جاتا ہے، یعنی اندھیرے کا ظہور بھی روشنی کی پرتوں (Layers) کی شکل میں ہوتا ہے۔ ۱۰۰۰ میٹر سے زیادہ کی گہرائی میں مکمل اندھیرا ہوتا ہے۔ (بحوالہ: اوشنز از: ایلڈر اور پرنیٹا صفحہ ۲۷)

دوم: دھوپ کی شعاعیں بادلوں میں جذب ہوتی ہیں۔ جو نتیجتاً روشنی کی شعاعوں کو ادھر اُدھر بکھیرتے ہیں، جس کی وجہ سے بادلوں کے نیچے تاریکی کی ایک پرت (تہہ) سی بن جاتی ہے۔ یہ تاریکی کی پہلی پرت ہے جب روشنی کی شعاعیں سطح سمندر سے ٹکراتی ہیں تو وہ (سمندری) لہروں کی سطح سے ٹکرا کر پلٹتی ہیں اور جگمگانے کا سا تاثر دیتی ہیں، لہٰذا یہ (سمندری) لہریں ہیں جو روشنی کو منعکس کرتی ہیں تاریکی کی وجہ بنتی ہیں۔ غیر منعکس شدہ روشنی، سمندر کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے، لہٰذا سمندر کے دو حصے ہوئے، سطح کی امتیازی علامت روشنی اور گرمی ہیں، جب کہ اندھیرا سمندری گہرائیوں کا طرۂ امتیاز ہے، علاوہ ازیں گہرے سمندر اور سطح سمندر کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے والی چیز بھی لہریں ہی ہیں۔

اندرونی موجیں سمندروں کے گہرے پانیوں کا احاطہ کرتی ہیں کیونکہ گہرے پانیوں کی کثافت اپنے اوپر موجود (کم گہرائی والے) پانیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اندرونی پانیوں ہی میں تاریکی کا راج ہوتا ہے۔ سمندر کی اتنی گہرائی میں مچھلیاں بھی دیکھ نہیں سکتیں؛ روشنی کا واحد ذریعہ خود ان کے جسم ہوتے ہیں۔

اسی بات کو قرآن پاک نہایت جامع انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مثل ان اندھیروں کے ہے جو نہایت گہرے سمندر کی تہہ میں ہوں جسے اوپر تلے کی موجوں نے ڈھانپ رکھا ہو۔"

بالفاظ دیگر، ان لہروں کے اوپر مزید اقسام کی لہریں ہیں، یعنی وہ لہریں جو سمندر کی سطح پر پائی جائیں۔ اسی تسلسل میں یہ آیت مبارکہ فرماتی ہے۔ "پھر اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ غرض اندھیریاں ہیں جو اوپر تلے پے در پے ہیں۔ جیسا کہ وضاحت کی گئی، یہ بادل وہ پے در پے رکاوٹیں ہیں جو مختلف سطحوں پر روشنی کے مختلف رنگ جذب کرتے ہوئے اندھیرے

کو بڑھاوا دیتی چلی جاتی ہیں۔

پروفیسر درگاراؤ نے یہ کہتے ہوئے اپنی بات مکمل کی "۱۴۰۰ سال پہلے کوئی عام انسان اس مظہر کو اتنی تفصیل سے بیان نہیں کرسکتا تھا، لہٰذا یہ معلومات یقیناً کسی مافوق الفطرت ذریعے سے آئی ہیں۔"

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ﴾ (القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۴)

"اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔ تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے۔"

کیا یہ ممکن تھا کہ چودہ صدیوں پہلے کوئی بھی انسان یہ اندازہ لگا سکے کہ ہر ایک جاندار چیز پانی ہی سے وجود میں آئی ہے؟ مزید برآں کیا یہ ممکن تھا کہ عرب کے ریگزاروں سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد ایسا کوئی اندازہ قائم کر لیتا؟ ایسے ریگزاروں کا باشندہ کہ جہاں پانی کی قلت ہمیشہ رہتی ہو۔

نباتیات (Botany)

پودوں میں نر اور مادہ

پرانے زمانے کے انسان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پودوں میں بھی جانوروں کی طرح نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ البتہ جدید نباتیات یہ بتاتی ہے کہ ہر پودے کی نر اور مادہ صنف ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ پودے جو یک صنفی (Unisexual) ہوتے ہیں۔ ان میں بھی نر اور مادہ کے امتیازی اجزاء یکجا ہوتے ہیں۔

﴿ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۰، آیت ۵۳)

"اور اوپر سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار (جوڑا جوڑا) نکالی۔"

پھلوں میں نر اور مادہ کا فرق

﴿ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۳، آیت ۳)

"اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔"

اعلیٰ درجے کے پودوں (Superior Plants) میں نسل خیزی کی آخری پیداوار اُن کے پھل (Fruits) ہوتے ہیں۔ پھل سے پہلے پھول کا مرحلہ ہوتا ہے جس میں نر اور مادہ اعضا (Organs) یعنی اسٹیمنز (Stamens) اور اوویولز (Ovules) ہوتے ہیں جب کوئی زردانہ (Pollen) کسی پھول تک پہنچتا ہے، تبھی وہ پھول "بارآور" ہو کر پھل میں بدلنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پھل پک جاتا ہے اور (اُس پودے کی) اگلی نسل کو جنم دینے والے بیج سے

لیس ہو کر تیار ہو جاتا ہے۔لہٰذا تمام پھل اس امر کا پتا دیتے ہیں کہ (پودوں میں بھی) نر اور مادہ اعضا ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جسے قرآن پاک بہت پہلے بیان فرما چکا ہے۔

پودوں کی بعض انواع میں غیر بارآور (Non Fertilized) پھولوں سے بھی پھل بن سکتے ہیں۔ (جنہیں مجموعی طور پر "پارتھینو کارپک فروٹ" کہا جاتا ہے) ان میں کیلے کے علاوہ انناس، انجیر، نارنگی، اور انگور وغیرہ کی بعض اقسام شامل ہیں۔ان پودوں میں بھی بہت واضح صنفی خصوصیات (Sexual Characteristics) موجود ہوتی ہیں۔

ہر چیز کو جوڑوں میں بنایا گیا ہے

﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴾

(القرآن، سورۃ ۵۱، آیت ۴۹)

"اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم اس سے سبق لو۔"

اس آیت مبارکہ میں "ہر چیز" کے جوڑوں کی شکل میں ہونے پر زور دیا گیا ہے۔انسانوں، جانوروں، پودوں اور پھلوں کے علاوہ بہت ممکن ہے کہ یہ آیت مبارکہ بجلی کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہو کہ جس میں ایٹم منفی بار والے الیکٹرونوں اور مثبت بار والے مرکزے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے جوڑے ہو سکتے ہیں۔

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِىْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن، سورۃ ۳۶، آیت ۳۶)

"پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوع انسانی) میں سے یا اُن اشیا میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں۔"

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر چیز جوڑوں کی شکل میں پیدا کی گئی ہے، جن میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جنہیں آج کا انسان نہیں جانتا اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے کل میں انہیں دریافت کر لے۔

حیوانیات (Zoology)

جانوروں اور پرندوں میں معاشرے کا وجود

﴿ وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ بِجَنَاحَیۡہِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُکُمۡ مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡکِتٰبِ مِنۡ شَیۡءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ یُحۡشَرُوۡنَ ﴾

(القرآن، سورۃ ۶، آیت ۳۸)

''زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں اور ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جانور اور پرندے بھی ''معاشروں'' (Communities) کی شکل میں رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان میں بھی ایک اجتماعی نظم وضبط ہوتا ہے۔ وہ مل جل کر رہتے ہیں اور کام بھی کرتے ہیں۔

پرندوں کی پرواز

﴿ اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا اللّٰہُ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴾ (القرآن: سورہ ۱۶، آیت ۷۹)

''کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں۔ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔''

ایک اور آیت مبارکہ میں پرندوں پر کچھ اس انداز سے بات کی گئی ہے:

﴿ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَہُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقۡبِضۡنَ مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا

الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ﴾ (القرآن: سورۃ، ۶۷، آیت ۱۹)

”یہ لوگ اپنے اوپر اُڑنے والے پرندوں کو پر پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمان کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔“

عربی لفظ ”امسک“ کا لغوی ترجمہ ”کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دینا، روکنا، تھامنا، یا کسی کی کمر پکڑ لینا“ ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں ”یُمْسِكُهُنَّ“ سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے پرندوں کو ہوا میں تھامے رکھتا ہے، ان آیات ربانی میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ پرندوں کے طرزِ عمل کا مکمل انحصار اُنہی قوانین پر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق فرمایا ہے۔ (اور جنہیں ہم قوانین فطرت کے نام سے جانتے ہیں) جدید سائنسی معلومات سے ثابت ہو چکا ہے کہ بعض پرندوں میں پرواز کی بے مثل اور بے عیب صلاحیت کا تعلق اس وسیع تر اور مجموعی منصوبہ بندی (پروگرامنگ) سے ہے جو اُن کی حرکات وسکنات سے متعلق ہے۔ مثلاً ہزاروں میل دور تک نقل مکانی کرنے والے پرندوں کی جینیاتی رموز (جینیٹک کوڈز) میں اُن کے سفر کی تمام تر تفصیلات وجزئیات موجود ہوتی ہیں، جو ان پرندوں کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ نہایت کم عمری میں بھی لمبے سفر کے کسی تجربے کے بغیر، کسی رہنما کے بغیر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرلیں اور پیچیدہ راستوں سے پرواز کرتے چلے جائیں۔ بات صرف سفر کی یک طرفہ تکمیل ہی پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ وہ ایک مخصوص تاریخ پر اپنے عارضی مسکن سے پرواز کرتے ہیں اور ہزاروں میل واپسی کا سفر کر کے ایک بار پھر اپنے گھونسلوں تک بالکل ٹھیک جا پہنچتے ہیں۔

پروفیسر ہیمبر گر نے اپنی کتاب ”پاور اینڈ فرجیلیٹی“ میں ”مٹن برڈ“ نامی ایک پرندے کی مثال دی ہے، جو بحرالکاہل کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ نقل مکانی کرنے والا یہ پرندہ ۲۴،۰۰۰ (چوبیس ہزار) کلومیٹر کا فاصلہ ۸ کی شکل میں چکر لگا کر طے کرتا ہے۔ یہ اپنا سفر چھ ماہ میں پورا کرتا ہے اور مقامِ ابتداء تک زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی تاخیر سے واپس پہنچ جاتا ہے۔ ایسے کسی سفر کے لیے نہایت پیچیدہ معلومات کا ہونا ضروری ہے جو اس پرندے کے اعصابی خلیات

میں محفوظ ہونی چاہیں۔ یعنی ایک باضابطہ "پروگرام" کی شکل میں پرندے کے جسم میں موجود اور ہمہ وقت دستیاب ہوتی ہے۔ اگر پرندے میں کوئی پروگرام ہے تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اسے تشکیل دینے والا کوئی "پروگرامر" بھی یقیناً ہے؟

شہد کی مکھی اور اس کی مہارت

﴿ وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ٥ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴾

(القرآن: سورة ۱۶، آیات ۶۸ تا ۶۹)

"اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں، اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

وان فرش نے شہد کی مکھیوں کے طرز عمل اور ان میں رابطہ و ابلاغ (کمیونی کیشن) کی تحقیق پر ۱۹۷۳ء کا نوبل انعام حاصل کیا۔ شہد کی کسی مکھی کو جب کوئی نیا باغ یا پھول دکھائی دیتا ہے تو وہ اپنے چھتے میں واپس جاتی ہے اور اپنی ساتھی شہد کی مکھیوں کو اُس مقام کی ٹھیک ٹھیک سمت اور وہاں پہنچانے والے راستے کے مفصل نقشے سے آگاہ کرتی ہے۔ شہد کی مکھی، پیغام رسانی کا یہ کام خاص طرح کی جسمانی حرکات سے لیتی ہے جنہیں "شہد کی مکھی کا رقص" (Bee Dance) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عام معنوں والا رقص نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد شہد کی "کارکن مکھیوں" (Worker Bees) کو یہ سمجھانا ہوتا ہے کہ پھول کس سمت ہیں اور وہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں کس انداز سے پرواز کرنا ہوگی۔ تاہم شہد کی مکھی کے بارے میں یہ

ساری معلومات ہم نے جدید فوٹو گرافی اور دیگر پیچیدہ مشاہداتی ذرائع ہی سے حاصل کی ہیں۔
لیکن ملاحظہ فرمایئے کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں قرآنِ عظیم نے کتنی صراحت کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو خاص طرح کی مہارت عطا فرمائی ہے، جس سے لیس ہو کر وہ اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے تلاش کر لیتی ہے۔ ایک اور توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں شہد کی مکھی کے لیے جو صنف استعمال کی گئی ہے، وہ مادہ کی ہے (یعنی، فاسلکی اور کلی) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غذا کی تلاش میں نکلنے والی شہد کی مکھی "مادہ" ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر سپاہی یا کارکن شہد کی مکھی بھی مادہ ہی ہوتی ہے۔
دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ شیکسپیر کے ڈرامے "ہنری دی فورتھ" میں بعض کردار شہد کی مکھیوں کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ (شہد کی) مکھیاں سپاہی ہوتی ہیں اور یہ کہ اُن کا بادشاہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیکسپیئر کے زمانے میں لوگ یہی سمجھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ شہد کی کارکن مکھیاں "نر" ہوتی ہیں اور وہ شہد کی "بادشاہ مکھی" (نر) کو جوابدہ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ شہد کی کارکن مکھیاں مادہ ہوتی ہیں اور وہ شہد کی بادشاہ مکھی کو نہیں بلکہ "ملکہ مکھی" کو اپنی کارگزاری پیش کرتی ہیں۔ اب اس بارے میں کیا کہا جائے کہ گذشتہ ۳۰۰ سال کے دوران ہونے والی جدید تحقیق کی بدولت ہی ہم یہ سب کچھ دریافت کر پائے ہیں۔

مکڑی کا جالا، ناپائیدار ترین گھر

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۹، آیت ۴۱)

"جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔"

مکڑی کے جالے کو نازک اور کمزور کے طور پر بیان کرنے کے علاوہ، قرآن پاک نے

مکڑی کے گھریلو تعلقات کے بھی نازک اور ناپائیدار ہونے پر زور دیا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے، کیونکہ بیشتر اوقات مکڑی اپنے ملاپ کار (Mate) یعنی نر کو مار ڈالتی ہے۔ یہی مثال ایسے لوگوں کی کمزوریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بھی دی گئی ہے جو دنیا اور آخرت میں تحفظ وکامیابی حاصل کرنے کے لیے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے اس کی امید کرتے ہیں۔

چیونٹیوں کا طرزِ حیات اور باہمی روابط

﴿ وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ حَتّٰى اِذَا اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۷، آیات ۱۷ تا ۱۸)

"سلیمان علیہ السلام کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے، اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: "اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔"

ہوسکتا ہے کہ ماضی میں بعض لوگوں نے قرآن پاک میں چیونٹیوں کا مذکورہ بالا مکالمہ دیکھ کر اس پر نکتہ چینی کی ہو اور کہا ہو کہ چیونٹیاں تو صرف کہانیوں کی کتابوں ہی میں باتیں کرتی ہیں۔ البتہ، حالیہ برسوں کے دوران ہمیں چیونٹیوں کے طرزِ حیات باہمی روابط اور پیچیدہ معلومات کے تبادلے کے حوالے سے بہت کچھ علم ہو چکا ہے۔ یہ معلومات دورِ جدید سے پہلے کے انسانوں کو حاصل نہ تھیں۔ تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ وہ جانور یا وہ حشرات (کیڑے مکوڑے) جن کا طرزِ حیات انسانی معاشرت سے غیر معمولی مماثلت رکھتا ہے، وہ چیونٹیاں ہی ہیں۔ اس کی تصدیق چیونٹیوں کے بارے میں درج ذیل حالیہ دریافتوں سے بھی ہوتی ہے:

الف۔ چیونٹیاں بھی اپنے مردوں کو انسانوں کی طرح دفناتی ہیں۔

ب۔ ان میں کارکنان کی تقسیم کا پیچیدہ نظام موجود ہے جس میں منیجر، سپروائزر، فورمین اور مزدور وغیرہ شامل ہیں۔

ج۔ کبھی کبھار وہ آپس میں ملتی ہیں اور ''گفتگو'' (Chat) بھی کرتی ہیں۔

د۔ ان میں باہمی تبادلہ خیال (کمیونی کیشن) کا ترقی یافتہ نظام موجود ہے۔

ہ۔ ان کی کالونیوں میں باقاعدہ ''مارکیٹیں'' ہوتی ہیں جہاں وہ اشیا کا تبادلہ کرتی ہیں۔

ی۔ سردیوں میں لمبے عرصے تک زیرِ زمین رہنے کے لیے وہ اناج کے دانوں کا ذخیرہ بھی کرتی ہیں۔ اور اگر کوئی دانہ پھوٹنے لگے۔ یعنی اس سے پودا بننے لگے تو وہ فوراً اس کی جڑیں کاٹ دیتی ہیں۔ جیسے انھیں یہ پتا ہو کہ اگر وہ اس دانے کو یونہی چھوڑ دیں گی تو وہ بڑھنا اور پکنا شروع کر دے گا۔ اگر ان کا محفوظ کیا ہوا اناج کسی بھی وجہ سے مثلاً بارش سے گیلا ہو جائے تو وہ اسے اپنے بل سے باہر لے جاتی ہیں اور دھوپ میں سکھاتی ہیں۔ جب اناج سوکھ جاتا ہے تبھی وہ اسے بل میں واپس لے کر جاتی ہیں۔ یعنی یوں لگتا ہے، جیسے انہیں یہ علم ہو کہ نمی کی وجہ سے اناج کے دانے سے جڑیں نکل پڑیں گی جو دانے کو اس قابل نہیں چھوڑیں گی کہ اسے کھایا جا سکے۔

طب (میڈیسن)

شہد: نوعِ انسانی کے لیے شفا

شہد کی مکھی کئی طرح کے پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی ہے اور اسے اپنے ہی جسم کے اندر شہد میں تبدیل کرتی ہے۔ اس شہد کو وہ اپنے چھتے میں بنے خانوں (Cells) میں جمع کرتی ہے۔ آج سے صرف چند صدیوں قبل ہی انسان کو یہ معلوم ہوا ہے کہ شہد اصل میں شہد کی مکھی کے پیٹ (Belly) سے نکلتا ہے، مگر یہ حقیقت قرآن پاک نے ۱۴۰۰ سال پہلے درج ذیل آیت مبارکہ میں بیان کردی تھی:

﴿ ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَٰتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنۢ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَٰنُهُ فِيهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَأٓيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۶۹)

"ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس، اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہ پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے (پیٹ کے) اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

علاوہ ازیں ہم نے حال ہی میں یہ دریافت کیا ہے کہ شہد میں شفا بخش خصوصیات پائی جاتی ہیں اور یہ اوسط درجے کے دافع عفونت (مائلڈ اینٹی سیپٹک) کا کام بھی کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں روسیوں نے بھی اپنے زخمی فوجیوں کے زخم ڈھانپنے کے لیے شہد کا استعمال کیا تھا۔ شہد کی خاصیت ہے کہ یہ نمی کو برقرار رکھتا ہے اور بافتوں پر زخموں کے بہت ہی کم نشان باقی رہنے دیتا ہے۔ شہد کی کثافت (Density) کے باعث کوئی پھپھوندی یا جراثیم، زخم میں یہ وان

نہیں چڑھ سکتے۔

سسٹر کیرول نامی ایک عیسائی راہبہ (Nun) نے برطانوی شفا خانوں میں سینے اور الزائیمر کے عارضوں میں مبتلا بائیس ۲۲ نا قابل علاج مریضوں کا علاج پروپولس (Propolis) نامی مادے سے کیا۔ شہد کی مکھیاں یہ مادہ پیدا کرتی ہیں اور اسے اپنے چھتوں کو جرثوموں کے خلاف سربند (Seal) کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی پودے سے ہونے والی الرجی میں مبتلا ہو جائے تو اسی پودے سے حاصل شدہ شہد اس شخص کو دیا جا سکتا ہے تاکہ وہ الرجی کے خلاف مزاحمت پیدا کر لے۔ شہد وٹامن کے اور فرکٹوز (ایک طرح کی شکر) سے بھی بھرپور ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں شہد اس کی تشکیل اور خصوصیات کے بارے میں جو علم دیا گیا ہے اسے انسان نے نزول قرآن کے صدیوں بعد اپنے تجربے اور مشاہدے سے دریافت کیا ہے۔

فعلیات (Physiology)

دورانِ خون (بلڈ سرکولیشن) اور دودھ

قرآن پاک کا نزول، دورانِ خون کی وضاحت کرنے والے اوّلین مسلمان سائنس دان ابن النفیس سے ۶۰۰ سال پہلے اور اس دریافت کو مغرب میں روشناس کروانے والے ولیم ہاروے سے ۱۰۰۰ سال پہلے ہوا تھا۔ تقریباً تیرہ صدیوں پہلے یہ معلوم ہوا کہ آنتوں کے اندر ایسا کیا کچھ ہوتا ہے جو نظامِ ہاضمہ میں انجام پانے والے افعال کے ذریعے دیگر جسمانی اعضا کی نشوونما کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ قرآنِ پاک کی ایک آیت مبارک، جو دودھ کے اجزا کے ماخذ کی وضاحت کرتی ہے، اس تصور کی عین مطابقت میں ہے۔

مذکورہ بالا تصور کے حوالے سے آیت قرآنی کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا اہم ہے کہ آنتوں میں کیمیائی تعاملات (Reactions) واقع ہوتے ہیں اور یہ کہ آنتوں ہی سے ہضم کردہ غذا سے اخذ کیے ہوئے مادے ایک پیچیدہ نظام سے گزر کر دورانِ خون میں شامل ہوتے ہیں۔ کبھی وہ (مادے) جگر سے ہو کر گزرتے ہیں جس کا انحصار ان کی کیمیائی ترکیب پر ہوتا ہے۔ خون ان اجزا (مادوں) کو تمام اعضا تک پہنچاتا ہے، جن میں دودھ پیدا کرنے والے (چھاتیوں کے) غدود بھی شامل ہیں۔

سادہ الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنتوں میں موجود غذا کے بعض مادے آنتوں کی دیوار سے سرایت کرتے ہوئے خون کی نالیوں (Vessels) میں داخل ہو جاتے ہیں، اور پھر خون کے راستے یہ دورانِ خون کے ذریعے کئی اعضا تک جا پہنچتے ہیں۔ یہ فعلیاتی تصور مکمل طور پر لازماً ہماری گرفت میں آ جائے گا، اگر ہم قرآن پاک کی درج ذیل آیات مبارکہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے:

﴿ وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۶۶)

''اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ، جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔''

﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۳، آیت ۲۱)

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں بہت سے فائدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو۔''

۱۴۰۰ سال قبل، قرآن پاک کی فراہم کردہ یہ وضاحت جو گائے میں دودھ کے پیدا ہونے کے حوالے سے ہے، حیرت انگیز طور پر جدید فعلیات سے بھرپور انداز میں ہم آہنگ ہے جس نے اس حقیقت کو حال ہی میں دریافت کیا ہے۔

جنینیات (Embryology)

مسلمان جوابات کی تلاش میں

یمن کے معروف عالم، شیخ عبدالمجید الزندانی کی قیادت میں مسلمان اسکالروں کے ایک گروپ نے جنینیات (ایمبریالوجی) اور دیگر (سائنسی) علوم کے بارے میں قرآن پاک اور مستند احادیث سے معلومات جمع کیں اور انہیں انگریزی میں ترجمہ کیا۔ پھر انہوں نے قرآن پاک کے ایک مشورے پر عمل کیا:

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۴۳)

"اے نبی! ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔"

جب قرآن پاک اور مستند احادیث مبارکہ سے جنینیات کے بارے میں حاصل کی گئی معلومات یکجا ہو کر انگریزی میں ترجمہ ہو گئیں تو انہیں پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر کیتھ مور، یونیورسٹی آف ٹورانٹو (کینیڈا) میں ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی کے سربراہ اور جنینیات کے پروفیسر ہیں۔ آج کل وہ جنینیات (ایمبریالوجی) کے میدان میں مقتدر اور معتبر ترین شخصیت بھی ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ وہ انہیں پیش کیے گئے علمی مواد کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ محتاط مطالعے کے بعد ڈاکٹر کیتھ مور نے کہا کہ جنینیات کے متعلق آیات قرآنی اور مستند احادیث میں بیان کردہ تقریباً تمام معلومات، جدید سائنسی دریافتوں کی عین مطابقت میں ہیں جدید جنینیات سے ان کا بھرپور اتفاق ہے اور وہ کسی بھی طرح جدید جنینیات سے

اختلاف نہیں کرتیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ البتہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کی سائنسی درستگی کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ آیات (سائنس کی مطابقت میں) صحیح ہیں یا غلط، کیونکہ خود انہیں ان آیات میں دی گئی معلومات کے متعلق کچھ علم نہیں۔ ان کے متعلق جنینیات کے جدید مطالعات اور مقالہ جات تک میں بھی کچھ موجود نہ تھا۔ ایسی ہی ایک آیت مبارکہ درج ذیل ہے:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴾

(القرآن: سورۃ ۹۶ آیات ۱ تا ۲)

"پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔"

یہاں عربی لفظ "علق" استعمال ہوا ہے جس کا ایک مطلب تو خون کا لوتھڑا ہے، جب کہ دوسرا مطلب کوئی ایسی چیز ہے جو "چمٹ" جاتی ہو، یعنی جونک جیسی کوئی شے ہو۔ ڈاکٹر کیتھ مور کو علم نہیں تھا کہ حمل کے ابتدائی مرحلوں میں جنین (ایمبریو) کی شکل جونک جیسی ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے انہوں نے نہایت طاقتور اور حساس آلات کی مدد سے جنین کے ابتدائی مراحل کا بڑے محتاط انداز میں مطالعہ کیا اور پھر ان تصاویر کا موازنہ جونک کے خاکے سے کیا۔ وہ ان دونوں کے درمیان غیر معمولی مشابہت دیکھ کر حیران رہ گئے، اسی طرح انہوں نے جنینیات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں جو قرآن پاک سے تھیں اور جن سے وہ قبل ازیں واقف نہیں تھے۔

ڈاکٹر کیتھ مور نے جنینیاتی معلومات سے متعلق قرآن وحدیث سے حاصل شدہ مواد پر تقریباً ۸۰ سوالوں کے جوابات دیے، قرآن وحدیث میں جنینیات کے حوالے سے موجود علم صرف جدید سائنسی معلومات سے ہم آہنگ ہی نہ تھا بلکہ بقول ڈاکٹر کیتھ مور اگر آج سے تیس سال پہلے مجھ سے یہی سب سوالات کیے جاتے تو سائنسی معلومات کی عدم موجودگی کے باعث میں ان میں سے آدھے سوالوں کے جوابات بالکل بھی نہیں دے سکتا تھا۔

۱۹۸۱ء میں دمام (سعودی عرب) میں منعقدہ، ساتویں طبی کانفرنس کے دوران ڈاکٹر مور نے کہا "میرے لیے نہایت خوشی کا مقام ہے کہ میں نے قرآن میں انسان کی (دوران حمل) نشو و نما سے متعلق پیش کردہ نکات کی وضاحت کرنے میں مدد کی۔ اب مجھ پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ ساری معلومات محمد (ﷺ) تک خدا یا اللہ نے ہی پہنچائی ہیں کیونکہ کم و بیش یہ سارا علم (نزول قرآن کے) کئی صدیوں بعد ہی دریافت کیا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) بلاشبہ خدا یا اللہ کے رسول ہی تھے۔"

قبل ازیں ڈاکٹر کیتھ مور ایک کتاب "دی ڈیویلپنگ ہیومین" لکھ چکے تھے۔ قرآن پاک سے نئی معلومات سے حاصل ہو جانے کے بعد انہوں نے ۱۹۸۲ء میں اسی کتاب کا تیسرا ایڈیشن مرتب کیا۔ اس ایڈیشن کو عالمی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس کتاب نے کسی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ یہ کتاب دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور اسے میڈیکل کی تعلیم کے پہلے سال میں اک نصابی کتاب کے طور پر بھی پڑھایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جو سمپسن، بیلر کالج آف میڈیسن، ہیوسٹن، (امریکہ) میں شعبہ حمل و زچگی (آبسٹیٹرکس اینڈ گائنا کولوجی) کے چیئرمین ہیں۔ ان کا کہنا ہے "یہ احادیث، محمد (ﷺ) کی کہی ہوئی باتیں، کسی بھی طرح مصنف کے زمانے (ساتویں صدی عیسوی) میں دستیاب سائنسی معلومات کی بنیاد پر پیش نہیں کی جا سکتی تھیں، اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ جنینیات (Genetics) اور مذہب (یعنی اسلام) میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ بھی پتا چلا کہ مذہب (اسلام) اس طرح سے سائنس کی رہنمائی کر سکتا ہے کہ روایتی سائنسی انداز نظر میں کچھ الہامی انکشافات بھی شامل کرتا چلا جائے۔ قرآن میں ایسے بیانات موجود ہیں جن کی توثیق کئی صدیوں بعد ہوئی۔ جس سے اس (یقین) کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن میں دیا گیا علم واقعی خدا کی طرف سے آیا ہے۔"

ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان سے خارج ہونے والا قطرہ

﴿ فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۸۶، آیات ۵ تا ۷)

"پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔"

جنینی مراحل میں مردانہ و زنانہ تولیدی اعضاء یعنی فوطے (Testicles) اور بیضہ دان (Ovary) گردوں پاس سے ریڑھ کی ہڈی اور گیارھویں / بارھویں پسلیوں کے درمیان سے نمو پذیر ہونا شروع کرتے ہیں۔ بعدازاں وہ کچھ نیچے اتر آتے ہیں: زنانہ تولیدی غدود (Gonads) یعنی بیضہ دانیاں پیڑو (Pelvis) میں رک جاتی ہیں جب کہ مردانہ اعضائے تولید (Inguinal Canal) کے راستے خصیہ دانی (Scrotum) تک جا پہنچتے ہیں۔ حتیٰ کہ بلوغت میں بھی جب کہ تولیدی غدود کے نیچے سرکنے کا عمل رک چکا ہوتا ہے ان غدود میں دھڑ والی اورطہ (Abdominal Aorta) کے ذریعے خون اور اعصاب کی رسائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دھیان رہے کہ دھڑ والی اورطہ اُس علاقے میں ہوتی ہے جو ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ لمفی نکاس (Lymphetic Drainage) اور خون کا وریدی بہاؤ بھی اس سمت ہوتا ہے۔

نطفہ: مائع کی معمولی سی مقدار

قرآن عظیم میں کم از کم گیارہ مرتبہ کہا گیا ہے کہ انسان کو "نطفہ" سے تخلیق کیا گیا ہے جس کا مطلب مائع کی نہایت معمولی مقدار یا پیالہ خالی ہو جانے کے بعد اس میں لگا رہ جانے والا مائع ہے۔ یہ بات قرآنِ عالی شان کی کئی آیات مبارکہ میں وارد ہوئی ہے جن میں سورۃ ۲۲ آیت ۵ اور سورۃ ۲۳، آیت ۱۳ کے علاوہ سورۃ ۱۶، آیت ۴؛ سورۃ ۱۸ آیت ۳۷؛ سورۃ ۳۵، آیت ۱۱؛ سورۃ ۳۶، آیت ۷۷؛ سورۃ ۴۰ آیات ۶۷؛ سورۃ ۵۳، آیت ۴۶؛ سورۃ ۷۶، آیت ۲؛ اور سورۃ ۸۰ آیت ۱۹ شامل ہیں۔

سائنس نے حال ہی میں یہ دریافت کیا ہے کہ بیضے (Ovum) کو بار آور کرنے کے لیے اوسطاً تین لاکھ خلیات نطفہ (Sperms) میں سے صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ خارج ہونے والے نطفے کی مقدار کا تین لاکھواں حصہ یا ۰۰۰۰۳۔۰ فیصد مقدار ہی بار آوری (حمل ٹھہرانے) کے لیے کافی ہوتی ہے۔

"سُلٰلَة": مائع کا جوہر

﴿ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ﴾ (القرآن: سورة، ۳۲، آیت ۸)

"پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے۔"

عربی لفظ سُلٰلَةٌ سے مراد کسی مائع کا بہترین حصہ، خلاصہ یا جوہر ہے۔ اب ہم جان چکے ہیں زنانہ بیضے کی بار آوری کے لیے مرد سے خارج ہونے والے لاکھوں کروڑوں خلیات نطفہ میں سے صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں سے اسی ایک خلیۂ نطفہ کو قرآنِ پاک نے "سُلٰلَة" کہا ہے۔ اب ہمیں یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ عورت میں پیدا شدہ ہزاروں بیضوں (Ovam) میں سے صرف ایک ہی بار آور ہوتا ہے۔ ان ہزاروں بیضوں میں سے اسی ایک بیضے کے لیے (جو بار آور ہوتا ہے) قرآنِ پاک نے "سُلٰلَة" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کا ایک اور مفہوم کسی مائع سے (کسی چیز کا) بڑی احتیاط سے اخراج بھی ہے۔ اس مائع سے مراد زنانہ اور مردانہ، دونوں طرح کے تولیدی مائعات بھی ہیں جن میں صنفی تخم (Gametes) موجود ہوتے ہیں۔ بار آوری کے مرحلے کے دوران نطفہ خلیہ اور بیضہ دونوں ہی اپنے اپنے ماحول سے بہ احتیاط جدا ہوتے ہیں۔

نطفةٍ اَمشاج..... باہم ملے ہوئے مائعات

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴾ (القرآن: سورة ۷۶، آیت ۲)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

عربی لفظ " نطفة اَمشاج " کا مطلب ملے ہوئے مائعات " ہے۔بعض مفسرین کے نزدیک ملے ہوئے مائعات سے مراد عورت یا مرد کے (تولیدی) عامل (ایجنٹ) یا مائعات ہیں مردانہ اور زنانہ صنفی تخم کے باہم مل جانے کے بعد بننے والا جفتہ (Zygote) بھی ابتدا میں نطفہ ہی رہتا ہے۔ باہم ملے ہوئے (ہم آمیز) مائعات سے ایک اور مراد وہ مائع بھی ہو سکتا ہے جس میں خلیاتِ نطفہ تیر رہے ہوتے ہیں۔یہ مائع کئی طرح کی جسمانی رطوبتوں سے مل کر بنتا ہے جو کئی جسمانی غدود سے خارج ہوتی ہیں۔

لہٰذا، "نطفةِ امشاج "یعنی آپس میں ملے ہوئے مائعات کے ذریعے مردانہ و زنانہ صنفی مواد (تولیدی مائع یا خلیات) اور اس کے اردگرد مائعات کے کچھ حصے کی جانب اشارہ کیا جا رہا ہے۔

جنس کا تعین

پختہ جنین (Foetus) کی جنس کا تعین (یعنی اس سے لڑکا ہوگا یا لڑکی) خلوی نطفے سے ہوتا ہے نہ کہ بیضہ سے مطلب یہ کہ رحم مادر میں ٹھہرنے والے حمل سے لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی اس کا انحصار کروموسوم کے 23 ویں جوڑے میں بالترتیب XX/XY کروموسومز کی موجودگی پر ہوتا ہے۔ابتدائی طور پر جنس کا تعین بارآوری کے موقع ہی پر ہو جاتا ہے اور اس کا انحصار خلوی نطفے (اسپرم) کے صنفی کروموسوم (سیکس کروموسوم) پر ہوتا ہے جو بیضے کو بارآور کرتا ہے۔اگر بیضے کو بارآور کرنے والے اسپرم میں X صنفی کروموسوم ہے تو ٹھہرنے والے حمل سے لڑکی پیدا ہو گی۔اس کے برعکس، اگر اسپرم میں صنفی کروموسوم Y ہے تو حمل کے نتیجے میں لڑکا پیدا ہوگا۔

﴿ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۝﴾

(القرآن: سورۃ ۵۳، آیات ۴۵ تا ۴۶)

"اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا، ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔"

یہاں عربی لفظ نطفہ کا مطلب تو مائع کی نہایت قلیل مقدار ہے جب کہ " تُمنیٰ " کا

مطلب شدت سے ہونے والا اخراج یا پودے کی طرح بوئی گئی کوئی چیز ہے۔لہٰذا نطفہ بطورِ خاص اسپرم ہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ یہ شدت سے خارج ہوتا ہے۔قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰىo ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى o فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴾

(القرآن: سورة ۷۵، آیات ۳۷، ۳۹)

''کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔''

ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں ایک بار پھر یہ بتایا گیا ہے کہ نہایت قلیل مقدار (قطرے) پر مشتمل مادۂ تولید (جس کے لیے عربی عبارت '' نطفة مِّنْ مَّنِيٍّ '' وارد ہوئی ہے) جو کہ مرد کی طرف سے آتا ہے) رحمِ مادر میں بچے کی جنس کے تعین کا ذمہ دار ہے۔ برصغیر میں یہ افسوس ناک رواج ہے کہ عام طور پر ساسوں کو پوتیوں سے زیادہ پوتوں کا ارمان ہوتا ہے۔اور اگر بہو کے ہاں بیٹوں کے بجائے بیٹیاں ہو رہی ہوں تو وہ انہیں ''اولادِ نرینہ'' پیدا نہ کر سکنے پر طعنے دیتی ہیں۔ اگر انہیں صرف یہی پتا چل جاتا کہ اولاد کی جنس کے تعین میں عورت کے بیضے کا کوئی کردار نہیں اور اس کی تمام تر ذمہ داری مردانہ نطفے پر عاید ہوتی ہے اور اگر پھر بھی وہ لعن طعن پر آمادہ ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ (اولاد نرینہ کے نہ ہونے پر) اپنی بہوؤں کے بجائے اپنے بیٹوں کو کوسنے دیں۔قرآنِ پاک اور جدید سائنس دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ بچے کی جنس کے تعین میں مردانہ تولیدی مواد ہی ذمہ دار ہے،عورت کا اس میں کوئی قصور نہیں۔

تین تاریک پردوں کی حفاظت میں رکھا گیا بطن

﴿ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ

خَلۡقٍ فِیۡ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ لَہُ الۡمُلۡکُ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا ہُوَ فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ ﴾ (القرآن: سورة ۳۹، آیت ۶)

''اسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ اور وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے۔ پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو۔''

پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور کے مطابق، قرآن پاک میں تاریکی کے جن تین پردوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ شکمِ مادر کی اگلی دیوار

۲۔ رحمِ مادر کی دیوار

۳۔ غلافِ جنین اور اس کے گرد لپٹی ہوئی جھلی

جنینی (ایمبریانک) مراحل

﴿ وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ طِیۡنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلۡنٰہُ نُطۡفَۃً فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَۃَ مُضۡغَۃً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَۃَ عِظٰمًا فَکَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰہُ خَلۡقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ﴾ (القرآن: سورة ۲۳، آیات ۱۲ تا ۱۴)

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کو مائع کی نہایت قلیل مقدار سے تخلیق کیا گیا ہے جسے سکون (Rest) والی جگہ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ (مائع) اُس جگہ پر مضبوطی سے چمٹا رہتا ہے۔ (یعنی قیام پذیر حالت میں جکڑے ہوئے) اور اسی کے لیے قرآن پاک میں ''قرارِ مکین'' کی عبارت وارد ہوئی ہے۔ رحمِ مادر کے پچھلے حصے کو ریڑھ کی ہڈی اور کمر کے پٹھوں کی بدولت کافی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اس جنین (ایمبریو) کو مزید تحفظ جنینی تھیلی (Amniotic Sac) سے حاصل ہوتا ہے جس میں جنینی مائع (Amniotic Fluid) بھرا ہوتا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ رحمِ مادر ایک ایسی ''جائے قرار'' (رُکنے کی جگہ) ہے جسے بخوبی تحفظ دیا گیا ہے۔

مائع کی مذکورہ قلیل مقدار ''علقۃ'' کی شکل میں ہوتی ہے یعنی ایک ایسی چیز کی شکل میں جو ''چمٹ جانے'' کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس سے مراد جونک جیسی کوئی چیز بھی ہے۔ یہ دونوں توضیحات سائنسی اعتبار سے قابلِ قبول ہیں، کیونکہ بالکل ابتدائی مراحل میں جنین واقعتاً رحمِ مادر کی دیوار سے چمٹ جاتا ہے جب کہ اس کی ظاہری شکل بھی کسی جونک سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس کا طرزِ عمل بھی جونک ہی کی طرح کا ہوتا ہے، کیونکہ یہ آنول نال کے راستے اپنی ماں کے جسم سے خون حاصل کرتا (اور اس سے اپنی غذا اخذ کرتا) ہے۔

علقۃ کا تیسرا مطلب ''خون کا لوتھڑا'' ہے۔ اس ''علقۃ'' والے مرحلے سے جو حمل ٹھہرنے کے تیسرے اور چوتھے ہفتے پر محیط ہوتا ہے۔ بند رگوں کے اندر خون جمنے لگتا ہے۔ لہٰذا جنین کی شکل صرف جونک جیسی ہی نہیں رہتی بلکہ وہ خون کے لوتھڑے جیسا بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔

اب ہم قرآنِ پاک کی فراہم کردہ معلومات، اور صدیوں کی جدوجہد کے بعد سائنس کی حاصل کردہ جدید معلومات کا موازنہ کریں گے۔

۱۶۷۷ء میں ہیم اور لیون ہاک وہ دو اوّلین سائنسدان تھے، جنہوں نے خردبین سے انسانی خلیاتِ نطفہ (اِسپرماٹوزوآ) کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ نطفے کے ہر خلیے میں ایک چھوٹا سا انسان موجود ہوتا ہے جو رحمِ مادر میں پروان چڑھتا ہے اور ایک نوزائیدہ بچے کی

شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نظریے کو ''پرفوریشن تھیوری'' بھی کہا جاتا تھا۔ بعدازاں جب سائنس دانوں نے یہ دریافت کیا کہ (عورت کا) بیضہ، نطفے کے خلیے سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے تو مشہور ماہر ڈی گراف سمیت کئی سائنس دانوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ بیضے کے اندر ہی انسانی وجود نہایت مختصر (خرد بینی) حالت میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بھی بہت عرصے بعد، اٹھارہویں صدی عیسوی میں (Maupeitius) نامی سائنسدان نے اس نظریے کی تشہیر کرنا شروع کی کہ (مذکورہ بالا دونوں ابتدائی خیالات کے برعکس) کوئی بچہ اپنے ماں اور باپ دونوں کی مشترکہ وراثت (Inheritence) ہوتا ہے۔

علقۃ تبدیل ہوتا ہے اور ''مضغۃ'' کی شکل میں آتا ہے، جس کا مطلب ہے ایسی کوئی چیز جسے چبایا گیا ہو (یعنی جس پر دانتوں کے نشانات ہوں) اور کوئی ایسی چیز ہو جو چپچی (لیس دار) اور مختصر ہو یعنی جسے چیونگم کی طرح منہ میں رکھا جا سکتا ہو۔ یہ دونوں توضیحات سائنسی اعتبار سے درست ہیں۔ پروفیسر کیتھ مور نے پلاسٹوسین (ربر اور چیونگم جیسے مادے) کا ایک ٹکڑا لے کر اسے ابتدائی مرحلے والے جنین کی شکل دی اور دانتوں سے چبا کر ''مضغہ'' میں تبدیل کیا۔ پھر انہوں نے اس (تجرباتی) مضغہ کی ساخت کا موازنہ ابتدائی جنین (Foetus) کی تصاویر سے کیا۔ اس پر موجود، دانتوں کے نشانات انسانی مضغہ پر پڑے ''سومائٹس'' (Somites) سے مشابہ تھے جو (جنین میں) ریڑھ کی ہڈی کی ابتدائی شکل کو ظاہر کرتے ہیں۔

اگلے مرحلے میں یہ مضغہ تبدیل ہو کر ہڈیوں کا روپ (عِظَم) دھارتا ہے۔ ان ہڈیوں کے گرد نازک اور مہین گوشت یا پٹھوں (لحم) کا غلاف ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اسے ایک بالکل ہی الگ مخلوق کی شکل دے دیتا ہے۔

امریکہ میں چوٹی کے ایک سائنسدان پروفیسر مارشل جونس سے (جو فلاڈلفیا میں واقع تھومس جیفرسن یونیورسٹی میں اناٹومی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ اور اسی یونیورسٹی میں ڈینیئل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بھی ہیں) یہ کہا گیا کہ وہ جنینیات کے حوالے سے آیاتِ قرآنی پر تبصرہ کریں پہلے انہوں نے کہا کہ متعدد جنینی مراحل کو بیان کرنے والی قرآنی آیات کسی بھی طرح سے

اتفاق کا حاصل نہیں ہوسکتیں، اور ہوسکتا ہے کہ محمد (ﷺ) کے پاس بہت ہی طاقتور خردبین رہی ہو۔ جب انہیں یہ یاد دلایا گیا کہ قرآنِ پاک کا نزول ۱۴۰۰ سال پہلے ہوا تھا اور دنیا کی اوّلین خردبین بھی حضرت محمد (ﷺ) کے سینکڑوں سال بعد ایجاد ہوئی تھی، تو پروفیسر جونس ہنسے اور یہ تسلیم کیا ایجاد ہونے والی اولین خردبین بھی دس گنا سے زیادہ بڑی شبیہ دکھانے کے قابل نہیں تھی اور اس کی مدد سے واضح (خردبینی) منظر بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ بعدازاں انہوں نے کہا: ''سردست مجھے اس تصور میں کوئی تنازعہ دکھائی نہیں دیتا کہ جب محمد (ﷺ) نے قرآنِ پاک کی آیات پڑھیں تو اُس وقت یقیناً کوئی آسمانی (الہامی) قوت بھی ساتھ میں کارفرما تھی۔''

ڈاکٹر کیتھ مور کا کہنا ہے کہ جنینی نشوونما کے مراحل کی وہ درجہ بندی جو آج ساری دنیا میں رائج ہے، آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کیونکہ اس میں ہر مرحلے کو ایک عدد (نمبر) کے ذریعے شناخت کیا جاتا ہے۔ مثلاً مرحلہ نمبر ۱ مرحلہ نمبر ۲ وغیرہ۔ دوسری جانب قرآنِ پاک نے جنینی مراحل کی جو تقسیم بیان فرمائی ہے اس کی بنیاد جداگانہ اور بہ آسانی شناخت ہونے کے قابل حالتوں یا ساختوں پر ہے۔ یہی وہ مراحل ہیں جن سے کوئی جنین مرحلہ وار انداز میں گزرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ حالتیں، (ساختیں) بھی قبل از ولادت نشوونما کے مختلف مراحل کی علمبردار ہیں اور ایسی سائنسی توضیحات (وضاحتیں) فراہم کرتی ہیں جو نہایت عمدہ اور قابلِ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ عملی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔ رحمِ مادر میں انسانی جنین کی نشوونما کے مختلف مراحل درج ذیل آیاتِ مبارکہ میں بھی بیان فرمائے گئے ہیں:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ ﴾

(القرآن: سورۃ ۷۵، آیات ۳۷ تا ۳۹)

''کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے پھر اس سے مرد

اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔"

﴿ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ ﴾ (القرآن: سورة، ۸۲، آیات ۷ تا ۸)

"جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا۔"

نیم مکمل اور نیم نامکمل جنین

اگر مضغہ کے مرحلے پر جنین کو درمیان سے کاٹا جائے اور اس کے اندرونی حصوں کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں واضح طور پر نظر آئے گا کہ (مضغہ کے اندرونی اعضا میں سے) بیشتر پوری طرح بن چکے ہیں جب کہ بقیہ اعضا اپنی تکمیل کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ پروفیسر جونس کا کہنا ہے کہ اگر ہم پورے جنین کو ایک مکمل وجود کے طور پر بیان کریں تو ہم صرف اسی حصے کی بات کر رہے ہوں گے جو پہلے سے مکمل ہو چکا ہے۔ اور اگر ہم اسے نامکمل وجود کہیں تو پھر ہم جنین کے ان حصوں کا حوالہ دے رہے ہوں گے جو ابھی پوری طرح سے مکمل نہیں ہوئے بلکہ تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اس موقع پر جنین کو کیا کہنا چاہیے: مکمل وجود یا نامکمل وجود؟ جنینی نشوونما کے اس مرحلے کی جو وضاحت قرآن پاک نے ہمیں دی ہے، اس سے بہتر کوئی اور وضاحت ممکن نہیں۔ قرآن پاک اس مرحلے کو "نیم مکمل اور نیم نامکمل" قرار دیتا ہے۔ درج ذیل آیات مبارکہ ملاحظہ فرمایئے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ﴾ (القرآن: سورة ۲۲ آیت ۵)

"لوگو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر

گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔"

سائنسی نقطۂ نگاہ سے ہم جانتے ہیں کہ جنینی نشوونما کے اس ابتدائی مرحلے پر کچھ خلیات ایسے ہوتے ہیں جو جداگانہ شکل اختیار کر چکے ہیں جب کہ کچھ خلیات امتیازی شکل میں آئے نہیں ہوتے۔ یعنی کچھ اعضا بن چکے ہوتے ہیں اور کچھ ہنوز غیر تشکیل شدہ حالت میں ہوتے ہیں۔

سننے اور دیکھنے کی حسیات

رحمِ مادر میں نشوونما پانے والے انسانی وجود میں سب سے پہلے جو حس جنم لیتی ہے وہ سننے کی حس (حسِ سامعہ) ہوتی ہے۔ ۲۴ ہفتوں بعد کا پختہ جنین (Foetus) آوازیں سننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر حمل کے ۲۸ویں ہفتے تک دیکھنے کی حس (بصارت بھی وجود میں آجاتی ہے اور پردۂ چشم (Retina) روشنی کے لیے حساس ہو جاتا ہے۔ ان مراحل کو قرآنِ پاک یوں بیان فرماتا ہے:

﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۲ آیت ۹)

"پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۶، آیت ۲)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة، ۲۳، آیت ۷۸)

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں دیکھنے اور سننے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

ملاحظہ فرمایئے کہ تمام آیات مبارکہ میں حسِ سماعت کا تذکرہ حسِ بصارت سے پہلے آیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ قرآنِ پاک کی فراہم کردہ توضیحات، جدید جنینیات میں ہونے والی دریافتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔

عمومی سائنس

نشاناتِ انگشت (فنگر پرنٹس)

﴿ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝ ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۵، آیات ۳، ۴)

''کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔''

کفار اور ملحدین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص مرجانے کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے اور اس کی ہڈیاں تک خاک کا پیوند ہو جاتی ہیں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ قیامت کے روز اُس کے جسم کا ایک ایک ذرہ دوبارہ یکجا ہو کر پہلے والی (زندہ) حالت میں واپس آجائے......اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو روزِ محشر اس شخص کی ٹھیک ٹھیک شناخت کیونکر ہو گی؟ اللہ تعالیٰ ربِ ذوالجلال نے مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں اسی اعتراض کا بہت واضح جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) صرف اسی پر قدرت نہیں رکھتا کہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کو واپس یکجا کر دے۔ بلکہ اس پر بھی قادر ہے کہ ہماری انگلیوں کی پوروں تک کو دوبارہ سے پہلے والی حالت میں ٹھیک ٹھیک طور پر لے آئے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآنِ پاک انسانوں کی انفرادی شناخت کی بات کر رہا ہے تو ''انگلیوں کی پوروں'' کا خصوصیت سے تذکرہ کیوں کر رہا ہے؟ سرفرانسس گالٹ کی تحقیق کے بعد ۱۸۸۰ء میں نشاناتِ انگشت (فنگر پرنٹس) کو شناخت کے سائنسی طریقے کا درجہ حاصل ہوا۔ آج ہم یہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی سے بھی دو افراد کی انگلیوں کے نشانات کا نمونہ بالکل ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ ہم شکل جڑواں افراد کا بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں

مجرموں کی شناخت کے لیے ان کے فنگر پرنٹس ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے کس کو نشاناتِ انگشت کی انفرادیت کے بارے میں معلوم تھا؟ یقیناً یہ علم رکھنے والی ذات اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

جلد میں درد کے آخذے (Receptors)

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ محسوسات اور درد وغیرہ کا انحصار صرف اور صرف دماغ پر ہوتا ہے۔ البتہ حالیہ دریافتوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جلد میں درد کو محسوس کرنے والے آخذے (Receptors) ہوتے ہیں۔ اگر یہ خلیات نہ ہوں تو انسان درد کو محسوس کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

جب کوئی ڈاکٹر کسی مریض میں جلنے کے باعث پڑنے والے زخموں کا معائنہ کرتا ہے تو وہ جلنے کا درجہ (شدت) معلوم کرنے کے لیے (جلے ہوئے مقام پر) سوئی چبھو کر دیکھتا ہے۔ اگر سوئی چبھنے سے متاثرہ شخص کو درد محسوس ہوتا ہے تو ڈاکٹر کو اس پر خوشی ہوتی ہے...... کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جلنے کا زخم صرف باہر کی حد تک ہے اور درد محسوس کرنے والے خلیات (درد کے آخذے) محفوظ ہیں۔ اس کے برخلاف، اگر متاثرہ شخص کو سوئی چبھنے پر درد محسوس نہ ہو تو یہ تشویشناک امر ہوتا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جلنے سے بننے والے زخم کی گہرائی زیادہ ہے اور درد کے آخذے بھی مردہ ہو چکے ہیں۔

درج ذیل آیت مبارکہ میں قرآن پاک نے بہت واضح الفاظ میں درد کے آخذوں کی موجودگی کے بارے میں بیان فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ (القرآن: سورۃ ۴، آیت ۵۶)

”جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تا کہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا

ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔"

تھائی لینڈ میں چیانگ مائی یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی کے سربراہ پروفیسر تیگاتات تیجاسان نے درد کے آخذوں پر تحقیق میں بہت وقت صرف کیا ہے۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ قرآن پاک نے ۱۴۰۰ سال پہلے اس سائنسی حقیقت کا انکشاف کر دیا ہو گا۔ تاہم، بعد ازاں جب انہوں نے مذکورہ آیتِ قرآنی کے ترجمے کی باقاعدہ تصدیق کر لی تو وہ قرآن پاک کی سائنسی درستگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سعودی عرب کے شہر ریاض میں منعقدہ آٹھویں سعودی طبی کانفرنس کے موقع پر (جس کا موضوع قرآن پاک اور سنت میں سائنسی نشانیاں تھا) انہوں نے بھرے مجمعے میں فخر و انبساط کے ساتھ کہا:

لا اِلٰہ اِلّا اللہ محمد الرسول اللہ

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (اور) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں)

حرفِ آخر

قرآن پاک میں سائنسی حقائق کی موجودگی کو اتفاق قرار دینا بیک وقت عقلِ سلیم (کامن سینس) اور صحیح سائنسی اندازِ نظر کے بالکل خلاف ہوگا۔ درحقیقت قرآنی آیات کی سائنسی درستگی قرآن پاک کے واضح اعلان کی تائید کرتی ہے:

﴿ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴾

(القرآن: سورۃ ۴۱، آیت ۵۳)

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

قرآن پاک تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق پر غور وفکر کریں:

﴿ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳، آیت ۱۹۰)

''زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوش مندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔''

قرآن پاک میں موجود سائنسی شواہد واشگاف انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ یہ واقعی الہامی ذریعے سے نازل ہوا ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے کوئی انسان ایسا نہیں تھا جو اس قدر اہم اور درست سائنسی حقائق پر مبنی کوئی کتاب لکھ سکتا۔

تاہم قرآن پاک کوئی سائنسی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ "نشانیوں" (Signs) کی کتاب ہے۔ یہ نشانیاں انسان کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ زمین پر اپنے وجود کی غرض وغایت کا احساس کرے اور فطرت سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے رہے۔ اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ قرآنِ پاک اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا کلام ہے..... رب العالمین کا کلام کہ جو کائنات کا خالق و مالک بھی ہے اور اسے چلا بھی رہا ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا وہی پیغام ہے جس کی تبلیغ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام نے کی۔

قرآن اور جدید سائنس کے موضوع پر کثیر تفصیلی علمی مواد قلم بند کیا جا چکا ہے اور اس میدان میں تحقیق ہمہ وقت جاری ہے۔ ان شاء اللہ یہ تحقیق بھی نوعِ انسانی کو اللہ تعالیٰ کے کلام سے قریب لانے میں معاون ثابت ہوگی۔ اس مختصر سی کتاب میں قرآن پاک کے پیش کردہ صرف چند سائنسی حقائق جمع کیے گئے ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے اس موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔

پروفیسر تیجاسان نے قرآن پاک میں بیان کی گئی صرف ایک سائنسی نشانی کی مضبوطی کے باعث اسلام قبول کیا۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو دس اور بعض کو ۱۰۰ سائنسی نشانیوں کی ضرورت ہو، تاکہ وہ قرآن کے من جانب اللہ ہونے کو تسلیم کرسکیں، کچھ لوگ شاید ایسے بھی ہوں جو ہزار نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود بھی سچائی کو قبول کرنا نہ چاہتے ہوں۔ قرآن پاک نے اس تنگ نظری کی درج ذیل آیتِ مبارکہ میں مذمت فرمائی ہے:

﴿ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲، آیت ۱۸)

"بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔"

قرآن پاک انفرادی زندگی اور اجتماعی معاشرت، سب ہی کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ الحمد للہ قرآن پاک ہمیں زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتاتا ہے وہ ان تمام ''ازموں'' سے بالاتر ہے جو جدید انسان نے محض اپنی کم فہمی اور لاعلمی کی بنا پر ایجاد کیے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ خود خالق سے بہتر کوئی اور رہنمائی دے سکے؟ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عاجزانہ کوشش کو قبول فرمائے ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں صحیح راستہ دکھائے۔ (آمین)

اسلام

دہشت گردی یا عالمی بھائی چارہ

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

سید امتیاز احمد

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۲۰۰۶ء

کتاب: اسلام دہشت گردی یا عالمی بھائی چارہ

مصنف: ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم: سید امتیاز احمد

اہتمام: دار النوادر، لاہور

مطبع: موٹر وے پریس، لاہور

قیمت: ۵۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ترتیب

☆......☆......☆

اسلام اور عالمی بھائی چارہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ٥

(۱۳:۴۹)

آج ہمارا موضوع ہے عالمی بھائی چارہ۔ بھائی چارے کی متعدد اقسام ہیں یعنی کئی طرح کا بھائی چارہ ممکن ہے۔ مثال کے طور پر:

- خاندان اور قرابت داری کی بنیاد پر بھائی چارہ
- علاقے اور وطن کی بنا پر بھائی چارہ
- ذات پات اور قوم یا قبیلے کی بنیاد پر بھائی چارہ
- اور عقاید کی بنیاد پر قایم بھائی چارہ

لیکن بھائی چارے کے متذکرہ بالا تمام تصورات محدود ہیں جب کہ اسلام لامحدود عالمی بھائی چارے کا تصور پیش کرتا ہے۔ میں نے گفتگو کا آغاز جس آیت سے کیا ہے، اس میں اسلام میں بھائی چارے کا تصور بہت واضح طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ

لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○

(۴۹:۱۳)

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں قرآن بنی نوع انسان سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم کو قبیلوں اور قوموں میں اس لیے تقسیم کیا گیا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو یعنی یہ تقسیم محض تعارف کے لیے ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس بنیاد پر ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا شروع کردیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں فضیلت اور برتری کا معیار جنس، ذات، رنگ و نسل اور مال و دولت نہیں ہے۔ معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے، پرہیزگاری، نیکوکاری اور حسن عمل ہے۔ جو شخص زیادہ متقی ہے، زیادہ پرہیزگار ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا ہے وہی اللہ کے ہاں زیادہ عزت والا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر شے کے بارے میں پورا علم رکھتا ہے۔

قرآنِ مجید میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ○ (۳۰: ۲۲)

''اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔''

یہاں قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ رنگ، نسل اور زبانوں کا اختلاف اللہ ہی کا پیدا کردہ

ہے۔ یہ کالے، گورے، لال، پیلے لوگ سب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ لہٰذا اس اختلاف کی بنیاد پر نفرت کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ روئے زمین پر بولی جانے والی ہر زبان خوبصورت ہے۔ اگر آپ نے کوئی زبان پہلے نہیں سنی ہوئی یا آپ یہ زبان نہیں جانتے تو عین ممکن ہے کہ آپ کو وہ زبان مضحکہ خیز معلوم ہو۔ لیکن جو لوگ اس زبان کو بولنے والے ہیں، ان کے لیے شاید یہ دنیا کی سب سے خوبصورت زبان ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زبان اور رنگ و نسل کے یہ اختلاف محض تعارف اور پہچان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (۱۷: ۷۰)

"اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔"

یہاں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف عربوں کو عزت دی ہے یا صرف امریکیوں کو عزت دی ہے یا کسی خاص قوم کو عزت دی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تمام اولاد کو عزت دی ہے۔ رنگ، نسل، قوم، عقیدے اور جنس کے امتیاز کے بغیر ہر انسان کو عزت دی ہے۔ بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ نسلِ انسانی کا آغاز ایک ہی جوڑے سے ہوا ہے یعنی آدم و حوا علیہما السلام سے۔ لیکن بہت سے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام کی غلطی اور گناہ کی وجہ سے پوری بنی نوع انسان گناہ گار ہو گئی ہے۔ وہ ہبوطِ آدم علیہ السلام کی ذمہ داری ایک عورت پر، یعنی حوا علیہا السلام پر ڈالتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس واقعہ کا ذکر موجود ہے لیکن بلا استثنیٰ ہر جگہ دونوں کو یکساں ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ آدم اور حوا علیہما السلام میں سے محض کسی ایک کو قصوروار نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اگر آپ قرآنِ مجید کی سورۂ اعراف کا مطالعہ کریں

تو وہاں ارشاد ہوتا ہے:

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ٥ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ٥ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ٥ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ٥ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ٥

(۷:۱۹-۲۴)

"اور اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے ان کو بہکایا تا کہ ان کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں، ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا "تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمہیں ہمیشگی کی زندگی نہ حاصل ہو جائے۔" اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انھوں نے اس درخت کا مزہ چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ تب ان کے رب نے انھیں پکارا

''کیا میں نے تمھیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟'' دونوں بول اٹھے: ''اے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔'' فرمایا: اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لیے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامانِ زیست ہے۔''

مندرجہ بالا آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آدم اور حوا علیہما السلام دونوں سے غلطی ہوئی، دونوں معافی کے خواستگار ہوئے اور دونوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا۔ قرآنِ مجید میں کسی جگہ بھی اس غلطی کے لیے اکیلی حوا علیہا السلام کو ذمہ دار قرار نہیں دیا گیا بلکہ ایک آیت تو ایسی ہے جس میں صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے۔

وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی ۝ (۲۰:۱۲۱)

''اور آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔''

لیکن (جیسا کہ عرض کیا گیا) بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور پوری انسانیت ان کی وجہ سے گنہگار ٹھہری۔ اسلام اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ اسی طرح یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے عورت سے ناراض ہو کر اس کو اولاد پیدا کرنے کی تکلیف میں مبتلا کیا، اس سے بھی اسلام قطعاً اتفاق نہیں کرتا۔ اس طرح تو ماں بننے کا عمل ایک سزا اور عذاب ٹھہرتا ہے۔

سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً وَ اتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَ الْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا ۝ (۴:۱)

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا

دیے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔''

اسلام کا موقف تو یہ ہے کہ ماں بننے کا عمل عورت کے مقام اور مرتبے میں اضافہ کرنے والا عمل ہے۔

سورۂ لقمان میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ وَّ فِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْلِي وَ لِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ (۳۱: ۱۴)

''اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اسے نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔''

اسی طرح سورۂ احقاف میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسٰنًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ط (۴۶:۱۵)

''اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔''

حمل، عورت کو مزید محترم اور مکرم کرتا ہے۔ یہ کوئی سزا نہیں۔

اسلام عورت اور مرد کو برابر اور مساوی قرار دیتا ہے۔ صحیح بخاری کتاب الآداب میں ایک حدیث ہے، جس کا مفہوم ہے:

''ایک شخص جناب پیغمبر ﷺ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ یا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم! مجھ پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:
''تیری ماں کا۔'' اس شخص نے پوچھا کہ اس کے بعد؟ آپ ﷺ نے فرمایا:
''تیری ماں۔'' اس نے پھر پوچھا کہ اس کے بعد؟ آپ ﷺ نے پھر فرمایا:
''تیری ماں۔'' اس شخص نے چوتھی مرتبہ پوچھا کہ اس کے بعد کون؟ تو آپ صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارا باپ۔''

گویا مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اولاد پر تین چوتھائی یا پچھتر فی صد حق ماں کا بنتا ہے اور ایک چوتھائی یا پچیس فی صد باپ کا۔ اسے گولڈ میڈل بھی ملتا ہے، سلور میڈل بھی اور برونز میڈل بھی جب کہ باپ کو صرف حوصلہ افزائی کا انعام ملتا ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات ہیں۔

اسلام مرد اور عورت کو برابر قرار دیتا ہے لیکن برابری کا مطلب یکسانیت نہیں ہے۔ اسلام میں خواتین کے حقوق اور مقام کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ غیر مسلموں اور خود مسلمانوں میں پائی جانے والی یہ تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں اگر اسلام کو قرآن اور صحیح احادیث کی مدد سے سمجھا جائے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا اسلام میں مجموعی طور پر مرد اور عورت برابر ہیں لیکن اس برابری کا مطلب یکسانیت نہیں ہے۔ اس حوالے سے میں ایک مثال پیش کیا کرتا ہوں۔

فرض کیجیے ایک ہی جماعت میں دو طالب علم ہیں ''الف'' اور ''ب''۔ یہ دونوں طالب علم ایک امتحان میں اوّل آئے ہیں کیوں کہ دونوں نے سو میں سے اسّی نمبر حاصل کیے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کے پرچوں کا تجزیہ کریں تو صورتِ حال یہ ہے کہ پرچے میں دس سوال ہیں اور ہر سوال کے دس نمبر ہیں۔ پہلے سوال میں طالب علم ''الف'' نے دس میں سے نو نمبر لیے ہیں اور طالب علم ''ب'' نے دس میں سے سات نمبر لیے ہیں، لہٰذا پہلے سوال کی حد تک طالب علم ''الف'' کو ایک درجہ برتری حاصل ہے۔ دوسرے میں ''ب'' نے نو اور ''الف'' نے سات نمبر لیے ہیں لہٰذا دوسرے سوال میں برتری طالب علم ''ب'' کو حاصل ہے۔ باقی آٹھ سوالوں میں دونوں طالب علموں نے آٹھ آٹھ نمبر حاصل کیے ہیں۔ مجموعی

طور پر دونوں طالب علموں کے نمبر ۸۰، ۸۰ ہیں۔

اس تجزیے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مجموعی طور پر تو دونوں طالب علم برابر ہیں لیکن کسی سوال میں ''الف'' کو برتری حاصل ہے اور کسی میں ''ب'' کو۔ اسی طرح اسلام میں عورت اور مرد کو مجموعی طور پر مساوی درجہ دیا گیا ہے لیکن کسی جگہ عورت کا درجہ زیادہ ہے تو کہیں مرد کو فضیلت حاصل ہے۔ اسلام میں بھائی چارے سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف مرد ہی آپس میں برابر ہیں۔ اس بھائی چارے میں خواتین بھی شامل ہیں۔ عالمی بھائی چارے سے یہی مراد ہے کہ رنگ، نسل، زبان اور عقیدے کے علاوہ جنس کی بنیاد پر بھی انسانوں کے درمیان کوئی فرق روا رکھنا جائز نہیں۔ سب برابر ہیں البتہ جزوی فرق ضرور موجود ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے میرے گھر میں ایک ڈاکو آ جاتا ہے۔ اب میں خواتین کے حقوق اور آزادی پر پورا یقین رکھتا ہوں اور دونوں جنسوں کو بالکل برابر سمجھتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں یہ نہیں کہوں گا کہ میری بیوی یا بہن یا ماں جائیں اور ڈاکو کا مقابلہ کریں کیوں کہ اللہ تعالیٰ سورۂ نسا میں فرماتا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ط (۴:۳۴)

''مرد عورتوں پر قوام ہیں۔''

چوں کہ مرد کو جسمانی قوت زیادہ عطا کی گئی ہے لہٰذا اس حوالے سے اسے ایک درجہ برتری حاصل ہے اور یہ اس کا فرض ہے کہ خواتین کی حفاظت کرے۔ گویا قوتِ جسمانی ایک ایسا پہلو ہے جس کے حوالے سے مرد کو برتری حاصل ہے جب کہ اولاد پر حق کے حوالے سے عورت کو برتری حاصل ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ اولاد پر ماں کا حق تین گنا زیادہ ہے۔ اگر آپ اس حوالے سے مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب ''اسلام میں خواتین کے حقوق...... جدید یا فرسودہ؟''● کا مطالعہ کریں۔

اس کتاب میں، میں نے خواتین کے حقوق کو چھ اقسام یا درجات میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ میری تقریر پر مشتمل ہے جس میں اسلام میں خواتین کے روحانی حقوق،

● شائع کردہ، دارالنوادر، الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔

معاشی حقوق، قانونی حقوق، تعلیمی حقوق، سماجی حقوق اور سیاسی حقوق کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ سوال و جواب پر مشتمل ہے، جس میں اسلام میں خواتین کے مقام اور ان کے حقوق کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام میں اللہ تعالیٰ کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ کسی خاص قوم یا خاص نسل کا خدا ہے۔

قرآنِ مجید کی پہلی سورۃ میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ (۱: ۱۔۳)

"تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے۔ نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ روزِ جزا کا مالک ہے۔"

اور آخری سورۃ میں بتایا جاتا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ (۱۱۴: ۱)

"کہو میں پناہ مانگتا ہوں (تمام) انسانوں کے رب کی۔"

اسی طرح سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (۲: ۱۶۸)

"لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انھیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

اسلام اس دنیا میں حقیقی عالمی بھائی چارہ قائم کرنے کے لیے ایک مکمل نظامِ اخلاقیات بھی دیتا ہے۔ اسلام ایک ایسا اخلاقی قانون فراہم کرتا ہے، جس کی مدد سے پوری دنیا میں بھائی چارے پر مبنی معاشرے کا قیام ممکن ہو جاتا ہے۔

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ

جَمِیْعًا ط وَ مَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ط (۵:۳۲)

''جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔''

یہاں قرآن کہتا ہے کہ اگر کوئی کسی انسان کو قتل کرتا ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ انسان مسلمان تھا یا غیر مسلم، تو یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے پوری انسانیت کو قتل کرنا۔ یہاں نہ مذہب اور عقیدے کی تخصیص کی گئی ہے نہ رنگ ونسل اور جنس کی۔ کسی بھی بے قصور انسان کو قتل کرنا ایسا ہے جیسے پوری انسانیت کو قتل کرنا۔ دوسری طرف اگر کوئی کسی انسان کی جان بچاتا ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے پوری انسانیت کو بچالیا جائے۔ یہاں بھی کوئی تخصیص نہیں کی گئی کہ بچایا جانے والا انسان کس مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہو؟

اسلام اس مقصد کے لیے متعدد اخلاقی قوانین وضع کرتا ہے تاکہ عالمی بھائی چارہ دنیا کے ہر حصے میں جاری وساری ہو سکے۔ قرآنِ مجید ہر صاحبِ نصاب کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یعنی ہر قمری سال میں ۲٫۵ فی صد کے حساب سے مستحقین میں تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

آج اگر پوری دنیا میں ہر شخص زکوٰۃ ادا کرنا شروع کر دے تو دنیا سے غربت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو سکتا ہے یہاں تک کہ دنیا میں کوئی شخص بھی بھوک سے نہیں مرے گا۔ قرآن ہمیں اپنے پڑوسیوں کے کام آنے کا بھی حکم دیتا ہے۔

قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ○ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ○ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ○ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ○ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ ○ الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ ○ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ○

(۱۰۷: ۱-۷)

''تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ جو ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔''

اسی طرح ایک حدیث نبوی ﷺ کا مفہوم ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص مسلمان نہیں جس کا ہمسایہ بھوکا ہو اور وہ خود پیٹ بھر کر سو جائے۔''

ایسا شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر عمل نہیں کر رہا۔ قرآن فضول خرچی سے بھی روکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۝ (۱۷: ۲۶، ۲۷)

''رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔ فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔''

اگر آپ اسراف کا مظاہرہ کرتے ہیں تو یقیناً آپ بھائی چارے کی فضا خراب کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔ کیوں کہ جب ایک شخص فضول خرچی اور ریا کاری کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں ناپسندیدگی اور نفرت کے جذبات کو فروغ ملتا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا کسی کو بھی دوسرے کا حق نہیں مارنا چاہیے بلکہ ایک دوسرے کی امداد کرنی چاہیے۔ اپنے پڑوسیوں کے کام آنا چاہیے۔ یہ تمام اخلاقی اصول ہیں جن کا ذکر قرآنِ عظیم میں موجود ہے۔

اسی طرح قرآن رشوت سے بھی سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔ قرآنِ مجید کی سورۂ بقرہ

میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ (۲: ۱۸۸)

''اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔''

گویا اس بات سے منع کیا جا رہا ہے کہ رشوت کے ذریعے دوسروں کا مال ہتھیانے کی کوشش کی جائے۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی بھی شخص اپنے بھائی کی جائداد یا مال کو ہتھیانے کی کوشش کرے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○ (۵: ۹۰)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔''

اس آیت مبارکہ میں قرآنِ پاک ہمیں تمام نشہ آور اشیا یعنی شراب وغیرہ اور جوئے، قمار بازی سے اور اسی طرح ضعیف الاعتقادی کے مختلف شرکیہ مظاہر سے روک رہا ہے۔ کیوں کہ یہ سب شیطانی افعال ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ معاشرے میں موجود بہت سی برائیوں کا بنیادی سبب منشیات کا استعمال ہے۔ اور نتیجتاً، یہ اُس مثالی بھائی چارے کی فضا کو بھی مکدر کرنے کا سبب بنتا ہے جو ایک حقیقی اسلامی اور فلاحی معاشرے کا مقصود ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ امریکہ میں اوسطاً روزانہ تقریباً ایک ہزار نو سو جنسی زیادتی کے واقعات ہوتے ہیں اور بیش تر صورتوں

میں زیادتی کرنے والے یا زیادتی کا شکار ہونے والے نشے کی حالت میں ہوتے ہیں۔

اسی طرح شماریاتی اعداد و شمار ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں (Incesl) کے واقعات کی شرح آٹھ فی صد ہے یعنی ہر بارھواں یا تیرھواں فرد محرمات کے ساتھ زنا میں ملوث ہے۔

اور محرمات کے ساتھ زنا کے تقریباً تمام واقعات نشے کی حالت میں ہی ہوتے ہیں۔

ایڈز جیسی بیماریوں کے دنیا میں اس قدر تیزی سے پھیلنے کی وجوہات میں سے ایک وجہ منشیات بھی ہے۔ اسی لیے قرآن جوئے اور منشیات کو شیطانی اعمال قرار دیتا ہے۔ کامیابی اور فوز و فلاح کے حصول کے لیے ان شیطانی افعال سے اجتناب ضروری ہے۔ اگر آپ واقعی ان اعمال سے مجتنب رہتے ہیں تو دنیا بھر میں حقیقی بھائی چارے کا ماحول قایم کرنے میں مدد ملے گی۔

قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ (۱۷: ۳۲)

"زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔"

گویا اسلام بدکرداری سے سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔

سورۂ حجرات میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاۗءٌ مِّنْ نِّسَاۗءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۴۹: ۱۱-۱۲)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بُری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں، اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔''

اس قرآنی ارشاد کے مطابق کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا یا غیبت کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا اور اس کام کی کراہت اس مثال سے واضح ہو جاتی ہے۔ انسانی گوشت کھانا ہی حرام ہے اور اپنے مردہ بھائی کا گوشت...... گویا حرمت دگنی ہو جاتی ہے۔ آدم خور لوگ جو انسانی گوشت مزے لے لے کر کھاتے ہیں وہ بھی اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اگر آپ کسی کی غیبت کرتے ہیں تو یہ دہرا گناہ ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ تو کیا آپ یہ پسند کریں گے؟ قرآن خود جواب دیتا ہے، کہ نہیں تم یہ پسند نہیں کرو گے۔ کوئی بھی یہ پسند نہیں کرے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ (۱۰۴ : ۱)

''تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن کرنے اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خُوگر ہے۔''

قرآنِ مجید اور احادیث صحیحہ میں دیے گئے یہ تمام اخلاقی اصول، حقیقی بھائی چارے کو فروغ دینے والے اور مستحکم کرنے والے ہیں۔ اسلام کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ محض بھائی

چارے کا ذکر نہیں کرتا بلکہ بھائی چارے کے عملی مظاہرے کے لیے بھی مطلوبہ اقدامات پر زور دیتا ہے۔

مسلمان اس بھائی چارے کا ایک عملی مظاہرہ دن میں پانچ مرتبہ نماز باجماعت کی ادائیگی کے دوران کرتے ہیں۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث کا مفہوم ہے:

''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب ہم لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو کندھے سے کندھا اور پاؤں سے پاؤں ملا کر کھڑے ہوتے تھے۔''

سنن ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ کی ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنی صفیں سیدھی کرلیا کرو، کندھے سے کندھا ملا لیا کرو اور شیطان کے لیے خالی جگہ نہ چھوڑا کرو۔''

مندرجہ بالا حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز کے دوران ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہوا کرو اور شیطان کے لیے خالی جگہ نہ چھوڑا کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اس شیطان کا ذکر نہیں کر رہے جسے آپ لوگ ٹی وی پر دیکھتے ہیں جس کے دو سینگ اور ایک دُم ہوتی ہے۔ یہاں شیطان سے مراد اس قسم کی کوئی مخلوق نہیں ہے بلکہ یہاں مراد نسل پرستی کا شیطان ہے، علاقائی تعصب کا شیطان ہے۔ رنگ وذات پات اور زبان کے تعصب کا شیطان ہے جسے اپنی صفوں میں جگہ دینے سے یہاں روکا جا رہا ہے۔

بین الاقوامی بھائی چارے کی ایک بڑی مثال ''حج'' ہے۔ دنیا بھر سے تقریباً پچیس لاکھ افراد فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب کے شہر مکہ پہنچتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا کے کونے کونے سے وہاں آتے ہیں، امریکہ سے، کینیڈا سے، برطانیہ سے، سنگاپور، ملیشیا، ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا غرض کہ دنیا بھر سے مسلمان حج کے لیے مکہ مکرمہ پہنچتے ہیں۔

اس موقع پر تمام مرد دو ایک جیسی اَن سلی سفید چادروں میں ملبوس ہوتے ہیں۔ اس

موقع پر آپ اپنے اردگرد کھڑے لوگوں کے بارے میں یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی کیا حیثیت ہے۔ وہ بادشاہ ہوں یا فقیر ان کا حلیہ ایک سا ہوگا۔ بین الاقوامی بھائی چارے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے؟ حج دنیا کا سب سے بڑا سالانہ اجتماع ہے۔ کم از کم پچیس لاکھ افراد وہاں جمع ہوتے ہیں۔ آپ بادشاہ ہوں یا فقیر، غریب ہوں یا امیر، گورے ہوں یا کالے، شرقی ہوں یا غربی، آپ ایک ہی لباس میں ملبوس ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں اعلان فرمادیا کہ تمام انسان ایک ہی رب کی مخلوق ہیں لہٰذا؛

''کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ کوئی گورا کالے سے یا کالا گورے سے افضل نہیں ہے برتری کی بنیاد صرف اور صرف تقویٰ ہے۔''

صرف تقویٰ، پرہیزگاری، نیکی اور خوفِ خدا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں فضیلت کا معیار ہیں۔ آپ کی قوم، آپ کا رنگ آپ کو کوئی برتری نہیں دلاتے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب انسان برابر ہیں۔

ہاں اگر آپ اللہ سے زیادہ ڈرنے والے ہیں، زیادہ پرہیزگار ہیں، زیادہ متقی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی نظر میں آپ کے افضل ہونے کا امکان ہے۔

حج کے موقع پر تمام حاجی مسلسل یہی الفاظ دہراتے ہیں:

((لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ ....))

''ترجمہ: حاضر ہوں، اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ نہیں کوئی معبود............''

پورے حج کے دوران وہ مسلسل یہ الفاظ دہراتے رہتے ہیں تاکہ یہ ان کے ذہن میں راسخ ہو جائیں یہاں تک کہ جب وہ واپس آتے ہیں تو پھر بھی یہ الفاظ ان کے ذہن میں رہتے ہیں۔

اسلامی عقیدے کا بنیادی ستون یہی ہے کہ اس بات پر ایمان رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ

ہی اس کائنات کا واحد بلاشرکت غیرے خالق اور مالک ہے۔ صرف وہی ہے جس کی عبادت کی جانی چاہیے۔ اگر آپ غور کریں تو ایک اور صرف ایک خدا پر ایمان کی صورت میں ہی عالمی بھائی چارے کا قیام ممکن ہے۔

ایک ہی خدا پوری انسانیت کا خالق ہے۔ اسی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ آپ امیر ہوں یا غریب، کالے ہوں یا گورے، مرد ہوں یا عورت، آپ کا تعلق کسی عقیدے سے ہو، کسی ذات سے ہو، کسی ملک یا علاقے سے ہو، آپ سب برابر ہیں کیوں کہ آپ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔ آپ سب کو خدائے واحد ہی نے پیدا کیا ہے۔ اگر آپ ایک رب پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ کے درمیان حقیقی بھائی چارہ قایم ہونا ممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیش تر بڑے مذاہب میں ایک اعلیٰ سطح پر خدائے واحد کا تصور پایا جاتا ہے۔

آکسفرڈ انگریزی ڈکشنری میں مذہب کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

" Belief in a super human controlling power, a God or gods that deserve worship & obedience."

اس تعریف کی روشنی میں اگر آپ کسی مذہب کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مذہب میں خدا کے تصور کو سمجھا جائے۔ اور کسی مذہب کے تصور خدا کو، اس مذہب کے ماننے والوں کے اعمال و افعال کو سامنے رکھ کر نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیوں کہ ضروری نہیں کہ کسی مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کی حقیقی تعلیمات سے آگاہ ہوں اور ان پر عمل بھی کر رہے ہوں۔ لہٰذا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس مذہب کے متونِ مقدسہ کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ ان میں خدا کا کیا تصور پیش کیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید سورۂ آلِ عمران میں ہمیں بتاتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ

اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ o (۳:۶۴)

''اے نبی ﷺ، کہو! اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم (خدا کی اطاعت و بندگی کرنے والے) ہیں۔''

جیسا کہ عرض کیا گیا کسی مذہب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس مذہب میں خدا کے تصور کو سمجھ لیا جائے۔ اگر کسی مذہب کا تصورِ خدا آپ کی سمجھ میں آ گیا تو گویا آپ نے اس مذہب کو سمجھ لیا۔

آیئے سب سے پہلے ہندومت کے تصور خدا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر آپ ایک عام ہندو سے، جو عالم نہیں ہے، یہ پوچھیں گے کہ وہ کتنے خداؤں کی عبادت کرتا ہے تو اس کا جواب مختلف ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کہے ''تین'' یا کہے کہ ''ایک سو'' یا ''ایک ہزار''۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا جواب ہو ۳۳ کروڑ۔ لیکن اگر آپ ایک پڑھے لکھے عالم ہندو سے یہی سوال پوچھیں تو اس کا جواب ہوگا، حقیقتاً ہندوؤں کو ایک اور صرف ایک خدا ہی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی پر ایمان رکھنا چاہیے۔ عام ہندو ''حلول'' کے عقیدے پر یقین رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر چیز ہی خدا ہے، درخت خدا ہے، سورج خدا ہے، چاند خدا ہے، بندر خدا ہے، سانپ خدا ہے اور خود انسان بھی خدا ہے۔ ''ہر چیز خدا ہے۔''

جب کہ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ''ہر چیز خدا کی ہے۔'' یعنی ہم اس جملے میں صرف ایک لفظ ''کی'' کا اضافہ کرتے ہیں۔ ''ہر چیز خدا کی ہے۔'' سارا فرق اسی ایک لفظ ''کی'' کا ہے۔ ہندو کہتا ہے ''ہر چیز خدا ہے۔'' مسلمان کہتا ہے ''ہر چیز خدا کی ہے۔'' اگر اس ایک لفظ کا مسئلہ حل کر لیا جائے تو ہندو اور مسلمان متفق ہوسکتے ہیں۔ ان کے اختلافات کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

یہ کس طرح ہوگا؟ قرآن اس کا طریقہ یہ بتاتا ہے کہ جو امور ہمارے درمیان مشترک

ہیں ان پر اتفاقِ رائے کر لیا جائے۔ اور ان میں سے پہلا امر کیا ہے؟ یہ کہ ہم خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہندوؤں کے متون مقدسہ میں سے سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اور سب سے مقبولِ عام ''بھگود گیتا'' ہے۔ اگر آپ بھگود گیتا کا مطالعہ کریں تو اس میں آپ کو یہ بیان بھی ملے گا:

''اور وہ لوگ جن کی عقل وفہم مادی خواہشات سلب کر چکی ہیں، وہ جھوٹے خداؤں کی عبادت کرتے ہیں۔ ایک حقیقی خدا کے علاوہ۔'' (۷/۱۳)

اسی طرح اگر آپ اپنشد کا مطالعہ کریں تو آپ چندوگیہ اپنشد میں لکھا ہوا پائیں گے کہ:

''خدا ایک ہی ہے، دوسرا کوئی نہیں۔'' (جلد اول، حصہ دوم، باب ۶)

''اس ایک کے علاوہ کوئی خدا نہیں اور وہ کسی سے پیدا بھی نہیں ہوا۔''

(سویتا سوترا اپنشد)

''اس جیسا کوئی بھی نہیں۔'' (سویتا سوترا اپنشد)

''اس کی کوئی صورت نہیں ہے، اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔'' (سویتا سوترا اپنشد)

اسی طرح ہندومت کے متونِ مقدسہ میں سے مقدس ترین ویدوں کو تصور کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر چار وید ہیں:

۱۔ رگ وید ۲۔ یجر وید

۳۔ سام وید ۴۔ اتھر وید

اگر آپ ان ویدوں کا مطالعہ کریں تو ان میں آپ کو اس قسم کے بیانات ملیں گے:

''اس کا کوئی عکس نہیں ہے۔'' (یجر وید)

''وہ جسمانیت سے پاک اور خالص ہے۔'' (یجر وید)

اور یجر وید کی اگلی ہی سطر میں یہ بیان بھی موجود ہے:

''جو لوگ اسمبھوتی کی پوجا کرتے ہیں وہ اندھیرے میں داخل ہو رہے

ہیں۔"   (یجروید)

"اسمبھوتی" سے مراد قدرتی مظاہر مثلاً آگ، پانی اور ہوا وغیرہ ہیں۔ آگے مزید یہ کہا جاتا ہے:

"اور جو لوگ اسمبھوتی کی پوجا کرتے ہیں وہ اس سے زیادہ اندھیرے میں داخل ہو رہے ہیں۔"   (یجروید)

اسمبھوتی سے مراد ہے انسان کی بنائی ہوئی چیزیں مثلاً میز، کرسیاں وغیرہ۔ انسان کے بنائے ہوئے بت بھی اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح اگر آپ اتھروید کا مطالعہ کریں تو اس میں بھی آپ کو اس قسم کے بیانات ملیں گے:

"اور بلاشبہ عظمت خدائے عظیم ہی کے لیے ہے۔"   (اتھروید)

ویدوں میں سے مقدس ترین "رگ وید" کو سمجھا جاتا ہے۔

"سادھو اور نیک لوگ خدائے عظیم کو کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔"

(رگِ وید)

رگ وید میں خدائے عظیم کی کئی صفات بیان کی گئی ہیں اور اس کے لیے کئی نام استعمال کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک "برھما" ہے۔

اگر آپ برھما کا انگریزی ترجمہ کریں تو وہ ہوگا: ...... Creator

اور اگر آپ برھما کا عربی ترجمہ کریں تو وہ ہوگا: ...... خالق

ہم مسلمانوں کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ کوئی خدائے عظیم کو خالق کہہ کر پکارتا ہے یا Creator کہہ کر یا برھما کہہ کر۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ برھما وہ خدا ہے جس کے چار سر ہیں اور ہر سر پر ایک تاج ہے، تو ہم مسلمان اس بات پر شدید اعتراض کریں گے۔ مزید برآں یہ بات سویتا سوترا اپنشد کے بھی خلاف جائے گی جس میں کہا گیا ہے:

"کوئی اس سے مشابہ نہیں ہے۔"

لیکن آپ برھما کو ایک معین تشبیہ دے رہے ہیں۔

اسی طرح رگ وید میں خدا کو وشنو کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ یہ بھی ایک خوبصورت نام ہے جس کا انگریزی ترجمہ The Sustainer ہوگا۔ عربی میں اس لفظ کا ترجمہ ہوگا ''ربّ''۔

ہم مسلمانوں کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ خدائے واحد کو رب یا Sustainer یا وشنو کہہ کر پکارا جائے۔ لیکن اس وقت یقیناً ہمیں شدید اعتراض ہوگا جب کہا جائے کہ وشنو وہ خدا ہے جس کے چار ہاتھ ہیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں ''چکر'' ہے، ایک ہاتھ میں کنول کا پھول ہے۔ اس قسم کے بیانات سے ہم قطعاً اتفاق نہیں کریں گے۔

مزید برآں یہ بات کرنے والے ویدوں کے اس ارشاد کی بھی مخالفت کریں گے کہ ''اس کا کوئی عکس نہیں ہے۔'' کیوں کہ اس طرح وہ خدا کا عکس ایک معین شبیہ کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ رگ وید میں یہ بھی کہا گیا ہے:

''جملہ تعریفیں اسی کے لیے ہیں اور وہی پوجا کے لائق ہے۔'' (رگ وید)

''بھگوان ایک ہی ہے، دوسرا نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے، ذرا بھی نہیں ہے۔''

(رگ وید)

گویا خود ہندومت کے متونِ مقدسہ پڑھ کر ہی ہندو مذہب کے حقیقی عقاید کو سمجھا جاسکتا ہے اور یوں ہندومت کے تصورِ خدا کی تفہیم ممکن ہے۔

اب ہم آتے ہیں یہودیت کے تصورِ خدا کی جانب۔ اگر آپ عہد نامۂ عتیق کا مطالعہ کریں تو اس میں آپ کو مندرجہ ذیل آیات ملیں گی۔

''قدوس، قدوس، قدوس رب الافواج ہے۔ ساری زمین اس کے جلال سے معمور ہے۔'' (یسعیاہ: ۶/۴)

''میں ہی یہوواہ ہوں اور میرے سوا کوئی بچانے والا نہیں۔'' (یسعیاہ: ۴۳/۱۱)

''میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں۔ میرے سوا کوئی خدا نہیں۔''

(یسعیاہ: ۴۵/۵)

''یاد کرو کہ میں خدا ہوں اور کوئی دوسرا نہیں، میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی

نہیں۔" (یسعیاہ: ۹/۴۶)

میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بناتا۔ نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین میں یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ ان کی عبادت کرنا کیوں کہ میں خداوند تیرا خدا، غیور خدا ہوں۔ (خروج: ۵-۷/۲۰)

یوں عہد نامہ قدیم کا مطالعہ کر کے آپ یہودیت میں خدا کا تصور اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

لہٰذا ہم یہ دیکھنے میں حق بجانب ہیں کہ یہودیت کے تصور خدا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے پرانے عہد نامے سے ہی سمجھا جائے۔ مسیحیت کے تصورِ خدا پر بات کرنے سے قبل میں یہ واضح کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ خود عیسائیت کے علاوہ، اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا بنیادی عقاید میں شامل ہے۔ کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی تسلیم نہ کرے۔ ہم انھیں مسیح علیہ السلام سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کی پیدائش معجزاتی طور پر ہوئی تھی۔ وہ بغیر کسی باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ حالانکہ آج کل کے بہت سے عیسائی یہ بات تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں معجزات عطا فرمائے تھے۔ وہ اللہ کے حکم سے کوڑھیوں کو ٹھیک کر دیتے تھے۔ اندھوں کی بینائی لوٹا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ یہاں تک تو ہم اور عیسائی متفق ہیں لیکن کچھ عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدائی میں شریک ہونے کا یا الوہیت کا دعویٰ کیا تھا۔

حالانکہ اگر آپ انجیل کا مطالعہ کریں تو پوری انجیل میں کہیں بھی آپ کو کوئی ایسا بیان نہیں ملے گا جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے الوہیت کا دعویٰ کیا ہو یا یہ کہا ہو کہ میری عبادت کرو۔

انجیل میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قسم کے ارشادات ملتے ہیں:

"اگر تم مجھ سے محبت رکھتے تو اس بات سے خوش ہوتے کہ میں باپ کے پاس

جاتا ہوں کیوں کہ باپ مجھ سے بڑا ہے۔" [یوحنا ۲۸:۱۴]

"میرا باپ سب سے بڑا ہے۔" [یوحنا ۲۹:۱۰]

"میں خدا کی روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں۔" [متی ۲۸:۱۲]

"میں بدروحوں کو خدا کی قدرت سے نکالتا ہوں۔" [لوقا ۲۰:۱۱]

"میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کرسکتا، جیسا سنتا ہوں عدالت کرتا ہوں اور میری عدالت راست ہے کیوں کہ میں اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی سے چاہتا ہوں۔" [یوحنا ۳۰:۵]

اگر کوئی یہ کہے کہ میں اپنی مرضی نہیں چاہتا بلکہ خدا کی مرضی چاہتا ہوں تو یہ درحقیقت "اپنی مرضی کو اللہ کی رضا کے تابع کر دینا ہے۔" اور اگر اس کا عربی ترجمہ ایک لفظ میں کیا جائے تو وہ لفظ ہوگا "اسلام"۔ وہ شخص جو اپنی مرضی اور خواہش کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کے تابع کر دیتا ہے، مسلمان کہلاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے سے پہلے کے انبیائے کرام کی شریعتیں ختم کرنے کے لیے تشریف نہیں لائے تھے بلکہ درحقیقت وہ ان کی تصدیق کے لیے آئے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود فرماتے ہیں:

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیوں کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں، ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا۔ جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے، پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا، وہ آسمان کی بادشاہی میں سب سے چھوٹا کہلائے گا لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور ان کی تعلیم دے گا وہ آسمان کی بادشاہی میں بڑا کہلائے گا۔ کیوں کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راست بازی فقیہوں اور فریسیوں کی راست بازی سے

زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخل نہ ہوگے۔''

[متی ۲۰، ۱۷:۵]

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خود خدا ہیں بلکہ ہمیشہ یہی فرماتے رہے کہ خدا نے انھیں بھیجا ہے۔ یوحنا کی انجیل میں آتا ہے:

''اور جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔''

[یوحنا ۱۴:۲۴]

''اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے مانیں۔'' [یوحنا ۱۷:۳]

''اے اسرائیلیو! یہ باتیں سنو کہ یسوع ناصری ایک شخص تھا جس کا خدا کی طرف سے ہونا تم پر ان معجزوں اور عجیب کاموں اور نشانوں سے ثابت ہوا جو خدا نے اس کی معرفت تم میں دکھائے، چنانچہ تم آپ ہی جانتے ہو۔'' [اعمال ۲:۲۲]

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ پہلا حکم کیا ہے، تو انھوں نے وہی جواب دیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیا تھا:

''اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔'' [مرقس ۱۲:۲۹]

آپ نے دیکھا کہ عیسائیت میں تصورِ خدا کو سمجھنے کے لیے انجیل کا مطالعہ کس قدر ضروری ہے۔ گویا انجیل کا مطالعہ کیے بغیر عیسائیت کے تصورِ خدا کو سمجھنا ممکن نہیں۔

اب ہم اسلام کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اسلام میں خدا کا تصور کیا ہے؟ اسلام کے تصورِ خدا کے بارے میں کئی سوالات کا بہترین جواب قرآن مجید کی سورۂ اخلاص میں موجود ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

''کہو وہ اللہ ہے، یکتا۔

اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں

نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔"
یہ سورۃ اسلام میں خدا کا تصور، اللہ تعالیٰ کا تصور چار سطروں میں پیش کر دیتی ہے۔
اب جو کوئی بھی خدائی کا دعویٰ کرے اس کو ان چار سطروں میں موجود معیار پر پورا اترنا ہو گا۔ اگر وہ ان شرائط پر پورا اُترتا ہے تو پھر ہم مسلمان اسے خدا تسلیم کر سکتے ہیں۔

پہلی شرط:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ — کہو کہ وہ اللہ ہے، یکتا ہے

دوسری شرط:

اَللّٰهُ الصَّمَدُ — وہ بے نیاز ہے،

تیسری شرط ہے:

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ — نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ — کوئی اس جیسا نہیں، اس کا ہم سر نہیں۔

سورۂ اخلاص الٰہیات کی کسوٹی ہے۔ خدا کے بارے میں یا خدا سے متعلق علم کو الٰہیات (Theology) کہتے ہیں اور سورۂ اخلاص قرآن مجید کی ایک سو بارھویں سورۃ درحقیقت الٰہیات کی کسوٹی ہے کیونکہ خدائی کے کسی بھی دعویدار کا دعویٰ اس سورۃ کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔ ایسے کسی بھی دعوے کو اس چار سطری تعریف پر پورا اُترنا ہو گا۔ اگر کوئی اس تعریف پر پورا اُترتا ہے تو ہم اسے خدا تسلیم کر لیں گے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی وضاحت کر چکے ہیں، حقیقی عالمی بھائی چارے کے قیام کے لیے لازم ہے کہ سب ایک ہی خدائے واحد پر ایمان رکھیں۔ لہٰذا اگر خدائی کا کوئی اُمیدوار اس چار سطری تعریف پر پورا اُترتا ہے تو ہمیں اس کا دعویٰ تسلیم کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔
آپ جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ خدائی کے جھوٹے دعوے کرتے رہے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ کیا ایسے لوگ اس امتحان پر پورے اُتر سکتے ہیں؟

ایسے لوگوں میں سے ایک شخص گرو رجنیش تھا۔ آپ کو علم ہے کہ بعض لوگ رجنیش کو خدا مانتے ہیں۔ میری ایک تقریر کے بعد سوال و جواب کے وقفے کے دوران میں ایک ہندو دوست نے کہا کہ ''ہم بھگوان رجنیش کو خدا نہیں مانتے۔'' میں نے اسے بتایا کہ مجھے بھی اس بات سے اتفاق ہے۔ میں ہندومت کے متون مقدسہ کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ ان میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہوا کہ بھگوان رجنیش خدا ہے۔ میں نے جو بات کی تھی وہ یہ تھی کہ ''بعض لوگ بھگوان رجنیش کو خدا مانتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمام ہندوؤں کا یہ عقیدہ نہیں۔

بہر حال ہم ان لوگوں کے دعوے کا تجزیہ کرتے ہیں جن کا کہنا ہے کہ بھگوان رجنیش خدا ہے۔ پہلی شرط، پہلا امتحان جس پر اسے پورا اُترنا ہوگا وہ ہے:

هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ — وہ اللہ ہے، یکتا ہے

کیا بھگوان رجنیش ایک اور یکتا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ اس جیسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ خصوصاً ہندوستان میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ سو وہ یکتا کیسے ہوا؟

لیکن اس کے پیروکار اصرار کریں گے کہ وہ ایک ہی تھا لہٰذا ہم اگلی شرط کی طرف بڑھتے ہیں، دوسری شرط ہے:

اَللّٰهُ الصَّمَدُ — وہ بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔

کیا رجنیش بے نیاز تھا؟ کیا وہ کسی کا محتاج نہیں تھا؟ اس کی سوانح پڑھنے والے جانتے ہیں کہ وہ دمے کا مریض تھا۔ شدید کمر درد کا شکار رہتا تھا اور ذیابیطس کا بھی مریض تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب امریکہ میں اسے گرفتار کیا گیا تھا تو دورانِ گرفتاری اسے زہر بھی دیا گیا۔ ذرا اندازہ لگایئے یہ اچھی بے نیازی ہے کہ خدا کو زہر دیا جا رہا ہے۔

تیسرا امتحان جس پر اسے پورا اُترنا ہوگا، یہ ہے:

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ — نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔

لیکن رجنیش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ مدھیہ پردیش میں پیدا ہوا تھا۔ اس

کا باپ بھی تھا۔ اس کی ماں بھی تھی۔ اس کے والدین بعد میں اس کے پیرو کار بن گئے تھے۔
۱۹۸۱ء میں وہ امریکہ گیا اور ہزار ہا امریکیوں کو اپنا معتقد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بالآخر اس نے امریکہ میں اپنا ایک پورا گاؤں بسا لیا جس کا نام رجنیش پورم تھا۔ بعد میں امریکہ کی حکومت نے اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور ۱۹۸۵ء میں اسے امریکہ بدر کر دیا گیا۔

۱۹۸۵ء میں وہ ہندوستان واپس پہنچا۔ یہاں اس نے پونا شہر میں اپنا ایک مرکز قایم کر لیا۔ یہ مرکز "اوشو کمیون" کہلاتا ہے۔ اگر آپ کو وہاں جانے کا اتفاق ہو تو وہاں لکھا ہوا رجنیش کا کتبہ ضرور پڑھیے۔ ایک پتھر پر یہ عبارت تحریر ہے:

"بھگوان رجنیش

اوشو رجنیش، نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ کبھی مرا

البتہ اس نے ۱۱ دسمبر ۱۹۳۱ء سے ۱۹ جنوری ۱۹۹۵ء تک اس زمین کا ایک دورہ کیا۔"

اس تحریر میں وہ یہ بتانا بھول گئے ہیں کہ ۲۱ ممالک نے رجنیش کو ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا۔
ذرا اندازہ لگائیے، خود خدا دنیا کا دورہ کر رہا ہے اور اسے پاسپورٹ اور ویزوں کی ضرورت ہے۔

آخری امتحان یہ ہے کہ:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ — اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔

'یہ شرط بھی ایسی مشکل ہے کہ سوائے خدائے بزرگ و برتر کے کوئی بھی اس پر پورا نہیں اُتر سکتا۔ اگر آپ خدا کا تقابل دنیا کی کسی بھی شے سے کر سکیں تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہوا کہ وہ خدا نہیں ہے۔

مثال کے طور پر فرض کیجیے کوئی شخص کہتا ہے کہ خدا آرنلڈ شوارزینگر سے ہزار گنا زیادہ طاقت ور ہے۔ آرنلڈ کو تو آپ جانتے ہوں گے جسے دنیا کا سب سے طاقت ور شخص سمجھا جاتا ہے۔ جسے مسٹر یونیورس کا خطاب دیا گیا ہے۔ تو اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ خدا آرنلڈ شوارزینگر سے یا کنگ کانگ سے یا دارا سنگھ سے یا کسی اور سے ایک ہزار گنا طاقت ور ہے یا دس لاکھ گنا طاقت ور ہے، تو وہ خدا کا تقابل مخلوق سے کر رہا ہے اور وہ جس کا تقابل ہو سکے،

خدا نہیں ہوسکتا۔ چاہے لاکھوں گنا کا فرق ہو یا کروڑوں گنا کا، لیکن اگر تقابل ممکن ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ خدا کا ذکر نہیں کر رہے۔ خدا کا تقابل اس دنیا کی کسی بھی چیز سے نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید جو میزان الٰہیات ہے اس بارے میں ہمیں بتاتا ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى

(۱۷: ۱۱۰)

"اے نبیؐ! ان سے کہو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔"

آپ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ یہ نام خوبصورت ہونا چاہیے اور اسے سن کر آپ کے ذہن میں کوئی تصویر نہیں بننی چاہیے۔ یعنی اس نام کے ساتھ کوئی شبیہ وابستہ نہیں ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے ۹۹ اسمائے حسنہ استعمال ہوئے ہیں جیسے الرحمان، الرحیم۔

ہم مسلمان خدا کے لیے لفظ "اللہ" استعمال کرتے ہیں۔ خدا یا انگریزی کے لفظ God کے بجائے ہم کسی بھی زبان میں عربی کے لفظ "اللہ" کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی لفظ God کے ساتھ بہت سے دیگر الفاظ بھی وابستہ ہیں جن کی وجہ سے اس کے معانی میں بہت سی تبدیلیاں ممکن ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ اس لفظ کے آخر میں حرف "S" لگا دیں تو یہ جمع بن جائے گی "Gods" لیکن خدا کے لفظ کی جمع ممکن ہی نہیں اور اللہ لفظ کی کوئی جمع ہے بھی نہیں۔

اسی طرح اگر آپ God کے آخر میں "dess" لگا دیں تو یہ لفظ مؤنث بن جائے گا یعنی Goddess جس کے معنی ہوں گے مؤنث خدا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنس کا کوئی تصور وابستہ نہیں ہے۔ نہ مذکر اور نہ مؤنث۔ اس لحاظ سے بھی عربی لفظ اللہ بہتر ہے کیونکہ اس لفظ کے ساتھ بھی کوئی تانیث وابستہ نہیں ہے۔ یہ ایک منفرد لفظ ہے۔

اگر آپ لفظ God کے ساتھ Father لگا دیں تو یہ Godfather بن جائے گا۔ آپ کہتے ہیں فلاں جو ہے وہ فلاں کا گاڈ فادر ہے یعنی سرپرست ہے۔ لیکن اللہ کے ساتھ کوئی ایسا لفظ نہیں لگ سکتا۔ Allah-Father یا ''اللہ ابا'' کوئی لفظ نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ God کے ساتھ Mother لگا دیں تو Godmother بن جائے گا لیکن دوسری طرف Allah-Mother یا ''اللہ امی'' کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے بھی لفظ ''اللہ'' ایک منفرد لفظ ہے۔

یہی نہیں، اگر آپ لفظ God سے پہلے Tin لگا دیں تو یہ لفظ Tin-God بن جائے گا یعنی جھوٹا یا جعلی خدا۔ لیکن اسلام میں آپ کو اس قسم کا کوئی لفظ نہیں ملے گا۔ اللہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے ساتھ اس قسم کے سابقے اور لاحقے لگ ہی نہیں سکتے۔

مذکورہ اسباب کی بنا پر ہم مسلمان انگریزی لفظ God کے بجائے عربی لفظ اللہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ البتہ اگر کچھ مسلمان اس لیے اللہ کے بجائے God کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ جو غیر مسلم ''اللہ'' کے تصور کو نہیں سمجھتے وہ ان کی بات سمجھ سکیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن بہر حال اسلام میں ترجیح، بہتر لفظ یعنی اللہ کو ہی حاصل ہے، انگریزی لفظ God کو نہیں۔

اسلام میں حقیقی بھائی چارے کا تصور محض اُفقی نہیں عمودی بھی ہے۔ یعنی اسلام محض اتنا ہی نہیں کرتا کہ تمام علاقوں کے رہنے والے تمام انسانوں کے مابین بھائی چارے کا تصور دے بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے۔ عمودی تصور سے مراد یہ ہے کہ ہم سے پہلے گزرنے والے لوگ اور بعد میں آنے والے لوگ بھی ہمارے بھائی ہیں۔

ماضی میں اس زمین پر رہنے والے لوگ اور ہم جو آج اس زمین پر زندہ ہیں درحقیقت ایک ہی قوم سے، ایک ہی اُمت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایمان کا تعلق ہے۔ یہ وہ بھائی چارہ ہے جو ایمان باللہ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح بھائی چارے کا ایک عمودی تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ ایمانی بھائی چارہ ہے جو زمانی بھی ہے اور مکانی بھی۔

دنیا کے تمام مذاہب میں کسی ایک خالق پر ایمان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اگر آپ غور کریں تو حقیقی بھائی چارہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے اور دنیا بھر میں قایم رہ سکتا ہے جب تمام لوگ ایک ہی خدا پر ایمان رکھیں، ایک خالق اور ایک مالک پر ایمان رکھیں۔ اس طرح بھائی چارے کا جو رشتہ وجود میں آئے گا وہ خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط اور زیادہ اہم ہوگا۔

میں نے پہلے عرض کیا کہ اسلام ہمیں والدین کی فرماں برداری کا حکم دیتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْ هُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۝ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۝ (۱۷: ۲۳، ۲۴)

”تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو۔ نہ انھیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان کے ساتھ احترام سے بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ ”پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔“

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں والدین کو عزت، احترام اور محبت دینا ہر مسلمان کا ن ہے لیکن اس کے باوجود ایک چیز ایسی ہے جس میں والدین کا حکم بھی نہیں مانا جا سکتا۔

رۂ لقمان میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ

ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (۳۱: ۱۵)

"لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے، اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔"

گویا والدین کی اطاعت جو کہ ایک لازمی امر ہے، ان کی اجازت بھی وہیں تک ہے جہاں تک وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات ہی برتر ہیں اور جہاں دونوں احکام میں ٹکراؤ ہو وہاں آپ اللہ کا حکم ہی مانیں گے۔ اسی طرح ایمان اور عقیدے کی بنیاد پر بننے والا بھائی چارہ ہی حقیقی بھائی چارہ ہے۔ ایمان کا رشتہ خون کے رشتے سے برتر ہے۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے:

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ○

(۹: ۲۴)

"اے نبیؐ! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔"

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ دریافت کر رہا ہے کہ بتاؤ اور سوچو تمہاری ترجیحات کیا ہیں؟ کیا تمہیں اپنے بیٹے عزیز ہیں؟ یا تمہیں اپنے والدین عزیز ہیں؟ یا تمہارے زوج؟ (زوج کا لفظ شوہر کے حق میں بیوی کے لیے اور بیوی کے حق میں شوہر کے لیے استعمال ہوتا ہے، انگریزی لفظ Spouse کے معنوں میں) یا دیگر عزیز و اقارب؟

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے کہ کیا تمہاری ترجیح مال و دولت، کاروبار اور جائیداد ہے؟ کیا یہ تمام چیزیں تمہیں زیادہ پسند ہیں، اگر تم ان چیزوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے مقابلے میں زیادہ عزیز جانتے ہو تو پھر اللہ کے فیصلے یعنی اپنی سزا کا انتظار کرو۔

پتہ یہ چلا کہ اگر والدین کسی غلط کام کا حکم دیں جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہو تو اس کام کا کرنا جائز نہیں۔ والدین یا اولاد یا بیوی یا دیگر کسی رشتہ دار کی محبت میں چوری کرنا، بے ایمانی کرنا، رشوت لینا، کسی کے ساتھ زیادتی کرنا، کسی کو قتل کرنا اللہ کے عذاب کا باعث ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح مال و دولت، کاروبار، جائیداد بنانے کی خواہش میں جائز و ناجائز سے لاپروا ہو جانا بھی عذاب خداوندی کو دعوت دینے والا کام ہے۔

جہاں بات عقیدے اور ایمان کی آئے گی تو خونی رشتے بھی پیچھے رہ جائیں گے۔

قرآن مجید میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۝ (۴: ۱۳۵)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور اللہ کے واسطے گواہ بنو، اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا

تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔فریق معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب معاملہ عدل و انصاف کا ہو،جس وقت آپ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہوں تو صرف سچی گواہی دیں خواہ اس میں آپ کا ذاتی نقصان ہو،خواہ آپ کے والدین یا رشتہ داروں کا نقصان ہو،آپ ہر حال میں سچائی پر قایم رہیں۔

اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ صاحب معاملہ غریب ہے یا امیر کیونکہ اللہ کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔

سو جب بات عدل و انصاف کی آئے گی ، جب معاملہ حق اور سچائی کا ہوگا تو خون کے تمام رشتے فراموش کر دیے جائیں گے۔کیونکہ یہ عقیدہ کا معاملہ ہے اور عقیدے کا رشتہ تمام رشتوں سے برتر ہے۔

عقیدے کے اس رشتے کی اساس اس یقین پر ہے کہ ایک ہی خدائے بزرگ و برتر اس کائنات کا خالق ہے۔تمام مذاہب فی الاصل اسی عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں اور جیسا کہ میں نے پہلے آپ کے سامنے قرآن کی آیت پیش کی ، اسلام اسی مشترکہ بات کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ○ (۳:۶۴)

"اے نبیؐ کہو!اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں ، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب

نہ بنالے۔'' اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم (صرف اللہ کی بندگی واطاعت کرنے والے) ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی ذات پر صرف ایمان رکھنا کافی نہیں بلکہ عبادت بھی صرف خدائے واحد ہی کی ہونی چاہیے۔ حقیقی عالمی بھائی چارے کا قیام صرف اسی صورت ممکن ہے کہ پوری انسانیت ایک ہی خدائے بزرگ و برتر پر ایمان رکھے اور صرف اسی کی عبادت کرے۔

سورۂ انعام میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط ﴾ (۶:۱۰۸)

''(اور اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔''

میں اپنی گفتگو کا اختتام قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ پر کرنا چاہوں گا:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ○ (۴:۱)

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔''

☆......☆......☆
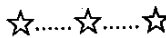
حصہ دوم

سوالات وجوابات

سوال: آپ نے اپنی گفتگو کے دوران میں بھائی چارے کی مختلف صورتوں کی وضاحت تو کردی لیکن اسلام میں ''کافر'' کے تصور کی وضاحت نہیں کی جو کہ بھائی چارے کو نقصان پہنچانے والی چیز ہے۔

جواب: بھائی کا سوال یہ ہے کہ میں نے متعدد تصورات کے بارے میں گفتگو کی، حقیقی عالمی بھائی چارے کی وضاحت کی اور ساتھ ہی رشتے، ذات اور عقاید وغیرہ کی بنیاد پر قایم ہونے والے بھائی چارے کی بھی وضاحت کی کہ وہ کس طرح مسائل کا سبب بنتا ہے، لیکن میں نے ''کافر'' کے تصور پر گفتگو نہیں کی۔

میرے بھائی ''کافر'' عربی زبان کا ایک لفظ ہے جو لفظ ''کفر'' سے نکلا ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں چھپانا یا انکار کرنا، ردّ کرنا۔ اسلامی تناظر میں دیکھا جائے تو اس لفظ کے معانی ہیں ''کوئی ایسا شخص جو اسلامی عقاید کا انکار کرے یا انھیں ردّ کرے۔'' گویا جو شخص اسلام کا انکار کردے اُسے اسلام میں کافر کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو شخص اسلام کے تصورِ خدا کا انکار کردے وہ کافر کہلائے گا۔

جہاں تک بھائی چارے کے دیگر تصورات کی بات ہے تو واقعی کئی طرح کے بھائی چارے موجود ہیں مثلاً علاقے کی اور وطن کی بنیاد پر، ہندوستان میں، پاکستان میں اور امریکہ میں ہر جگہ ایک وطنی بھائی چارہ موجود ہے۔ یہ تمام بھائی چارے عقیدے کی بنیاد پر نہیں بلکہ بعض دیگر تصورات کی بنیاد پر قایم ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقی بھائی چارے کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک کافروں کا بھائی چارہ بھی ہے جو کفر کی بنیاد پر قایم ہوا ہے۔ یہ بھی حقیقی عالمی بھائی چارے کے لیے نقصان دہ ہے۔

کافر کا مطلب ہے اسلام کی حقانیت کا انکار کرنے والا۔ میرے ایک خطاب کے بعد سوالات کے دوران میں ایک صاحب نے کہا کہ مسلمان ہمیں کافر کہہ کر گالی کیوں دیتے ہیں؟ اس طرح ہماری انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

میں نے انھیں بھی یہی بتایا تھا کہ جناب کافر عربی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے اسلام

کی سچائی کا انکار کرنے والا۔ اگر مجھے اس لفظ کا انگریزی ترجمہ کرنا ہو تو میں کہوں گا Non Muslim یعنی جو شخص اسلام کو قبول نہیں کرتا وہ Non Muslim ہے اور عربی میں کہا جائے گا کہ وہ کافر ہے۔

لہٰذا اگر آپ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ نان مسلم کو کافر نہ کہا جائے تو یہ کس طرح ممکن ہو گا؟ اگر کوئی غیر مسلم یہ مطالبہ کرے کہ مجھے کافر نہ کہا جائے یعنی غیر مسلم نہ کہا جائے تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جناب! آپ اسلام قبول کرلیں تو میں خود بخود آپ کو غیر مسلم یعنی کافر کہنا چھوڑ دوں گا۔ کیونکہ کافر اور غیر مسلم میں کوئی فرق تو ہے نہیں۔ یہ تو سیدھا سیدھا لفظ Non Muslim کا عربی ترجمہ ہے اور بس۔

اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہو گا۔

☆......☆......☆

سوال: محترم ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب! آپ فرماتے ہیں کہ خدا حي و قیوم ہے، تجسیم سے پاک ہے اور اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اگر ایسا ہے تو مسلمان حج کیوں کرتے ہیں اور وہ ہندوؤں کی طرح مقاماتِ مقدسہ کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟

جواب: میرے بھائی نے ایک بہت اچھا سوال پوچھا ہے کہ اگر اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی تجسیم یا تصور ممکن نہیں اور خدا ان چیزوں سے پاک ہے تو پھر مسلمان دورانِ حج مقاماتِ مقدسہ کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟ مقاماتِ مقدسہ سے ان کی مراد کعبہ ہے۔

بھائی! یہ ایک صریح غلط فہمی ہے۔ کوئی بھی مسلمان کعبہ کی عبادت قطعاً نہیں کرتا۔ غیر مسلموں میں بالعموم یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ہم مسلمان کعبہ کی عبادت کرتے ہیں حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں جس کو دیکھنا اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ کعبہ ہمارے لیے صرف قبلہ ہے۔ جس کا مطلب ہے سمت (Direction) کعبہ ہمارا قبلہ ہے اور قبلے کے تعین کی ضرورت اس لیے ہے کہ ہم مسلمان اتحاد پر یقین رکھتے ہیں، یگانگت پر یقین رکھتے ہیں۔ اب فرض کیجیے ہم نماز پڑھنے لگے ہیں، ہوسکتا ہے کچھ لوگ کہیں کہ مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنی چاہیے، کچھ کہیں کہ نہیں شمال کی طرف منہ ہونا چاہیے، کس طرف منہ کر کے نماز پڑھی جائے گی؟

لہٰذا چونکہ ہم اتحاد و یگانگت پر یقین رکھتے ہیں، اسی لیے ایک سمت دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے معین کر دی گئی ہے کہ ہمیشہ اسی سمت یعنی قبلے کی سمت رُخ کر کے نماز پڑھی جائے۔ قبلہ یا کعبہ محض ایک سمت ہے، ہم اس کی عبادت قطعاً نہیں کرتے۔

دنیا کا نقشہ سب سے پہلے مسلمانوں نے بنایا تھا۔ مسلمانوں کے بنائے ہوئے نقشے میں قطب جنوبی کو اوپر اور قطب شمالی کو نیچے رکھا گیا تھا۔ اس نقشے کی رُو سے کعبہ دنیا کے مرکز میں واقع تھا۔ بعد ازاں جب مغربی سائنس دانوں نے دنیا کا نقشہ تیار کیا تو انھوں نے اس کا رُخ اُلٹ دیا یعنی قطب شمالی کو اوپر کر دیا اور قطب جنوبی کو نیچے لیکن الحمد للہ کعبہ پھر بھی اس نقشے کے مرکز میں ہی رہا۔ مکہ پھر بھی دنیا کا مرکز ہی رہا۔

اب چونکہ مکہ مرکز میں ہے لہٰذا اگر کوئی مسلمان کعبہ کے شمال میں ہے تو اسے جنوب کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرنا ہوگی اور اگر وہ کعبہ کے جنوب میں ہے تو شمال کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھے گا۔ لیکن پوری دنیا کے مسلمان ایک ہی طرف رُخ کر کے فریضۂ نماز ادا کریں گے۔ یعنی کعبے کی طرف رُخ کر کے۔ کعبہ ہمارا قبلہ ہے، ہمارا سمت نما ہے، ہمارا معبود نہیں ہے۔ کوئی بھی مسلمان کعبے کی عبادت ہرگز نہیں کرتا۔

اسی طرح جب ہم حج کے لیے جاتے ہیں تو کعبے کا طواف کرتے ہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ دائرے کا ایک مرکز ہوتا ہے۔ اور اس طرح دائرے میں چکر لگا کر ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ کائنات کا مرکز صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے۔ طواف کا مقصد عبادت ہرگز نہیں ہے۔

صحیح مسلم، کتاب الحج کی ایک حدیث کا مفہوم ہے:

''خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حج کے موقع پر حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں تجھے بوسہ دے رہا ہوں کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے وگرنہ میں جانتا ہوں کہ تو ایک سیاہ پتھر ہے جو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔''

اسی طرح کعبہ کے معبود نہ ہونے کا ایک اہم ثبوت یہ بھی ہے کہ دورِ رسالت مآب ﷺ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کعبے کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیا کرتے تھے۔ یعنی مسلمانوں کو نماز کے لیے بلایا کرتے تھے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ بتائیں کیا کوئی بھی شخص اپنے معبود کے اوپر چڑھنا گوارا کر سکتا ہے؟ کیا آج تک کوئی بت پرست اپنے بُت کے اوپر کھڑا ہونا پسند کرتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ مسلمان کعبے کو اپنا معبود نہیں سمجھتے۔ کعبہ ان کے لیے محض قبلہ یعنی سمت نما ہے اور عبادت وہ صرف ایک ہی خدائے واحد و برتر کی کرتے ہیں۔ جسے دیکھنا اس دنیا میں اور ان آنکھوں سے ممکن ہی نہیں ہے۔

سوال: ہم یہاں کائناتی بھائی چارے کے بارے میں آپ کی گفتگو سننے آئے تھے، صرف مسلمانوں کے بھائی چارے کے بارے میں نہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا کائنات کے دوسرے حصوں میں بھی ہمارے بھائی موجود ہیں؟

جواب: میرے بھائی نے ایک اچھا سوال کیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ کیا بھائی چارے کا تصور صرف اس زمین تک ہی محدود ہے یا کائنات میں مزید وسعت بھی دی جاسکتی ہے؟ حقیقی کائناتی بھائی چارے کا مطلب کیا ہے؟ میرے بھائی اگر آپ نے میری گفتگو توجہ سے سنی ہے تو اس گفتگو کے دوران میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے، ہم اس خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو تمام عالمین کا یعنی پوری کائنات کا رب ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ۝ (۴۲: ۲۹)

’’اس کی نشانیوں میں سے ہے زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جان دار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں وہ جب چاہے انھیں اکٹھا کرسکتا ہے۔‘‘

گویا اس دنیا کے علاوہ بھی جاندار مخلوقات موجود ہیں۔ ابھی علوم انسانی نے اتنی ترقی نہیں کی کہ ان کا وجود ثابت کیا جاسکے لیکن بہر حال سائنس دان مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ وہ خلائی راکٹ اور مصنوعی سیارے مسلسل خلا میں بھیج رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس بات کے قوی امکانات موجود ہیں لیکن ابھی تک کوئی بات ثابت نہیں ہوئی۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ ہاں اس زمین کے علاوہ بھی جاندار مخلوقات موجود ہیں اور میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں۔ اس یقین کے نتیجے میں کائناتی بھائی چارے کا ایک تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔ بھائی چارہ صرف اس زمین تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بھائی چارہ ہر جگہ درکار ہے۔ ہندوستان میں بھی اور ہندوستان سے باہر پوری دنیا میں بھی۔ یہ بھائی

چارہ کس طرح قایم ہوسکتا ہے؟ میں یہاں اپنی پوری گفتگو دہرانا نہیں چاہتا۔ لیکن مختصراً یہ کہ ایک اخلاقی نظام ہونا چاہیے، ایک ہی نظامِ اخلاقیات لاگو ہونا چاہیے۔ کوئی انسان کسی کو قتل نہیں کرے گا، کوئی چوری نہیں کرے گا، غریبوں کے کام آئے گا، پڑوسیوں کی مدد کرے گا، کسی کی غیبت نہیں کرے گا۔ انسان کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ وہ خود تو پیٹ بھر کر سونے لگا ہے لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ ہر کوئی شراب سے پرہیز کرے گا کیونکہ نشہ اس دنیا میں بھائی چارے کے قایم ہونے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

مندرجہ بالا تمام اُمور بھائی چارے کو تقویت دینے والے ہیں۔ نہ صرف ہندوستان میں، نہ صرف امریکہ میں، نہ صرف اس دنیا میں بلکہ پوری دنیا میں۔

لیکن یہ صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے اگر ساری دنیا کے لوگ یہ بات تسلیم کر لیں کہ تمام انسان خواہ وہ بھارت میں ہوں، امریکہ میں ہوں، دنیا کے کسی ملک میں ہوں یا اس زمین سے دور کسی اور سیارے کی مخلوق ہے، ان کا خالق ایک ہی خدائے عظیم ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ فی الاصل تمام مذاہب میں ایک برتر اور عظیم خدا کا تصور موجود ہے۔ اس کی تفصیل میری کتاب ''مذاہب عالم میں تصورِ خدا'' [1] میں موجود ہے۔ اس میں آپ پڑھ سکتے ہیں کہ دنیا کے تمام اہم مذاہب میں خدا کا کیا تصور ہے۔ سکھ مت، پارسی مذہب وغیرہ تمام مذاہب کے تصورِ خدا کے بارے میں اگر آپ تفصیل جاننا چاہتے ہیں تو یہ کتاب پڑھ لیں۔

☆......☆......☆

[1] شایع کردہ دارالنوادر، الحمد مارکیٹ، اُردو بازار لاہور۔
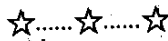
سوال: میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب محض لفظوں سے کھیل رہے ہیں۔ عالمی بھائی چارہ اسلام کے ذریعے ممکن ہی نہیں ہے۔ اسلام تو دنیا کے لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے یعنی کافر اور مسلمان۔ ظاہر ہے کہ ہم اسلام کی بہت سی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اسلام صرف تقسیم کو تقویت دیتا ہے۔ ہم شیعہ سنی اور ستر دیگر فرقے بھی دیکھ رہے ہیں۔ عالمی بھائی چارہ صرف ہندو مذہب قایم کر سکتا ہے۔ اسلام تو گائے کو قتل کرنے، کفار کو قتل کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور آپ بھائی چارے کی بات کرتے ہیں؟

جواب: میرے بھائی نے بہت سی باتیں کر دی ہیں۔ لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' بھائی چارے کے برقرار رہنے کے لیے صبر کرنا، بہت ضروری ہے۔ اب اگر میں صبر نہ کروں تو میرے اور بھائی کے درمیان لڑائی ہو جائے گی۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَعِينُوا۟ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ۝ (۲:۱۵۳)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

جیسا کہ میں نے کہا، بھائی چارے کے فروغ کے لیے صبر ضروری ہے۔ میں یہاں موجود اپنے بڑے بھائی کا احترام کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ہندو مت کا اچھا مطالعہ کر رکھا ہو لیکن مجھے معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں ان کی باتوں سے اتفاق نہیں کرتا۔ اسلام کے بارے میں ان کا علم ہرگز کافی نہیں ہے۔

البتہ ان کی ایک بات سے مجھے ضرور اتفاق ہے اور وہ یہ کہ اسلام لوگوں کو دو گروہوں میں رکھتا ہے۔ ایک وہ جو ایمان لائے یعنی مومن اور دوسرے وہ جو ایمان نہیں لائے یعنی کافر۔ جیسا کہ بھائی نے خود بھی کہا ''کافر''۔ لیکن یہ تقسیم تو دنیا کے ہر مذہب میں موجود

ہے۔خود ہندومت میں بھی موجود ہے۔یعنی لوگ ہندو ہوتے ہیں یا غیر ہندو۔اسی طرح عیسائیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو کوئی شخص یا تو عیسائی ہوگا یا غیر عیسائی۔یہودیت کے حوالے سے ایک انسان یا تو یہودی ہوگا یا غیر یہودی۔بالکل اسی طرح اسلامی تناظر میں دیکھا جائے تو ایک شخص یا تو مسلمان ہوگا یا غیر مسلم۔میں ہندومت پر تنقید نہیں کرنا چاہتا لیکن چونکہ سوال پوچھنے والے ایک پڑھے لکھے شخص ہیں لہٰذا میں ہندومت کے بارے میں بھی کچھ گفتگو کرنا چاہوں گا۔

میں تقابل ادیان کا طالب علم ہوں۔میں نے ویدوں کا مطالعہ کر رکھا ہے۔میں نے اپنشد بھی پڑھ رکھے ہیں۔سو یہاں میں بس ایک چھوٹی سی بات عرض کرنا چاہوں گا۔ویدوں کی تحریر کے مطابق انسان خدا کے جسم سے پیدا ہوئے ہیں۔برہمن سر سے پیدا ہوئے، سینے سے کھتری، رانوں سے دیش اور پیروں سے شودر پیدا کیے گئے۔اور یوں ذات پات کا نظام وجود میں آتا ہے۔

میرے بھائی میں یہاں یہ باتیں نہیں کرنا چاہتا۔میں اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کو ٹھیس بھی نہیں پہنچانا چاہتا۔کیونکہ اسلام ہمیں یہ تعلیم نہیں دیتا۔میں ان باتوں پر تبصرہ نہیں کرتا کیوں کہ میں کسی مذہب پر تنقید نہیں کرنا چاہتا، میں یہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا کہ فلاں مذہب میں کیا برائیاں ہیں۔

لیکن اگر آپ ویدوں کا اچھی طرح مطالعہ کر چکے ہیں تو آپ کو یہاں آخر سامعین کے سامنے یہ گواہی دینی چاہیے کہ کیا ویدوں میں یہ نہیں لکھا ہوا کہ برہمن خدا کے سر سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں اور کیا ذات پات کا ایک طبقاتی نظام ویدوں میں نہیں بنا دیا گیا جس میں ایک مذہبی علما کا طبقہ ہے، ایک جنگجوؤں کا اور حکمرانوں کا طبقہ ہے۔ایک کاروباری طبقہ ہے اور ایک شودروں کا مظلوم، استحصال زدہ طبقہ ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر امبید کر جیسے لوگوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی تفصیل میں، میں نہیں جانا چاہتا۔لیکن میرے بھائی، ہندومت کے بارے میں، میں بہت کچھ پڑھ چکا ہوں۔اور میں ہندو مذہب

کے بعض پہلوؤں کی قدر بھی کرتا ہوں۔ ہندومت کی بعض باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ میں اس موضوع پر بولنا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے مجبور کر دیا گیا لہٰذا مجھے بولنا پڑا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط (۶: ۱۰۸)

''(اور اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔''

میں نے اپنی گفتگو کے دوران میں ہندومت کا مثبت پہلو دکھانے کی کوشش کی اور یہ دکھایا کہ ہندو مذہب میں بھی خدائے واحد کا تصور موجود ہے۔ آپ نے اپنے سوال میں کہا کہ مسلمان ''لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور گائے کا قتل کرتے ہیں۔''

دیکھیں بات یہ ہے کہ آپ کے ہر الزام کا جواب دینے کے لیے کافی وقت چاہیے جبکہ ہمارے پاس وقت محدود ہے۔ لہٰذا میں آپ کے چند سوالات کا جواب دیتا ہوں۔ اس کے بعد اگر آپ چاہیں تو بعد میں دوبارہ پوچھ سکتے ہیں۔ مجھے جواب دے کر اور آپ کی غلط فہمیاں دور کر کے خوشی ہوگی۔ اگر میں یہاں وضاحت کر سکا تو اسی صورت میں اسلام کی درست تفہیم ہوگی۔ اسی لیے ہم اپنی ہر گفتگو کے بعد ایک وقفہ سوالات ضرور رکھتے ہیں اور ہم اس وقفے میں کسی بھی قسم کی تنقید کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر بھی یہ پسند ہے کیوں کہ جس قدر کوئی شخص تنقید کرے گا اور منطقی طور پر قائل ہوگا، اسی قدر وہ اسلام کی درست تفہیم کر سکے گا اور یہی میں کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

اسلام حکم دیتا ہے کہ پیغام خداوندی کو حکمت کے ساتھ پھیلایا جائے۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ

بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ۝ (۱۲۵:۱۶)

''اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو، ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو، تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔''

سب سے پہلے ہم گوشت خوری کا معاملہ دیکھتے ہیں۔ آپ نے ''گائے کو قتل کرنے'' کی بات کی۔ بہت سے غیر مسلم یہ کہتے ہیں کہ ''تم مسلمان ظالم لوگ ہو کیونکہ تم جانوروں کو قتل کرتے ہو۔'' سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک شخص گوشت کھائے بغیر بھی بہت اچھا مسلمان ہو سکتا ہے۔ اچھا مسلمان ہونے کے لیے گوشت کھانا فرض نہیں ہے، یعنی اسلام اور گوشت خوری لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن ہمیں متعدد مقامات پر گوشت خوری کی اجازت دیتا ہے تو ہم گوشت کیوں نہ کھائیں؟

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَھِیْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰہَ یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ۝ (۱:۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بندشوں کی پوری پوری پابندی کرو۔ تمہارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے، سوائے ان کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لیے حلال نہ کر لو، بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔''

[اسی] طرح سورۂ نحل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَھَا لَكُمْ فِیْھَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْھَا تَاْكُلُوْنَ۝ (۵:۱۶)

''اس نے جانور پیدا کیے جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور طرح طرح کے دوسرے فایدے بھی۔''

سورۂ مومنون میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ (۲۳:۲۱)

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فایدے بھی ہیں۔ تم ان کو کھاتے ہو۔''

یہاں ڈاکٹر حضرات موجود ہیں اور میں خود بھی ایک ڈاکٹر ہوں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ گوشت ایک ایسی غذا ہے جس میں زیادہ مقدار میں فولاد اور پروٹین موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ نہایت غذائیت بخش ہے۔ پروٹین کی اتنی مقدار آپ کو کسی دوسری غذا یعنی سبزیوں وغیرہ میں نہیں مل سکتی۔

سبزیاتی غذا میں پروٹین کی مقدار کے حوالے سے سویابین کو بہترین خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ بھی گوشت کے قریب نہیں پہنچتی۔ باقی جہاں تک گائے کو قتل کرنے کا تعلق ہے تو میں یہاں کسی پر تنقید نہیں کرنا چاہتا، لیکن چونکہ بھائی نے ایک سوال کیا ہے تو اس کا جواب دینا بھی ضروری ہے۔ اگر آپ ہندو متونِ مقدسہ کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ خود ان میں بھی گوشت خوری کی اجازت موجود ہے۔ قدیم دور کے سادھو اور سنت خود گوشت کھاتے رہے ہیں اور بڑا گوشت کھاتے رہے ہیں، یہ تو بعد میں دیگر مذاہب مثلاً جین مت وغیرہ کے زیرِ اثر ہندوؤں میں 'اہمسا'' یعنی عدم تشدد کے فلسفے کو پذیرائی حاصل ہوئی جس کی رُو سے جانوروں کو مارنا ممنوع قرار پایا اور یہ فلسفہ ہندوؤں کے طرزِ زندگی کا حصہ بن گیا۔

دوسری طرف اسلام جانوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے والا مذہب ہے۔ اسلام میں

جانوروں سے متعلق جتنی ہدایات دی گئی ہیں ان کے حوالے سے طویل گفتگو ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر جانوروں پر حد سے زیادہ بوجھ لادنے سے منع کیا گیا ہے۔ ان کو پوری غذا دینے اوران کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ ہے کہ جب ضرورت ہوتو انھیں غذا کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

جو مذاہب گوشت خوری کے خلاف ہیں اور جانوروں کے گوشت کو بطورِ غذا استعمال کرنے سے روکتے ہیں، اگر آپ ان کے فلسفے کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ یہ مذاہب گوشت خوری سے منع اس لیے کرتے ہیں کیوں کہ اس مقصد کے لیے جانداروں کی جان لینی پڑتی ہے اور یہ ایک گناہ ہے۔ مجھے ان کی بات سے اتفاق ہے، اگر کسی جاندار کی جان لیے بغیر زندہ رہنا اس دنیا میں کسی بھی انسان کے لیے ممکن ہوتو یقین کیجیے میں وہ پہلا انسان ہوں گا جو اس طرح رہنے کا فیصلہ کرے گا۔

ہندومت میں بھائی چارے کا مقصد یہ ہے کہ ہر زندہ مخلوق کے ساتھ بھائی چارہ ہونا چاہیے قطع نظر اس کے کہ وہ مخلوق انسان ہے یا جانور، پرندہ ہے یا کیڑا مکوڑا۔ اب میں آپ سے ایک سادہ سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا کوئی انسان پانچ منٹ بھی بغیر کسی جاندار کو قتل کیے زندہ رہ سکتا ہے؟ علم طب سے آشنائی رکھنے والے میرے اس سوال کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم سانس لیتے ہیں تو سانس کے ساتھ بے شمار جراثیم بھی جاتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ گویا ہندومت کی رو سے آپ زندہ رہنے کے لیے خود اپنے بھائیوں کو قتل کررہے ہیں۔

اسلام میں حقیقی بھائی چارے کا تصور یہ ہے کہ ہر انسان آپ کا بھائی ہے اور دینی بھائی چارے کے لحاظ سے ہر مسلمان آپ کا بھائی ہے۔ ہر زندہ مخلوق بھائی نہیں ہے۔ ہمیں جانوروں کا تحفظ کرنا ہے، انھیں نقصان نہیں پہنچانا، ان پر غیر ضروری تشدد نہیں کرنا لیکن بہ وقت ضرورت ہم انھیں غذا کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ سبزی خوروں کا کہنا ہے کہ گوشت خوری کے لیے آپ جانداروں کو قتل کرتے ہیں لٰہذا یہ ایک گناہ ہے۔

لیکن جب جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ: ''پودے بھی جاندار مخلوق ہیں'' تو کیا ہوتا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ سبزی خوروں کی منطق ناکام ہوجاتی ہے۔ اب سبزی خور اپنی منطق تبدیل کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے پودے جاندار ہیں لیکن انھیں تکلیف کا احساس نہیں ہوتا جب کہ جانوروں کو ہوتا ہے۔ لہٰذا پودوں کو قتل کرنا جرم نہیں ہے جب کہ جانوروں کو مارنا بڑا جرم ہے۔

لیکن سائنس بہت ترقی کر چکی ہے اور اب ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ پودے بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ پودے روتے بھی ہیں اور خوش بھی ہوتے ہیں لہٰذا یہ منطق بھی ناکام ہو چکی ہے کہ پودوں کو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ پودوں کو بھی تکلیف کا احساس ہوتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ انسانی کان پودوں کی آواز نہیں سن سکتے۔ انسانی کان ایک خاص فریکونسی کی آواز سن سکتے ہیں۔ اس حد سے کم یا زیادہ فریکونسی کی آواز ہمارے کان سننے سے قاصر ہیں۔

مثال کے طور پر ایک چیز ہوتی ہے کتوں کی سیٹی ''Dog Whistle''۔ جب کتے کا مالک یہ سیٹی بجاتا ہے تو انسانوں کو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی لیکن کتا یہ آواز سن لیتا ہے۔ کیوں کہ ایک سیٹی کی آواز کی فریکونسی اُس حد سے زیادہ ہوتی ہے جس حد تک انسانی کان آواز سن سکتے ہیں۔ چوں کہ کتے کی سننے کی صلاحیت انسان سے زیادہ ہے لہٰذا وہ اس آواز کو سن لیتا ہے۔

اسی طرح پودوں کی آواز بھی انسانی کان نہیں سن سکتے کیوں کہ ان کی فریکونسی مختلف ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پودے تکلیف محسوس نہیں کرتے یا اس کا اظہار نہیں کرتے۔

میرے ایک بھائی نے یہ بات سن کر مجھ سے بحث مباحثہ شروع کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ ذاکر بھائی، یہ ٹھیک ہے کہ پودے جاندار ہوتے ہیں لیکن جانوروں میں تو پورے پانچ حواس خمسہ ہوتے ہیں جب کہ پودوں میں صرف تین حواس ہوتے ہیں یعنی دو حواس کم ہوتے ہیں۔ لہٰذا جانوروں کو مارنا بڑا جرم ہے جب کہ پودوں کو مارنا چھوٹا جرم ہے۔

میں نے اس سے کہا کہ اچھا چلو فرض کرو تمہارا ایک چھوٹا بھائی ہے جو پیدائشی گونگا بہرا ہے۔یعنی اس میں عام انسانوں کے مقابلے میں دو حسیات کم ہیں۔اب فرض کیجیے کوئی آپ کے بھائی کو مار دیتا ہے۔کیا اس وقت آپ جج کے سامنے جا کر یہ کہنے کے لیے تیار ہوں گے کہ "مائی لارڈ چوں کہ میرے بھائی میں دو حواس کم تھے، لہٰذا مجرم کو کم سزا دی جائے۔" بتائیے کیا آپ یہ کہنے کے لیے تیار ہوں گے؟ نہیں بلکہ آپ کہیں گے کہ مجرم کو دگنی سزا دی جائے کیوں کہ اس نے ایک معصوم اور مجبور شخص پر ظلم کیا ہے۔لہٰذا اسلام میں بھی یہ منطق نہیں چلتی۔حواس دو ہوں یا تین، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (۲: ۱۶۸)

"لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں، انھیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

گویا جو بھی چیز اچھی ہے اور حلال ہے، اس کے کھانے کی اسلام اجازت دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر آپ تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں چوپایوں وغیرہ کی تعداد بہت تیزی سے بڑھتی ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ انسانوں اور جنگلی جانوروں کے مقابلے میں چوپائے بہت تیزی سے اپنی نسل میں اضافہ کرتے ہیں، اگر آپ کی بات مان لی جائے اور گوشت کھانا چھوڑ دیا جائے تو چوپایوں کی آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

جہاں تک گائے کی آبادی میں اضافے کا تعلق ہے اس حوالے سے مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "گئو ہتھیا"۔یعنی گائے کا قتل۔اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ کون کون گائے کے قتل کا ذمہ دار ہے۔اس کتاب میں چمڑے کے کاروبار کا تجزیہ کر کے بتایا گیا ہے کہ اس کاروبار سے کون لوگ وابستہ ہیں۔آپ کو حیرت ہوگی کہ اس کاروبار سے مسلمان کم اور غیر مسلم زیادہ وابستہ ہیں۔اس کاروبار میں

بیش تر لوگ ''جین مت'' کے ہیں۔ یعنی گائے سے صرف مسلمان ہی فایدہ نہیں اٹھار ہے، غیر مسلموں کو زیادہ فایدہ پہنچ رہا ہے۔

لہٰذا اگر آپ سمجھ دار ہیں تو آپ کو فیصلے تک پہنچنے میں دقت نہیں ہونی چاہیے۔ مزید برآں اگر آپ دیکھیں تو انسان کے دانت ہمہ خوری کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یعنی انسانی جبڑے میں نوکدار دانت بھی ہوتے ہیں ہموار بھی تا کہ یہ گوشت خوری بھی کر سکے اور سبزی خوری بھی جو جانور صرف سبزی خور ہیں ان کے تمام دانت ہموار ہوتے ہیں لہٰذا وہ گوشت کھا ہی نہیں سکتے۔ جب کہ گوشت خور جانوروں کے تمام دانت نوکیلے ہوتے ہیں، یوں وہ تمام سبزی خوری کر ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا انسانی دانتوں کی ساخت اور بناوٹ سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دانت ہر قسم کی خوراک کے لیے بنائے ہیں، اگر ہمارا خالق چاہتا کہ ہم صرف سبزیاں ہی کھائیں تو وہ ہمیں نوکیلے دانت کیوں عطا کرتا؟ یہ دانت کیوں عطا کیے گئے ہیں؟ اس لیے تا کہ ہم گوشت خوری کر سکیں۔ اسی طرح اگر آپ سبزی خور جانوروں مثلاً گائے، بکری بھیڑ وغیرہ کے نظام انہضام کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ صرف سبزیاں ہی ہضم کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف اگر آپ گوشت خور جانوروں مثلاً شیر، بھیڑیے، چیتے وغیرہ کے نظام ہضم کا جائزہ لیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ صرف گوشت ہی ہضم کر سکتے ہیں، لیکن انسان کا نظام ہضم اللہ تعالیٰ نے بنایا ہی اس طرح ہے کہ ہر طرح کی غذا ہضم کر سکتا ہے۔

یوں سائنسی تجزیے کی روشنی میں بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ انسان ہر طرح کی غذا استعمال کرے۔ نباتاتی بھی اور لحمیاتی بھی۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا کہ ہم صرف سبزیاں کھائیں تو وہ ہمیں گوشت ہضم کرنے کی صلاحیت ہی کیوں دیتا۔

میں امید رکھتا ہوں کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

☆......☆......☆

سوال: میں کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتا۔ میرا سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے کہنے کے مطابق تمام مذاہب اور نسلیں وغیرہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں تو پھر یہ لڑائیاں کیوں ہیں؟ آپ کہتے ہیں کہ ہندومت کا عقیدہ ہے کہ ''ہر شے خدا ہے'' اور اسلام کا عقیدہ ہے کہ ''ہر شے خدا کی ہے'' تو ہندوستان میں اور پوری دنیا میں یہ لڑائیاں کیوں ہیں؟ بلکہ خود مسلمان ممالک میں بھی؟

جواب: میرے بھائی نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پوری انسانیت کو ایک جوڑے یعنی آدم وحوا علیہما السلام سے تخلیق فرمایا۔ بھائی کہتے ہیں کہ میں نے یہ کہا کہ ''تمام مذاہب اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں۔'' میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو مختلف مذاہب میں تقسیم کیا ہے۔

میری تقریر ریکارڈ ہو رہی ہے۔ میں نے کسی جگہ یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مذاہب میں تقسیم کیا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ انسان کو مختلف قوموں، قبیلوں، نسلوں اور رنگوں میں تقسیم کیا گیا۔

مذہب صرف ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو مذاہب کے لحاظ سے تقسیم نہیں کرتا۔ ہاں، اس نے رنگ ونسل اور قبیلوں کے لحاظ سے ضرور انسان کو بانٹا ہے۔ اسی طرح زبانوں کا اختلاف ہے تاکہ انسانوں کی پہچان ہو سکے۔

اسی طرح جہاں تک ہندومت کا تعلق ہے تو آکسفرڈ ڈکشنری کی تعریف کے مطابق مذہب نام ہی خدا پر ایمان کا ہے۔ ہندومت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندومت کے تصور خدا کو سمجھا جائے۔ یہودیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہودیت کے تصورِ خدا کو سمجھا جائے۔ عیسائی مذہب کی تفہیم کے لیے لازم ہے کہ عیسائیت کے تصورِ خدا کی تفہیم ہو۔ اسی طرح اسلام کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے تصورِ خدا کو درست طور پر سمجھا جائے۔ میں نے اپنی گفتگو کے دوران یہی بات کی تھی۔ جہاں تک اختلافات کا

سوال ہے تو یہ اختلافات کس نے پیدا کیے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان اختلافات کی تعلیم نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ تو سورۂ انعام میں صاف فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْادِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ٥ (۶: ۱۵۹)

''جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں، ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے۔ وہی ان کو بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا۔''

مذہب کو تقسیم نہیں کیا جانا چاہیے۔ تفرقہ نہیں ہونا چاہیے۔ جو تفرقے میں پڑتا ہے وہ غلط کرتا ہے۔ آپ نے پوچھا ہے کہ لوگ آپس میں لڑ کیوں رہے ہیں اور ایک دوسرے کو مار کیوں رہے ہیں؟ یہ تو آپ کو ان لوگوں سے پوچھنا چاہیے۔

فرض کیجیے آپ ایک استاد ہیں۔ آپ اپنے شاگرد کو نقل کرنے سے منع کرتے ہیں لیکن وہ پھر بھی باز نہیں آتا اور نقل کرتا ہے تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟ کون قصور وار ہے استاد یا شاگرد؟ ظاہر ہے کہ شاگرد ہی قصور وار ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہدایت دے دی ہے، اسے راہِ مستقیم دکھا دی ہے۔ انسان کو آخری اور مکمل پیغام ہدایت مل چکا ہے۔ یہ پیغام ہدایت انسان کو قرآنِ مجید کی صورت میں عطا کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں انسان کے لیے اوامر و نواہی بیان کر دیے گئے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا، سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ٥ (۵: ۳۲)

اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ: ''جس نے کسی انسان

کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔"

گویا اللہ تعالیٰ قتل و غارت کو پسند نہیں فرماتا۔ لیکن اگر انسان احکامات الٰہی پر عمل نہ کرے تو قصور کس کا ہے؟ خود انسان کا۔

سورۂ ملک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَّھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۝ (۶۷:۲)

"(اللہ تعالیٰ) جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے، تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔"

زندگی اور موت دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کے لیے یہ ایک امتحان ہے، جس میں کامیابی کا انحصار اس کے اعمال کی نوعیت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو اچھے یا برے اعمال پر مجبور نہیں کرتا۔ اگرچہ وہ چاہے تو یقیناً کر سکتا ہے۔ ایک استاد چاہے تو اپنے تمام طالب علموں کو پاس کر سکتا ہے خواہ وہ کامیابی کی اہلیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ استاد چاہے تو بڑی آسانی سے سب کو کامیاب کر سکتا ہے لیکن ایسا کرنا غلط ہوگا، اسی طرح اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو تمام انسان ایمان لے آئیں۔ ہر کوئی ایمان لے آئے لیکن ایسا نہیں ہوگا۔

اگر استاد ایک ایسے طالب علم کو پاس کر دے جو نالائق ہے، جس نے امتحان میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا، جس نے درست جوابات نہیں دیے تو محنتی اور قابل طالب علم کہے گا کہ میں نے اتنی محنت کی لیکن دوسرا طالب علم جس نے محنت نہیں کی، جو نقل کرتا رہا،

جس نے جوابات ہی نہیں لکھے وہ بھی کامیاب ہوگیا ہے۔ اگر استاد اسی طرح سب کو کامیاب کردے تو اگلی دفعہ آنے والے طالب علموں میں سے کوئی ایک بھی محنت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ اگر نظام ہی اس طرح کا بن جائے گا تو میڈیکل کالج کا طالب علم ڈاکٹر تو بن جائے گا۔ اس کے پاس ایم بی بی ایس کی ڈگری تو ضرور ہوگی لیکن وہ لوگوں کا علاج نہیں کرسکے گا۔ وہ لوگوں کی جان بچانے کی بجائے لوگوں کی جان لینے کا سبب بنے گا۔

لہٰذا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بنی نوع انسان کو راہِ ہدایت دکھا دی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ؛

کسی کو قتل نہ کرو............

کسی کو ایذا نہ پہنچاؤ............

لوگوں کے کام آؤ............

اپنے پڑوسیوں سے محبت کرو............

اگر لوگ ایسا نہیں کرتے تو جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو کے دوران میں عرض کیا، اس کا مطلب ہے کہ لوگ قرآنی احکامات پر عمل نہیں کر رہے۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ قرآن کی تعلیمات پر عمل نہیں کر رہا۔ وہ کوئی بھی ہو، کہیں بھی ہو، امریکہ میں ہو یا پاکستان میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں۔ لوگ کچھ بھی کریں، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ محض مسلمانوں والا نام رکھ لینے سے، عبداللہ یا ذاکر یا محمد نام رکھ لینے سے کوئی جنت میں داخلے کا حق دار نہیں ہوجاتا۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ میں مسلمان ہوں، کوئی حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں بن جاتا۔ اسلام کوئی لیبل نہیں ہے جسے جو چاہے چسپاں کرلے۔ اگر کوئی شخص اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کردے تو وہی مسلمان ہے۔ قرآن کے مطابق کچھ لوگ ایسے ہیں جو مسلمان ہونے کا زبانی دعویٰ کرتے ہیں، لہٰذا اگر کچھ لوگ قتل و غارت گری میں ملوث ہیں تو وہ قرآنی احکامات کی پیروی نہیں کر رہے۔ اگر قرآنی ہدایت کی پیروی کی جائے تو پوری دنیا میں امن وسلامتی کا دور دورہ ہوجائے۔

سوال: ذاکر بھائی! کیا اگر ایک ہندو قرآنی تعلیمات پر عمل کرتا ہے جو کہ ہندو مت کی کتب مقدسہ میں بھی موجود ہیں تو کیا وہ مسلمان کہلا سکتا ہے؟ اسی طرح اگر ایک مسلمان ہندو صحائف کی تعلیمات کو درست سمجھتا ہے تو کیا وہ ہندو کہلا سکتا ہے؟ کیوں کہ آپ کی گفتگو کا عنوان ہی ''عالمی بھائی چارہ'' ہے۔

جواب: بھائی نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ یہ سوال بہت اچھا اس لیے ہے کیوں کہ یہ ایک واضح سوال ہے۔ اگر آپ ایک واضح سوال پوچھیں گے تو میں اس کا جواب دے سکوں گا۔ سوال یہ ہے کہ ایک ہندو جو قرآنی تعلیمات اور ہندو مذہب پر بیک وقت عمل کرتا ہے کیا وہ مسلمان کہلا سکتا ہے۔ اور یہ کہ کیا اس قسم کا مسلمان ہندو کہلا سکتا ہے؟

اس سلسلے میں پہلے تو ہمیں یہ پتہ ہونا چاہیے کہ ''ہندو'' اور ''مسلمان'' کی تعریف کیا ہے؟ یعنی ہندو کسے کہتے ہیں اور مسلمان کسے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ''مسلمان وہ شخص ہے جو اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کردے۔'' ہندو کی تعریف کیا ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں؟

''ہندو'' کی صرف ایک جغرافیائی تعریف ممکن ہے۔ کوئی بھی شخص جو ہندوستان میں رہتا ہے یا ہندوستانی تہذیب سے اِدھر آباد ہے وہ ہندو کہلا سکتا ہے۔ اس تعریف کی رو سے میں بھی ہندو ہوں۔ یعنی جغرافیائی اعتبار سے آپ مجھے ہندو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ پوچھیں کہ کیا میں ''ویدانتی'' ہوں یعنی کیا میں ویدوں پر ایمان رکھتا ہوں؟ تو میرا جواب ہوگا کہ جہاں تک ویدوں کے اس حصے کا تعلق ہے جو قرآنِ مجید کی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے انھیں تسلیم کرنے پر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مثال کے طور پر یہ بات کہ ''صرف ایک ہی خدا ہے۔''

لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ خدا نے برہمنوں کو اپنے سر سے اور کھتریوں کو سینے سے پیدا کیا۔ اور یوں برہمن ایک برتر ذات ہے تو میں یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گا۔ یہ بات میں ویدوں ہی سے پیش کر رہا ہوں۔ ویدوں میں ایسا لکھا ہوا ہے اگر آپ

ویدوں کو تسلیم ہی نہیں کرتے تو یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ لیکن یہ بات ویدوں میں اسی طرح موجود ہے، آپ کسی بھی ویدوں کے عالم سے پوچھ سکتے ہیں۔ وید کے عالم یہاں بھی موجود ہیں۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہہ رہا وید کہہ رہے ہیں کہ ویشوں کو رانوں سے اور شودروں کو پاؤں سے پیدا کیا گیا۔ میں اس تصور سے قطعاً اتفاق نہیں کرتا اور اگر آپ پوچھیں گے کہ کیا میں ویدوں کے فلسفے پر ایمان رکھتا ہوں تو میرا جواب ہوگا کہ نہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ جو شخص ہندوستان میں رہتا ہے وہ ہندو ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان میں رہنے والا ہر شخص ہندو ہے۔ اسی طرح جیسے امریکہ میں رہنے والا ہر شخص امریکی ہے۔ اور اسے امریکی ہونا بھی چاہیے۔

لہٰذا آپ کے سوال کا جواب یہ بنتا ہے کہ ہاں آپ ایک مسلمان کو ہندو کہہ سکتے ہیں اگر وہ ہندوستان میں رہتا ہے تو۔ لیکن اس بات کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ویدک مذہب کا ماننے والا اگر امریکہ چلا جاتا ہے تو پھر آپ اسے ہندو نہیں کہہ سکتے اب وہ ایک امریکی ہے۔

ہندومت ایک عالمی مذہب نہیں ہے۔ ہندومت صرف ہندوستان میں ہے۔ علما کا کہنا ہے کہ آپ ہندو ازم کو مذہب نہیں کہہ سکتے۔ یہ محض ایک جغرافیائی تعریف ہے۔ سوامی ویویک آنند کا شمار عظیم علما میں ہوتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ لفظ ہندومت ایک غلط نام (Misnoma) ہے۔ اصولاً انھیں ویدانتی کہا جانا چاہیے۔

چنانچہ میں اپنی بات پھر دہراتا ہوں کہ اگر آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ:

''کیا آپ ایک ہندو ہیں؟''

تو میرا جواب ہوگا:

''اگر ہندو کا مطلب ہندوستان میں رہنے والا ہے تو پھر میں یقیناً ہندو ہوں۔
لیکن اگر ہندو ہونے سے آپ کا مطلب بہت سے خداؤں پر ایمان رکھنا ہے
جن کے اتنے سر ہیں اور اتنے ہاتھ ہیں تو پھر میں ہندو نہیں ہوں۔''

اسی طرح جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کیا کسی ہندو کو مسلمان کہا جا سکتا ہے تو

اس کا جواب ہے کہ ہاں ایک ہندو یعنی ایک ہندوستانی مسلمان بھی ہوسکتا ہے لیکن اگر وہ ہندو بتوں کی پوجا کرتا ہے تو پھر وہ ہرگز مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ایک بت پرست کبھی مسلمان نہیں کہلا سکتا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا○ (۴: ۴۸)

''اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔''

اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر دوبارہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا○ (۴: ۱۱۶)

''اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے، اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہوسکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔''

لہٰذا بات یہ ہوئی کہ ایک ہندوستانی یعنی جغرافیائی ہندو مسلمان ہوسکتا ہے لیکن اگر وہ ہندو اسلامی احکامات پر عمل پیرا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتا تو پھر اسے مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔

☆......☆......☆

سوال: بیش تر مسلمان بنیاد پرست اور دہشت گرد کیوں ہیں؟

جواب: بھائی نے سوال پوچھا ہے کہ بیش تر مسلمان بنیاد پرست اور دہشت گرد کیوں ہیں۔ مجھ سے ایک سوال پوچھا گیا ہے اور میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔ اگر یہ جواب آپ کے لیے اطمینان بخش ہو تو اسے قبول کرلیں اور اگر غیر تسلی بخش ہو تو ردّ کردیں۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ○ (۲: ۲۵۶)

’’دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔‘‘

میں آپ کے سامنے حقیقت پیش کروں گا لیکن اس حقیقت کو قبول کرنے پر میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتا۔ آپ چاہیں تو اس کو قبول کریں چاہیں تو نہ کریں کیوں کہ دین میں یعنی اسلام میں زبردستی تو ہے نہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ زیادہ تر مسلمان دہشت گرد اور بنیاد پرست کیوں ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ’’بنیاد پرست‘‘ کا مطلب کیا ہے؟

’’بنیاد پرست اس شخص کو کہتے ہیں جو (کسی بھی معاملے میں) بنیادی اصولوں پر عمل کرتا ہو۔‘‘

مثال کے طور پر ایک شخص اگر اچھا ریاضی دان بننا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ریاضی کے بنیادی تصورات سے آشنا بھی ہو اور ان پر عمل پیرا بھی ہو۔ گویا اگر کوئی اچھا ریاضی دان بننا چاہتا ہے تو اسے ریاضیات کے شعبے کا بنیاد پرست ہونا چاہیے۔

اسی طرح اگر کوئی اچھا سائنس دان بننا چاہتا ہے تو اسے سائنس کے بنیادی اصول کا علم بھی ہونا چاہیے اور اُسے ان اصولوں پر عمل بھی کرنا چاہیے۔ بہ الفاظِ دیگر اسے سائنس کے شعبے کا بنیاد پرست ہونا چاہیے۔

اگر ایک شخص اچھا ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس کو چاہیے کہ وہ علم طب کے بنیادی اصولوں یعنی مبادیات کا علم حاصل کرے اور پھر ان پر پورا عمل بھی کرے۔ یعنی اچھا ڈاکٹر بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شعبہ طب کا بنیاد پرست بن جائے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تمام بنیاد پرستوں کو کسی ایک خانے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمام بنیاد پرست برے ہوتے ہیں یا یہ کہ ''تمام بنیاد پرست اچھے ہوتے ہیں۔''

مثال کے طور پر ایک ڈاکو بھی بنیاد پرست ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ مبادیاتِ ڈاکہ زنی پر پوری طرح عمل کرتا ہو اور کامیابی سے ڈاکے ڈالتا ہو۔ لیکن وہ ایک اچھا آدمی نہیں ہے کیوں کہ وہ لوگوں کو لوٹتا ہے، وہ معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے۔ وہ بھائی چارے کو خراب کرتا ہے۔ وہ ایک اچھا انسان نہیں ہے۔

دوسری طرف ایک بنیاد پرست ڈاکٹر ہے۔ جو مبادیاتِ طب پر عمل پیرا ہے۔ بنیادی طبی اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کا علاج کرتا ہے ان کی تکالیف دور کرتا ہے۔ وہ ایک اچھا انسان ہے کیوں کہ وہ نبی نوع انسانیت کے کام آرہا ہے۔

یعنی آپ تمام بنیاد پرستوں کا خاکہ ایک ہی مُوقلم سے نہیں بنا سکتے۔

جہاں تک سوال ہے مسلمانوں کے بنیاد پرست ہونے کا تو مجھے فخر ہے کہ میں ایک بنیاد پرست مسلمان ہوں کیوں کہ میں اسلام کی بنیادی باتوں کا علم رکھتا ہوں اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور فخر سے کہتا ہوں کہ میں ایک بنیاد پرست مسلمان ہوں۔ کوئی بھی شخص جو اچھا مسلمان بننا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک بنیاد پرست مسلمان بنے۔ بصورتِ دیگر وہ کبھی بھی ایک اچھا مسلمان نہیں بن سکتا۔

اسی طرح اگر ایک ہندو چاہتا ہے کہ وہ ایک اچھا ہندو بنے تو اسے ایک بنیاد پرست ہندو بننا پڑے گا۔ ایک عیسائی اگر اچھا عیسائی بننا چاہتا ہے تو اسے بنیاد پرست عیسائی بننا پڑے گا بصورتِ دیگر وہ کبھی ایک اچھا عیسائی نہیں بن سکتا۔

اصل سوال یہ ہے کہ ایک ''بنیاد پرست مسلمان'' اچھا ہوتا ہے یا برا؟ الحمدللہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جو انسانیت کے خلاف ہو۔ مجھ سے متعدد ایسے سوالات پوچھے گئے جو غلط فہمیوں پر مبنی تھے۔ لوگوں کو اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں ہیں اور ان غلط فہمیوں کی وجہ سے ہی وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات میں خرابی ہے۔ جس طرح کہ ایک بھائی نے گائے کے بارے میں سوال کیا اور میں نے جواب دیا۔ اسی طرح کے مزید سوالات کیے گئے اور میں نے جوابات دیے۔

اصل میں ہوتا یہ ہے کہ لوگوں کی معلومات محدود ہوتی ہیں۔ اور وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اسلام کی کچھ بنیادی تعلیمات ہی غلط ہیں۔ لیکن اگر آپ اسلام کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے ہیں تو آپ کے علم میں ہوگا کہ اسلام کا کوئی ایک اصول بھی ایسا نہیں ہے جو معاشرے اور انسانیت کے لیے نقصان دہ ہو۔

میں یہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو، اور یہی نہیں، کائنات کے تمام لوگوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں کوئی ایک چیز مجھے ایسی دکھادیں جو انسانیت کے خلاف ہو۔

ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو اسلامی تعلیمات بری لگتی ہوں لیکن مجموعی طور پر پوری انسانیت کی بہتری اور فلاح کے لیے یہی تعلیمات بہترین ہیں۔ میں دوبارہ چیلنج کرتا ہوں، اس ہال میں بیٹھا ہوا کوئی بھی شخص مجھ سے کوئی بھی سوال پوچھ سکتا ہے۔ میں ان شاء اللہ تمام غلط فہمیاں دور کروں گا۔

ویبسٹر ڈکشنری بتاتی ہے کہ:

''فنڈامنٹلزم وہ تحریک تھی جو بیسویں صدی کے آغاز میں امریکی پروٹسٹنٹ

عیسائیوں نے شروع کی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ نہ صرف بائبل میں بیان کردہ تعلیمات الہامی ہیں بلکہ پوری انجیل لفظ بہ لفظ کلامِ خداوندی ہے۔''

اب ظاہر ہے کہ اگر یہ ثابت کیا جاسکے کہ بائبل واقعی حرف بہ حرف کلامِ خداوندی ہے تو پھر یہ ایک اچھی تحریک ہے لیکن اس تحریک سے وابستہ لوگ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو پھر فنڈامنٹلزم کی یہ تحریک قابلِ ستائش نہیں کہلائے گی۔

آکسفرڈ انگریزی لغت میں بنیاد پرست کی یہ تعریف ملتی ہے:

" ...... Strictly adhering to the ancient laws of a religion, especialy Islam."

''کسی بھی مذہب کے قدیم قوانین کی سختی سے پابندی کرنا، خصوصاً ''اسلام''۔

یعنی اب آکسفرڈ ڈکشنری کہتی ہے کہ'' خصوصاً اسلام''۔ اس لغت کی تازہ ترین اشاعت میں یہ اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی اب بنیاد پرستی کا لفظ سنتے ہی فوراً دھیان جائے گا مسلمان کی طرف .... کیوں؟

اس لیے کہ مغربی ذرائع ابلاغ مسلسل لوگوں پر ایسے بیانات کی بمباری کیے چلے جارہے ہیں جن سے مسلمان ہی بنیاد پرست معلوم ہوتے ہیں اور مسلمان ہی دہشت گرد۔ اور اب تو صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ'' بنیاد پرست'' لفظ سنتے ہی فوراً ذہن میں مسلمان آتے ہیں۔

ذرا لفظ'' دہشت گرد'' پر غور کریں۔ دہشت گرد کسے کہتے ہیں؟ اس شخص کو جو دہشت پھیلائے۔

اب اگر ایک ڈاکو پر پولیس کو دیکھ کر دہشت طاری ہوجاتی ہے تو اس کے لیے پولیس دہشت گرد ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟

میں انگریزی زبان میں واضح طور پر بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں لفظوں سے نہیں کھیل رہا۔ دہشت گرد وہ ہے جو دہشت پھیلائے۔ اب اگر کسی ڈاکو، کسی مجرم، کسی

سماج دشمن پر پولیس کو دیکھ کر دہشت طاری ہوتی ہے تو پولیس بھی دہشت گرد ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہر مسلمان کو دہشت گرد ہونا چاہیے۔ اسے سماج دشمن عناصر کے لیے دہشت گرد ہونا چاہیے۔ کوئی ڈاکو کسی مسلمان کو دیکھے تو اس پر دہشت طاری ہو جانی چاہیے۔ اسی طرح اگر کوئی زانی کسی مسلمان کو دیکھے تو اسے دہشت زدہ ہو جانا چاہیے۔

مجھے اس بات سے بھی اتفاق ہے کہ بالعموم دہشت گرد اس شخص کو کہا جاتا ہے جو عام لوگوں کو دہشت زدہ کرے۔ جو معصوم لوگوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کرے اور اس تناظر میں کسی بھی مسلمان کو دہشت گرد نہیں ہونا چاہیے۔ عام لوگوں کو مسلمان سے قطعاً دہشت زدہ نہ ہونا چاہیے۔

البتہ جہاں تک سماج دشمن عناصر، چوروں، ڈاکوؤں اور مجرموں کا تعلق ہے تو جس طرح پولیس ان کے لیے دہشت گرد ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی ان کے لیے دہشت گرد ہونا چاہیے۔

ایک معاملہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اگر آپ تجزیہ کریں تو بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص پر دو مختلف لیبل لگ جاتے ہیں۔ ایک ہی شخص کے، ایک ہی کام کی وجہ سے، دو مختلف تصور بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا، جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی تو اس وقت مجاہدین آزادی، برصغیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ انگریز حکمران ان لوگوں کو دہشت گرد کہتے تھے جب کہ ہندوستانی انھیں محبِّ وطن اور مجاہدین آزادی کہتے تھے۔

وہی لوگ تھے، ایک ہی فعل کی وجہ سے انگریزوں کی نظر میں وہ دہشت گرد تھے لیکن ہندوستانیوں کی نظر میں، ہماری نظر میں وہ مجاہد تھے۔ آپ جب ان لوگوں پر کوئی لیبل لگائیں گے تو پہلے صورتِ حال کا تجزیہ کریں گے۔ اگر آپ انگریز حکمرانوں سے اتفاق کرتے ہیں تو پھر یقیناً آپ انھیں دہشت گرد قرار دیں گے لیکن اگر آپ ہندوستانیوں کے اس موقف سے اتفاق کرتے ہیں کہ انگریز ہندوستان میں تجارت کرنے آئے تھے اور یہاں

قابض ہوگئے، ان کی حکومت غاصبانہ اور غیر قانونی ہے تو پھر آپ انھی لوگوں کو مجاہدین آزادی قرار دیں گے۔

یعنی ایک ہی طرح کے لوگوں کے بارے میں دو مختلف آرا ہونا ممکن ہے۔

چنانچہ میں آخر میں یہ کہہ کر اپنی بات سمیٹوں گا کہ "جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہر مسلمان کو بنیاد پرست ہونا چاہیے کیوں کہ اسلام کی تمام تعلیمات انسانیت کے حق میں ہیں۔ انسان دوستی اور عالمی بھائی چارے کو تقویت دینے والی ہیں۔"

میں امید رکھتا ہوں کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

☆......☆......☆

سوال: جہاں تک میرا خیال ہے کسی مذہب میں بھی کوئی برائی نہیں ہے۔ ہر مذہب کے اصول اچھے ہیں لیکن اصول بیان کر دینا ایک چیز ہے اور ان اصولوں پر عمل کرنا ایک دوسری بات ہے۔ عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ خون ریزی مذہب کے نام پر ہی ہوتی ہے۔ آپ مذہبی اصولوں اور مذہب کے نام پر ہونے والی قتل وغارت میں مطابقت کس طرح تلاش کریں گے؟

جواب: یہ ایک بہت اچھا سوال ہے کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر اچھی باتیں ہی کرتے ہیں لیکن جہاں تک عمل درآمد کا تعلق ہے تو وہ کچھ مختلف ہے۔ تعلیم اچھی باتوں کی دی جاتی ہے لیکن اگر دنیا پر نظر دوڑائی جائے تو بے شمار لوگ ہیں جو مذہب کے نام پر لڑ رہے ہیں۔ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

یہ ایک بہت اچھا سوال ہے۔ اس سوال کا جزوی جواب تو میں اپنی گفتگو کے دوران میں دے چکا ہوں۔ یعنی جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، ہمارا دین ہمیں کسی بے گناہ کے قتل کی اجازت نہیں دیتا۔

سورۂ مائدہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ۝ (۵: ۳۲)

اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ: ”جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ

زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔“

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اپنے اختلافات کو کس طرح حل کر سکتے ہیں۔ اتفاق کس طرح پیدا ہوسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی میں نے سورۂ آل عمران کی چونسٹھویں آیت کی روشنی میں دیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝ (۳: ۶۴)

اے نبی ﷺ کہو! ”اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔“

فرض کیجیے دس نکات آپ پیش کرتے ہیں اور دس نکات میں پیش کرتا ہوں۔ اب فرض کیجیے کہ ان میں سے پانچ نکات مشترکہ ہیں اور باقی میں اختلاف ہے تو ہمیں کم از کم پانچ نکات کی حد تک تو اتفاق رائے کر لینا چاہیے۔ اختلافات کو ملتوی کیا جاسکتا ہے، نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

قرآن کن باتوں پر جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ ہم ایک خدائے واحد و برتر کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں گے۔

دوسری بات یہ کہ ہم کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے۔

آپ نے ایک اچھی بات کی کہ یہ مسائل کیوں کر حل ہوسکتے ہیں؟ میں نے ایک طریقۂ کار آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ مشترکہ امور پر اتفاق رائے پیدا کیا جائے۔ لیکن

اس سلسلے میں ایک نہایت اہم بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی وہ یہ کہ مختلف مذاہب کے بیش تر پیروکار خود اپنے مذہب کی حقیقی تعلیمات سے باخبر نہیں ہوتے۔ انھیں یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کے صحائف مقدس میں لکھا کیا ہوا ہے؟

بہت سے مسلمانوں کو بھی یہ علم نہیں ہوتا کہ قرآن اور احادیث صحیحہ میں کیا تعلیمات دی گئی ہیں۔ اسی طرح بہت سے ہندوؤں کو یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کے متونِ مقدسہ کہتے کیا ہیں۔ بہت سے عیسائی ایسے ہیں جو نہیں جانتے کہ بائبل کے احکامات کیا ہیں اور بہت سے یہودیوں کو یہ خبر نہیں کہ عہد نامہ قدیم میں لکھا کیا ہوا ہے؟

اب قصور کس کا ہے؟ ان مذاہب کا یا ان کے ماننے والوں کا؟ ظاہر ہے کہ ان مذاہب کے پیروکار ہی قصور وار ہیں۔ اسی لیے میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ اپنے متون مقدسہ کا مطالعہ تو کریں۔ اختلافات بعد میں نپٹا لیے جائیں گے، پہلے کم از کم ان امور پر تو ہم اکٹھے ہو جائیں جو ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہیں۔

میں ''اسلام اور عیسائیت میں یکسانیت'' کے موضوع پر ایک گفتگو کر چکا ہوں۔ اس یں بھی میں نے یہی کہا کہ اختلافات کو فی الحال نظر انداز کر دیا جائے اور کم از کم ان نکات پر تو ہم متفق ہو جائیں جو ہمارے قرآن اور تمہاری انجیل میں مشترک ہیں۔ اگر ہم مشترک مور پر ہی متفق ہو جائیں تو جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

میں اپنی اس گفتگو میں بھی یہی کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیا میں کبھی کسی مذہب ر از خود تنقید کرتا ہوں؟ صرف اس وقت جب بعض بھائیوں کے سوالات کی وجہ سے میں مجبور ہو جاتا ہوں تو مجھے اظہارِ حقیقت کرنا پڑتا ہے۔ آپ میری تقاریر کی ریکارڈنگ دیکھ سکتے ہیں ں نے ایک دفعہ بھی کسی مذہب پر از خود تنقید کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اختلافات کے ے میں بحث کرتا ہی نہیں۔ میں مشترک امور سامنے لانے کی کوشش کرتا ہوں ورنہ میں ختلافات پر بھی بحث کر سکتا ہوں۔ میں ایسے موضوعات پر بھی تقریریں کر سکتا ہوں:

''اسلام اور ہندومت کے اختلافات''

اسلام اور عیسائیت کے اختلافات''

میں تقابل ادیان کا طالب علم ہوں۔ اللہ کا شکر ہے میں دنیا کے بیش تر مذاہب کے متون مقدسہ کے اقتباسات یہاں پیش کرسکتا ہوں۔ اور ان مذاہب کے اختلافات آپ کے سامنے پیش کرسکتا ہوں۔

لیکن میں ایسا نہیں کرتا۔ میں اختلافات کا ذکر اسی وقت کرتا ہوں جب اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب حاضرین میں سے کوئی پروگرام کو خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہمیں ان اختلافات سے باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں عام آدمی کے سامنے ان اختلافات پر گفتگو نہیں کرتا۔ عام آدمی سے میں یہی کہتا ہوں کہ خود اپنی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ اس طرح تم اپنے مذہب کے بھی قریب ہو جاؤ گے اور عالمی بھائی چارہ بھی بڑھے گا۔ اپنے صحائف مقدسہ کا مطالعہ کرو۔ کم از کم خدا پر تو ایمان لاؤ۔ اختلافات بعد میں حل ہوتے رہیں گے۔

یہودیت یہی کہتی ہے، عیسائیت یہی کہتی ہے، ہندومت یہی کہتا ہے، اسلام یہی کہتا ہے، سکھ مذہب یہی کہتا ہے، پارسی مذہب یہی کہتا ہے کہ:

''ایک خدا پر ایمان لاؤ اور اسی کی پرستش کرو۔''

آپ دوسروں کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟ پہلے صرف اسی نکتے پر جمع ہو جائیں دیگر نکات کے بعد میں فیصلے ہوتے رہیں گے۔ اگر ہم یہ مشترکہ مسئلہ حل کرلیں اگر ہم دس میں سے تین مسائل پر بھی متفق ہو جائیں تو دیگر نکات کا اختلاف برداشت کیا جاسکتا ہے۔ ان کا فیصلہ بعد میں ہوسکتا ہے۔

آپ یقین کیجیے کہ اگر ہم مشترکہ نکات پر اتفاق کرلیں تو بیش تر مسائل حل ہو جائیں گے۔ اور میں خود یہی کام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں ساری دنیا میں سفر کرتا ہوں۔ غیر مسلموں کے سامنے خطابات کرتا ہوں اور چوں کہ لوگ نہ اپنے صحائف مقدسہ کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے ہیں اور نہ ہماری کتابوں کے بارے میں، لہٰذا بہت سے لوگ

سوالات کرتے ہیں۔ خود مسلمان بھی قرآن و حدیث کی تعلیمات کے بارے میں پورا علم نہیں رکھتے۔ وہ ان باتوں کے بارے میں سوالات کرتے ہیں جن کے بارے میں وہ نہیں جانتے لہٰذا میں انھیں معلومات فراہم کرتا ہوں۔ میں انھیں قرآن اور حدیث کے بارے میں بتاتا ہوں۔ ویدا اور بائبل کے بارے میں بتاتا ہوں۔ اور میں جب بھی کوئی اقتباس پیش کرتا ہوں تو اس کا حوالہ ضرور پیش کر دیتا ہوں۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ذاکر بھائی ہوائی باتیں کر رہے ہیں۔ اور یہ تمام کتب مقدسہ جن کا میں حوالہ دیتا ہوں، اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن میں دستیاب ہیں۔ ہماری لائبریری میں وید مقدس کے متعدد ترجمے موجود ہیں۔ ہمارے پاس سیکڑوں قسم کی انجیلیں موجود ہیں۔ بائبل کے تیس سے زیادہ مختلف متن ہمارے پاس ہیں۔ الحمدللہ۔ لہٰذا آپ کا تعلق کسی بھی فرقے سے ہو۔ آپ Jehovahs Witness ہوں، Catholic ہوں یا Protestent ہوں، آپ کی بائبل ہمارے پاس موجود ہوگی اور ہم اس کا حوالہ پیش کریں گے۔ چنانچہ اگر کوئی کہنا چاہے کہ ذاکر نائیک غلط کہہ رہا ہے تو اُسے ان متونِ مقدسہ کو بھی غلط کہنا پڑے گا کیوں کہ میری تقریر کا بیش تر حصہ ان متون مقدسہ کے اقتباسات ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر آپ ان صحائف سے اختلاف کرتے ہیں تو اس سے کوئی آپ کو روک نہیں سکتا۔ ضرور اختلاف کریں۔ بڑے شوق سے اختلاف کریں کیوں کہ قرآن کہتا ہے کہ ''دین میں کوئی جبر نہیں ہے'' حق کو باطل سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ میں ہندومت کی حقیقی تعلیم آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ اتفاق کرنا چاہیں تو کریں اگر اختلاف کرنا چاہیں تو اختلاف کریں۔

ایک سمپوزیم منعقد ہوا تھا، جس کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی دستیاب ہے۔ اس سمپوزیم کا موضوع تھا ''اسلام عیسائیت اور ہندومت میں تصورِ خدا'' کچھ لوگ اسے مناظرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیرالہ کے ایک ہندو پنڈت، کالی کٹ کے ایک مسیحی پادری اور اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے میں۔ یہ مباحثہ ساڑھے چار گھنٹے جاری رہا۔ اس مباحثے کی ریکارڈنگ دستیاب ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ اس مباحثے میں عیسائیت اور ہندومت کے علما بھی

شریک ہیں اور میں تو محض ایک طالب علم ہوں۔ میں نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ فیصلہ کرنا تو ناظرین کا کام ہے۔ میں نے بہر حال مشترکہ نکات پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھی کی کتابوں کے ساتھ اور مکمل حوالوں کے ساتھ۔ باب نمبر اور آیت نمبر کے ساتھ۔ بنی نوع انسان کو متحد کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ ہے ایسی باتوں کی تلاش جو ہمارے مابین مشترک ہوں۔

امید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

☆......☆......☆

سوال: اگر اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے تو پھر اسے تلوار کی مدد سے کیوں پھیلایا گیا ہے؟

جواب: سوال پوچھا گیا ہے کہ: ''اگر اسلام واقعی امن وسلامتی کا مذہب ہے تو پھر یہ تلوار کی مدد سے کیوں پھیلا؟ بات یہ ہے کہ اسلام کا لفظ ہی سَلَمَ سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہی سلامتی ہے۔ اسلام کا ایک اور مطلب اپنی رضا کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دینا ہے۔ گویا اسلام کا مطلب ہوا ''وہ سلامتی جو اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دینے سے حاصل ہوتی ہے۔'' لیکن جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا کہ دنیا میں ہر شخص سلامتی کا متمنی نہیں ہوتا۔ ہر شخص یہ نہیں چاہتا کہ پوری دنیا میں امن وسلامتی کا دور دورہ ہو۔ کچھ سماج دشمن عناصر بھی ہوتے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کی وجہ سے امن وسلامتی نہیں چاہتے۔ اگر مکمل طور پر امن ہو جائے تو ظاہر ہے کہ چوروں، ڈاکوؤں اور مجرموں کے لیے مواقع ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اپنے فایدے کے لیے ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ امن وسلامتی نہ رہے۔ ایسے سماج دشمن لوگوں کی بیخ کنی کے لیے طاقت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے پولیس کا ادارہ قایم کرنا پڑتا ہے۔

گویا اسلام واقعی امن وسلامتی کا مذہب ہے لیکن امن وسلامتی قایم رکھنے کے لیے بھی بعض اوقات طاقت کا استعمال کرنا پڑتا ہے تاکہ معاشرے کے لیے نقصان دہ عناصر کی حوصلہ شکنی کی جاسکے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ''اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے'' تو اس سوال کا بہترین جواب ڈی لیسی اولیری نے دیا ہے، جو کہ ایک مشہور غیر مسلم مؤرخ ہیں۔ اپنی کتاب ''Islam at the Cross Roods.'' کے صفحہ آٹھ پر وہ لکھتے ہیں:

''......تاریخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شدت پسند مسلمانوں کے پوری دنیا پر قبضے کرنے اور تلوار کے زور پر مفتوحہ اقوام کے لوگوں کو مسلمان کرنے کی کہانیاں درحقیقت ان افسانوں میں سب سے زیادہ بے سروپا اور ناقابل یقین

ہیں جو مورخ دہراتے رہتے ہیں۔"

کتاب کا نام Islam at the Cross Roads ہے۔ مصنف ڈی لیسی اولیری ہیں اور صفحہ نمبر آٹھ ہے۔ اب میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں کہ ہم مسلمانوں نے سپین پر تقریباً آٹھ سو برس تک حکومت کی۔ لیکن جب صلیبی جنگجو وہاں آئے تو مسلمانوں کا نام و نشان ہی مٹا دیا گیا۔ وہاں کوئی ایک مسلمان بھی ایسا نہیں بچا جو سرعام اذان دے سکے۔ لوگوں کو نماز کی دعوت دے سکے۔ ہم نے وہاں قوت کا استعمال نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم مسلمانوں نے تقریباً چودہ سو سال مسلسل عرب علاقے میں حکومت کی۔ صرف چند سال انگریزی اور چند سال فرانسیسی بھی رہے لیکن مجموعی طور پر ایک ہزار چار سو برس تک عربوں کے علاقے میں مسلمانوں ہی کی حکومت رہی۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وقت بھی تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ عرب عیسائی ہیں۔ یہ لوگ قبطی عیسائی کہلاتے ہیں۔ قبطی عیسائی نسل در نسل عیسائی چلے آ رہے ہیں۔ اگر ہم مسلمان چاہتے تو ان میں ہر ایک کو بہ زورِ شمشیر مسلمان کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔

یہ چودہ ملین عرب جو کہ قبطی عیسائی ہیں، درحقیقت اس بات کی گواہی ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر ہرگز نہیں پھیلا۔ خود ہندوستان پر بھی صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی لیکن یہاں بھی اسلام پھیلانے کے لیے تلوار سے کام نہیں لیا گیا۔ اگر چند لوگ کوئی غلط کام کریں تو اس کے لیے مذہب کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اگر چند لوگ مذہب کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس مذہب ہی میں برائی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہنا غلط ہوگا کہ عیسائیت ایک برا مذہب ہے کیوں کہ ہٹلر نے ۶۰ لاکھ یہودی مار دیے تھے۔ فرض کیجیے ایسا ہوا بھی ہو کہ ہٹلر نے ساٹھ لاکھ یہودی جلا کر مار دیے ہوں تو پھر بھی اس کا ذمہ دار عیسائی مذہب کو کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کالی بھیڑیں تو ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہیں۔

ہم مسلمانوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی، اگر ہم چاہتے تو یہاں کے ہر

غیر مسلم کو بہ زورِ شمشیر مسلمان کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہم نے کبھی ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس بات کی شہادت وہ ہندو ہیں جو آج بھی اس ملک کی آبادی کا اسی فی صد ہیں۔ یہاں موجود حاضرین میں شامل غیر مسلم خود اس بات کی گواہی ہیں کہ ہم نے طاقت اور قوت رکھنے کے باوجود لوگوں کو بہ زورِ شمشیر مسلمان نہیں کیا۔ ہم نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ اسلام اس بات پر یقین ہی نہیں رکھتا۔

آج آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا مسلمان ملک انڈونیشیا ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی وہاں ہے۔ کون سی فوج انڈونیشیا فتح کرنے گئی تھی؟ ملیشیا کی آبادی کا بھی ۵۵ فی صد مسلمانوں پر مشتمل ہے تو بتائیے وہاں کون سی فوج روانہ کی گئی تھی؟ افریقہ کا مشرقی ساحل فتح کرنے کون گیا تھا؟ کون سی فوج؟ کون سی تلواریں؟

اس کا جواب تھامس کارلائل دیتا ہے۔ کارلائل اپنی کتاب Heroes & Hero Worship میں لکھتا ہے:

''آپ کو یہ تلوار حاصل کرنا پڑتی ہے۔ بصورتِ دیگر کم ہی فایدہ ہو سکتا ہے۔ ہر نیا نظریہ ابتدا میں ایک آدمی کے ذہن میں ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں صرف ایک آدمی کے ذہن میں، ایک آدمی بمقابلہ پوری نوعِ انسانی اگر وہ تلوار کا استعمال کرے گا تو اس کی کامیابی کا امکان کم ہی ہے۔''

کون سی تلوار؟ فرض کیجیے کوئی ایسی تلوار ہوتی بھی تو مسلمان اسے استعمال نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ قرآن انھیں حکم دیتا ہے:

لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌO (۲: ۲۵۶)

''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان

لے آیا اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔"

یعنی ہر وہ شخص جو اللہ سے دست گیری چاہتا ہے اور باطل قوتوں کو رد کر دیتا ہے۔ درحقیقت اس نے سب سے مضبوط سہارا پکڑا ہے۔ ایسا سہارا جو کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔

کون سی تلوار سے لوگوں کو مسلمان کیا گیا ہے؟ یہ حکمت کی تلوار تھی۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝ (۱۶: ۱۲۵)

"اے نبی ﷺ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو، تمہارا ربّ ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔"

The Plain Truth نامی رسالے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جو اصل میں ریڈرز ڈائجسٹ کی سالانہ کتاب ۱۹۸۶ء سے لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۸۴ء تک کے پچاس برسوں میں مذاہب عالم میں اضافے کے حوالے سے اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔ اس نصف صدی کے دوران سب سے زیادہ اضافہ مسلمانوں کی تعداد دو سو پینتیس فی صد ۲۳۵٪ بڑھ گئی ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ان پچاس برسوں میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۸۴ء تک مسلمانوں نے کون سی جنگیں لڑ کر لوگوں کو مسلمان کیا ہے؟ وہ کون سی تلوار تھی جس کے ذریعے ان لاکھوں افراد کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وقت امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے بڑھنے والا مذہب اسلام ہے۔ ان امریکیوں کو اسلام قبول کرنے پر کون سی تلوار مجبور کر رہی ہے؟ یورپ

میں بھی اسلام ہی سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ انھیں کون بہ نوکِ شمشیر اسلام قبول کرنے پر مجبور کر رہا ہے؟ قرآن اس سوال کا جواب متعدد مقامات پر دیتا ہے۔

میں اس سوال کا جواب ڈاکٹر ایڈم پیٹرسن کے ان الفاظ پر ختم کرنا چاہوں گا:

''وہ لوگ جنھیں یہ خوف ہے کہ ایٹمی ہتھیار کہیں عربوں کے ہاتھ نہ آ جائیں، وہ یہ بات نہیں سمجھ رہے کہ اسلامی بم تو پہلے ہی گرایا جا چکا ہے۔ یہ بم اس دن گرا تھا جس دن پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ولادت ہوئی تھی۔''

☆......☆......☆

سوال: اگر اسلام واقعی عالمی بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے تو پھر مسلمان خود کیوں مختلف فرقوں میں تقسیم ہیں؟

جواب: سوال یہ کیا گیا ہے کہ اگر واقعی اسلام حقیقی عالمی بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے تو پھر مسلمان خود کیوں فرقوں میں تقسیم ہیں۔ اس سوال کا جواب قرآنِ مجید کی سورۂ آل عمران میں کچھ یوں دیا گیا ہے:

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ﴾ (۳:۱۰۳)

''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔''

اللہ کی رسی سے کیا مراد ہے؟ اللہ کی رسی سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآنِ مجید۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کو مضبوطی سے پکڑلیں۔ یعنی قرآنِ مجید اور احادیث صحیحہ کی تعلیمات پیش نظر رکھیں، اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالیں۔ جیسا کہ پہلے بھی میں نے عرض کیا قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۶: ۱۵۹)

''جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں، ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے۔ وہی ان کو بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔''

پتہ یہ چلا کہ دینِ اسلام میں تفرقے سے یعنی فرقوں میں تقسیم ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض مسلمانوں سے جب پوچھا جائے کہ تم کون ہو تو جواب ملتا ہے:

''میں حنفی ہوں۔''

بعض کہتے ہیں:

''میں شافعی ہوں۔''

بعض کہتے ہیں:

"میں مالکی ہوں۔"

اور بعض کا جواب ہوتا ہے:

"میں حنبلی ہوں۔"

سوال یہ ہے کہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیا تھے؟ کیا وہ حنفی تھے؟ حنبلی تھے؟ مالکی تھے؟ یا شافعی تھے؟ وہ صرف اور صرف مسلمان تھے۔

قرآن پاک کی سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (۳:۵۲)

"جب عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟"

حواریوں نے جواب دیا:

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ اشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ؀ (۳:۵۲)

"ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے والے) ہیں۔"

ایک اور جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ؀ (۴۱: ۳۳)

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔"

یعنی اچھا وہ ہے جو کہے کہ میں مسلم ہوں۔ جب بھی کوئی آپ سے یہ سوال کرے کہ آپ کون ہیں؟ تو آپ کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ "میں مسلمان ہوں۔" اس میں کوئی حرج نہیں اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے بعض معاملات میں امام ابوحنیفہؒ یا کسی اور عظیم عالم کی رائے سے اتفاق ہے۔ یا یہ کہ مجھے امام شافعیؒ یا امام مالکؒ یا امام ابن حنبلؒ کے فیصلوں سے اتفاق ہے۔

میں ان تمام فقہا کا احترام کرتا ہوں۔ اگر کوئی بعض معاملات میں امام ابو حنیفہؒ کی تقلید کرتا ہے اور بعض میں امام شافعیؒ کی تو میرے نزدیک اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں لیکن جب آپ کی شناخت کے بارے میں سوال کیا جائے تو آپ کا جواب ایک ہی ہونا چاہیے اور وہ یہ کہ میں مسلمان ہوں۔ پہلے کسی بھائی نے کہا کہ ''قرآن کہتا ہے کہ مسلمانوں کے ۷۳ فرقے ہوں گے۔......'' دراصل وہ قرآن کا نہیں بلکہ حضور نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث کا حوالہ دے رہے تھے۔ یہ حدیث سنن ابو داؤد میں موجود ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ دین اسلام ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گا لیکن اگر آپ ان الفاظ پر غور کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اس میں اطلاع دی جارہی ہے کہ ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گا، حکم نہیں دیا جارہا کہ دین کو ۷۳ فرقوں میں تقسیم کردو۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیش گوئی فرمارہے ہیں۔ حکم تو یہی ہے جو قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ ''تفرقے میں نہ پڑو۔''

یہ تو ایک سچی پیش گوئی ہے جس نے پورا ہو کر رہنا ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے:

> ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امت ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور ایک فرقے کے علاوہ سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یہ ایک فرقہ کون سا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جو میرے اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے رستے پر چلے گا۔''

یعنی وہ جو قرآن اور صحیح احادیث کی پیروی کرے گا، وہی درست راستے پر یعنی صراط مستقیم پر ہے۔ اسلام دین میں تفرقے اور تقسیم کے خلاف ہے۔ لہٰذا قرآن اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ ہونا چاہیے۔ اور ان پر عمل ہونا چاہیے کیوں کہ قرآن و حدیث پر عمل کرکے ہی مسلمان متحد ہو سکتے ہیں۔

امید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

☆......☆......☆

سوال: دنیا میں بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے بہترین طریقۂ کار کیا ہو سکتا ہے؟ ہمیں زیادہ زور کس پہلو پر دینا چاہیے؟ مذہب پر؟ سماجیات پر؟ یا سیاست پر؟

جواب: بھائی نے سوال یہ پوچھا ہے کہ عالمی بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے ہمیں کس چیز کو ترجیح دینی چاہیے؟ کیا مذہب پر زور دینا چاہیے؟ سماجیات پر؟ یا سیاست پر؟

میرے بھائی میری ساری گفتگو ہی اس موضوع پر تھی اور اب میرے لیے وہ ساری باتیں دہرانا ممکن نہیں ہے۔ آپ کے سوال کا جواب وہی ہے۔ دنیا میں بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے ہمیں مذہب کو ترجیح دینی پڑے گی۔ یہ بات تمام مذاہب میں موجود ہے کہ: ''ہمیں ایک خدا پر ایمان رکھنا چاہیے اور اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔'' لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اسی بات کو اہمیت دیں اور اسی نکتے کو ترجیح دیں۔ میں اپنی گفتگو کے دوران میں بھی یہی دہراتا رہا ہوں، میں نے متعدد سوالات کے جوابات دیتے ہوئے بھی یہ بات کی اور اب پھر کہہ رہا ہوں کہ سماجیات اور سیاسیات بنیادی ترجیح نہیں ہیں بلکہ یہ چیزیں بعد میں آتی ہیں۔ سیاسیات جس بھائی چارے کی بات کرتی ہے وہ محدود ہے اور اسی طرح سماجیات بھی محدود ہے لیکن ایک خدا پر ایمان، ایک کائناتی سچائی ہے۔

اللہ ہی نے پوری انسانیت کو تخلیق فرمایا ہے۔ مرد ہو یا عورت، گورا ہو یا کالا، امیر ہو یا غریب، سب اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ لہٰذا عالمی بھائی چارے کا قیام صرف اور صرف خدائے واحد پر ایمان اور عبادت کو صرف اُسی کے لیے خاص کر دینے کی صورت میں ہی ممکن ہے۔

امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

☆......☆......☆

سوال: تمام مذاہب بنیادی طور پر اچھی باتوں ہی کی تعلیم دیتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی مذہب کی پیروی کی جائے ایک ہی بات ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ جب تمام مذاہب بنیادی طور پر اچھی باتوں کی ہی تعلیم دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کسی بھی مذہب کی پیروی کریں ایک ہی بات ہے۔ مجھے آپ کے سوال کے پہلے جزو سے پورا اتفاق ہے کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر اچھی باتیں ہی سکھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذہب اپنے پیروکاروں کو یہی تعلیم دیتا ہے کہ کسی کو لوٹنا نہیں چاہیے، خواتین کی عزت کرنی چاہیے یعنی کسی خاتون کی بے حرمتی نہیں کرنی چاہیے۔ ہندومت یہی کہتا ہے، عیسائیت یہی تعلیم دیتی ہے اور اسلام بھی یہی تعلیم دیتا ہے۔

لیکن اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ اسلام نہ صرف اچھی باتوں کی تعلیم دیتا ہے بلکہ ان باتوں کے عملی نفاذ کا طریق کار بھی سکھاتا ہے۔ مثال کے طور پر بھائی چارے کی تعریف تو تمام مذاہب کرتے ہیں لیکن اسلام آپ کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ آپ کی عملی زندگی میں بھائی چارہ کس طرح آئے گا۔ ہندومت کسی کو لوٹنے سے منع کرتا ہے۔ عیسائیت بھی یہی تعلیم دیتی ہے اور اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ کسی کو لوٹنا غلط کام ہے۔ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اسلام آپ کو ایسا معاشرہ تعمیر کرنے کی بھی تعلیم دیتا ہے جس میں کوئی کسی کو لوٹنے کی کوشش ہی نہ کرے۔ یہی اسلام اور دیگر مذاہب میں فرق ہے۔

اسلام ایک نظامِ زکوٰۃ قائم کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس نظام کے تحت ہر امیر آدمی اپنی بچت کا ڈھائی فی صد غریبوں کو دینے کا پابند ہے۔ زکوٰۃ ہر قمری سال میں ایک بار ادا کی جاتی ہے اور ہر اس شخص پر فرض ہے جس کے پاس ایک خاص مقدار سے زیادہ سونا یا اس کے مساوی مال و دولت ہو۔ اگر ہر امیر آدمی زکوٰۃ کی ادائیگی شروع کر دے تو دنیا سے غربت کا خاتمہ ممکن ہے۔ اگر دنیا کے تمام امیر لوگ زکوٰۃ ادا کرنا شروع کر دیں تو پوری دنیا میں کوئی بھی شخص بھوک سے نہیں مرے گا۔

مزید برآں یہ نظام قائم کرنے کے بعد قرآن حکیم حکم دیتا ہے:

اور ابھی تو میں نے اپنی پہلی نگاہ آدھی بھی مکمل نہیں کی تھی۔ میں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارکہ میں یہ جو کہا گیا ہے کہ پہلی نظر قابل معافی ہے اور دوسری قابل مواخذہ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلی مرتبہ نظر پڑے تو آدھا گھنٹہ گھورتے ہی چلے جاؤ اور پلک بھی نہ جھپکو۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں کہ بلا ارادہ اگر کسی خاتون پر نظر پڑ بھی جائے تو خیر ہے لیکن قصداً، ارادتاً، جان بوجھ کر قطعاً نہ دیکھو۔ سورۂ نور کی اگلی آیت خواتین کے لیے حجاب کا ذکر کرتی ہے۔

﴿ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ ط ﴾ (۲۴:۳۱)

''اور اے نبی ﷺ مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں۔ بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ......''

اس کے بعد ان لوگوں کی فہرست دی گئی ہے جو پردے سے مستثنیٰ ہیں۔

حجاب کے حوالے سے بنیادی طور پر چھ اصول ایسے ہیں جنھیں مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

پہلا اصول ہے حجاب کی حد یا معیار، یہ حد مردوں اور عورتوں کے لیے مختلف ہے۔ مرد کے لیے حجاب کی کم از کم حد ناف سے گھٹنے تک ہے جب کہ عورت کا سارا جسم حجاب میں ہونا ضروری ہے۔ صرف چہرہ اور کلائیوں تک ہاتھ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ بعض علما تو چہرے کا پردہ بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ صرف یہ اصول ہے جو عورت اور مرد کے لیے مختلف ہے۔ باقی پانچوں اصول مرد اور عورت پر یکساں لاگو ہوتے ہیں۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ آپ کا لباس تنگ اور چست ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی ایسا لباس پہننے کی بھی ممانعت ہے جو جسم کی ساخت کو نمایاں کرے۔

تیسرا اُصول یہ ہے کہ آپ کا لباس شفاف نہیں ہونا چاہیے، یعنی ایسے کپڑے کا بنا ہوا لباس پہننے سے پرہیز کرنا چاہیے جس سے آر پار نظر آتا ہو۔

چوتھا اُصول یہ ہے کہ آپ کا لباس اتنا شوخ اور بھڑکیلا بھی نہیں ہونا چاہیے جو خواہ مخواہ لوگوں کو خصوصاً جنس مخالف کو متوجہ کرنے کا سبب بنے۔

پانچواں اُصول یہ ہے کہ آپ کا لباس کفار کے لباس کے مشابہ نہیں ہونا چاہیے یعنی کوئی ایسا لباس نہیں پہننا چاہیے جو کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے والوں کی پہچان بن چکا ہو۔

چھٹی اور آخری بات یہ ہے کہ آپ کا لباس جنس مخالف کے مشابہ نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی مردوں کے لیے خواتین جیسے اور خواتین کے لیے مردوں والے لباس پہننے سے احتراز بہتر ہے۔

حجاب کے حوالے سے یہ وہ چھ بنیادی اصول ہیں جو قرآن اور صحیح احادیث کی روشنی میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

حجاب کے حوالے سے قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۳۳: ۵۹)

"اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔"

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ حجاب اسی لیے لازم کیا گیا ہے کہ خواتین کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھا جاسکے، اگر اس کے باوجود کوئی شخص زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جدید دور میں، اکیسویں صدی میں ایسی سزا کیوں کر دی جاسکتی ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلام ایک ظالمانہ مذہب ہے۔ یہ ایک

وحشیانہ اور بے رحمی پر مبنی قانون ہے۔

لیکن کیا آپ کے علم میں ہے کہ امریکہ، جو دورِ حاضر کا ترقی یافتہ اور جدید ترین ملک سمجھا جاتا ہے، وہاں زنا بالجبر کے واقعات پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اعداد و شمار کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں روزانہ اوسطاً ایک ہزار نو سو ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ یعنی ہر ۱۳ منٹ کے بعد زنا بالجبر کا ایک واقعہ ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ اس ہال میں تقریباً ڈھائی گھنٹے سے ہیں۔ اس دوران امریکہ میں زنا بالجبر کے کتنے واقعات ہو چکے ہوں گے؟ ایک سو سے بھی زیادہ۔

میں آپ سے پھر ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

یہ بتایئے کہ اگر آج امریکہ میں اسلامی شریعت کا نفاذ کر دیا جائے تو کیا ہوگا۔ یعنی ایک تو مرد خواتین کو گھ... نے سے مکمل پرہیز کریں یعنی اپنی نگاہوں کی حفاظت کریں۔ دوسرے یہ کہ لباس، حجاب کی تمام شرائط پوری کرنے والا ہو۔ اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی مرد اس کے بعد کسی خاتون کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہو تو اسے سزائے موت سنائی جائے گی۔ میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ ایسی صورت میں زنا بالجبر کے واقعات کی شرح یہی رہے گی؟ اس میں کمی ہوگی؟ یا اضافہ ہو جائے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ شرح کم ہو جائے گی۔

اسلامی قانون ایک قابلِ عمل قانون ہے، لہٰذا جہاں بھی اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا آپ کو فوری نتائج ملیں گے۔

باقی جہاں تک قوانین کے سخت ہونے کا تعلق ہے تو اس حوالے سے میں غیر مسلموں سے بالعموم ایک سوال کیا کرتا ہوں کہ فرض کیجیے کوئی شخص آپ کی بیوی یا بیٹی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ اس کے بعد مجرم کو آپ کے سامنے لایا جاتا ہے اور آپ کو جج بنا دیا جاتا ہے۔ آپ اس شخص کو کیا سزا سنائیں گے؟

آپ یقین کیجیے، ہر ایک نے بلا استثنیٰ ایک ہی جواب دیا، اور وہ یہ کہ ہم اس مجرم کو موت کی سزا دیں گے۔ بعض لوگ اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور جواب دیا کہ ہم ایسے

شخص کو اذیتیں دے دے کر، تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دہرے معیار کیوں؟

اگر کوئی شخص کسی اور کی بہن یا بیٹی کے ساتھ زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے تو آپ کے خیال میں سزائے موت ظالمانہ سزا ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہی واقعہ آپ کی بہن یا بیٹی کے ساتھ ہو جاتا ہے تو پھر یہ سزا ٹھیک ہو جاتی ہے۔

خود ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ ہر ۵۴ منٹ کے بعد زنا بالجبر کا ایک واقعہ رجسٹر ہوتا ہے۔ گویا ہر چند منٹ کے بعد ایک خاتون کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس حوالے سے ہندوستان کے وزیر داخلہ کی رائے کیا ہے؟

اکتوبر ۱۹۹۸ء کے اخبارات میں ہندوستانی وزیر داخلہ مسٹر ایل۔ کے۔ ایڈوانی کا ایک بیان چھپا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ: ''زنا بالجبر کے مجرم کے لیے سزائے موت ہونی چاہیے۔'' وزیر موصوف نے اس حوالے سے قانون میں ترمیم کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ Times of India کی سرخی تھی کہ ''ایڈوانی کی طرف سے زنا بالجبر کے مجرم کے لیے سزائے موت کی تجویز''۔

الحمدللہ جو بات اسلام نے آج سے چودہ سو برس پہلے کی تھی، آج بالآخر دنیا اس کی طرف آرہی ہے۔ مسٹر ایڈوانی نے بالکل ٹھیک بات کی ہے اور مجھے اس بات پر انہیں داد دینی چاہیے، مبارک باد دینی چاہیے۔ میں یہاں کسی سیاسی جماعت کی حمایت کرنے کے لیے نہیں آیا۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی حق بات کرتا ہے تو اس کی تعریف ضرور ہونی چاہیے۔ اگر اس تجویز پر عمل ہوا تو یقیناً زنا بالجبر کے واقعات میں کمی آجائے گی۔ ہوسکتا ہے آئندہ کوئی وزیر داخلہ اسلام کے نظامِ حجاب کو نافذ کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائے۔ اگر اس طرح ہو تو ان شاء اللہ ان جرائم کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے گا۔ لوگ اسلام کے قریب آرہے ہیں۔ اور میرے نزدیک یہ قابل تعریف عمل ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا اسلام کی دعوت یہی ہے کہ آؤ ان باتوں پر اتفاق رائے پیدا کریں جو

ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں۔ مسٹر ایڈوانی نے ہندوستان میں زنا بالجبر کی وارداتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر صورت حال کی سنگینی کو محسوس کیا اور قوانین میں ترمیم کی تجویز پیش کی۔ میں ان کی مکمل حمایت کرتا ہوں کہ قانون کو تبدیل کیا جانا چاہیے اور اس جرم کے مرتکب کو سزائے موت ملنی چاہیے۔

لہٰذا اگر آپ غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اسلام صرف اچھی باتوں کی تلقین نہیں کرتا بلکہ معاشرے میں عملی طور پر بہتری اور اچھائی لانے کا طریقہ کار بھی بتاتا ہے۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اسلام اور اچھی باتوں کی تعلیم دینے والے دیگر مذاہب میں فرق ہے۔ اسلام اور دیگر مذاہب یکساں نہیں ہیں۔ اور میں اس مذہب کی پیروی کروں گا جو محض اچھی باتوں کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ ان اچھی باتوں پر عمل درآمد کو بھی یقینی بناتا ہے۔

اسی لیے بجا طور پر سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا:

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (۳: ۱۹)

''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ ان کے اس طرزِ عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آ جانے کے بعد آپس میں زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لینے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔''

☆.....☆.....☆

سوال: آپ بات تو کرتے ہیں عالمی بھائی چارے کی، آپ کی گفتگو کا عنوان بھی عالمی بھائی چارہ ہے لیکن بات صرف اسلام کی کر رہے ہیں۔ عالمی بھائی چارے کا مطلب تو سب کے لیے بھائی چارہ ہونا چاہیے، خواہ کسی کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ بصورتِ دیگر کیا اسے عالمی بھائی چارے کی بجائے ''مسلم بھائی چارہ'' کہنا بہتر نہیں ہوگا؟

جواب: بھائی نے سوال یہ پوچھا ہے کہ عالمی بھائی چارے کے نام پر میں اسلام کی وکالت کر رہا ہوں۔ فرض کیجیے مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ بہترین کپڑا کون سا ہے؟ اور فرض کیجیے کہ بہترین کپڑا کسی خاص کمپنی مثال کے طور پر ریمنڈز کا ہے۔ اب اگر میں کہتا ہوں کہ ''بہترین کپڑا ریمنڈز کا ہے اور آپ کو ریمنڈز کا کپڑا استعمال کرنا چاہیے'' تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں گا۔

اسی طرح فرض کیجیے، مجھے یہ بتانا ہے کہ بہترین ڈاکٹر کون ہے اور فرض کیجیے کہ مجھے علم ہے کہ ڈاکٹر ''الف'' ہی بہترین ڈاکٹر ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ لوگوں کو ڈاکٹر ''الف'' سے علاج کرانا چاہیے تو کیا میں ڈاکٹر ''الف'' کی وکالت کر رہا ہوں؟

ہاں میں آپ کو یہی بتا رہا ہوں کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو عالمی بھائی چارے کی بات کرتا ہے اور صرف بات ہی نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر اس کے حصول کو ممکن بھی بناتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کیا عالمی بھائی چارے کے تناظر میں آپ مسلمان اور غیر مسلم کو بھائی قرار دے سکتے ہیں یا صرف مسلمان ہی مسلمان کا بھائی ہے؟ تو میں یہ عرض کروں گا کہ اسلام کا بھائی چارہ یہی ہے کہ تمام انسان ہمارے بھائی ہیں۔ میں نے اپنی گفتگو کے دوران یہ بات واضح طور پر کی تھی۔ میں قطعاً لفظوں سے کھیلنے کی کوشش نہیں کر رہا بلکہ واضح الفاظ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔

ہوسکتا ہے آپ نے دھیان نہ دیا ہو یا یہ بات آپ سے نظر انداز ہوگئی ہو کہ میں نے اپنی گفتگو کا آغاز ہی سورۂ حجرات کی ان آیات سے کیا تھا:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَـٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ

لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ٥

(۴۹: ۱۳)

"لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

عالمی بھائی چارے میں ہر انسان شامل ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ اس کا عمل اچھا ہو، اس میں تقویٰ ہو۔ فرض کیجیے میرے دو بھائی ہیں جن میں سے ایک اچھا آدمی ہے۔ درحقیقت میرا ایک ہی بھائی ہے لیکن فرض کر لیجیے کہ دو ہیں۔ ان میں ایک اچھا آدمی ہے۔ وہ ڈاکٹر ہے، لوگوں کا علاج کرتا ہے اور دوسرا بھائی ایک غلط آدمی ہے وہ شرابی ہے زانی ہے۔

اب میرے بھائی تو دونوں ہیں لیکن ان دونوں میں اچھا بھائی کون سا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ بھائی جو ڈاکٹر ہے جو لوگوں کا علاج کرتا ہے، معاشرے کے لیے مفید ہے، نقصان دہ نہیں ہے۔ دوسرا بھی میرا بھائی تو ہے لیکن اچھا بھائی نہیں ہے۔

اسی طرح دنیا کا ہر انسان میرا بھائی ہے لیکن وہ جو نیک ہے، متقی ہے، ایمان دار ہے اور اچھے کام کرنے والا ہے وہ میرے دل کے زیادہ قریب ہے۔ یہ بات بہت واضح ہے۔ میں اپنی گفتگو کے دوران میں بھی یہ باتیں کر چکا ہوں اور اب دہرا بھی دی ہیں۔

امید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

☆......☆......☆

سوال: ہندومت، اسلام اور عیسائیت تینوں مذاہب عالمی بھائی چارے کو فروغ دینے والی باتیں کر رہے ہیں لیکن آپ نے بات صرف اسلام کے حوالے سے کی ہے۔ آپ نے بھائی چارے کے حوالے سے ہندومت اور عیسائیت کے کردار کی وضاحت نہیں کی؟

جواب: بھائی کا کہنا ہے کہ میں نے صرف اسلام کے حوالے سے اچھی باتیں کی ہیں۔ عالمی بھائی چارے کے حوالے سے ہندومت اور عیسائیت کی خوبیاں نہیں گنوائیں۔ اگرچہ میں نے ان مذاہب کے حوالے سے کچھ اچھی باتیں ضرور کی ہیں لیکن یہ بات درست ہے کہ بھائی چارے کے حوالے سے ان مذاہب کی ہر بات پر گفتگو میں نے نہیں کی۔ کیوں کہ شاید یہاں موجود لوگ ان تمام باتوں کو ہضم نہ کر پائیں۔ لوگ وہ باتیں برداشت ہی نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا مجھے خود پر قابو رکھنا پڑتا ہے۔

میں عیسائیت کے بارے میں جانتا ہوں۔ میں نے بائبل کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ میں ہندو مذہب کی مقدس کتابیں بھی پڑھ چکا ہوں۔ اگر میں ان کے حوالے سے بات کروں تو یہاں مسئلہ بن جائے گا اور وہ میں نہیں چاہتا۔ لہٰذا میں صرف مشترکہ تعلیمات کا ذکر کرتا ہوں ہندومت کہتا ہے کسی کو مت لوٹو، عیسائیت بھی یہی کہتی ہے کہ کسی کو مت لوٹو، کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرو، زنا نہ کرو۔

جہاں تک بھائی چارے کے حوالے سے دوسری باتوں کا تعلق ہے، میں ان کا ذکر نہیں کرتا۔ یہاں محض مثال کے طور پر میں ایک بات کرنا چاہوں گا۔ متی کی انجیل میں تحریر ہے۔ اور میں ہر بات حوالے کے ساتھ کرتا ہوں۔ میں کتاب کا نام، باب کا نمبر سب کچھ بتا رہا ہوں، لہٰذا اس حوالے سے کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔

"ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور حکم دے کر کہا: غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔" (متی: ۱۰/۶،۷)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا.........لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں۔''

(متی: ۱۵/۲۴۔۲۶)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب صرف یہودیوں کے لیے ہے، پوری کائنات کے لیے ں ہے۔ عیسائیت میں رہبانیت کا تصور موجود ہے۔ رہبانیت کیا ہے؟ یہ کہ اگر آپ خدا ے قریب ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو دنیا چھوڑنی پڑے گی۔ جب کہ قرآن کہتا ہے:

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ (۵۷:۲۷)

''ان کے بعد ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے اور ان سب کے بعد عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام کو مبعوث کیا اور اس کو انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے اس کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کر لی۔ ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے تھے ان کا اجر ہم نے عطا کیا مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔''

اسلام میں رہبانیت کی اجازت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ: م میں رہبانیت نہیں ہے۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح کی ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں لہ ہر وہ جوان شخص جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو، اُسے نکاح کرنا چاہیے۔

اگر میں یہ بات مان لوں کہ ترک دنیا کرنے سے آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے قریب تے ہیں اور اگر ہر شخص اس بات سے اتفاق کر کے رہبانیت اختیار کرنے لگے تو کیا ہوگا؟

ہوگا یہ کہ سوڈیڑھ سو سال کے اندر اندر روئے زمین پر کوئی آدم زاد باقی نہیں رہے گا۔ آپ یہ بتائیے کہ اگر آج دنیا کا ہر شخص ان تعلیمات پر عمل کرنے لگے تو عالمی بھائی چارہ کہاں سے آئے گا؟ اسی لیے میں نے دوسرے مذاہب کا ذکر صرف اچھے پہلوؤں سے کیا۔ لیکن اگر آپ جاننا چاہیں گے اور سوالات کریں گے تو پھر میرا فرض ہے کہ میں سچ بولوں۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○ (۱۷:۸۱)

اور اعلان کردو کہ ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔''

امید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

☆......☆......☆

اسلام اور ہندومت

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

سید امتیاز احمد

دارالنوادر
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۱۴۲۸ھ ۲۰۰۷ء

کتاب : اسلام اور ہندومت

مصنف : ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم : سید امتیاز احمد

اہتمام : دار النوادر، لاہور

مطبع : موٹروے پریس، لاہور

قیمت : ۶۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

ترتیب

تعارف

ایمانیات

فرشتے

ہندومت کے متونِ مقدسہ

ہندوؤں کی کتب مقدسہ میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر

ویدوں کی مزید پیش گوئیاں

(حصہ دوم)

ہندوؤں کی جانب سے عام طور پر اسلام کے بارے میں پوچھے جانے والے سوالات

باب اوّل

تعارف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝﴾

(آل عمران:٦٤)

''اے نبیؐ، کہو''اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔'' اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف اللہ کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔''

ہندومت کا تعارف

لفظ''ہندو'' جغرافیائی اہمیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا جو دریائے''سندھو'' کے پار رہتے تھے۔ یا ان علاقوں کے رہنے والوں کے لیے جن علاقوں کو دریائے سندھ کا پانی سیراب کرتا تھا۔

بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ یہ لفظ پہلے پہل ان ایرانیوں نے استعمال کیا تھا جو شمال مغربی سمت سے یعنی سلسلہ ہائے کوہِ ہمالیہ میں موجود درّوں کے راستے ہندوستان وارد ہوئے تھے۔

Encyclopedia of Religions & Ethics کے مطابق، مسلمانوں کی آمد سے پہلے کے متون اور ادب میں لفظ ہندو کہیں استعمال نہیں ہوا۔

اپنی کتاب Discovery of India کے صفحہ ۷۵۔۷۴ پر جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ ''لفظ ہندو کا قدیم ترین استعمال ہمیں آٹھویں صدی (CE) میں ملتا ہے لیکن وہاں بھی یہ لفظ کسی خاص مذہب کے پیروکاروں کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ محض ایک قوم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لفظ ''ہندو'' کا استعمال مذہبی تناظر میں بہت بعد میں جا کر ہوا۔

مختصراً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لفظ ہندو ایک جغرافیائی اصطلاح ہے جو ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو دریائے سندھ کے پار یا دوسرے لفظوں میں ہندوستان میں رہتے ہیں۔

ہندومت کی تعریف

- ہندومت یا ہندوازم لفظ ہندو سے نکلا ہے۔ یہ وہ لفظ ہے جو انیسویں صدی میں انگریز دریائے سندھ کی وادی میں رہنے والے لوگوں کے متنوع اور مختلف عقاید اور نظریات کے لیے مجموعی طور پر استعمال کرتے تھے۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا کا بیان ہے کہ انگریز مصنفین نے ۱۸۳۵ء میں یہ لفظ ہندوستان میں رہنے والے تمام لوگوں کے مذہبی عقاید کے لیے استعمال کرنا شروع کیا، سوائے مسلمانوں اور عیسائی لوگوں کے۔
- ہندومت کی اصطلاح گمراہ کن ہے کیونکہ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہندومت کسی ایک نظامِ عقاید یا منظم نظریے کا نام ہے جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ عام طور پر لفظ ''مذہب'' سے جو تصور ذہن میں آتا ہے ہندومت اس سے خاصا مختلف قسم کا مظہر ہے۔ لہٰذا مذہب کی کسی تعریف کی رُو سے ہندومت کو ایک مذہب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی ابتدا، تشکیل اور تکمیل کسی ایک تاریخی شخصیت یا پیغمبر سے بھی وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ ہندومت میں کوئی عبادت کا طریقہ، کوئی عقیدہ یا رسم و رواج ایسا نہیں جو ہندو

کہلانے والے تمام لوگوں میں یکساں ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ ہندو مت کے اُصول بھی وضع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اُصول وضع کرنے کے لیے کوئی معیار ہی موجود نہیں ہے۔ مختصراً یہ کہ جو شخص بھی یہ کہے کہ "میں ہندو ہوں" وہی سچا ہندو ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ وہ کس کی عبادت کرتا ہے؟ اس کے عقاید کیا ہیں؟ اور اس کے اعمال کیسے ہیں؟

⊙ ہندو علما کے نزدیک بھی ہندو مت بطور مذہب ایک غلط اصطلاح ہے۔ اس مذہب کو ان کے نزدیک "سناتن دھرم" یعنی ابدی مذہب کہا جانا چاہیے یا "وید دھرم" یعنی وہ مذہب جو ویدوں پر مبنی ہے۔ سوامی ویویک آنند کے بقول اس مذہب کے ماننے والوں کو ویدانتی کہا جانا چاہیے۔

اسلام کا تعارف

"اسلام" عربی زبان کا لفظ ہے جو کہ "سلام" سے نکلا ہے۔ اس لفظ کا لغوی مطلب امن و سلامتی ہے۔ اس لفظ کا مطلب فرماں برداری بھی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا مطلب وہ سلامتی ہے جو اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

مسلمان کی تعریف

"مسلمان" اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی رضا کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا کے تابع کر دے۔

ایک عام غلط فہمی

بہت سے لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اسلام کوئی نیا مذہب ہے، جو آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے وجود میں آیا اور یہ کہ حضرت محمد ﷺ مذہب اسلام کے بانی ہیں۔ یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ درحقیقت اسلام آغازِ انسانیت ہی سے موجود ہے۔ اس وقت سے جب پہلے انسان نے روئے زمین پر قدم رکھا تھا۔ حضرت محمد ﷺ اسلام کے بانی نہیں ہیں بلکہ اسلام کے آخری اور حتمی پیغمبر ﷺ ہیں جن پر نبوت و رسالت کا اختتام ہو گیا ہے۔

ایمانیات

ہندومت کی ایمانیات (بنیادی عقاید)

ہندومت کے بنیادی عقاید طے شدہ نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہندومت میں عقاید یا ایمانیات کا کوئی طے شدہ نظام یا باقاعدہ اُصول موجود ہی نہیں ہے۔ نہ ہی ہمیں ہندومت میں کوئی ایسا عقیدہ یا بنیادی اُصول ملتا ہے جسے ماننا اور جس پر عمل کرنا ہر ہندو کے لیے لازم ہو۔

عملاً ایک ہندو آزاد ہے، وہ جو چاہے کرے، جو چاہے عقیدہ رکھے۔ اس کے لیے حلال وحرام کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ یعنی نہ تو کوئی چیز ایسی ہے جس پر عمل کرنا اس کے لیے بہر صورت لازم ہو اور نہ ہی کوئی عمل ایسا ہے جس سے پرہیز کرنا ہندو رہنے کے لیے ضروری ہو، اور جسے کرنے کے نتیجے میں ہندومت کے دائرے سے باہر نکل جائے۔

بہر حال چند اُصول ایسے ضرور ہیں جنھیں تمام ہندو نہ سہی، ہندوؤں کی اکثریت تسلیم کرتی ہے، خواہ سو فی صد ہندو اس پر متفق نہ بھی ہوں۔ ان میں سے بعض اُصول ہم اسلام کے بنیادی عقاید پر گفتگو کرتے ہوئے زیر بحث لائیں گے۔

”کہہ دو، وہ اللہ ہے، واحد۔“

سویتا سوترا اپنشد میں کہا گیا ہے:

”اس کا دنیا میں کوئی حکمران نہیں
کوئی آقا نہیں
نہ ہی وہ کوئی نشان رکھتا ہے
وہ سبب ہے
بادشاہوں کا بادشاہ
حواس کا مالک
نہ اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے
اور نہ ہی مالک۔“

(The Principle Upanishads by S.Radhakrishnan p.745)

(The Sacred Book of The East V.15 p.263)

جب کہ قرآن مجید کی سورۂ اخلاص میں ہمیں پیغام دیا گیا ہے:

﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ (الاخلاص: ۳)

”نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔“

اپنشد میں مزید کہا گیا:

”اس جیسا کوئی بھی نہیں ہے۔“ (سویتا سوترا اپنشد، باب ۴، اشلوک ۱۹)

مزید تحریر ہے:

”اس سے مشابہ کوئی نہیں ہے
وہ جس کا نام عظمت والا ہے۔“

(The Principle Upanishads by S.Radhakrishnan p.736-7)

(The Sacred Book of The East V.15 p.253)

قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (الاخلاص:٤)

''اور کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ:١١)

''کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔''

سویتا سوترا اپنشد کے چوتھے ادھیائے کے بیسویں اشلوک میں تحریر ہے:

''اس کی صورت دیکھی نہیں جا سکتی
کوئی بھی اپنی آنکھوں سے
اس کا دیدار نہیں کر سکتا۔''

یہی بات دوبارہ بھی کہی گئی ہے:

''اس کی صورت دیکھی نہیں جا سکتی
کوئی بھی اپنی آنکھوں سے
اس کا دیدار نہیں کر سکتا
وہ جو اپنے قلب اور اپنی فکر سے
یہ جان جاتے ہیں
کہ وہ دلوں میں بستا ہے
وہ لافانی ہو جاتے ہیں۔''

(The Sacred Book of The East V.15 p.253)

قرآن مجید کی سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ (الانعام:١٠٣)

''نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ نہایت باریک بین

اور باخبر ہے۔"

وید

ہندومت کے متونِ مقدسہ میں وید بھی نہایت اہم گردانے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر چار وید اہم ترین ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ رگ وید

۲۔ یجر وید

۳۔ سام وید

۴۔ اتھر وید

یجر وید میں کہا گیا ہے:

"اس کا کوئی عکس نہیں ہے۔"

(یجر وید، باب ۳۲، مصرعہ ۳)

[illegible]ر وید کہا گیا:

"وہی پیدا نہیں ہوا

وہی ہماری عبادت کا حق دار ہے

وہ روشن اجسام کی طرح خود قایم ہے

میری دعا ہے

کہ مجھے اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے

وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا

ہمیں اسی کی عبات کرنی چاہیے۔"

(یجر وید، از دیوی چند، صفحہ ۳۷۷)

[illegible] اور جگہ تحریر ہے:

وہ جسم سے پاک ہے، وہ خالص ہے

وہ روشن ہے......

جسم سے ماورا ہے......

دور اندیش اور دانا ہے......

وہ ابد تک باقی رہنے والا ہے۔''

(یجر وید، مرتبہ: رالف گرفتھ ص ۵۳۸)

یجر وید میں کہا گیا ہے:

''وہ لوگ تیرگی کا شکار ہو جاتے ہیں

جو مظاہر فطرت کی عبادت کرتے ہیں

(مثلاً آگ، ہوا، پانی وغیرہ)

(یجر وید، باب ۴۰، مصرعہ ۹)

یہی نہیں بلکہ مزید کہا گیا:

''وہ لوگ تیرگی کی گہرائیوں میں جا پہنچتے ہیں جو غیر فطری اشیا (مثلاً بت) کو

اپنا معبود بناتے ہیں۔''

یہ بات جا بجا دہرائی گئی ہے کہ ''سنبھوتی'' اور ''اسنبھوتی'' یعنی قدرتی اشیا اور انسان کی تخلیق کردہ اشیا کی عبادت کرنے والے یکساں طور پر تیرگی اور اندھیرے میں ہیں۔

(یجر وید مرتبہ: رالف گرفتھ، ص ۵۳۸)

اب ہم اتھر وید کی طرف آتے ہیں۔

اتھر وید کی بیسویں کتاب کے باب نمبر ۵۸ کے تیسرے مصرعے میں کہا گیا:

''بلاشبہ خدا عظیم ہے۔''

''تو عظیم ہے خدایا

تو عظیم ہے سوریا

تو عظیم ہے آدیتیہ۔''

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ۝﴾ (الرعد: ۹)

''وہ پوشیدہ اور ظاہر ہر کا عالم ہے، وہ بزرگ ہے اور ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے۔''

رگ وید کو ویدوں میں قدیم ترین خیال کیا جاتا ہے اور مقدس ترین بھی مانا جاتا ہے۔ رگ وید کی پہلی کتاب کے باب ۱۶۴ میں کہا ہے:

''پجاری، ایک ہی خدا کو بہت سے ناموں سے پکارتے ہیں، وہ اسے ''اندر'' بھی کہتے ہیں اور ''متر'' بھی ''ورون'' بھی کہتے ہیں اور اگنی بھی۔''

''پجاری ایک ہی خدا کو بہت سے ناموں سے پکارتے ہیں۔''

رگ وید کی دوسری کتاب کے پہلے ہی باب کا مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں خدا کے لیے بہت سی صفات گنوائی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر رگ وید میں اللہ تعالیٰ کی ۳۳ صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان صفات یا اسمائے صفاتی میں سے ایک بہت خوبصورت صفت ''برہما'' ہے۔ برہما کا مطلب ہوتا ہے تخلیق کرنے والا، یعنی اگر آپ اس کا عربی میں ترجمہ کریں تو وہ بنے گا ''الخالق''۔

لہٰذا ہم کو، یعنی مسلمانوں کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو خالق کہا جائے یا ''برہما'' کہہ کر پکارا جائے۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ ''برہما'' خدا ہے جس کے چار سر ہیں اور ہر سر پر تاج ہے اور یہ کہ اس کے چار ہاتھ ہیں تو ہم مسلمانوں کو آپ کے بیان پر شدید اعتراض ہوگا کیوں کہ آپ خدا کی تجسیم کر رہے ہیں۔

بلکہ دراصل خدا کے ساتھ اس قسم کے تصورات وابستہ کر کے آپ خود ویدوں کی تعلیمات کی بھی نفی کر رہے ہوتے ہیں جیسا کہ یجروید کا بیان پہلے بھی نقل کیا گیا:

''وہ جسم سے پاک ہے، وہ خالص ہے
وہ روشن ہے......
جسم سے ماورا ہے......

دور اندیش اور دانا ہے......

ابد تک باقی رہنے والا ہے......"

(یجر وید، مرتبہ: رالف گرفتھ، ص ۵۳۸)

سو جس وقت آپ برہما کی تجسیم کرتے ہیں تو گویا آپ یجر وید کے مذکورہ بالا بیان کی تردید کر رہے ہوتے ہیں۔

رگ وید میں ایک اور جگہ کہا گیا ہے:

"اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو

وہ جو صاحب الوہیت ہے

اسی کی مدح کرو۔"

(رگ وید، کتاب ۸، باب ۱)

ایک اور جگہ یہ بھی کہا گیا:

"اے دوستو! اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو

وہ جو خدا ہے

کوئی بھی دکھ تمہیں پریشان نہ کرے

صرف اسی کی مدح کرو......

وہ جو نعمتیں برسانے والا ہے

خود شناسی کے مراحل میں تمہیں چاہیے

کہ اسی کی شان میں نغمے گاتے رہو۔"

(رگ وید، مرتبہ: ستیہ پرکاش سرسوتی، ستیہ کام ودھیا، جلد چہارم، ص ۱۰۲)

پھر کہا گیا:

"بلاشبہ اس خالق کی شان سب سے بلند ہے۔"

(رگ وید، مرتبہ: ستیہ پرکاش سرسوتی، ستیہ کام ودھیا، جلد ششم، ص ۱۸۰۲)

اگر آپ قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو یہاں بھی اس سے ملتا جلتا ایک پیغام ہمیں اس

آیت مبارکہ میں نظر آتا ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ٥﴾ (الفاتحہ : ۱)

''تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے۔''

رگ وید میں ایک اور جگہ تحریر ہے:

''وہ رحیم عطا کرنے والا ہے۔''

(رگ وید، مرتبہ: رالف گرفتھ، جلد دوم، ص ۳۷۷)

جب کہ سورۂ فاتحہ کی تیسری آیت میں فرمایا گیا:

﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ (الفاتحہ: ۲)

''وہ نہایت مہربان، رحم فرمانے والا ہے۔''

یجر وید میں ہمیں یہ بات بھی ملتی ہے:

''اچھی راہ کی طرف ہماری راہنمائی کرا اور ان برائیوں کو ہم سے دُور کر دے جو

گمراہی اور پریشانیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔

اچھی راہ کے ذریعے ہمیں فراوانی تک لے جا

اے اگنی!

اے خدا تو ہمارے تمام اعمال اور خیالات کے بارے میں جانتا ہے

ان گناہوں کو ہم سے دُور کر دے

جو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔''

سورۂ فاتحہ کی ان آیات سے بھی ہمیں اسی قسم کا پیغام ملتا ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ٥ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ٥ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ٥﴾ (الفاتحہ: ٦، ٧)

''ہمیں سیدھا راستہ دکھا

ان لوگوں کا راستہ، جن پر تو نے انعام فرمایا

جو معتوب نہیں ہوئے

جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔"

رگ وید میں کہا گیا:

"اسی کی تعریف کرو جو واحد اور بے مثال ہے۔"

(رگ وید از رالف گرفتھ، ص ۶۴۸)

ہندو ویدانت کی برہما سوترا میں بھی یہی بات کی گئی ہے:

"بھگوان ایک ہی ہے

دوسرا نہیں ہے، نہیں ہے

ذرا بھی نہیں ہے۔"

لہٰذا ہندو مت کے متون مقدسہ کے مطالعے سے بھی آپ خدا کا صحیح تصور معلوم کر سکتے ہیں۔

فرشتے

اسلام میں فرشتوں کا تصور

اسلام میں فرشتوں کے بارے میں ہمارا تصور یا عقیدہ یہ ہے کہ:

- وہ اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہیں
- وہ بالعموم نظر نہیں آتے
- انھیں نور سے تخلیق کیا گیا ہے
- وہ اپنی مرضی اور ارادے کے مالک نہیں ہیں۔ (یعنی انھیں انسانوں کی طرح اپنے افعال پر اختیار حاصل نہیں ہے۔
- وہ ہمیشہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکامات کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مختلف فرشتوں کو مختلف کاموں پر مامور فرمایا ہے، مثال کے طور پر برگزیدہ ترین فرشتے حضرت جبریل علیہ السلام ہیں، جنھیں انبیائے کرام تک وحی پہنچانے پر مامور فرمایا گیا ہے۔

ہندومت میں فرشتوں کا تصور

ہندومت کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس مذہب میں فرشتوں یا ملائکہ کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

البتہ کچھ برتر ہستیوں کا تصور ضرور موجود ہے۔ یہ ہستیاں ایسے کام بھی کر سکتی ہیں جو عام انسان کی طاقت سے باہر ہیں۔ جن کا کرنا ایک عام آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔

انھی مافوق الفطرت صلاحیتوں کے باعث بعض ہندوان ہستیوں کو بھی دیوتا قرار دیتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں۔

ہندومت کے متونِ مقدسہ

تعارف

ہندومت کی مقدس تحریروں یا کتابوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایک طرح کی تحریروں کو ''شروتی'' کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کی تحریریں ''سمرتی'' کہلاتی ہیں۔

''شروتی'' سے مراد وہ تحریریں ہیں جو ''کھی گئی ہیں'' یا ''سنی گئی ہیں'' یا ''نازل ہوئی ہیں''۔ ہندو مذہب کی مقدس ترین اور قدیم ترین تحریریں وہی ہیں جو ''شروتی'' کے زمرے میں آتی ہیں۔

''شروتی'' میں دو طرح کی کتابیں شامل ہیں یا یوں کہیے کہ ''شروتی'' کی مزید تقسیم دو حصوں میں کی گئی ہے یعنی:

۱۔ وید مقدس

۲۔ اپنشد

ان دونوں تحریروں کو ہندو الوہی قرار دیتے ہیں۔

''سمرتی'' کو اس درجے میں مقدس یا الوہی تو قرار نہیں دیا جاتا لیکن پھر بھی انھیں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اور یہ کتابیں آج کل کے ہندوؤں میں مقبول بھی بہت زیادہ ہیں۔

''سمرتی'' کا مطلب ہے ''یادداشت'' یا وہ چیزیں جنھیں یاد کر لیا جائے، اس قسم کی تحریریں نسبتاً عام فہم ہیں کیونکہ ان میں کائنات کے بارے میں گفتگو علامتی انداز میں کی گئی ہے اور بالعموم اساطیری انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ''سمرتی'' کو الوہی قرار نہیں دیا جاتا بلکہ انسانی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ ان کتابوں میں انسان کو اس کی روزمرہ زندگی کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں اور اُصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں جن کی روشنی میں ایک فرد کو اپنا رویہ معین کرنا چاہیے اور روزمرہ افعال سرانجام دینے چاہئیں۔ ان کتابوں میں صرف فرد کے لیے ہی نہیں بلکہ معاشرے کے اجتماعی اُمور کے بارے میں بھی ہدایات دی گئی ہیں۔

ان کتابوں کو مجموعی طور پر دھرم شاستر بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں ''پران''، ''اتہاس'' اور متعدد دیگر تحریریں شامل ہیں۔

ہندوؤں کی کتب مقدسہ میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر

(جیسا کہ پہلے بھی وضاحت کی گئی) ہندومت میں متعدد کتابیں مقدس قرار دی جاتی ہیں۔ان مقدس کتابوں میں وید، اپنشد اور پران بھی شامل ہیں۔

وید

''وید'' کا لفظ ود (یا ودیا) سے نکلا ہے۔جس کے معنی سیکھنے یا جاننے کے ہوتے ہیں یعنی علم کی بہترین سطح۔ بلکہ یوں کہیے کہ علوم مقدسہ کے لیے وید کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ویدوں کو چار بنیادی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اگر تعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ویدوں کی کل تعداد ۱۱۳۱ بتائی جاتی ہے۔ان میں سے کوئی درجن بھر وید ایسے ہیں جن کا متن دستیاب ہے(باقی تمام متون غالباً تلف ہو چکے ہیں)۔

ویدوں کی چار اقسام میں رگ وید، اتھر وید، یجر وید اور سام وید شامل ہیں۔ پتانجلی کے مہابھاشیہ کے مطابق:

- رگ وید کی ۲۱ شاخیں ہیں
- اتھر وید کی ۹ شاخیں ہیں
- یجر وید کی ۱۰۱ شاخیں ہیں
- سام وید کی ۱۰۰ شاخیں ہیں

رگ وید، یجر وید اور سام وید کو نسبتاً قدیم کتابیں قرار دیا جاتا ہے اور یہ کتابیں مشترکہ

طور پر ''تری ودیا'' یا ''علوم سہ گانہ'' قرار دی جاتی ہیں۔

رگ وید کو قدیم ترین متن قرار دیا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی تدوین تین قدیم اور طویل زمانوں میں ہوئی ہے۔

چوتھا وید اتھر وید ہے جسے نسبتاً بعد کے زمانے کا سمجھا جاتا ہے۔

ان ویدوں کی تحریر و تدوین کے زمانے کے بارے میں اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ یعنی چاروں ویدوں کا زمانہ تحریر یا زمانہ نزول معین نہیں ہے۔

آریا سماج کے بانی سوامی دیانند کا کہنا تھا کہ وید ۱۳۱۰ ملین سال قبل نازل ہوئے تھے جب کہ دیگر علما کی رائے ہے کہ یہ وید چار ہزار برس سے زیادہ قدیم نہیں ہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی طے نہیں ہے کہ ان ویدوں کا مقامِ تحریر یا مقامِ نزول کیا تھا۔ یعنی کس جگہ، کس علاقے میں یہ کتابیں تحریر کی گئیں۔ یہ بات بھی نامعلوم ہے کہ وہ کون سے رشی تھے، کون سی شخصیات تھیں جنھیں یہ کتابیں عطا کی گئیں۔

لیکن ان تمام تر اختلافات اور غیر یقینی حالات کے باوجود ویدوں کو ہندو مذہب میں مقدس ترین مقام حاصل ہے اور ہندوؤں کے نزدیک یہ مستند ترین ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندومت کی بنیاد ہی ان ویدوں پر ہے۔

اپنشد

اپنشد کا لفظ دراصل تین لفظوں سے مل کر بنا ہے:

''اُپا'' جس کے معنی ہوتے ہیں قریب

''نی'' جس کا مطلب ہے نیچے

''شد'' یعنی بیٹھنا

گویا اپنشد کے معنی ہوئے ''قریب ہو کر زمین پر بیٹھنا'' جس طرح شاگرد اپنے استاد کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اپنشد کے معنی کسی استاد کے پاس بیٹھ کر علوم مقدس کی تعلیم حاصل کرنا ہے۔

البتہ ''سام کارا'' کے مطابق اپنشد کے معنی یہ نہیں ہیں بلکہ اصل لفظ ''شد'' ہے جس کے معنی کھولنے، ختم کرنے یا پہنچنے کے ہوتے ہیں۔ نی اور اُپا سابقے ہیں اور اپنشد کا مطلب ہے وہ مقدس علم جس کے ذریعے جہالت اور لاعلمی کو ختم کیا جاتا ہے۔

اپنشدوں کی تعداد دوسو سے بھی زاید ہے۔ اگر چہ روایتی طور پر ان کی تعداد ۱۰۸ بتائی جاتی ہے۔ دس بنیادی اپنشد ہیں لیکن یہ تعداد بھی معین نہیں ہے کیونکہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ تعداد ۱۸ ہے۔

ویدانت کا لفظ ابتدا میں اپنشدوں کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ سے مراد وہ فلسفیانہ نظام لیا جاتا ہے جو اپنشدوں پر مبنی ہے۔ لغوی طور پر دیکھا جائے تو ویدانت (وید۔ انت) کا مطلب ہے ویدوں کا اختتام یا انجام۔ مراد ہے ویدوں کا مقصد یا منزل کا حصول۔

گویا اپنشد، ویدوں کا تکملہ ہیں جو کہ ویدک دور کے آخر میں آتے ہیں اور ویدوں کی تکمیل کرتے ہیں۔

بعض پنڈت ایسے بھی ہیں جن کی رائے میں اپنشد کو ویدوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔

پُران

استناد کے حوالے سے دیکھا جائے تو اپنشد کے بعد پُرانوں کا نمبر آتا ہے۔ پُران ہندومت کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مذہبی متون ہیں۔ پُرانوں میں آغازِ کائنات کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ابتدائی آریائی قبیلوں کی تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے اور ہندو مذہب کی مقدس مذہبی شخصیات کی زندگیوں کے اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

پُرانوں کو بھی ویدوں کی طرح الہامی کتابیں خیال کیا جاتا ہے اور ان کا زمانہ نزول بھی ویدوں کے لگ بھگ ہی بتایا جاتا ہے۔ یعنی یہ بھی تقریباً اسی دور میں نازل ہوئے جس دور میں وید تحریر ہوئے تھے۔

مہارشی ویاس نے پُرانوں کو اٹھارہ ضخیم حصوں میں ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے ویدوں کی ترتیب وتدوین بھی کی ہے اور انھیں مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔

گیتا اور مہابھارت کی تدوین بھی اسی کے قلم سے ہوئی ہے۔ پُرانوں میں سے اہم کتاب ''بھوِش پُران'' یعنی ''مستقبل کا پُران'' سمجھی جاتی ہے۔ اس کا یہ نام اسی وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس کتاب میں مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندو اس کتاب کو کلامِ الٰہی گردانتے ہیں۔ یعنی ہندوؤں کا خیال ہے کہ مہارشی ویاس نے صرف اس کتاب کو ترتیب دیا تھا، وہ محض اس کتاب کے جامع تھے، مصنف خود خدا تھا۔

بھوِش پُران میں حضرت محمد ﷺ کا ذکر

بھوِش پُران میں تحریر ہے:

''ایک ملیچھ (یعنی کسی دوسرے ملک سے تعلق رکھنے والا اور اجنبی زبان بولنے والا روحانی استاد) ظاہر ہوگا۔ اس کے ساتھ اس کے اصحاب بھی ہوں گے۔ اس کا نام محمدؐ ہوگا۔ ''راجا بھوج'' اس مہادیو عرب کو پہنچ گیا اور گنگا جل میں پاک کرنے گا اور پھر اسے تحائف پیش کرے گا، احترام اور وفاداری کے ساتھ وہ کہے گا، میں تیرا وفادار ہوں۔ اے انسانیت کے لیے مایۂ فخر، اے عرب کے رہنے والے کہ تیرے پاس شیطان کے خاتمے کے لیے بیش بہا قوت ہے، اور تجھے تیرے ملیچھ مخالفوں سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔''

(بھوِش پُران، پراتی سرگ، پارو ۳، کھانڈ ۳، ادھیائے ۳، اشلوک ۵ تا ۸)

مندرجہ بالا پیش گوئی میں کچھ باتیں واضح طور پر بیان کر دی گئی ہیں:

۱۔ آنے والے پیغامبر کا نام محمدؐ ہوگا۔

۲۔ اس کا تعلق صحرائے عرب سے ہوگا۔ (کیوں کہ سنسکرت لفظ Marusthal کا مطلب ریتلا علاقہ یا صحرا ہوتا ہے)

۳۔ پیغمبر ﷺ کے ساتھیوں یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اور یہ بھی نبی کریم ﷺ کا اختصاص ہے کہ جتنے صحابہ رضی اللہ عنہم انھیں عطا کیے گئے اتنی تعداد میں کسی اور پیغمبر کے اصحاب نہیں تھے۔

۴۔ انھیں "فخرِ انسانیت" کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (القلم : ٤)

"اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔"

اسی طرح سورۂ احزاب میں بھی ارشاد فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے۔"

۵۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ باطل اور شیطانی قوتوں کا خاتمہ کرے گا یعنی بت پرستی اور دیگر تمام برائیوں کا خاتمہ کر دے گا۔

۶۔ اور یہ کہ اس کے دشمنوں سے اس کی حفاظت کی جائے گی۔

یہاں بعض لوگ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اس پیش گوئی میں "راجا بھوج" کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ راجا گیارھویں صدی عیسوی کی شخصیت ہے، یعنی رسولِ اکرم ﷺ کے پانچ سو سال بعد کی۔ اور یہ کہ یہ راجا "شالی واہن" کی دسویں پشت میں تھا۔

یہ اعتراض کرنے والے ایک بڑی بنیادی بات نظر انداز کر دیتے ہیں اور وہ یہ کہ راجہ بھوج نام کا کوئی ایک بادشاہ نہیں تھا۔ جس طرح تمام مصری بادشاہ فرعون کہلاتے تھے اور تمام رومی بادشاہوں کو سیزر کہا جاتا تھا، اسی طرح کا معاملہ لفظ "بھوج" کا بھی ہے۔ یعنی جس طرح "فرعون" اور "سیزر" بادشاہوں کے نام نہیں بلکہ لقب تھے، اسی طرح ہندوستانی مہاراجوں کو بھی "بھوج" کہا جاتا ہے۔ متعدد راجا بھوج تھے جن میں سے بہت سے گیارھویں صدی عیسوی والے راجا بھوج سے قبل گزرے ہیں۔

اسی طرح پہنچ گیا اور گنگا کے پانی سے پاک ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ پیغمبرؑ نے خود

وہاں جا کر غسل کیا ہوگا۔ یہاں استعاراتی انداز میں بات ہو رہی ہے۔ چونکہ گنگا کے پانی کو پوتر اور پوتر کرنے والا سمجھا جاتا ہے، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ گنگا میں نہانے والے کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں لہٰذا یہاں یہ استعارہ استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پیغمبر ﷺ گناہوں سے پاک یعنی معصوم ہوگا۔

بھوِش پُران میں لکھا ہے:

''ملیچھوں نے عرب کی مشہور سرزمین کو ناپاک کر دیا ہے۔ وہاں آریا دھرم موجود نہیں رہا۔ اس سے پہلے بھی وہاں ایک گمراہ شخص ظاہر ہوا تھا جسے میں نے ہلاک کر دیا۔ اب وہ دوبارہ ظاہر ہوا ہے۔ ایک طاقت ور دشمن نے اسے بھیجا ہے۔ اِن دشمنوں کو راہِ ہدایت دکھانے کے لیے اور ان کی رہنمائی کے لیے محمدؐ کو بھیجا گیا ہے۔ جسے میں نے برہما کا لقب عطا کیا ہے۔ وہ ''پشاچاؤں'' کو درست رستے کی طرف لانے میں مصروف ہے...... میرا پیرو ایک ایسا شخص ہوگا جو ختنہ کروائے گا، چوٹی نہیں رکھے گا۔ داڑھی رکھے گا، وہ ایک انقلاب لانے والا شخص ہوگا۔ وہ عبادت کے لیے صدا (اذان) دے گا۔ وہ تمام حلال چیزیں کھائے گا، وہ خنزیر کے علاوہ تمام جانوروں کے گوشت کھائے گا۔ وہ مقدس نباتات کے ذریعے پاکی تلاش نہیں کریں گے بلکہ انھیں پاکی جنگ و جدل کے ذریعے ملے گی۔ وہ لادین قوموں سے جنگ کریں گے اور اسی سبب سے مسلمان کہلائیں گے۔ وہ گوشت خور قوم کے دین کی ابتدا کرنے والا ہوگا۔''

(بھوِش پُران، پرتی سرگ، کھانڈ ۳، اشلوک ۱۰ تا ۲۷)

مندرجہ بالا پیش گوئی میں درج ذیل باتیں بیان ہوئی ہیں:

- بدکار لوگوں نے سرزمین عرب کو ناپاک کر دیا ہے۔
- اس سرزمین میں آریا دھرم موجود نہیں ہے۔
- موجودہ دشمن تباہ ہو جائیں گے۔ جس طرح ماضی کے دشمن تباہ ہو گئے تھے۔ مثال کے

طور پر ابرہہ وغیرہ جن کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ○ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ○ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ○ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ○﴾ (الفیل: ۱ تا ۵)

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور اُن پر پرندوں کے جھنڈ بھیج دیے۔ جو ان کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے، پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے (جانوروں کا) کھایا ہوا بھوسہ۔''

- حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو ''برہما'' کا خطاب دے کر گمراہوں کی ہدایت کے لیے مامور فرمایا گیا ہے۔
- ہندوستانی راجا کو عرب جانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کا تزکیہ ہندوستان ہی میں ہوگا جب مسلمان ہندوستان آجائیں گے۔
- آنے والا پیغمبر ﷺ آریا مذہب کے حقیقی عقیدے یعنی توحید کی تبلیغ کرے گا اور راہ گم کردہ لوگوں کی اصلاح بھی کرے گا۔
- پیغمبر ﷺ کے ماننے والے ختنہ کروائیں گے، چوٹیاں نہیں رکھیں گے، داڑھیاں رکھیں گے اور ایک عظیم انقلاب برپا کریں گے۔
- وہ عبادت کے لیے پکاریں گے یعنی اذان دیا کریں گے۔
- وہ تمام حلال اشیا اور گوشت کھائیں گے لیکن سؤر کے گوشت سے پرہیز کریں گے۔

اس بات کی تصدیق قرآن کم از کم چار مقامات پر کرتا ہے:

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾ (البقرہ:۱۷۳)

''اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ، خون سے اور سؤر کے گوشت سے پرہیز کرو اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے علاوہ کسی کا نام لیا گیا ہو۔ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے، بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو، یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ﴾ (المائدہ: ۳)

''تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، وہ جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا......''

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الانعام: ۱۴۵)

''اے نبیؐ، ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو، اِلَّا یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا سؤر کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے، یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں (کوئی چیز ان میں سے کھالے) بغیر

اس کے کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حد ضرورت سے تجاوز کرے، تو یقیناً تمھارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

سورۂ نحل میں پھر فرمایا گیا:

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

(النحل: ۱۱۵)

"اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ البتہ بھوک سے مجبور اور بے قرار ہو کر اگر کوئی ان چیزوں کو کھالے، بغیر اس کے کہ وہ قانون الٰہی کی خلاف ورزی کا خواہش مند ہو، یا حد ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو تو یقیناً اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔"

- یہ کہ وہ ہندؤوں کی طرح تزکیہ حاصل نہیں کریں گے بلکہ ان کے لیے تزکیے کا ذریعہ کفار اور لامذہب لوگوں کے ساتھ جہاد بالسیف ہوگا۔
- یہ کہ انھیں مسلمان کہا جائے گا۔
- وہ ایک گوشت کھانے والی قوم ہوں گے۔

قرآن گوشت خوری یعنی سبزی خور جانوروں کا گوشت کھانے کی اجازت دیتا ہے۔

سورۂ مائدہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ (المائدہ: ۱)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بندشوں کی پوری پابندی کرو۔ تمھارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے۔ سوائے ان کے جو آگے چل کر تم

کو بتائے جائیں گے لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لیے حلال نہ کرلو، بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔"

اسی طرح سورۂ مومنون میں فرمایا گیا:

﴿وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۝﴾ (المؤمنون: ۲۱)

"اور حقیقت یہ ہے کہ تمھارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمھیں پلاتے ہیں اور تمھارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے بھی ہو۔"

بھوش پران کے تیسرے پارو کے پہلے کھانڈ کے تیسرے ادھیائے کے اشلوک ۲۱ اور ۲۳ میں کہا گیا:

"کاشی وغیرہ، سات مقدس شہروں میں بدعنوانی اور ظلم وستم کا دور دورہ ہے۔ ہندوستان میں راکھشش، شبر، بھیل اور دیگر بیوقوف قومیں رہتی ہیں۔ ملیچھوں کے علاقے میں رہنے والے، ملیچھ مذہب کے پیروکار عقل منداور بہادر لوگ ہیں۔ مسلمانوں میں ہر طرح کی خوبیاں موجود ہیں جب کہ ہر طرح کی خامیاں آریاؤں کے علاقے میں جمع ہوگئی ہیں۔ اسلام ہی ہندوستان اور اس کے جزائر پر حکومت کرے گا۔ اے منی! تو یہ حقائق جان چکا ہے سو اپنے خالق کے نام کو روشن کر۔"

اس حوالے سے قرآن مجید کی درج ذیل آیت ملاحظہ فرمایئے:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾ (التوبہ: ۳۳، ۳۴)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ان اہل کتاب کے اکثر علما اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ دردناک سزا کی خوش خبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔"

اسی طرح سورۂ صف میں یہ ہدایت دی گئی:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝﴾ (الصف: ۹)

"وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اسی طرح سورۂ فتح میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۝﴾ (الفتح: ۲۸)

"وہ اللہ ہی ہے، جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔"

محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پیش گوئی

اتھروید کی بیسویں کتاب کی مناجات ۱۲۷ کے کچھ سکت "کنطپ سکت" کہلاتے ہیں۔

کنٹپ کا مطلب ہے مصائب و آلام کو ختم کرنے والا یعنی امن و سلامتی کا پیغام۔ اس کا عربی ترجمہ کیا جائے تو وہ بنے گا ''اسلام''

کنٹپ کے ایک معنی ''پیٹ میں چھپے ہوئے اعضا'' کے بھی ہیں۔ غالباً اس کے لیے ان کے حقیقی معنی چھپے ہوئے تھے اور بعد میں ظاہر ہوئے تھے۔ اس لفظ کے معنی کا تعلق زمین کے مرکز یا ''ناف'' سے بھی ہے۔ مکہ کو ''ام القریٰ'' یعنی آبادیوں کی ماں بھی کہا جاتا ہے اور زمین کی ناف بھی، متعدد کتب مقدسہ میں ہمیں ایسے بیانات ملتے ہیں۔ یہ زمین پر عبادتِ خداوندی کے لیے بنایا جانے والا پہلا گھر تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیائے انسانیت کے لیے پہلی ہدایت نازل فرمائی۔

قرآنِ مجید کی سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّ هُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (آل عمران: ۹۶)

''بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔''

مکہ ہی کا ایک دوسرا نام بکہ ہے اور کنٹپ کے معنی مکہ یا بکہ ہی ہوتے ہیں۔

متعدد اہل علم نے ان ''کنٹپ سکت'' کا ترجمہ کیا ہے جن میں مندرجہ ذیل نام زیادہ اہم ہیں:

- مسٹر ایم، بلوم فیلڈ
- پروفیسر رالف گرفتھ
- پنڈت راجا رام
- پنڈت کھیم کرن اور دیگر

ان سکت کے اہم نکات یا خاص خاص باتیں جو ویدوں کے اس حصے کی نمائندگی کرتے

ہیں، کچھ یوں ہیں:

پہلا منتر

وہ، جس کی تعریف کی گئی ہے (محمدؐ)

وہ، امن کا شہزادہ ہے

ہجرت کرنے والا ہے

وہ ۶۰۰۹۰ دشمنوں کے درمیان بھی محفوظ و مامون ہے۔

دوسرا منتر

وہ ایک شتر سوار رشی ہے

وہ جس کا رتھ آسمانوں کو چھوتا ہے۔

تیسرا منتر

وہ مہا رشی ہے جسے دس سنہری سکے دیے گئے

جسے دس ہار عطا کیے گئے

جسے تین سو جنگی گھوڑے دیے گئے

جسے دس ہزار گائیں عطا کی گئیں۔

چوتھا منتر

ہاں، تو جو منور کرنے والا ہے۔

پانچواں منتر

عبادت کرنے والے اپنی عبادات میں طاقت ور بیلوں کی مانند سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

چھٹا منتر

اے تو کہ حمد کرتا ہے۔

دانائی کو مضبوطی سے تھام لے۔

ساتواں منتر

وہ دنیاؤں کا شہنشاہ ہے

انسانوں میں سے بہترین

اور پوری انسانیت کے لیے ہدایت۔

آٹھواں، نواں منتر

اس نے لوگوں کے لیے مامون ٹھکانہ حاصل کر لیا ہے

وہ ہر کسی کی حفاظت کرتا ہے

اور دنیا میں امن پھیلاتا ہے۔

دسواں منتر

لوگ اس کی حکومت میں خوش ہیں

ترقی کر رہے ہیں

ذلت کی گہرائیوں سے

عظمت کی بلندیوں تک

گیارھواں منتر

اسے کہا گیا کہ اُٹھے

اور دنیا کو خبردار کرے

بارھواں منتر

وہ انتہائی سخی ہے

اور بے حد نوازنے والا

تیرھواں منتر

(اس کے پیروکار)

دشمنوں کی مخالفت اور ایذا سے بچا لیے گئے ہیں تاکہ

آقا کو کوئی گزند نہ پہنچے

چودھواں منتر

ہم عظمت اور تعریف بیان کرتے ہیں
اس عظیم رہ نما کی
ایک نغمۂ توصیف اور دعا کے ساتھ
اس تعریف و توصیف کو قبول فرما
تا کہ باطل ہمیں گمراہ نہ کرے

یہاں سنسکرت زبان کا لفظ Narashansah استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں ''وہ جس کی تعریف کی گئی'' اور یہی معنی عربی میں ''محمد'' کے ہیں۔ یہ گویا ''محمد'' کا سنسکرت ترجمہ ہے۔ اسی طرح سنسکرت لفظ Kaurama کا مطلب ہے ''وہ شخص جو امن قائم کرنے اور پھیلانے والا ہو'' اور ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ امن کے سفیر تھے۔ آپؐ نے مساوات انسانی کی تعلیم دی اور عالمی بھائی چارہ قائم فرمایا۔ اسی لفظ کا ایک معنی ''ہجرت کرنے والا'' بھی ہے۔ پیغمبر ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تھی اور یوں آپ ﷺ ہجرت فرمانے والوں میں سے بھی تھے۔ یہ کہا گیا کہ ۶۰,۰۹۰ دشمنوں سے آپؐ کی حفاظت کی جائے گی اور مکہ کی آبادی (تقریباً) اتنی ہی تھی۔

- یہ کہا گیا کہ وہ اونٹ پر سواری کرے گا۔ یہاں یہ بات تو واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس سے مراد کوئی ہندوستانی تو ہو نہیں سکتا کیونکہ برہموں کے لیے اونٹ کی سواری ویسے ہی ممنوع ہے۔

''ایک برہمن کو اونٹ یا گدھے پر بیٹھنے کی اجازت نہیں، اور اسے برہنہ غسل کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اسے چاہیے کہ پاکی حاصل کرنے کے لیے ضبطِ نفس سے کام لے۔''

(Sacred Books Of The East, Vol 25, p 472)

- تیسرے منتر میں اس شخصیت کو ''Mamah'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس نام کا کوئی رشی یا کوئی پیغمبر ہندوستان میں یا کسی اور جگہ ہمارے علم میں نہیں۔ کسی کا یہ نام نہیں تھا۔

یہ لفظ ''Mah'' سے نکلا ہے جس کے معنی عروج، عظمت اور بلندی کے ہوتے ہیں۔ کچھ سنسکرت کتابوں میں یہ نام ''Mahamad'' بھی لکھا گیا ہے لیکن سنسکرت گرامر کی رُو سے اس لفظ کو نامناسب مفہوم میں بھی برتا جا سکتا ہے۔ اور عربی زبان کے لفظ پر سنسکرت گرامر لاگو کرنا یوں بھی غلط ہے۔ یہ لفظ ''Mamah'' ہی ہے اور اس کا تلفظ اور معنی دونوں لفظ ''محمد ﷺ'' سے مشابہ ہیں۔

- پھر کہا گیا کہ اسے ''سو سنہری سکے'' دیے گئے۔ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ پر ابتدائی ایمان لانے والے اور مکی دور کے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جو اس مشکل دور میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ بعد ازاں کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر وہ مکہ سے حبشہ ہجرت کر گئے اور کچھ عرصہ بعد جب خود رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی تو یہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم بھی وہاں آ گئے۔

- دس ہاروں سے مراد رسول اللہ ﷺ کے وہ دس بہترین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جنہیں عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے۔ (یعنی وہ دس جنہیں بشارت دی گئی) یہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جنہیں زندگی ہی میں مغفرت اور کامیابی کی بشارت مل گئی تھی۔ خود نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے انہیں آخرت کی کامیابی اور جنت کے حصول کی خوشخبری مل گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے ہر ایک کا نام لے کر اس کے جنتی ہونے کی تصدیق فرمائی۔

ان اصحابِ رسول ﷺ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

۲۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

۳۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

۵۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ

۶۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ

۷۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ

۸۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

۹۔ حضرت سعد ابن زید رضی اللہ عنہ

۱۰۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ

⊙ اس کے بعد ذکر تین سو جنگی گھوڑوں کے تحفے کا ہے۔ سنسکرت لفظ **Arwah** کا مطلب ہے ''تیز رفتار عربی النسل گھوڑا'' یہاں تین سو گھوڑوں سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ تین سو جاں نثار صحابہؓ ہیں جنہوں نے غزوۂ بدر میں حصہ لیا تھا اور دشمن کی تعداد تین گنا زیادہ ہونے کے باوجود فتح مند لوٹے تھے۔

⊙ سنسکرت کا لفظ ''گئو'' دراصل ''گاؤ'' سے نکلا ہے۔ اس کا مطلب لڑائی یا جنگ کے لیے روانہ ہونا بھی ہوتا ہے اور گائے کو بھی گئو ہی کہتے ہیں۔ گائے ہندو مذہب میں جنگ کی علامت بھی ہے اور امن کی بھی۔ یہاں دس ہزار گائیوں سے مراد وہ دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں داخل ہونا تاریخ انسانی کا ایک منفرد واقعہ تھا۔ اس موقع پر کوئی قتل و غارت کوئی کشت و خون نہیں ہوا۔ یہ دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم ایک طرف تو گائے کی مانند ہمدرد اور نیک سرشت تھے تو دوسری طرف مضبوط اور بہادر بھی تھے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ (الفتح: ۲۹)

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔''

- اگلے منتر میں سنسکرت کا ایک لفظ استعمال ہوا ہے Rebh، اس لفظ کا عربی ترجمہ کیا جائے تو وہ بنے گا ''احمد'' اور یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا ایک نام ہے۔
- پھر یہ کہا گیا کہ وہ اور ان کے ساتھی ہمیشہ عبادات کو یاد رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں عبادت کو فراموش نہیں کرتے۔ قرآنِ مجید کی سورۂ بقرہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ۝﴾

(البقرہ: ٤٥)

''صبر اور نماز سے مدد لو، بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے لیکن فرمانبردار بندوں کے لیے نہیں۔''

اسی طرح قرآنِ مجید کی سورۂ نساء میں فرمایا گیا:

﴿ وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝﴾

(النساء:۱۰۲، ۱۰۳)

''اور اے نبیؐ! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالتِ جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنا اسلحہ لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کرے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آ کر تمہارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنا اسلحہ لیے رہے، کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یک بارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے، پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔ اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیٔ وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔''

⊙ اس منتر میں جس دانائی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد قرآنِ مجید ہے۔ قرآنِ مجید نہ صرف دنیا بلکہ آخرت کی بھلائی کا بھی ضامن ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی تعلیم دیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بہت سوں نے قرآن مجید کو حفظ بھی کیا تھا۔

⊙ اس سے اگلے منتر میں بیان شدہ تمام خصوصیات بھی صرف رسول اللہ ﷺ پر صادق آتی ہیں۔

سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (الانبیاء:۱۰۷)

''اے نبیؐ! ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

سورۂ سبا میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (سبا: ۲۸)

''اور (اے نبیؐ!) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

سورۂ القلم میں فرمایا گیا:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (القلم: ٤)

''اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔''

سورۂ احزاب میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے، اور ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔''

⊙ کعبہ کی تعمیر نو کے دوران میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی حکمت و دانائی سے کام لے کر عرب قبائل کو ایک ممکنہ جنگ سے بچا لیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی ذات بابرکات سے نہ صرف جزیرۃ العرب میں امن قائم ہوا بلکہ باقی دنیا کو بھی امن و سلامتی کا پیغام انھی سے پہنچا۔

فتح مکہ کے دوران بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پورا واقعہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر مکمل ہو گیا اور نبی کریم ﷺ نے وہاں امن قائم فرما دیا۔ آپ ﷺ نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی سزا نہیں دی بلکہ یہ کہہ کر امن و سلامتی سے جانے دیا کہ:

''جاؤ! آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔''

⊙ آج سے چودہ صدیاں قبل، عرب قوم ایک جاہل قوم تھی۔ اس زمانے کو عربوں کی تاریخ میں کہا ہی ''ایام جاہلیت'' جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے پیغامِ ہدایت کے ذریعے اس قوم کو ترقی اور خوش حالی عطا فرمائی۔ ان لوگوں کو جہالت سے نکال کر پوری انسانیت کے لیے رہنما کے منصب پر فائز کیا۔

⊙ اس منتر میں تو گویا قرآنِ مجید کی ایک آیت کا ترجمہ ہی پیش کر دیا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُO قُمْ فَاَنْذِرْO وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ O﴾ (المدثر:۱، ۳)

''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔''

اور پیغمبر ﷺ اسلام نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس حکم پر عمل فرمایا۔ آپؐ لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے اُٹھے اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان فرماتے رہے۔

⊙ قرآنِ مجید کی سورۂ آلِ عمران میں کہا گیا:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَO﴾

(آل عمران:۱۵۹)

''(اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسہ پر کام کرتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کی نرمی، رحم دلی اور سخاوت کی وجہ سے لوگ آپ ﷺ کے گرد جمع ہوتے چلے گئے۔ بصورتِ دیگران سخت مزاج عربوں کے دل جیتنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

⊙ اس منتر میں ایک رشی کی دعا نقل کی گئی ہے اور نبی کریم ﷺ کو بھی ایک اس طرح کی دعا عنایت فرمائی گئی تھی جو ہمیں قرآنِ مجید کی آخری سورۃ میں ملتی ہے:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ○ مَلِكِ النَّاسِ ○ اِلٰـهِ النَّاسِ ○ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ○ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ○ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ○﴾ (الناس:۱ تا ٦)

''کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی، اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔''

⊙ آخری منتر میں ویدوں کے ماننے والوں کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ آنے والے پیغمبر کی تعریف وتوصیف کریں اور اس پر ایمان لائیں تاکہ اس دنیا کی برائیوں سے محفوظ رہ سکیں۔

ویدوں کی مزید پیش گوئیاں

اتھر وید میں کہا گیا ہے:

اے حق پرستوں کے خدا
یہ لوگ جو شراب معرفت سے مست ہیں
اور شجاعت کے کارنامے سرانجام دیتے ہیں
اور تجھے خوش کرنے کو نغمہ سرا ہیں میدان وغا میں
اور بغیر خون بہائے انہوں نے شکست دی
دعا و ثنا کرنے والے کے دس ہزار دشمنوں کو

(اتھر وید، کتاب ۲۰، مناجات ۱)

یہ پیش گوئی تاریخ اسلام کی مشہور جنگ غزوۂ احزاب کے بارے میں ہے۔ یہ جنگ رسول اللہ ﷺ کے دورِ مبارک میں ہوئی تھی اور باقاعدہ جنگ کیے بغیر ہی اللہ کے رسول ﷺ کو فتح حاصل ہوگئی تھی۔ قرآنِ مجید کی سورۂ احزاب میں اس غزوہ کا ذکر کچھ یوں کیا گیا ہے:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴾

(الاحزاب: ۲۲)

''اور سچے مومنوں (کا حال اس وقت یہ تھا) کہ جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ ''یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی'' اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔''

اس منتر میں استعمال ہونے والے سنسکرت لفظ ''کارو'' کا مطلب ہوتا ہے ''د: کرنے والا'' یا ''تعریف کرنے والا'' جس کا عربی ترجمہ کیا جائے تو وہ بنے گا ''احمد'' جو کر رسول اللہ ﷺ کا ایک اسمِ مبارک ہے۔

اس جنگ میں شریک کفار کی تعداد دس ہزار تھی جب کہ مسلمان صرف تین ہزار تھے منتر میں بھی دشمنانِ رسول ﷺ کی تعداد دس ہزار بتائی گئی ہے۔

منتر کے آخری الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ بغیر جنگ کیے دشمنوں کو شکست ہو گئی تھی (او واقعہ یہ ہے کہ اس جنگ میں دوبدو لڑائی کی نوبت ہی نہیں آئی تھی)

فتح مکہ

اتھروید میں کہا گیا ہے:

تو نے اے ہند

بیس بادشاہوں کو معزول کیا

اور اُن ۶۰,۰۹۹ صاحب ساز وسامان

لوگوں کو بھی

جو لڑنے آئے تھے

اس صاحب توصیف وثنا یتیم سے

(اتھروید، کتاب ۲۰، مناجات ۲۱، سطر:

مندرجہ بالا پیش گوئی کے حوالے سے تین باتیں قابل ذکر ہیں:

۱۔ نبی کریم ﷺ کے وقت میں مکہ کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔

۲۔ مکہ میں متعدد قبائل تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار تھا اور ان سرداروں کی کل تعداد ۲۰ تھی۔ یہی سردار مکہ کی آبادی کے حکمران تھے۔

۳۔ یہاں جو لفظ استعمال ہوا ہے، اس کے معنی ہیں "جس کی بہت تعریف کی جائے" اور "محمد" کے معنی بھی یہی ہیں۔

اسی طرح کی ایک پیش گوئی رگ وید میں بھی موجود ہے۔ جس میں سنسکرت کا لفظ "Susharna" استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے معنی بھی "تعریف کے قابل" یا "وہ جس کی بہت تعریف کی جائے" ہیں۔ اور اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی لفظ "محمد" ہے۔

سام وید کی پیش گوئی

"احمد نے اپنے خدا سے قانون دائمی کا علم حاصل کیا۔ جس سے میں نے اسی طرح نور (ہدایت) حاصل کیا، جس طرح سورج سے روشنی ملتی ہے۔"

(سام وید، کتاب ۲، مناجات ۶)

اس منتر میں پیغمبر کا نام "احمد" بتایا گیا ہے اور یہ ایک عربی نام ہے۔ ویدوں کے اکثر مترجمین نے اس لفظ کا ترجمہ کرنے کی کوشش میں ٹھوکر کھائی ہے۔ اور لفظ کو "احمت" سمجھ کر ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے اس منتر میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کو ابدی اور دائمی قانون عطا کیا گیا۔ اس سے مراد اسلام کا "قانون شریعہ" ہے۔

رشی کہتا ہے کہ میں نے پیغمبر ﷺ کے قانون سے ہدایت حاصل کی اور قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (سبا: ۲۸)

"اور (اے نبیؐ!) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

ہندوؤں کی جانب سے
عام طور پر اسلام کے بارے میں
پوچھے جانے والے سوالات

(حصہ دوم)

کیا وید وحی خداوندی ہیں؟

سوال:.....اگر یہ درست ہے کہ اللہ تبارک وتعالٰی کی طرف سے ہر دور میں (اور ہر علاقے میں) وحی نازل ہوئی ہے تو پھر ہندوستان کی طرف کون سی ہدیت بھیجی گئی تھی؟ اور کیا ''وید'' اور ہندومت کی دیگر مقدس کتابیں وحی خداوندی ہو سکتی ہیں؟

جواب:.....وحی ہر دور میں نازل ہوئی

اس بات کا تذکرہ ہمیں قرآن مجید فرقان حمید کی درج ذیل آیت مبارکہ میں ملتا ہے۔

سورۂ رعد میں فرمایا گیا:

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ٥﴾

(الرعد:۳۸)

''تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا۔ اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا۔ ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے۔''

قرآن میں چار کتابوں کا ذکر ہے

قرآن مجید میں صرف چار الہامی کتابوں کا ذکر نام لے کر کیا گیا ہے۔ اور یہ چار کتابیں درج ذیل ہیں:

۱۔ توراۃ

۲۔ زبور

۳۔ انجیل

۴۔ قرآنِ مجید

توراۃ سے مراد وہ وحی خداوندی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

زبور سے مراد وہ الہامی کلام ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوا۔

انجیل سے مراد وہ وحی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور قرآنِ مجید وہ وحی خداوندی ہے جس کا نزول پیغمبر اعظم و آخر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا۔ یہ ہدایت الٰہی کی حتمی اور آخری صورت ہے۔

سابقہ کتب خاص قوموں کے لیے تھیں

قرآن مجید سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتب مقدسہ کسی خاص قوم اور ایک خاص عرصے تک کے لیے نازل ہوتی تھیں۔ لہٰذا ان کی پیروی بھی اسی عرصے تک مطلوب تھی۔

قرآن پوری بنی نوع انسان کے لیے ہے

قرآنِ مجید چونکہ آخری اور حتمی وحی الٰہی ہے، اس لیے اس کو پوری انسانیت کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا گیا ہے۔ محض مسلمانوں یا یوں کہیے کہ محض عربوں کے لیے نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ٥﴾ (ابراھیم:۱)

ا۔ل۔ر۔ (اے محمدؐ!) یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ، ان کے رب کی توفیق سے، اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔"

اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر ہمیں ایک اور پیغام ملتا ہے:

﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝﴾ (ابراھیم:۵۲)

''یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے اور یہ بھیجا گیا ہے اس لیے کہ ان کو اس کے ذریعہ سے خبردار کیا جائے۔ اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آ جائیں۔''

سورۂ البقرہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ﴾ (البقرہ:۱۸۵)

''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔''

سورۂ زمر میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ۝﴾

(الزمر: ۴۱)

''(اے نبیؐ!) ہم نے اب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہو گا، تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔''

ہندوستان میں کون سی وحی نازل ہوئی؟

یہاں یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں کون سی وحی خداوندی نازل ہوئی تھی اور یہ کہ کیا ہم ویدوں کو اور ہندومت کے دیگر متون مقدسہ کو الہامی یا منزل من اللہ سمجھ سکتے ہیں؟

تو بات یہ ہے کہ ویدوں یا ہندو مت کی دیگر کتابوں میں سے کسی کتاب کا نام قرآنِ مجید یا احادیث صحیحہ میں نہیں ملتا۔ نہ ہی کسی ایسی وحی کا ذکر ملتا ہے جو ہندوستان کے علاقے میں نازل ہوئی ہو لہٰذا ہم یقین سے تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ الہامی کتابیں ہیں لیکن اس امکان کی نفی بھی نہیں کر سکتے۔

بالفاظ دیگر یہ کتابیں الہامی ہو بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی۔

بالفرض اگر وید الہامی ہیں؟

اگر بالفرض وید یا ہندو مت کی دیگر مقدس کتابیں الہامی متون تھے بھی اور خدا کی طرف سے نازل ہوئے بھی تھے تو پھر بھی یہ صرف ایک خاص دور کے لوگوں کے لیے تھے۔

آج دنیا کے تمام انسانوں کو، اور ان میں ہندوستانی بھی شامل ہیں، صرف ایک ہی وحی خداوندی کی پیروی کرنی ہے، جو اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی آخری اور حتمی کتاب ہدایت ہے۔ یعنی قرآنِ مجید فرقانِ حمید۔

مزید برآں چونکہ سابقہ الہامی کتابیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نازل نہیں کی گئی تھیں لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں محفوظ بھی نہیں فرمایا۔ دنیا کے کسی بھی مذہب کی کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جو من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہو اور اپنی اصل حالت میں محفوظ ہو۔ جس میں کسی قسم کی تحریف نہ ہوئی ہو، تدلیس یا تبدیلی نہ ہوئی ہو۔

لیکن قرآنِ مجید کی پیروی چونکہ روزِ قیامت تک ہونی ہے اور یہ انسانوں کے لیے ابدی ہدایت کا ذریعہ ہے لہٰذا اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۝﴾ (الحجر:۹)

''اس ذکر (قرآن) کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔''

کیا رام اور کرشن پیغمبر تھے؟

سوال:...... اگر اسلام کہتا ہے کہ دُنیا کی ہر قوم میں پیغمبر بھیجے گئے تھے تو پھر ہندوستان کی طرف کون سے پیغمبر کو مبعوث فرمایا گیا تھا؟ اور کیا ہم رام اور کرشن کو اللہ کے پیغمبر سمجھ سکتے ہیں؟

جواب:...... **ہر قوم کی طرف پیغمبر بھیجے گئے**

قرآنِ مجید کی سورۂ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (فاطر: ٢٤)

''ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی اُمت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔''

اسی طرح کی بات قرآنِ مجید میں ایک دوسری جگہ بھی فرمائی گئی ہے:

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (الرعد:٧)

''اور ہر قوم کے لیے ایک راہنما ہے۔''

چند پیغمبروں کے ہی واقعات بیان کیے گئے

سورۂ نساء میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

﴿وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ

عَلَيْكَ ﴾ (النساء:١٦٤)

''ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔''

سورۂ غافر میں بھی ہمیں اس سے ملتا جلتا پیغام دیا گیا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ﴾ (المؤمن:۷۸)

''(اے نبیؐ!) تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے۔''

بعض انبیاء کے نام بتائے گئے

قرآنِ مجید میں صرف ۲۵ انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر نام لے کر کیا گیا ہے جن میں حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمد علیہم السلام اور دیگر انبیاء کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر

نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ کے مطابق اس دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام مبعوث فرمائے جا چکے ہیں۔

انبیا صرف اپنی اُمتوں کے لیے

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے قبل تشریف لانے والے انبیائے کرام علیہم السلام کو صرف ان کی اپنی قوم کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا گیا تھا۔ اسی طرح ان کی پیروی ایک خاص زمانے اور خاص وقت تک کے لیے لازم تھی۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ﴾ (آل عمران: ٤٩)

''اور (عیسیٰ علیہ السلام کو) بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کیا۔''

حضرت محمد ﷺ آخری پیغمبر ہیں

حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں۔ قرآن مجید میں اس بات کا اعلان یوں فرمادیا گیا ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا٥﴾ (الاحزاب: ٤٠)

''(لوگو!) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

حضرت محمد ﷺ کی نبوت پوری انسانیت کے لیے

چونکہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا آخری اور حتمی پیغام لائے تھے لہٰذا آپ ؐ کی نبوت مسلمانوں یا عربوں (یا کسی بھی خاص قوم یا علاقے) سے مخصوص نہیں تھی۔ آپ ﷺ کی نبوت پوری انسانیت کے لیے تھی۔

اس بات کا تذکرہ قرآن مجید میں متعدد جگہ کیا گیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ٥﴾ (انبیاء: ١٠٧)

''اے نبیؐ! ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

اسی طرح سورۂ سبا میں فرمایا گیا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ٥﴾ (سبا: ٢٨)

''اور (اے نبیؐ!) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں کہا گیا:

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
ہر نبی کو اپنی قوم ہی کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے لیکن مجھے پوری انسانیت کے

لیے بھیجا گیا ہے۔'' (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

ہندوستان میں کون سے پیغمبر تشریف لائے

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ہندوستان میں کون سے پیغمبر تشریف لائے تھے؟ اور کیا رام اور کرشن اللہ کے پیغمبر ہو سکتے ہیں؟ تو اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید اور احادیث صحیحہ میں کسی ایسے پیغمبر کا ذکر نہیں ملتا جنہیں ہندوستان میں مبعوث کیا گیا ہو۔

چونکہ رام اور کرشن وغیرہ کا نام قرآن وحدیث میں کسی بھی جگہ مذکور نہیں ہے لہٰذا یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لوگ نبی یا پیغمبر تھے یا نہیں تھے۔ بعض مسلمان خصوصاً بعض مسلمان سیاستدان ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''رام علیہ السلام'' وغیرہ کہنا۔ یہ بالکل غلط ہے کیوں کہ ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ قرآن وحدیث سے اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ وہ اللہ کے پیغمبر تھے۔ ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ''شاید'' وہ پیغمبر ہوں ...... اور بس۔

اگر وہ پیغمبر تھے بھی؟

فرض کیجیے کہ رام اور کرشن اللہ کے پیغمبر تھے بھی تو وہ صرف ایک خاص زمانے تک کے لیے اور ایک خاص قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہوں گے۔ ان کی پیروی صرف اس زمانے کے لوگوں ہی پر فرض تھی۔ آج ہندوستان سمیت پوری دنیا کے لوگوں کی ہدایت صرف اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی پر منحصر ہے۔ لہٰذا سب کو انھی کی پیروی کرنی چاہیے۔

ہندومت کے اوتار

جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے، اس میں پیغمبروں کا کوئی تصور موجود نہیں۔ البتہ اوتاروں کا تصور ہمیں ضرور نظر آتا ہے۔ ''اوتار'' سنسکرت زبان کا لفظ ہے، یہ دو لفظوں سے مل کر بنا ہے یعنی ''او'' جس کا مطلب ہے نیچے اور ''تار'' جس کا مطلب ہے گزرنا۔ تو اوتار کا مطلب ہے ''وہ جو نیچے اترا۔''

آکسفرڈ ڈکشنری میں اس لفظ کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے:

(ہندو اساطیر کے پس منظر میں) ایک نجات یافتہ روح (یعنی دیوی، دیوتا) کا انسانی جسم میں زمین پر اترنا۔

آسان لفظوں میں کہا جائے تو اوتار کا مطلب ہے خدا کا انسانی صورت میں زمین پر آنا۔

ہندومت میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ مذہب کی حفاظت کے لیے، انسانوں کے لیے ایک مثال پیش کرنے کے لیے یا ان کے لیے اصول وضوابط معین کرنے کے لیے خدا خود انسانی صورت میں زمین پر آتا ہے۔ ویدوں میں اوتاروں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ وید ہندومت کی مقدس ترین کتب ہیں لیکن ان میں اوتاروں کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ''شروتی'' میں اوتاروں کا کوئی ذکر نہیں البتہ سمرتی میں اوتاروں کا ذکر موجود ہے۔ یعنی ''پُران'' اور اتہاس میں اوتاروں کا حوالہ ملتا ہے۔

ہندوؤں میں جو متون زیادہ مقبول ہیں اور زیادہ پڑھے جاتے ہیں ان میں اوتاروں کا ذکر موجود ہے۔ مثال کے طور پر بھگود گیتا میں کہا گیا:

''جب بھی اور جہاں بھی
مذہب پر زوال آتا ہے
اے بھرت کی اولاد
جب بھی لا مذہبیت کا دور دورہ ہوتا ہے
تو میں اترتا ہوں
جو نیک ہیں ان کی مدد کے لیے
جو بُرے ہیں انھیں ختم کرنے کے لیے
اور (مذہبی) اصولوں کو قائم کرنے کے لیے
ہر ہزار سال کے بعد

میں خود ظاہر ہوتا ہوں۔"

(بھگود گیتا، باب ۴)

گویا بھگود گیتا کے مطابق پاک لوگوں کی مدد کے لیے، گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے اور مذہبی اصولوں کو دوبارہ مستحکم کرنے کے لیے خدا خود اوتاروں کی صورت میں زمین پر اترتا ہے۔

اوتاروں کی تعداد

"پرانوں" کے مطابق اوتاروں کی کل تعداد تو سینکڑوں میں ہے لیکن "وشنو" کے مندرجہ ذیل دس اوتار بتائے گئے ہیں:

۱: متسیا اوتار...... مچھلی کی صورت میں

۲: کرم اوتار...... کچھوے کی صورت میں

۳: وراہ اوتار...... خنزیر کی صورت میں

۴: نرسمہا اوتار...... بلا (Monster) کی صورت میں جو آدھا انسان ہے اور آدھا شیر۔

۵: ومن اوتار...... ایک پستہ قد برہمن کی صورت میں جس کا نام ومن تھا۔

۶: پرشورام اوتار...... پرشورام کی صورت میں

۷: رام اوتار...... رام کی صورت میں جو رامائن کا بنیادی کردار ہے

۸: کرشنا اوتار...... گیتا کے بنیادی کردار، کرشن کی صورت میں

۹: بدھ اوتار...... گوتم بدھ کی صورت میں

۱۰: کلکی اوتار...... کلکی کی صورت میں

یہ تمام متن جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ واضح ہونے کے باوجود حقیقت سے دور ہے۔

حلول کا عقیدہ

بات یہ ہے کہ انسانوں کے بارے میں جاننے کے لیے خدا کو انسانی صورت اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بہت سے مذاہب حلول اور تناسخ کے عقیدے پر تھوڑا بہت یا

زیادہ زور دیتے نظر آتے ہیں۔ اسے فلسفہ تناسخ یا فلسفہ حلول کہا جاتا ہے یعنی خدا کا انسانی صورت اختیار کر لینا۔ وہ اس کے لیے ایک منطقی دلیل بھی فراہم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی پاک اور اتنی مقدس ہے کہ دکھ، درد، تکلیف، پریشانی اور مصیبت جو انسان کو درپیش آتی ہیں ان سے وہ لاعلم ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ جب ایک انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے یا وہ کسی پریشانی میں ہوتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے قوانین وضع کرنے کی خاطر وہ خود انسان کی صورت میں زمین پر آتا ہے۔ بظاہر یہ منطق بالکل درست معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔

بنانے والا صرف ایک ہدایتی کتابچہ فراہم کرتا ہے

فرض کیجیے میں ایک ٹیپ ریکارڈر بناتا ہوں۔ اب کیا یہ جاننے کے لیے مجھے خود ٹیپ ریکارڈر بننا ہوگا کہ اس ٹیپ ریکارڈر کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ میں صرف اتنا کرتا ہوں کہ ایک ہدایتی کتابچہ لکھ دیتا ہوں۔ اس کتابچے میں لکھا ہوتا ہے کہ کیسٹ سننے کے لیے کیسٹ کو ریکارڈر میں ڈالیں اور PLAY کا بٹن دبائیں، اسی طرح روکنے کے لیے STOP کا بٹن دبائیں۔ کیسٹ آگے کرنے کے لیے فلاں اور پیچھے کرنے کے لیے فلاں بٹن دبائیں۔ اس ٹیپ ریکارڈر کی حفاظت کریں، اگر یہ اونچی جگہ سے گرا یا اس میں پانی چلا گیا تو یہ خراب ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ میں ہدایات پر مشتمل ایک کتاب لکھ دوں گا، جس میں درج ہوگا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔

قرآن مجید پوری انسانیت کے لیے ہدایت نامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو انسان کے بارے میں آگاہی کے لیے انسان بننے کی (نعوذ باللہ) ضرورت نہیں ہے۔ انسانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ ان کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ اسے خود ہم انسانوں کی صورت اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس نے صرف یہ کرنا ہے کہ انسانیت کے لیے ایک ہدایت نامہ نازل کر دے۔ آخری اور حتمی ہدایت نامہ قرآن مجید کی صورت میں نازل کیا جا چکا ہے۔

اس ہدایت نامے میں یہ بتادیا گیا ہے کہ انسان کو (کامیابی کے لیے) کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں؟ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر منتخب کرتا ہے۔ اپنا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لیے وہ انسانوں ہی میں سے ایک انسان کو منتخب کرتا ہے، جس کے ذریعے اس کی ہدایت ہم تک پہنچتی ہے۔ اس کے لیے اُسے خود زمین پر آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک خاص انسان تک وحی کے ذریعے اپنی ہدایت اور رہنمائی منتقل کرتا ہے جس کے ذریعے یہ ہدایت دیگر انسانوں تک پہنچتی ہے۔ یہ خاص انسان اللہ کے نبی اور پیغمبر کہلاتے ہیں۔

تصورِ آخرت

قرآنِ مجید کی سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾ (البقرة:۲۸)

’’تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تمھیں زندگی عطا کی۔ پھر وہی تمہاری جان سلب کرے گا، پھر وہی تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا، پھر اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔‘‘

اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اس دنیا میں صرف ایک بار ہی آتا ہے۔ اور جب وہ یہاں اپنی زندگی پوری کر کے مرجاتا ہے تو پھر وہ قیامت کے دن ہی دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ پھر اس کے اعمال کا حساب ہوگا اور اپنی نیکیوں اور گناہوں کے لحاظ سے وہ یا تو جنت میں چلا جائے گا یا دوزخ میں۔

دنیاوی زندگی امتحان ہے

قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

﴿ الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝ ﴾ (الملک:۲)

’’جس نے زندگی اور موت کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے

اور اپنے مالک کے قوانین پر عمل نہیں کرتے۔"

(رگ وید، کتاب ۴، مناجات ۵)

تصورِ تقدیر

اسلام میں قدر یا تقدیر کا تصور سمجھنے سے پیش تر یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہیں جن پر اس کا اختیار نہیں کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے ہی طے شدہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ ایک شخص کب اور کہاں پیدا ہوگا۔ اسے کتنی زندگی ملے گی اور یہ کہ اس کی موت کہاں واقع ہوگی۔

حالات میں فرق کا سبب

مختلف افراد کے حالات پیدائشی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بچہ معذور ہوسکتا ہے دوسرا صحت مند، ایک بچہ امیر ترین گھرانے میں پیدا ہوسکتا ہے دوسرا غریب ترین خاندان میں۔ ہندومت میں اس فرق کا سبب پچھلے جنم کے کرم یا اعمال کو قرار دیا جاتا ہے۔

تناسخ یا آواگون کے اس عقیدے کی کوئی منطقی یا سائنسی دلیل موجود نہیں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اسلام ہمیں قرآن میں اس بارے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ سورۂ ملک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝ ﴾ (الملك:٢)

"جس نے زندگی اور موت کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔"

موجودہ زندگی ایک امتحان ہے

قرآن مجید کی متعدد آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مختلف طرح کے حالات کے

ذریعے اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ ﴾

(البقرة:٢١٤)

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا، حالاں کہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔''

قرآنِ مجید کی سورۂ عنکبوت میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ ارشاد اس معاملے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

﴿ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ ﴾ (العنكبوت:٢، ٣)

''کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے'' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالاں کہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟''

سورۂ انبیاء میں فرمایا گیا:

﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾ (الانبياء:٣٥)

”ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔ آخر کار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔“

سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾ (البقرة:۱۵۵)

”اور ہم ضرور تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں، انھیں خوش خبری دے دو۔“

اسی طرح سورۂ انفال میں ہمیں یہ بات ملتی ہے:

﴿ وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ (الانفال:۲۸)

”اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد حقیقت میں سامانِ آزمائش ہیں۔ اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔“

ہندومت میں حیات بعد الموت کا تصور

ہندومت میں ایک تصور بار بار جنم لینے اور بار بار اس دنیا میں آنے کا ملتا ہے۔ اس تصور یا عقیدے کے لیے بہت سے نام استعمال ہوتے ہیں، اسے وہ Transmigration of Soul بھی کہتے ہیں۔ اور Reincarnation بھی، اور یہ عقیدہ آواگون بھی کہلاتا ہے لیکن ہندو مذہب میں اس کے لیے ”سمسارہ“ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ سمسارہ کا عقیدہ ہندومت کے بنیادی عقاید میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے۔

ہندومت میں اس عقیدے کی مدد سے مختلف لوگوں کے مختلف حالات میں پیدا ہونے کی توجیہہ کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک بچہ صحت مند پیدا ہوا ہے اور دوسرا معذور تو یہ دراصل ان کے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ہے یعنی وہ کام جو انھوں نے اپنی پچھلی زندگی

میں کیے تھے۔ اسی طرح اگر ہماری زندگی میں اچھے اور برے کاموں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اگلے جنم میں ان کا نتیجہ نکل ہی آئے گا۔

بھگود گیتا میں کہا گیا ہے:

''جیسے ایک شخص پرانے کپڑے اتار کر نئے پہن لیتا ہے اسی طرح روح بھی پرانے اور بیکار مادی اجسام کو چھوڑ کر نئے جسموں میں آجاتی ہے۔''

(بھگود گیتا، باب ۲، نمبر ۲۲)

دوبارہ جنم لینے کے عقیدے کا ذکر ہمیں اپنشدوں میں بھی ملتا ہے۔ ایک اپنشد میں کہا گیا:

''جس طرح ایک ایک سنڈی ایک پتے سے دوسرے پتے پر منتقل ہو جاتی ہے، اسی طرح روح بھی ایک جسم سے دوسرے جسم تک منتقل ہو جاتی ہے اور ایک نیا وجود اختیار کر لیتی ہے۔''

(برہدرنائکا اپنشد، حصہ ۴، باب ۴)

کرم: سبب اور نتیجے کا قانون

کرم کا مطلب ہوتا ہے افعال یا اعمال۔ اس میں جسمانی افعال بھی شامل ہیں اور ذہنی بھی۔ کرم دراصل عمل اور ردّ عمل کا نام ہے یا یوں کہیے کہ سبب اور نتیجے کا۔

''جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔''

ایک کسان گندم بو کر چاول کاٹنے کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح ایک اچھی سوچ ایک اچھی بات یا ایک اچھا عمل بھی اپنا ردّ عمل ضرور مرتب کرتا ہے۔ یہ ردّ عمل یا یہ اثر ہماری اگلی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی طرح بری بات یا برا عمل بھی اسی زندگی میں یا آئندہ زندگی میں ہم پر اثر انداز ہوتا ہے۔

دھرم......فرائض

دھرم سے مراد لازمی فرائض یا ذمہ داریاں ہیں۔ اسی میں فرائض کی ہر سطح شامل ہے۔ بحیثیت فرد بحیثیت خاندان، بحیثیت طبقہ، بحیثیت جماعت غرض پوری کائنات کو اچھے کرم

کمانے کے لیے اپنی زندگی دھرم کے مطابق گزارنی چاہیے۔

بصورت دیگر ہم برے کرم جمع کریں گے۔ دھرم نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ زندگی کو بھی بدل سکتا ہے۔

مکشا: آواگون سے نجات

''مکشا'' سے مراد بار بار جنم لینے کے چکر یعنی سمسارہ سے نجات ہے۔ ہر ہندو کے لیے آخری مقصد اور منزل یہی ہے کہ وہ اس چکر سے نجات پا جائے اور اس کو دوبارہ جنم نہ لینا پڑے۔ لیکن اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اس کا کوئی کرم ایسا نہ ہو، جس کی وجہ سے اس کو دوبارہ جنم لینا پڑے، یعنی نہ کوئی اچھا کرم ہو اور نہ بُرا۔

یہ عقیدہ ویدوں میں نہیں ہے

ویدوں میں ہمیں بار بار جنم لینے کے اس عقیدے کے بارے میں کوئی بات نہیں ملتی۔ کسی بھی وید میں کوئی ایسا بیان موجود نہیں جو روح کے اس طرح جسم بدلنے کے عقیدے کی تائید کرتا ہو۔

کیا خدا عادل ہے؟

س:...... اگر خدا عادل ہے تو پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض لوگ صحت مند پیدا ہوں اور بعض گونگے بہرے؟ بعض امیر ترین گھروں میں پیدا ہوں اور بعض غریب ترین گھروں میں؟

☺:...... زندگی ایک امتحان ہے

قرآنِ مجید کی سورۂ ملک میں فرمایا گیا ہے:

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ٥ ﴾ (الملك:۲)

”جس نے زندگی اور موت کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔“

اللہ تعالیٰ مختلف لوگوں کو مختلف طریقوں سے آزماتا ہے، جس طرح امتحانوں کے پرچے بدلتے رہتے ہیں ہر بار ایک ہی پرچہ نہیں آتا۔ ہر سال وہی سوالات نہیں ہوتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر کسی سے الگ امتحان لیتا ہے۔ ہر انسان کو مختلف امتحان دینا پڑتا ہے۔ کچھ لوگوں کو صحت دے کر ان کا امتحان لیا جاتا ہے، کچھ کو بیماری اور معذوری دے کر، کچھ لوگوں کو دولت دے کر آزمایا جاتا ہے تو کچھ کی آزمائش غربت اور تنگ دستی سے کی

جاتی ہے۔

فیصلہ امتحان کے مطابق ہوگا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر بندے کا فیصلہ اسے دی گئی سہولتوں اور اس پر پڑنے والی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی کیا جاتا ہے، اگر اس کی آزمائشیں مشکل تھیں تو یقیناً اس کے ساتھ رعایت کی جائے گی۔ یوں بھی مشکل حالات کا فائدہ اس امتحان میں ہوتا ہی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص غریب ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہی نہیں ہے۔ لہٰذا زکوٰۃ کی ادائیگی کے حوالے سے اس شخص کا کوئی نمبر نہیں کٹے گا جب کہ دوسری طرف ایک امیر آدمی پر زکوٰۃ فرض ہے لیکن اکثر امیر لوگ پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، لہٰذا وہ اسی حوالے سے پکڑے جائیں گے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو پیدائشی نقائص کے ساتھ پیدا کرتا ہے۔ کچھ گونگے بہرے ہوسکتے ہیں کچھ کو دیگر معذوریاں ہوسکتی ہیں۔ بچہ خود تو ان معذوریوں کے لیے ذمہ دار نہیں ہوتا۔ ایسی صورتوں میں اللہ تعالیٰ والدین کا بھی امتحان لیتا ہے کہ وہ ان حالات میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں یا نہیں۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

﴿ وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ (الانفال:۲۸)

''اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں۔ اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔''

بت پرستی کا مقصد؟

:...... ہندو پنڈت اور دانشور یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ وید اور ہندو مت کی دیگر مقدس کتب مورتی پوجا کی تعلیم نہیں دیتیں لیکن ابتدائی مراحل میں، جب ذہن پختہ نہ ہوا ہو، توجہ مرکوز کرنے کے لیے بت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ذہن ایک بلند سطح تک پہنچ جائے تو پھر مورتی پوجا یا بت پرستی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

:...... مسلمان بلند ذہنی سطح رکھتے ہیں

اگر مورتی پوجا کی ضرورت صرف ابتدائی سطح پر ہوتی ہے اور بلند تر ذہنی سطح کے حصول کے بعد ارتکاز توجہ کے لیے بت کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو پھر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مسلمان پہلے ہی سے اس بلند ذہنی سطح کے مالک ہیں کیوں کہ ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے کسی بت کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بجلی چمکنے کی مثال

ایک مرتبہ میں ایک سوامی جی سے I.R.F میں اسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ انھوں نے ایک مثال دی کہ جب بجلی چمکنے پر بچہ پوچھے کہ یہ کیوں چمک رہی ہے تو ہم جواب دیتے ہیں کہ ''نانی ماں چکی پیس رہی ہے''۔ چوں کہ بچے کی ذہنی سطح کم ہوتی ہے لہٰذا ہم اس قسم کی مثال سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو توجہ مرکوز کرنے کے لیے بت کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہمیں جھوٹ بولنے کی بالکل اجازت نہیں۔ میں اپنے بچے سے کبھی یہ بات نہیں کروں گا۔ اسے یہ غلط جواب نہیں دوں گا، کیوں کہ مجھے پتہ ہے کہ آگے چل کر جب وہ سکول جائے گا اور وہاں اُسے پتہ لگے گا کہ درحقیقت گرج چمک کی آواز کس وجہ سے آتی ہے تو وہ سوچے گا کہ یا تو اس کے استاد جھوٹ بول رہے ہیں اور یا میں جھوٹ بول رہا تھا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہین کہ بعض سائنسی حقائق کا سمجھنا بچے کے لیے دشوار ہوگا تو آپ کو چاہیے کہ ان حقائق کو آسان اور سہل کر کے سمجھانے کی کوشش کریں لیکن کبھی جھوٹ نہ بولیں۔ اگر آپ جواب نہیں جانتے تو پھر بھی آپ میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ آپ اس کو یہ کہہ سکیں کہ "میں نہیں جانتا"۔ اگرچہ اس جواب سے بچے کی تسلی نہیں ہوتی۔ اگر میں اپنے بچے سے کہوں کہ میں نہیں جانتا تو وہ کہتا ہے کہ "ابا آپ کیوں نہیں جانتے؟"

اس کے بعد آپ مجبور ہو جاتے ہیں کہ جواب معلوم کریں، یوں آپ کے علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور آپ کے بچے کے علم میں بھی۔

بعض سوامی اس بات کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی جماعت میں تو بچے کو مورتی پوجا کے ذریعے خدا تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعد میں اونچی جماعتوں میں جا کر یہ ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ارتکازِ توجہ کے لیے بتوں سے مدد لے۔

مگر یہاں ایک بہت بنیادی بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی مضمون میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مبادیات کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی بچہ کسی مضمون کے اصول و مبادی کو اچھی طرح سمجھ لے تو صرف اسی صورت میں وہ مستقبل میں اس مضمون میں مہارت حاصل کر سکے گا۔

مثال کے طور پر ریاضی کا استاد پہلی جماعت میں بچے کو سمجھاتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اب چاہے وہ بچہ میٹرک تک پڑھے یا گریجوایشن کرے یا پی ایچ ڈی کر لے، اس کے لیے دو جمع دو چار ہی رہیں گے، تین یا پانچ نہیں ہو جائیں گے۔ ہوسکتا ہے اعلیٰ

جماعتوں میں وہ الجبرا، ٹرگنومیٹری اور الگورتھم وغیرہ بھی سیکھ جائے لیکن بہرحال دو جمع دو چار رہیں گے۔ لیکن اگر پہلی جماعت میں ہی غلط پڑھایا جائے تو یہ توقع کیسے رکھی جاسکتی ہے کہ وہ طالب علم آگے چل کر ریاضی میں مہارت حاصل کرے گا؟

اسی طرح یہ بھی ویدوں کا بنیادی اصول ہے کہ خدا کا کوئی عکس نہیں، وہ تجسیم سے پاک ہے تو پھر ہندومت کے علما اس غلط روش پر خاموش کیوں ہیں؟

کیا آپ اپنے پہلی جماعت کے بچے کو یہ بتائیں گے کہ دو اور دو چار نہیں بلکہ تین یا پانچ ہوتے ہیں اور درست جواب میٹرک میں جاکر دیں گے؟

اگر نہیں تو پھر مذہب میں یہ رویہ کیوں اختیار کیا جائے؟

کیا مسلمان کعبے کو پوجتے ہیں؟

اعتراض:...... اگر اسلام بت پرستی کے خلاف ہے تو مسلمان کعبے کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟ وہ کعبہ کی طرف سجدہ کیوں کرتے ہیں؟

جواب:...... کعبہ قبلہ ہے!

مسلمان اپنی نماز میں کعبے کی عبادت نہیں کرتے۔ کعبہ تو ان کے لیے قبلہ ہے یعنی وہ سمت جس طرف منہ کر کے مسلمانوں کو نماز پڑھنی چاہیے۔ مسلمان نماز میں سوائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نہ کسی کے سامنے جھکتے ہیں اور نہ کسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

اسلام ہمیشہ مسلمانوں کے اتحاد اور اتفاق پر زور دیتا ہے۔ اب مثال کے طور پر اگر نماز ادا کرتے ہوئے بعض مسلمان شمال کی طرف رُخ کریں اور بعض جنوب کی طرف تو یہ اچھی بات نہیں، لہٰذا مسلمانوں کا اتحاد ظاہر کرنے کے لیے انھیں ایک خاص طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اور وہ کعبے کی سمت ہے۔ لہٰذا اب صورت یہ ہے کہ اگر مسلمان کعبے کے جنوب میں رہتے ہیں تو نماز پڑھتے ہوئے ان کا رُخ شمال کی طرف ہوگا اور اگر وہ شمال میں ہیں تو جنوب کی طرف۔ اسی طرح اگر وہ کعبے کے مغرب میں ہیں تو مشرق کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں گے اور اگر مشرق میں ہیں تو مغرب کی طرف۔

کعبہ زمین کا مرکز ہے

مسلمانوں نے سب سے پہلے دنیا کا نقشہ بنایا تھا۔ اور انھوں نے یہ نقشہ اس طرح تیار

کیا تھا کہ جنوب اوپر کی طرف اور شمال کو نیچے کی طرف رکھا گیا تھا۔ اس نقشے کے مطابق کعبہ بالکل مرکز میں آتا تھا۔ بعد ازاں مغرب میں دنیا کے نقشے تیار کیے گئے۔ انھوں نے اس نقشے کو الٹا کر دیا یعنی شمال اوپر کی طرف اور جنوب کو نیچے رکھا گیا، لیکن پھر بھی کعبہ اس نقشے کے عین مرکز میں تھا۔ الحمدللہ!

طوافِ کعبہ، اقرارِ توحید

ہم مسلمان جب مسجد الحرام میں جاتے ہیں تو کعبے کا طواف کرتے ہیں یعنی کعبہ کے گرد دائرے میں چکر لگاتے ہیں اور یوں اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جس طرح ہر دائرے کا ایک مرکز ہوتا ہے، اسی طرح کائنات کا ایک ہی خدا ہے، جس کی تمام انسانوں کو عبادت کرنی چاہیے۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بار حج کے موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''(حجر اسود کے حوالے سے) کہ میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے اور اگر میں رسول اللہ ﷺ کو تجھے چھوتے اور بوسہ دیتے نہ دیکھ چکا ہوتا تو نہ تجھے چھوتا اور نہ ہی بوسہ دیتا۔''

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ بیان اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ہم مسلمان کعبہ کی عبادت نہیں کرتے۔

لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہمیں جھوٹ بولنے کی بالکل اجازت نہیں۔ میں اپنے بچے سے کبھی یہ بات نہیں کروں گا۔ اسے یہ غلط جواب نہیں دوں گا، کیوں کہ مجھے پتہ ہے کہ آگے چل کر جب وہ سکول جائے گا اور وہاں اُسے پتہ لگے گا کہ درحقیقت گرج چمک کی آواز کس وجہ سے آتی ہے تو وہ سوچے گا کہ یا تو اس کے استاد جھوٹ بول رہے ہیں اور یا میں جھوٹ بول رہا تھا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بعض سائنسی حقائق کا سمجھنا بچے کے لیے دشوار ہوگا تو آپ کو چاہیے کہ ان حقائق کو آسان اور سہل کر کے سمجھانے کی کوشش کریں لیکن کبھی جھوٹ نہ بولیں۔ اگر آپ جواب نہیں جانتے تو پھر بھی آپ میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ آپ اس کو یہ کہہ سکیں کہ ''میں نہیں جانتا''۔ اگرچہ اس جواب سے بچے کی تسلی نہیں ہوتی۔ اگر میں اپنے بچے سے کہوں کہ میں نہیں جانتا تو وہ کہتا ہے کہ ''ابا آپ کیوں نہیں جانتے؟''

اس کے بعد آپ مجبور ہو جاتے ہیں کہ جواب معلوم کریں، یوں آپ کے علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور آپ کے بچے کے علم میں بھی۔

بعض سوامی اس بات کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی جماعت میں تو بچے کو مورتی پوجا کے ذریعے خدا تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعد میں اونچی جماعتوں میں جا کر یہ ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ارتکازِ توجہ کے لیے بتوں سے مدد لے۔

مگر یہاں ایک بہت بنیادی بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی مضمون میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مبادیات کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی بچہ کسی مضمون کے اصول و مبادی کو اچھی طرح سمجھ لے تو صرف اسی صورت میں وہ مستقبل میں اس مضمون میں مہارت حاصل کر سکے گا۔

مثال کے طور پر ریاضی کا استاد پہلی جماعت میں بچے کو سمجھاتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اب چاہے وہ بچہ میٹرک تک پڑھے یا گریجوایشن کرے یا پی ایچ ڈی کرلے، [illegible] دو دو چار ہی رہیں گے، تین یا پانچ نہیں ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے اعلیٰ

جماعتوں میں وہ الجبرا، ٹرگنومیٹری اور الگورتھم وغیرہ بھی سیکھ جائے لیکن بہر حال دو جمع دو چار رہیں گے۔ لیکن اگر پہلی جماعت میں ہی غلط پڑھایا جائے تو یہ توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ وہ طالب علم آگے چل کر ریاضی میں مہارت حاصل کرے گا؟

اسی طرح یہ بھی ویدوں کا بنیادی اصول ہے کہ خدا کا کوئی عکس نہیں، وہ تجسیم سے پاک ہے تو پھر ہندو مت کے علما اس غلط روش پر خاموش کیوں ہیں؟

کیا آپ اپنے پہلی جماعت کے بچے کو یہ بتائیں گے کہ دو اور دو چار نہیں بلکہ تین یا پانچ ہوتے ہیں اور درست جواب میٹرک میں جا کر دیں گے؟

اگر نہیں تو پھر مذہب میں یہ رویہ کیوں اختیار کیا جائے؟

کیا مسلمان کعبے کو پوجتے ہیں؟

سوال:...... اگر اسلام بت پرستی کے خلاف ہے تو مسلمان کعبے کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟ وہ کعبہ کی طرف سجدہ کیوں کرتے ہیں؟

جواب:...... کعبہ قبلہ ہے!

مسلمان اپنی نماز میں کعبے کی عبادت نہیں کرتے۔ کعبہ تو ان کے لیے قبلہ ہے یعنی وہ سمت جس طرف منہ کرکے مسلمانوں کو نماز پڑھنی چاہیے۔ مسلمان نماز میں سوائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نہ کسی کے سامنے جھکتے ہیں اور نہ کسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

اسلام ہمیشہ مسلمانوں کے اتحاد اور اتفاق پر زور دیتا ہے۔ اب مثال کے طور پر اگر نماز ادا کرتے ہوئے بعض مسلمان شمال کی طرف رُخ کریں اور بعض جنوب کی طرف تو یہ اچھی بات نہیں، لہٰذا مسلمانوں کا اتحاد ظاہر کرنے کے لیے انھیں ایک خاص طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اور وہ کعبے کی سمت ہے۔ لہٰذا اب صورت یہ ہے کہ اگر مسلمان کعبے کے جنوب میں رہتے ہیں تو نماز پڑھتے ہوئے ان کا رُخ شمال کی طرف ہوگا اور اگر وہ شمال میں ہیں تو جنوب کی طرف۔ اسی طرح اگر وہ کعبے کے مغرب میں ہیں تو مشرق کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھیں گے اور اگر مشرق میں ہیں تو مغرب کی طرف۔

کعبہ زمین کا مرکز ہے

مسلمانوں نے سب سے پہلے دنیا کا نقشہ بنایا تھا۔ اور انھوں نے یہ نقشہ اس طرح تیار

کیا تھا کہ جنوب اوپر کی طرف اور شمال کو نیچے کی طرف رکھا گیا تھا۔ اس نقشے کے مطابق کعبہ بالکل مرکز میں آتا تھا۔ بعد ازاں مغرب میں دنیا کے نقشے تیار کیے گئے۔ انھوں نے اس نقشے کو الٹا کر دیا یعنی شمال اوپر کی طرف اور جنوب کو نیچے رکھا گیا، لیکن پھر بھی کعبہ اس نقشے کے عین مرکز میں تھا۔ الحمدللہ!

طوافِ کعبہ، اقرارِ توحید

ہم مسلمان جب مسجد الحرام میں جاتے ہیں تو کعبے کا طواف کرتے ہیں یعنی کعبہ کے گرد دائرے میں چکر لگاتے ہیں اور یوں اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جس طرح ہر دائرے کا ایک مرکز ہوتا ہے، اسی طرح کائنات کا ایک ہی خدا ہے، جس کی تمام انسانوں کو عبادت کرنی چاہیے۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بار حج کے موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''(حجراسود کے حوالے سے) کہ میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے اور اگر میں رسول اللہ ﷺ کو تجھے چھوتے اور بوسہ دیتے نہ دیکھ چکا ہوتا تو نہ تجھے چھوتا اور نہ ہی بوسہ دیتا۔''

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ بیان اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ہم مسلمان کعبہ کی عبادت نہیں کرتے۔

گوشت خوری

جائز یا ناجائز؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک اور رشمی بھائی زاویری
کے مابین ایک دلچسپ مناظرہ

مترجم

سید امتیاز احمد

دار النوادر
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۲۰۰۶ء

کتاب: گوشت خوری جائز یا ناجائز؟
ڈاکٹر ذاکر نائیک اور رشی بھائی زاویری
کے مابین ایک دلچسپ مناظرہ

مترجم: سید امتیاز احمد

اہتمام: دار النوادر، لاہور

مطبع: موٹر وے پریس، لاہور

قیمت: ۵۰ روپے

اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

حصہ اوّل

حصہ دوم

☆......☆......☆

ڈاکٹر ذاکر نائیک کا تعارف

اشرف محمدی

ڈاکٹر ذاکر عبدالکریم نائیک کی عمر ۴۳ سال ہے۔ وہ اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کے صدر ہیں۔ پیشہ ورانہ لحاظ سے وہ ایک ڈاکٹر ہیں لیکن انھیں بین الاقوامی شہرت ایک زوردار خطیب اور مقرر کے طور پر حاصل ہے۔ ان کے موضوعات اسلام اور تقابل ادیان ہیں۔ وہ قرآن، حدیث اور دیگر مذاہب کے متون مقدسہ کی روشنی میں، اسلام کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں دور کرتے ہیں۔ وہ اس حوالے سے منطق استدلال اور جدید سائنسی حقائق کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے تنقیدی تجزیوں اور متاثر کن جوابات کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے عوامی خطبات کے بعد حاضرین ان سے سوالات کرتے ہیں جن کے وہ تشفی بخش جوابات دیتے ہیں۔ صرف گزشتہ تین سال کے عرصے میں وہ دنیا کے مختلف ممالک میں تین صد سے زاید عوامی اجتماعات سے خطاب کر چکے ہیں۔ وہ متعدد بین الاقوامی ٹی وی چینلز کے ذریعے بھی دنیا بھر میں سنے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے مختلف مذاہب کی اہم شخصیات کے ساتھ اس قسم کے مناظروں اور مباحثوں میں بھی شریک ہو چکے ہیں۔

☆......☆......☆

حصہ اوّل

گوشت خوری!..... جائز یا ناجائز؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دیگر کتب

- مذاہب عالم میں تصورِ خدا اور اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کے ۲۰ سوال
- اسلام میں خواتین کے حقوق
- اسلام دہشت گردی یا عالمی بھائی چارہ
- گوشت خوری جائز یا ناجائز؟
- بائبل اور قرآن...... جدید سائنس کی روشنی میں
- کیا قرآن کلامِ خداوندی ہے؟
- اسلام اور ہندومت

حرفِ آغاز

ڈاکٹر محمد نائیک

اللہ کے نام سے جو نہایت رحم کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

آج کی تقریب کے مہمانِ خصوصی جناب وائی پی تریویدی صاحب، جناب رشمی بھائی زاویری، ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب، چمن بھائی ڈہرا صاحب، دھن راج سلیچا صاحب اور محترم مہمان خواتین وحضرات، السلام علیکم!

اس تقریب کے منتظمین، انڈین ویجی ٹیرین کانفرنس، اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن اور رشبھ فاؤنڈیشن کی جانب سے میں آپ سب کو آج کی اس منفرد تقریب میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ تقریب ایک عوامی مباحثے پر مشتمل ہے جس کا موضوع ہے:

''انسان کے لیے گوشت خوری جائز ہے یا ناجائز؟''

یہ مباحثہ ایک دوستانہ فضا میں ہو رہا ہے جس کا مقصد ایک دوسرے کے نقطہ ہائے نظر کی تفہیم ہے۔ میں اس تقریب کی نظامت کروں گا اور میری اس ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ میں اس دوران قطعی غیر جانب دار رہوں۔ میرا یہ بھی فرض ہوگا کہ میں تقریب کے ماحول کو منصفانہ اور خوشگوار رکھنے کی کوشش کروں، لہٰذا میں اپنے جملہ حاضرین سے بھی یہ درخواست کروں گا کہ وہ آدابِ محفل کو ملحوظِ خاطر رکھیں تاکہ یہ مباحثہ خوشگوار اور صحت مند ماحول میں جاری رہ سکے۔

☆......☆......☆

افتتاحی کلمات

وائی پی تریویدی

ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب، جناب رشمی زادیری صاحب، ڈاکٹر محمد نائیک صاحب، ڈاکٹر دھن راج سلیچا صاحب، چمن لال ڈہرا صاحب اور محترم احباب!

اپنی تعارفی گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل ایک گزارش کرنا چاہوں گا۔ میں زور دے کر یہ بات آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری تہذیب کے لیے آج بہترین دوست اور بہترین دشمن ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے موبائل فون۔ جس وقت آپ کسی مصیبت میں ہوں تو یہ آپ کا بہترین دوست ثابت ہوسکتا ہے لیکن جس وقت آپ کسی محفل میں ہوں، اس وقت یہ آپ کا بدترین دشمن بھی ہوسکتا ہے۔

لہٰذا جن حاضرین کے پاس موبائل فون موجود ہیں، میں ان سے گذارش کرنا چاہوں گا کہ ازارہِ کرم اپنے فون بند کردیں تاکہ مقررین اور سامعین ڈسٹرب نہ ہوں۔ یہ ایک طرف مقرر کے خیالات کی پریشانی کا باعث بنتا ہے تو دوسری طرف سامعین کی توجہ کو ہٹانے کا سبب بھی بنتا ہے۔

دوستو! میں مقررین کو اور آپ کو آج منعقد ہونے والے انتہائی اچھے مباحثے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ یہ مباحثہ ایک نقطۂ آغاز ثابت ہوگا اور مستقبل میں بھی اسی قسم کے مباحثے اور مناظرے ہوتے رہیں گے۔

یہ مباحثہ یا مکالمہ دراصل ہندومت اور اسلامی تہذیب کی بہترین روایات کا تسلسل ہے۔ ہماری دیومالا اور تاریخ میں بھی ایسے مناظروں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مناظرے مختلف

بادشاہوں، مثال کے طور پر جَنَک کے دربار میں منعقد ہوئے۔ ان مناظروں میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے علما آپس میں مباحثے کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہندومت کبھی بھی کسی واحد فکر کا پیرو نہیں رہا۔ مختلف مکاتب فکر مثلاً بھگتی مارگ، ادوایت مارگ وغیرہ اور پھر چاروک تھے جو خدا پر یقین ہی نہیں رکھتے تھے۔

راجا جَنَک اکثر ان تمام مکاتب فکر کے علما کو جمع کرتا اور پھر انھیں موقع فراہم کرتا کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دلائل دیں، دوسروں سے مباحثہ کریں۔ راجا خود ان پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ صرف انھیں گفتگو کی تحریک دیتا تھا۔ یوں مباحثے ہوتے تھے اور حاضرین سب کی گفتگو سن کر خود نتائج اخذ کرتے تھے۔ سو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان میں ہندو مذہب کی یہ روایت رہی ہے۔ اسی طرح کی روایت اسلام میں بھی موجود ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد کا جو دور تھا، اس دور میں عربوں نے علم منطق، ریاضی اور علم فلکیات پر توجہ دی اور عرب علاقہ ان علوم کا مرکز بن گیا۔ ان علوم کے حوالے سے مباحثے ہوتے تھے، نظریات قائم ہوتے تھے جو بعد ازاں مغرب تک منتقل ہوئے۔

میرے خیال میں، مغرب میں نشاۃِ ثانیہ کی تحریک انھی عرب علما کے افکار کی مرہونِ منت ہے۔ یہ علما اپنے وقت کی عظیم شخصیات تھے۔ ہم لوگ بالعموم جب عرب فکر کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمارا خیال زیادہ سے زیادہ الف لیلیٰ کی طرف جاتا ہے۔ بلاشبہ عربوں نے داستان گوئی میں بھی کمال حاصل کیا تھا لیکن ان کے علوم محض داستان گوئی تک محدود نہیں تھے۔ انھوں نے سائنس، ٹیکنالوجی، فلسفہ، منطق اور ریاضی جیسے علوم کو بھی بیش بہا ترقی دی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی بے انتہا ترقی کے باوجود مغرب ہندسوں کو آج بھی ''عرب ہندسے'' ہی کہتا ہے۔ یوں اسلام میں آزادیٔ فکر کی روایت ہمارے سامنے آتی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ روایت مسلسل جاری رہی ہے کیونکہ ہندوستان میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ شہنشاہ اکبر کے دور میں بھی تمام مذاہب کے علما کو دعوت دی جاتی تھی کہ وہ

آئیں اور اپنے مذہبی عقاید کی وضاحت کریں۔ عیسائی جو اس دور میں نئے نئے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے، انھیں بھی یہ دعوت دی گئی کہ وہ شاہی دربار میں آئیں اور اپنے مذہبی اصولوں کا تعارف پیش کریں۔

گویا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس قسم کے مباحث جیسی صحت مندانہ فکری سرگرمیاں کسی بھی روشن خیال، مہذب اور اختلاف رائے برداشت کرنے والے معاشرے کے ارتقا کے لیے شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر ذہرا کی طرح میں بھی یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں یہاں قطعی غیر جانبدار ہوں۔ اگر میں غیر جانب دار نہ ہوتا تو ظاہر ہے مجھے مہمانِ خصوصی بھی نہ بنایا جاتا۔ لہٰذا میں زیر بحث موضوع کے بارے میں کوئی فیصلہ کن رائے بھی نہیں دینا چاہوں گا۔ لیکن یہاں میں ایک مکتب فکر کا ذکر ضرور کروں گا۔ یہ رائے میں نے کسی جگہ پڑھی تھی۔ وہ یہ کہ قدرتی طور پر جتنے سبزی خور جانور ہیں یعنی وہ جانور جو صرف نباتات کو بطورِ غذا استعمال کرتے ہیں، ان کے دانت چپٹے ہوتے ہیں جب کہ وہ جانور جو سبزی خور نہیں ہیں بلکہ گوشت خور ہیں، ان کے دانت نوکیلے ہوتے ہیں۔ چپٹے نہیں ہوتے۔

انسان ایک ایسی نوع ہے جو دونوں طرح کے دانت رکھتا ہے۔ یعنی انسانی جبڑے میں چپٹے دانت بھی ہوتے ہیں اور نوکیلے بھی۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قدرت چاہتی تھی کہ یہ نوع باقی رہے۔ قدرت کو یہ منظور تھا کہ اہم ترین نوع ہونے کے ناطے انسان کی بقا کو اس زمین پر یقینی بنایا جائے تاکہ یہ نوع پیغامِ الٰہی کی مخاطب اور مبلغ بنے۔ اسی لیے غالباً اس نوع کو اس طرح تشکیل دیا گیا کہ یہ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدائی دور کے انسان یعنی Homosapien اور Homoeructus وغیرہ تمام تر گوشت خور تھے۔ کیونکہ اس دور میں زراعت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اگر آپ موجودہ سائنسی معلومات کی روشنی میں ارتقائے انسانی کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تہذیبی ترقی کے نتیجے میں انسان نے زراعت کا آغاز کیا اور فصلیں

کاشت کرنا شروع کیں، اس کے بعد یہ ہوا کہ انسانوں میں سے کچھ سبزی خور بن گئے، کچھ گوشت خور ہی رہے اور کچھ دونوں طرح کی غذائیں استعمال کرتے رہے۔ یعنی ان کی غذا میں لحمیاتی اور نباتاتی ہر دو طرح کی خوراک شامل تھی۔ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بیش تر گوشت خور نباتاتی غذائیں بھی شوق سے کھاتے ہیں۔

لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ جب آپ اس حوالے سے بحث کرتے ہیں کہ ''گوشت خوری انسان کے لیے جائز ہے یا ناجائز؟'' تو آپ در حقیقت مذہبی لحاظ سے گوشت خوری کے جواز اور عدم جواز کے حوالے سے بات کر رہے ہوتے ہیں۔ اور یہاں میں ڈاکٹر ذاکر صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ مذہب کا کام نہیں ہے کہ وہ ہمیں بتائے کہ ''ہمیں کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔''

مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ ہماری روح کا تزکیہ کرے۔ اسے ہمارے ضمیر کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اچھے اخلاق کی تعلیم دینی چاہیے اور خدا کے راستے کی جانب ہماری رہنمائی کرنی چاہیے۔

یہ بتانا ڈاکٹروں کا کام ہے کہ ہمیں کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔ غذائی ماہرین کو اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرنی چاہیے۔ مذہب کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیں حکم دے۔

ادرک مت کھاؤ.............لہسن مت کھاؤ.............پیاز مت کھاؤ

کیونکہ جب آپ اس بارے میں غذائی ماہرین سے پوچھیں گے تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ یہ چیزیں آپ کے لیے انتہائی مفید ہیں۔ یہ آپ کی بقا کے لیے لازم ہیں اور بیماریوں کے خلاف مدافعت کے لیے بھی ضروری ہیں۔ لہٰذا ان چیزوں کو بطورِ غذا ضرور استعمال کرنا چاہیے۔

یہ جدید سائنس کے موضوعات ہیں۔ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے اور مستقبل کے حوالے سے سوچنا چاہیے۔ نئے ہزاریے اور اکیسویں صدی کے حوالے سے بے بہا توقعات ہیں۔

میں آج ہی کسی رسالے میں نوسٹراڈیم کی پیش گوئیوں کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔ اور نوسٹراڈیم نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ یہ ملک جو تین طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے، یہی ملک دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک بنے گا۔ لیکن اگر ہم فرسودہ باتوں سے چمٹے رہے تو کیا ہم ترقی کر پائیں گے؟ کیا ہم سپر پاور بن سکیں گے؟

ابھی چند روز پہلے کی بات ہے کہ بے شمار لوگ یہ علاقہ چھوڑ گئے۔ میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ اس سارے عمل کی کوئی سائنسی توجیہہ نہیں تھی۔ ہر وہ شخص جو ذرا سا بھی منطقی مزاج رکھتا ہے، جسے تھوڑا بہت بھی سائنس کا ادراک ہے، یہی کہہ رہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ چاہے آٹھ سیارے خطِ مستقیم میں ہوں یا خط منحنی میں، اس سے قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس کے باوجود طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ہماری سب سے بڑی بندرگاہ مکمل طور پر ویران ہوگئی تھی کیوں کہ لوگ راجھستان کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔

مجھے قطعاً سمجھ نہیں آتی کہ راجھستانی لوگ اس قدر جلد بدحواس کیوں ہو جاتے ہیں۔ یہ مارواڑی سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئے۔ یہاں انھوں نے بے بہا دولت کمائی اور اب محض یہ سن کر کہ آٹھ سیارے کسی خاص ترتیب میں آ رہے ہیں، انھی مارواڑیوں نے دوڑ لگا دی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راجھستان جانے کے لیے بس کی ٹکٹ ڈھائی ہزار روپے تک دی گئی ہے۔ لیکن ہوا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔

لہٰذا ہمارے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ، اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ ملک ترقی کرے، اگر ہم من حیث القوم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہماری منزل ہمارے سامنے ہے اور اس منزل کو بہت جلد حاصل کر سکتے ہیں۔

میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اکیسویں صدی ہندوستان اور پاکستان کی صدی ہے۔ دونوں کی۔ جیسے جیسے یہ ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، یہ اکیسویں صدی کے لیڈر بنیں گے۔ لیکن اگر ایسا ہونا ہے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کے لیے آپ کو فرسودہ عقاید سے

نجات حاصل کرنا ہوگی۔ کیا کھانا ہے اور کیا نہیں کھانا، یہ بات ہمیں ڈاکٹر بتائیں گے۔

اگر کوئی نئی تحقیق سامنے آتی ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ ٹماٹر کینسر کے خلاف مدافعت میں مدد دیتے ہیں، تو مجھے لازماً ٹماٹر کھانے چاہئیں اس سے قطع نظر کہ میرا مذہب اس بارے میں مجھے کیا بتاتا ہے۔

لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ ہمیں سائنس سے رجوع کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے ذہن کو جدید خطوط پر ترقی دینی چاہیے۔ ہمیں سائنسی زاویہ نظر اپنانا چاہیے۔

میں مقررین کی حدود میں داخل نہیں ہونا چاہتا، لہٰذا ان تعارفی کلمات کے ساتھ میں ایک دفعہ دوبارہ یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ میں اس مباحثے کے دوران قطعی غیر جانب دار رہوں گا۔ اور اس موضوع کے حوالے سے تحقیق کرنے والے علما کے خیالات سننا چاہوں گا۔

☆......☆......☆

رشمی بھائی زاویری کا تعارف

چمن بھائی وُہرا

مجھے آج اپنی تنظیم انڈین ویجی ٹیرین کانفرنس کے صدر جناب رشمی بھائی زاویری کا تعارف کراتے ہوئے انتہائی مسرت محسوس ہورہی ہے۔ محترم مہمانِ خصوصی تریویدی صاحب کی تعارفی تقریر کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کا یہ مباحثہ نہایت دلچسپ رہے گا اور ہمیں ایک اچھے مکالمے کی توقع رکھنی چاہیے۔

رشمی بھائی زاویری پیشے کے لحاظ سے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ ''رشمی زاویری اینڈ کمپنی'' کے نام سے ان کی اپنی کمپنی ہے جس کی کارپوریٹ سیکٹر میں ایک ساکھ ہے۔ وہ ایک بہت اچھے مقرر بھی ہیں۔ جہاں تک مذہبی تقریروں کا تعلق ہے، انھیں متعدد مذہبی فلسفوں پر عبور حاصل ہے۔ ایک طرف وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سوسائٹی کے ایک سرگرم رکن ہیں تو دوسری طرف وہ ''بھارت جین مہا منڈل'' کے بھی رکن ہیں۔ وہ Forum of Jain Intellectuals کے بانی صدر ہیں جو کہ جین لوگوں کے حوالے سے ایک انتہائی اہم ادارہ ہے۔

۶۳ برس کی عمر میں بھی وہ خود کو بوڑھا نہیں سمجھتے۔ ان میں بے حد توانائی ہے اور اس قسم کے مباحثوں کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ آج کا مکالمہ یقیناً ایک بہت اچھا مکالمہ ہے۔ اور رشمی بھائی زاویری کا تعارف پیش کرتے ہوئے میں مہمانِ خصوصی، دھن راج صاحب اور ذاکر نائیک صاحب کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے اس موضوع پر مناظرے کا اہتمام کیا کہ:

''کیا اصولی طور پر انسان کو غیر سبزیاتی غذا استعمال کرنی چاہیے یا نہیں؟''

مناظرے کا طریقۂ کار

ڈاکٹر محمد نائیک

متعدد لوگوں نے مجھ سے پوچھا ہے کہ یہ مناظرہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ اور انھی مقررین کے درمیان کیوں کیا جا رہا ہے؟ میں یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل رشبھ فاؤنڈیشن کے صدر جناب دھن راج سلیچا اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کے دفتر تشریف لائے اور ازراہِ مہربانی سبزی خوری کے حق میں لکھی گئی کتابوں کا ایک سیٹ ادارے کو دیا۔

ان کتابوں میں دنیا کے اہم مذاہب سے منسوب بیانات پیش کیے گئے تھے۔ ان کتابوں میں قرآن اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ انسان کے لیے لحمیاتی غذا ممنوع ہے۔

اس حوالے سے کچھ گفتگو کے بعد سلیچا صاحب نے تجویز پیش کی کہ اس موضوع کے حوالے سے پاٹکر ہال میں ایک اجتماع کا اہتمام ہونا چاہیے جس میں انڈین ویجی ٹیرین کانگرس کے صدر جناب رشمی بھائی زاویری اور اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کے صدر جناب ذاکر نائیک کے درمیان اس موضوع پر مناظرہ ہو کہ:

''انسان کے لیے گوشت خوری جائز ہے یا ناجائز؟''

اس طرح لوگ وسیع پیمانے پر دونوں حضرات کے نقطۂ ہائے نظر سن کر اپنی رائے قائم کر سکیں گے۔ دونوں مقررین نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ تقریباً پانچ روز قبل میں مسٹر زاویری سے ملا۔ انھوں نے کہا کہ اس مناظرے کے دوران دونوں مقرر صرف اپنے مذہب تک محدود رہیں اور دوسرے فریق کے مذہب پر رائے زنی نہ کریں۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک کو،

جنھیں تقابل ادیان پر عبور حاصل ہے، یہ شرط تسلیم کرنے میں تامل تھا لیکن بہر حال انھوں نے یہ شرط تسلیم کرلی۔

لہٰذا اب جہاں تک مذہبی نقطہ ہائے نظر کا تعلق ہے، مسٹر زاویری آج صرف جین مت کے نقطۂ نظر سے زیر بحث موضوع پر گفتگو کریں گے، جب تک انھیں مجبور نہ کیا جائے اور اسی طرح ڈاکٹر ذاکر نائیک بھی جہاں تک ممکن ہوگا اپنی گفتگو کو اسلامی نقطۂ نظر تک محدود رکھیں گے۔

یہ تو اس مناظرے کا پس منظر تھا، جو مختصراً آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ باقی جہاں تک طریقہ کار کا تعلق ہے، دونوں مقررین کی رضامندی سے فیصلہ کیا گیا ہے کہ:

☆ سب سے پہلے رشمی بھائی زاویری ''گوشت خوری کے جواز یا عدم جواز'' کے بارے میں ۵۰ منٹ تک گفتگو کریں گے۔

☆ بعد ازاں ڈاکٹر ذاکر نائیک بھی اسی موضوع پر پچاس منٹ تک گفتگو کریں گے۔

☆ اس کے بعد جوابات کا مرحلہ آئے گا۔ ذاکر نائیک کی گفتگو کا جواب زاویری صاحب پندرہ منٹ تک دیں گے۔

☆ ڈاکٹر ذاکر بھی زاویری صاحب کی گفتگو پر اپنا ردّعمل پندرہ منٹ تک بیان کریں گے۔ اس دوران جب مقرر کے پاس پانچ منٹ رہ جائیں گے تو میں یاد دہانی کرواؤں گا تاکہ وہ وقت مقررہ میں اپنی گفتگو مکمل کرلیں۔

آخر میں سوالات و جوابات کا مرحلہ ہوگا جس کے دوران میں حاضرین باری باری دونوں مقررین سے سوالات کرسکیں گے۔ سوالات کرنے کے لیے ہال میں مائک فراہم کیے گئے ہیں۔ تحریری سوالات کو ثانوی ترجیح دی جائے گی۔ یعنی اگر وقت بچا تو ان سوالات کے جوابات دیے جاسکیں گے بصورت دیگر نہیں۔

اب میں تقریب کے پہلے مقرر جناب رشمی بھائی زاویری سے ملتمس ہوں کہ وہ آپ کے سامنے اپنا خطاب پیش کریں۔

پہلا خطاب

رشمی بھائی زاویری

آج کے مہمانِ خصوصی جناب تریویدی صاحب، صدر رشبھ فاؤنڈیشن، شری دھن راج سلیچا صاحب، فاضل مقرر جناب ذاکر نائیک صاحب، ماہر میزبان جناب محمد نائیک صاحب، انڈین ویجی ٹیرین کانفرنس کے نائب صدر جناب چمن بھائی وُہرا صاحب، دیگر معزز مہمانانِ گرامی، میرے عزیز دوستو، بھائیو اور بہنو!

سب سے پہلے تو میں اس خلوص اور جذبے کی داد دینا چاہوں گا جس سے کام لیتے ہوئے تینوں متعلقہ تنظیموں، خصوصاً اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن نے آج کی تقریب کا اہتمام کیا۔ میں یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ اس تقریب کے انعقاد کا سہرا اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کے سر ہے۔

دوستو! آج ہمارا موضوع ہے:

''گوشت خوری انسان کے لیے جائز ہے یا ناجائز؟''

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے موضوعات کے حوالے سے کوئی بھی بیان یا کوئی بھی دلیل اضافی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے کوئی مطلق حقیقت پیش نہیں کی جاسکتی، کوئی مطلق نوعیت کا بیان نہیں دیا جا سکتا یعنی یوں کہنا ممکن نہیں کہ فلاں کام سو فی صد جائز ہے یا سو فی صد ناجائز ہے۔

لہٰذا میرے دوستو! جیسا کہ تریویدی صاحب نے بجا طور پر فرمایا ہمیں اس موضوع پر مذہب کے علاوہ دیگر پہلوؤں سے بھی غور و فکر کرنا چاہیے۔ اگرچہ یہ موضوع ایسا ہے کہ

مذہب کو کلی طور پر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا لہٰذا مذہب کا حوالہ بھی ضرور آئے گا۔ میں اس موضوع پر کہ ''گوشت خوری انسان کے لیے ممنوع ہے'' متعدد پہلوؤں سے گفتگو کرنا چاہوں گا۔ اس کے لیے مختلف وجوہات بیان کرنا چاہوں گا۔ مثال کے طور پر جغرافیائی وجوہات، تاریخی وجوہات، اخلاقی وجوہات، مذہبی وجوہات، معاشی وجوہات، ماحولیاتی وجوہات، فطری وجوہات، قدرتی وجوہات، نفسیاتی وجوہات اور سب سے بڑھ کر طبی وجوہات۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ہمارے افکار و خیالات ہمارے افعال و اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم جو کچھ سوچتے ہیں وہی کچھ کرتے ہیں اور ہماری غذا ہمارے خیالات کا تعین کرتی ہے یعنی ہماری غذا ہی ہماری رویے متعین کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا آج کا موضوع نہایت اہم ہے۔ ہمیں اپنی غذا کا انتخاب اس طرح کرنا چاہیے کہ ہمارے خیالات و افکار مثبت نوعیت کے ہوں۔ لفظ مثبت میں یہاں سب کچھ شامل ہے۔

عزیزانِ من، یقین کیجیے کہ نہ صرف مذہب بلکہ جدید سائنس بھی یہ بات ثابت کر چکی ہے کہ ہماری غذا ہمارے خیالات پر اثر انداز ہوتی ہے اور نتیجتاً ہمارے رویوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔

دوستو! ایک وقت تھا جب انسان کے پاس کوئی متبادِل موجود نہیں تھا۔ جیسا کہ تریویدی صاحب نے بجا طور پر فرمایا کہ زمین پر ایسے علاقے تھے اور اب بھی ہیں جہاں انسان کو نباتاتی غذا میسر ہی نہیں تھی۔ شدید ترین حالات کی بنا پر وہاں نباتات کا دستیاب ہونا ممکن ہی نہیں۔ لیکن اب دنیا ترقی کر چکی ہے۔ جدید ترین ذرائع نقل وحمل موجود ہیں اور کوئی بھی چیز، خوراک سمیت، دنیا کے کسی بھی حصے سے کسی بھی حصے تک بڑی آسانی سے منتقل کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا آج، جب کہ ہمارے پاس متبادل موجود ہیں، ہمیں اس مسئلے پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ ہمیں اُن تمام پہلوؤں سے جو بیان کیے گئے، غور و فکر کر کے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون سا متبادل ہمارے حق میں بہتر ہو سکتا ہے؟

دوستو! اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں اور وہ یہ کہ ''لحمیاتی غذا جائز نہیں ہے'' اور موجودہ حالات میں نہ صرف ہندوستان کے لیے بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ تمام ہندوستانی فلسفے یہی تعلیم دیتے ہیں کہ کسی جاندار کی جان نہ لی جائے۔ نہ صرف وہ جاندار جو ہمیں نظر آتے ہیں بلکہ وہ جاندار بھی جو ہوا، پانی وغیرہ میں موجود ہوتے ہیں اور ہمیں نظر نہیں آتے۔

بہر حال ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور کسی بھی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ مکمل طور پر ''ہنسا'' یا تشدد سے دور رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاویر نے فرمایا تھا:

> ''تم کم از کم حد تک جان لینے سے بچو اور خصوصاً اپنے خودغرضانہ مقاصد کے لیے یا اپنی بھوک مٹانے کے لیے قطعاً کسی کو قتل نہ کرو۔''

اور یہی وجہ ہے کہ جین مت اور دیگر ہندوستانی فلسفے، غیر نباتاتی غذا کو بالکل ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اب یہ تو مذہبی پہلو ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ نفسیاتی پہلو یعنی وہ اثرات جو لحمیاتی غذا ہمارے فکر و عمل پر مرتب کرتی ہے، بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ متعدد مصنفین کا یہی خیال ہے۔ میں وقت کی کمی کے پیش نظر یہاں کتابوں اور مصنفین کے نام پیش نہیں کروں گا لیکن میرے پاس تمام حوالے محفوظ ہیں۔

یہ کہا گیا ہے کہ نباتاتی غذا دنیا میں غیر ضروری مصائب کو کم کرنے اور ہمارے نظام فطرت کے توازن کو قائم رکھنے کا باعث بنتی ہے۔ جب میں متبادل کی بات کرتا ہوں تو آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ جتنے جانور ہیں، وہ اگر گوشت خور ہیں تو گوشت خوری ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اسی طرح جتنے سبزی خور جانور ہیں وہ کبھی گوشت خوری نہ کریں گے بلکہ نباتات تک ہی محدود رہیں گے، صرف انسان ایک ایسا جانور ہے جو بعض غلط نظریات کی وجہ سے سبزی خور بھی ہے اور گوشت خور بھی۔ جی ہاں، میں یہی کہوں گا کہ ایسا اسی وجہ سے ہے۔

لہٰذا اگر ہمیں متبادل دستیاب ہے تو پھر ہم غیر ضروری قتل کیوں کریں؟ اس نظریے کے

پیچھے اصل اصول عدم تشدد، جانوروں، مچھلیوں اور پرندوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت ہے۔

لحمیاتی غذا ''لازمی غذاؤں'' کے درجے میں نہیں آتی جب کہ نباتاتی غذا ''لازمی غذاؤں'' میں شمار ہوتی ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو بے رحمی، جلد بازی، بے صبری اور دیگر حیوانی خصائص لحمیاتی غذا کھانے کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ جانوروں کا گوشت کھانے سے جانوروں جیسی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔

چار بنیادی حیوانی خصلتیں بھوک، خوف، قابض ہونے کی خواہش اور افزائش نسل ہیں۔ یہ چاروں بنیادی خصوصیات انسان میں بھی موجود ہیں۔ مجھے اس سے قطعاً انکار نہیں، لیکن یوں ہے کہ انسان کو ایک سوچنے سمجھنے والا ذہن بھی دیا گیا ہے۔ ہم ان بنیادی خصائص سے اوپر بھی اٹھ سکتے ہیں۔ ہم اپنے فطری تقاضوں کو کنٹرول کر سکتے ہیں اور اسی صورت میں ہم حیوانات کی سطح سے اوپر اٹھ سکتے ہیں اور Super Animal یا Super Being کی سطح پر پہنچ سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر ہم میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں بالکل یکساں ہیں، فرق صرف اسی سوچنے سمجھنے والے ذہن کا ہے۔ اور گوشت خوری کے نتیجے میں یہ صلاحیت کند ہو جاتی ہے اور انسان حیوان نما ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی سائنسی وجہ یہ ہے کہ گوشت جانور کے جسم کا جزو لاینفک ہونے کی وجہ سے ''تماسک'' خصوصیات رکھتا ہے۔ تین قسم کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ تماسک، راجیاسک اور شارتک۔ ''تماسک'' خصوصیات سے مراد وحشیانہ حیوانی صفات ہیں۔ اس خصوصیت کے سبب انسان میں حیوانیت آ جاتی ہے۔ وہ ظالم ہو جاتا ہے، بے رحم ہو جاتا ہے اور اگر وہ اسی طرح مردہ جانوروں کا گوشت کھاتا رہے تو اس پر جہالت غالب آ جاتی ہے۔ جرائم کی شرح میں اضافہ ہو جاتا ہے کیوں کہ گوشت خوری کا لازمی نتیجہ تشدد کی صورت میں نکلتا ہے۔ آپ کا سوچنے سمجھنے کا عمل مسخ ہو جاتا ہے۔ گوشت خوری نہ صرف یہ کہ خود ایک مسئلہ ہے بلکہ بہت سے دیگر مسائل کا سبب بھی ہے، مثال کے طور پر جرائم میں اضافہ اور تشدد وغیرہ۔ رحم، ہمدردی اور قوت برداشت جیسی خوبیاں لحمیاتی غذا کھانے کے نتیجے میں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم

جانوروں پر ظلم کرتے رہے تو ہمارا رویہ بھی انسانی نہیں بلکہ ظالمانہ ہوتا چلا جائے گا۔ اگر حیوانی جبلت اسی طرح ہمارے اندر پختہ ہوتی چلی جائے گی تو آدمی کا کیا بنے گا؟ وہی جو ایک شاعر کہتا ہے:

آدمی کی شکل سے
اب ڈر رہا ہے آدمی
آدمی کو لوٹ کر
گھر بھر رہا ہے آدمی
کچھ سمجھ آتا نہیں
کیا کر رہا ہے آدمی؟

دوستو! ایسا اسی لیے ہوتا ہے کہ آدمی حیوان بنتا چلا جارہا ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ کہ وہ انسان ہے یا حیوان؟ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ گوشت خوری کرتا ہے۔ یہ تمام تر غذا کے اثرات ہیں۔ گوشت خوری پی ایم ایس سنڈروم کا باعث بنتی ہے۔ (Pre Postures Mood Swings.) اور اسی طرح متعدد دیگر نفسیاتی پیچیدگیوں کا امکان بھی ہوتا ہے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ گوشت خوری نفسیاتی اور روحانی زوال کا بنیادی سبب ہے۔

ہم لوگ انڈین ویجی ٹیرین کانفرنس کے ذریعے ایک بہت اہم کام کر رہے ہیں کیوں کہ ہم ایک انسان دوست دنیا کی تشکیل چاہتے ہیں جس میں انسان حیوانات کے ساتھ اور خود دیگر انسانوں کے ساتھ پرامن طریقے سے رہ سکے۔

ہم انڈین ''ویجی ٹیرین کانفرنس'' میں ایک سبزی خور کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ''سبزی خور وہ شخص ہوتا ہے جو کبھی بھی، کسی بھی صورتِ حال میں گوشت، مچھلی، پرندوں کا گوشت، انڈا یا کوئی بھی لحمیاتی غذا استعمال نہ کرے۔'' ''ویجی ٹیرین'' کا لفظ ویجی ٹیبل یعنی سبزیوں سے مشتق نہیں ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ Vegitarion کا لفظ Vagitable سے نہیں نکلا، یہ دراصل لفظ Vegetus سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ہیں مکمل، مضبوط، تازہ اور زندگی سے بھرپور۔

نارمن کانسن نے کہا تھا:

''اس شخص سے زیادہ مضبوط کون ہے جو اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرتا ہے اور یوں معاشرے کے اجتماعی ضمیر کو زندہ کرتا ہے۔''

اسی طرح البرٹ سویٹزر کا کہنا ہے:

''جب تک انسان اپنی ہمدردی کا دائرہ تمام جانداروں تک وسیع نہیں کرے گا اس وقت تک وہ خود بھی سکونِ قلب نہیں پا سکے گا۔ یہ تمام جانداروں کے لیے انسان کی ہمدردی ہی تو ہے جو اسے حقیقی معنوں میں انسان بناتی ہے۔''

دوستو! اب میں گفتگو کے ایک نہایت اہم حصے کی طرف بڑھتا ہوں اور وہ ہے ''طبی نقطۂ نظر''۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ نباتاتی غذاؤں سے ہمیں مکمل پروٹین نہیں ملتی۔ یہ سراسر غلط فہمی ہے اور اس کے سوا اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں کہ انسان کو لازماً لحمیاتی غذا استعمال کرنی چاہیے تاکہ اس کی پروٹین کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

ان غلط فہمیوں کو میں دور کروں گا۔ سب سے پہلے تو میں آپ کے سامنے کچھ طاقتور جانوروں کی مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔ مثال کے طور پر ہاتھی اور گینڈا۔ یہ دنیا کے طاقتور ترین جانور ہیں لیکن کیا یہ جانور گوشت خور ہیں؟ نہیں، بلکہ یہ جانور خالص سبزی خور ہیں۔ یہ جانور بھوک سے مر ہی کیوں نہ جائیں لیکن گوشت نہیں کھائیں گے۔ اور پھر بھی یہ طاقت ور ترین حیوان ہیں۔ اسی طرح گھوڑے کی مثال دیکھیے۔ ہم ''ہارس پاور'' کی بات کرتے ہیں۔ گھوڑا ایک انتہائی طاقت ور جانور ہے۔ اور انسان کے لیے نہایت مفید بھی۔ لیکن گھوڑا بھی ایک خالص سبزی خور جانور ہے۔ اسی طرح مویشیوں کی مثال دیکھیں۔ گائے، بیل، اور دیگر مویشی ہمارے لیے مفید ہیں لیکن یہ جانور خالص سبزی خور ہیں۔ میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ تمام جانور انتہائی طاقت ور ہیں اور اس کے باوجود انھیں کسی قسم کی لحمیاتی غذا کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اور اگر بالفرض ان جانوروں کو لحمیاتی غذا استعمال کروانے کی بے وقوفی کی جائے تو کیا ہوگا؟ آپ جانتے ہیں کہ چند سال پہلے برطانیہ میں ''میڈ کاؤ'' کی بیماری پھیل گئی تھی۔ یہ بیماری BSE کہلاتی ہے۔ یعنی (Bovine Spongephome Encypholopathy) کیا آپ جانتے ہیں کہ BSE کا آغاز کس طرح ہوا تھا؟ یہ دراصل بھیڑوں کی باقیات مویشیوں کو کھلانے کا نتیجہ تھا۔ مقصد تھا پروٹین کی اضافی مقدار فراہم کرنا۔ یہ بھیڑیں بیمار تھیں۔ اب اگر بھیڑ کا گوشت گائے کو پاگل کرنے کا سبب بن سکتا ہے تو آپ کا کیا خیال ہے انسان پر اس گوشت کے اثرات کیا ہوں گے؟ لاکھوں بے قصور گائیں محض اس وجہ سے بے رحمی کے ساتھ قتل کر دی گئیں کہ ان کے بارے میں یہ شک تھا کہ انھیں BSE ہے۔ اور اس میں ظاہر ہے کہ اُن کا ذرا سا بھی قصور نہ تھا۔ قصور تو سارا ان بے وقوفوں کا تھا جنہوں نے انھیں بھیڑوں سے حاصل کردہ پروٹین کھلانے کی کوشش کی، جو کہ گائے کے لیے ایک قطعاً غیر فطری غذا ہے۔

یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ حیوانی پروٹین ہماری فطری غذا نہیں ہے۔ اسی طرح ہم نے دیکھا کہ مشرقی ایشیا کے ممالک میں لاکھوں کی تعداد میں مرغیوں کو تلف کر دیا گیا کیوں کہ ان کو بھی کوئی بیماری لاحق ہوگئی تھی۔

واپس غذائیت کی طرف آتے ہوئے میں ڈاکٹر ڈین آرنش کا حوالہ دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک نہایت فاضلانہ کتاب تحریر کی ہے جس کا عنوان ہے:

''سرجری اور ادویات کے بغیر امراض قلب کا علاج۔''

یہ کتاب امریکہ میں سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں شامل ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا بھر میں دلچسپی لی جارہی ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس حوالے سے نباتاتی غذائیں، حیوانی غذاؤں کے مقابلے میں واقعی بہتر ہیں۔ اس نے دو طرح کی غذاؤں کے بارے میں بتایا ہے۔

ایک تو وہ غذائیں جن کی مدد سے امراضِ قلب سے بچا جاسکتا ہے، دوسری وہ

غذائیں جن کی مدد سے علاج معالجہ ممکن ہے۔

اور دونوں طرح کی غذائیں مکمل طور پر نباتاتی ہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ نباتاتی غذائیں نہ صرف امراضِ قلب کے لیے مفید ہیں بلکہ متعدد دیگر مہلک امراض سے بچاؤ میں بھی مددگار ہیں۔ جب کہ لحمیاتی غذائیں ان بیماریوں کا باعث بنتی ہیں مثال کے طور پر مختلف قسم کے کینسر، موٹاپا، بلند فشارِ خون، ذیابیطس اور پتھری وغیرہ۔

اس بات کی تائید غذائیت اور صحت کے حوالے سے ایک رپورٹ میں سرجن جنرل امریکہ نے بھی کی ہے۔ دوستو! یہاں ہمیں تھوڑی سی تفصیل میں جانا ہوگا۔ پروٹین جن اجزا سے تشکیل پاتے ہیں وہ اجزا امینوایسڈز کہلاتے ہیں، یہ امینوایسڈز لاکھوں اقسام کے ہوتے ہیں جن میں سے صرف تین ایسے ہیں جو ہمارے لیے لازمی ہیں یعنی Lysine, Mythiounine. Tryptophan, اور تینوں امینوایسڈز، لحمیاتی اور نباتاتی دونوں طرح کی غذاؤں میں موجود ہوتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب یہ تین ضروری اجزا حاصل کرنے کے لیے ہم لحمیاتی غذا استعمال کرتے ہیں تو متعدد غیر ضروری اجزا بھی ہمارے جسم میں پہنچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کولسٹرول اور Saturated Fats اور میرے دوستو! یہ دونوں چیزیں انسانی زندگی کے لیے سب سے زیادہ مضر ہیں۔

اب ہم ایک ایسے نکتے کی طرف آتے ہیں جو پوری دنیا میں اٹھایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ نباتاتی غذاؤں سے پروٹین کی درکار مقدار فراہم نہیں ہوتی۔ لہٰذا لحمیاتی غذاؤں کا استعمال ضروری ہے تاکہ مکمل مقدار میں پروٹین کی تیاری کے لیے درکار امینوایسڈز فراہم ہو سکیں۔

یہ ایک غلط فہمی ہے۔ اجناس اور دالوں پر مشتمل غذا مکمل پروٹین فراہم کرنے کے لیے کافی ہے۔ دالوں اور اجناس مثلاً گندم، چاول وغیرہ سے ملنے والی پروٹین گوشت اور انڈے سے ملنے والی پروٹین سے مختلف نہیں ہوتی۔ مزید یہ کولسٹرول وغیرہ سے پاک ہوتی ہے۔ ایک غذائی تنظیم کا کہنا ہے کہ سبزی خوری پر مبنی طرزِ زندگی اور متعدد خطرناک، مہلک

بیماریوں سے نجات میں ایک مثبت رشتہ موجود ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نباتاتی غذا زیادہ صحت بخش اور غذائیت سے بھرپور ہوتی ہے۔ نباتاتی غذائیں کولسٹرول سے مکمل طور پر پاک ہوتی ہیں۔ کولسٹرول صرف حیوانی غذاؤں مثلاً گوشت، مرغی، مچھلی اور دودھ سے بننے والی غذاؤں میں پایا جاتا ہے۔ لحمیاتی غذاؤں میں Saturated Fat کی مقدار بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جنھیں ہمارا جگر کولسٹرول میں تبدیل کر دیتا ہے۔ آپ کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ہمارے جسم کو کولسٹرول کی ضرورت تو ہوتی ہے لیکن اس کے لیے ہمیں کولسٹرول سے بھرپور غذائیں کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہمارے جسم کا نظام حیرت انگیز ہے۔ یہ ایک ایسا کیمیائی کارخانہ ہے جو خود اپنی ضرورت کے مطابق پروٹین اور کولسٹرول تیار کر سکتا ہے۔ ہمارے خون میں موجود تین چوتھائی کولسٹرول ہمارے جسم کا تیار کردہ ہوتا ہے۔ کولسٹرول کی ضرورت سے زیادہ مقدار امراض قلب کا باعث بنتی ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی متعدد بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ مختلف طبی جرائد سے میں نے یہ فہرست تیار کی ہے:

(A) epilepsy (B) infected flesh (C) Kidney Disease.

(D) excessive proteins (E) Uric Acid.

مندرجہ بالا بیماریوں کا بنیادی سبب لحمیاتی غذا ہوتی ہے۔ یورک ایسڈ کی زیادتی متعدد امراض کا باعث ہوتی ہے۔ اور یورک ایسڈ کی زیادتی کا باعث لحمیاتی غذا ہوتی ہے۔ اسی طرح نظام مدافعت بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔

امریکہ کے ڈاکٹر دیپک چوپڑا کا کہنا ہے کہ اگر ہم اپنی غذا کا خیال رکھیں تو بآسانی سو سال تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف آپ دیکھیں کہ برفانی علاقوں میں جہاں نباتاتی غذا دستیاب نہیں ہے۔ وہاں اوسط عمر کیا ہے؟ مثال کے طور پر اسکیموز، جو برفانی علاقوں میں رہتے ہیں اور نباتاتی غذاؤں کی عدم دستیابی کے سبب انھیں مجبوراً لحمیاتی غذائیں ہی استعمال کرنی پڑتی ہیں، ان کی اوسط عمر صرف ۳۰ سال ہے۔ تمام لحمیاتی غذائیں حیاتین

C اور A سے خالی ہوتی ہیں کیوں کہ قدرتی طور پر یہ وٹامن صرف نباتاتی غذاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ انڈوں میں پائے جانے والے جراثیم بھی متعدد بیماریوں کا باعث بن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر؛

(A) Exhema. ....(B) Scabies. ....(C) Leprosy.

اب میں آپ کے سامنے چند سائنسی حقائق پیش کرنا چاہوں گا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ طبی تحقیقات کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ گوشت خوروں کے مقابلے میں، سبزی خور لوگوں میں امراض قلب کی شرح بہت کم ہے۔

دوسری بات یہ کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی کوئی ایسا ''فول پروف'' نظام موجود نہیں ہے جس کے ذریعے ذبح کیے جانے سے قبل ہر جانور کا مکمل طبی معائنہ کیا جا سکے۔ یوں ان جانوروں کو لاحق بیماریاں، ان کے ذریعے گوشت کھانے والوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

دوستو! آپ جانتے ہیں کہ انسانوں کی طرح جانور بھی بیمار ہوتے ہیں اور ان کے اجسام میں خطرناک جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ ان جانوروں کو مارنے کے بعد جب ان کا گوشت بطور خوراک استعمال کیا جاتا ہے تو یہ جراثیم انسانی جسم میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور ان کے ذریعے وہ بیماری بھی جو ان مردہ اجسام میں موجود ہوتی ہے، انسانی جسم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ کیا آپ کے علم میں ہے کہ زہر خورانی یعنی Food Poisoning کے نوے فی صد واقعات گوشت خوروں میں ہوتے ہیں۔

اگر آپ کو کبھی کسی سلاٹر ہاؤس میں جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ کے علم میں ہوگا کہ جب جانوروں یا پرندوں کو ذبح کرنے کے لیے مذبح خانے یعنی سلاٹر ہاؤس میں لایا جاتا ہے تو یہ جانور انتہائی خوفزدہ ہوتے ہیں۔ خوف، ڈر، دکھ اور تکلیف کی یہ شدت ان کے جسمانی نظام پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ان جانوروں کو جب علم ہوتا ہے کہ وہ مرنے والے ہیں تو ان کے جسم میں Adreline ہارمون خارج ہو کر خون اور گوشت کا حصہ بن

جاتا ہے۔ اور پھر یہ ہوتا ہے کہ خوف، مایوسی، غصہ اور دکھ جیسے تمام منفی جذبات بھی اس گوشت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور جب کوئی شخص یہ گوشت کھاتا ہے تو اس میں بھی منتقل ہو جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ گوشت کھانے والا، جانوروں سے زیادہ مشابہ ہو جاتا ہے اور انسانوں سے کم۔ اب میں اس غلط فہمی کی طرف آتا ہوں کہ: بڑھتے ہوئے بچوں کے لیے انڈے ضروری ہیں کیونکہ ان میں پروٹین ہوتی ہے۔'' جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ضرورت سے زیادہ پروٹین فائدہ مند نہیں بلکہ الٹا نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ دالوں وغیرہ میں پائی جانے والی پروٹین نسبتاً زیادہ اور بہتر ہوتی ہے بہ نسبت اس پروٹین کے جو حیوانی ذرائع سے حاصل کی جائے۔

مثال کے طور پر انڈے کو دیکھیے۔ عام طور پر ایک انڈے کا وزن تقریباً سو گرام ہوتا ہے اور اس میں ایک سو ستر (۱۷۰) کیلوریز پائی جاتی ہیں۔ انڈے میں تقریباً ۱۳ء۱۶ فی صد پروٹین ہوتی ہے جب کہ دال میں تقریباً ۲۴ فی صد پروٹین ہوتی ہے۔ یعنی انڈے کے مقابلے میں کہیں زیادہ۔ اسی طرح انڈے میں تقریباً ۱۳ء۳ فی صد Saturated Fats ہوتے ہیں جب کہ دالوں میں اس کے مقابلے میں، نہ ہونے کے برابر یعنی زیادہ سے زیادہ ایک فی صد ہوتے ہیں۔

انڈے میں ساڑھے چار سو سے لے کر پانچ سو ملی گرام تک کولسٹرول ہوتا ہے۔ انڈے میں Milionine نام کا ایک امینو ایسڈ ہوتا ہے جو کہ وٹامن بی کو تلف کر دیتا ہے۔ اسی طرح بڑی مقدار میں نمک بھی ہوتا ہے۔ یہ تمام اشیا ایک انڈے میں موجود ہوتی ہیں۔ اور جب کوئی انڈا کھاتا ہے تو یہ سب چیزیں اس کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ Saturated Fats اور کولسٹرول اور ضرورت سے زیادہ پروٹین اس کے جسم کو متاثر کرتے ہیں، انڈے میں نہ تو کاربوہائیڈریٹ ہوتے ہیں اور نہ ہی ریشے دار اجزا۔

دوستو! طب جدید ہمیں بتاتی ہے کہ غذا کے ہضم ہونے کے لیے ہماری خوراک میں

ریشے دار اجزا یعنی Fibre کا ہونا بہت ضروری ہے اور فائبر صرف نباتاتی غذاؤں میں ہی پائے جاتے ہیں۔لحمیاتی غذا میں یہ موجود نہیں ہوتے۔

اب ہم ان کے معاشی پہلو کی جانب آتے ہیں۔اس وقت ہم صرف انڈے کا تقابل کر رہے ہیں۔انڈے سے حاصل کردہ ایک گرام پروٹین دال، گندم یا سویا بین سے حاصل کردہ ایک گرام پروٹین کے مقابلے میں چار پانچ گنا مہنگی پڑتی ہے۔اسی طرح انڈے سے حاصل ہونے والی ۱۰۰ کیلوریز کی بہ نسبت دالوں سے حاصل ہونے والی سو کیلوریز تقریباً دس گنا سستی ہوں گی۔ اس طرح دالیں اور اجناس وغیرہ ایک طرف تو سستے پڑتے ہیں اور دوسری طرف ان کے ذریعے ہمیں متعدد دیگر ضروری غذائی اجزا بھی حاصل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر حیاتین، نمکیات اور نباتاتی ریشے وغیرہ۔

اب ہم آتے ہیں ''پولٹری فارمنگ'' کی جانب۔اسے کہا تو مرغیوں کی فارمنگ جاتا ہے لیکن میں آپ سب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ مکمل طور پر مرغیوں کی فیکٹری ہوتی ہے۔ جس طریقے سے ان مرغیوں کو رکھا جاتا ہے، انھیں کھانے پینے کے لیے ایک دوسرے کے اوپر چڑھنا پڑتا ہے کیونکہ جگہ ہی اتنی تنگ ہوتی ہے۔

خود مرغی خانے کے کاروبار سے وابستہ لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ ہماری پیداوار ہے اور یہ ہماری فیکٹری ہے۔مرغیاں ہماری پراڈکٹ ہیں اور بس۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ زندہ ہیں یا بے جان۔ان لوگوں میں کسی قسم کی ہمدردی یا رحم دلی نہیں پائی جاتی۔اسی وجہ سے پرندوں سے ان کا سلوک اس طرح کا ہوتا ہے۔پرندوں کو سامان کی طرح رکھا جاتا ہے۔انھیں غیر فطری قسم کی غذا دی جاتی ہے اور ایسی ادویات دی جاتی ہیں جو انسانی صحت کے لیے مضر ہیں۔اس کا مقصد ان پرندوں میں میٹابولزم کے عمل کو تیز کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ انڈے دیں۔مرغی خانے والوں کا واحد مقصد اپنے منافع میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔اور اُن کی اِن حرکتوں کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ مرغیاں قبل از وقت مر جاتی ہیں۔

اس قسم کے انڈے ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے مضر ہوتے ہیں۔ بچوں کے لیے تو انڈا زہر ہوتا ہے۔ انڈا ایک ایسی چیز ہے جو بہت جلد خراب ہو جاتی ہے۔ خراب ہونے سے بچانے کے لیے اسے ڈیپ فریزر میں رکھنا ضروری ہے لیکن انڈوں کی مارکیٹنگ کے دوران اس طرح نہیں ہوتا، لہٰذا ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ خرابی تو ضرور ہوتی ہوگی۔ اسی طرح انڈے کو لحمیاتی غذا نہ قرار دینا بھی ایک غلط فہمی ہے۔ انڈا نباتاتی غذا نہیں ہو سکتا بلکہ یہ صرف اور صرف لحمیاتی غذا ہے۔ کیونکہ یہ حیوانی ذرائع سے حاصل کردہ غذا ہے لہٰذا اس کو سبزیوں میں شامل کرنا صریحاً دھوکا ہے۔

دوستو! اب ہم آتے ہیں اقتصادی پہلو کی جانب۔ اس سلسلے میں، میں نے مختلف رسائل و جراید کا مطالعہ کیا ہے۔ طبی جراید بھی دیکھے ہیں اور سب سے بڑھ کر حکومت ہندوستان کے شعبۂ شماریات کی رپورٹوں اور اسی طرح حکومت امریکہ اور حکومت برطانیہ کی رپورٹوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن میں ان رپورٹوں سے اقتباسات اپنی گفتگو میں شامل نہیں کروں گا، بلکہ آپ کے سامنے صرف خلاصہ پیش کروں گا۔

ایک برطانوی سروے سے پتہ چلتا ہے کہ گوشت حاصل کرنے کے لیے پالے جانے والے جانوروں کا چارہ فراہم کرنے کے لیے جس قدر زمین کاشت کرنی پڑتی ہے اس سے چودہ گنا کم زمین میں سبزیاں کاشت کر کے اتنے ہی افراد کو براہِ راست غذا فراہم کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ آپ پہلے چارہ کاشت کرتے ہیں، وہ چارہ جانور کو کھلا کھلا کر اسے بڑا کرتے ہیں اور پھر گوشت حاصل کرنے کے لیے اس جانور کو مار دیتے ہیں۔ اور اس طرح آپ کو لحمیاتی خوراک حاصل ہوتی ہے۔

اگر اسی رقبے پر براہِ راست سبزیاں اور دالیں کاشت کی جائیں تو اتنی ہی زمین کئی گنا زیادہ خاندانوں کی غذائی ضروریات کے لیے کافی ہو جائے گی۔ جب کہ بطورِ چراگاہ اس کی افادیت کہیں کم ہوگی۔

مجھے اعداد و شمار فراہم کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ دس ایکڑ زمین دس انسانوں

یا دس جانوروں کی سال بھر کی خوراک کے لیے کافی ہے لیکن دس جانور، دس انسانوں کی سال بھر کی خوراک کے لیے قطعاً ناکافی ہیں بلکہ دس بھیڑوں یا بکریوں کا گوشت ایک انسان کی سال بھر کی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں۔

آپ سب جانتے ہیں کہ زیادہ چارہ پیدا کرنے کے لیے کیمیائی کھادیں استعمال کرنی پڑتی ہیں اور کروڑوں روپے سالانہ ان کھادوں کی درآمد پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جانوروں کے فضلے سے حاصل ہونے والی کھاد انتہائی سستی بھی پڑتی ہے اور انسانوں کے لیے خطرناک بھی نہیں ہوتی۔ ہم بیوقوفوں کی طرح ان جانوروں کو اپنی غذا کے لیے ختم کر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ان کا فضلہ کھاد کے طور پر استعمال کیا جائے اور اس طرح سبزیاں اگائی جائیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ایک کلو گوشت حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک جانور کو سولہ کلو چارہ کھلانا پڑتا ہے۔ اس طرح گوشت حاصل کرنے کے لیے پالے جانے والے جانوروں کی خوراک پوری کرنے کے لیے اتنا غلہ اور چارہ لگ جاتا ہے جو بصورتِ دیگر زیادہ لوگوں کی غذائی ضروریات پوری کر سکتا تھا۔

غذائی اجناس کی پیداوار کے لیے ہی بلکہ چراگاہوں کے طور پر بھی ہمیں قابل کاشت زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ میساچوسٹس کے پروفیسر ول بینگ اپنی کتاب The Human Onkogene میں بتاتے ہیں کہ لحمیاتی غذا سے ایک کیلوری حاصل کرنے کے لیے آپ کو نباتاتی غذا کی سات کیلوریز خرچ کرنا پڑتی ہیں۔ اسی طرح پروفیسر صاحب کے مطالعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانور کے چرنے کے لیے جتنی جگہ درکار ہوتی ہے، وہاں پانچ خاندانوں کے لیے کافی خوراک کاشت کی جا سکتی ہے۔

دوستو! میں آپ کے ذہنوں پر اعداد و شمار کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ خلاصہ اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ گوشت خوری کے مقابلے میں سبزی خوری حصول غذا کا انتہائی ارزاں ذریعہ ہے۔ اب ہم اس معاملے کو ایک اور پہلو سے دیکھتے ہیں یعنی ماحولیات کے نقطۂ نظر

ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ گوشت کے لیے نسبتاً زیادہ رقبے، زیادہ پانی اور زیادہ اجناس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح یہ عمل ہمارے ماحولیاتی توازن کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ وسائل ہمیشہ محدود ہوتے ہیں۔ اور ہمارا کام درحقیقت یہ ہے کہ ان وسائل کا بہترین استعمال کریں۔ یا تو ہم غذائی اجناس اگائیں اور یا گوشت حاصل کرنے کے لیے مویشی پالیں۔

اسی طرح اگر آپ مذبح خانوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ یہ کس طرح کام کرتے ہیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ صفائی ستھرائی کا معاملہ ناقابل بیان حد تک خراب ہوتا ہے۔ مذبح خانوں کے حالات خوف ناک حد تک غیر معیاری ہوتے ہیں اور ایسا پوری دنیا میں ہے۔ ابھی کل ہی میں نے انٹرنیٹ پر امریکہ اور فرانس جیسے ترقی یافتہ ممالک کے بارے میں ایک رپورٹ پڑھی ہے اور اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ وہاں بھی مذبح خانوں کی صورتِ حال مکمل طور پر حفظانِ صحت کے اصولوں کے منافی ہے۔

میرے پاس حکومت امریکہ کے Accountability Project کا شائع کردہ قرطاسِ ابیض موجود ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ مذبح خانوں سے آنے والا گوشت امریکی خاندانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ ذبح کرنے کا عمل، گوشت کو پروسیس کرنے کے پلانٹ، گوشت کو منتقل کرنے کا طریقۂ کار اور فروخت کرنے کا عمل حفظانِ صحت کے اصولوں کے منافی ہونے کی وجہ سے یہ گوشت انسانی استعمال کے قابل نہیں ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ کیجیے گا کہ خوبصورت ڈبوں میں بند درآمد شدہ گوشت حفظانِ صحت کے اُصولوں کے مطابق ہوگا۔ نہیں، میرے عزیز دوستو! یہ گوشت بھی انھی مذبح خانوں سے حاصل ہوتا ہے جہاں طبی حوالے سے وہی صورتِ حال ہے جو میں آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ لوگ تو گوشت کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے اس میں کچھ کیمیائی اجزا بھی شامل کر دیتے ہیں۔

ماحولیات کے بارے آگاہی نے بھی ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بہت

سے لوگوں کو سبزی خوری کی طرف راغب کیا ہے۔ اب یہاں ''ماحول دوست نباتاتی غذائیں'' دستیاب ہیں۔ پوری دنیا میں اس قسم کی خوراک کا زور ہے کیونکہ یہ غذائیں صحت بخش بھی ہیں اور ماحول دوست بھی۔ ''گرین فیکٹریوں'' یا ''گلاس ہاؤسز'' میں کاشت کی جانے والی سبزیاں اور پھل اب ان ممالک کو برآمد کیے جارہے ہیں جہاں موسمی حالات کے باعث یہ چیزیں کاشت کرنا ممکن نہیں۔ اس طرح ذرائع نقل وحمل کی ترقی نے بھی غذا کے معاملے میں متبادل اشیا فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

درحقیقت ہندوستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں تو حکومت اور غیر سرکاری تنظیموں کو چاہیے کہ نباتاتی غذاؤں کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کریں تاکہ انھیں درآمد کر کے ملکی معیشت کو ترقی دی جاسکے۔

اب ذرا آلودگی کی طرف آئیں۔ قانونی اور غیر قانونی مذبح خانے بہت زیادہ آلودگی پھیلانے کا باعث بنتے ہیں۔ جدید مذبح خانے بھی جانوروں کی باقیات سرعام پھینک دیتے ہیں۔ جانوروں کے ڈھانچے، خون اور ناقابل بیان بدبو، ظاہر ہے کہ، آلودگی میں اضافے ہی کا باعث بنے گی، جو کہ ماحولیاتی توازن کو خراب کرے گی۔ انسانی فلاح کے لیے حیوانات کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ گائیں، بھیڑیں، مچھلیاں، مینڈک، زندہ حالت میں ہمارے لیے زیادہ مفید ہیں بہ نسبت مردہ حالت کے۔ تو پھر ہم اپنے ان دوستوں اور مددگاروں کو قتل کیوں کریں؟ محض اپنی حس ذائقہ کو تسکین دینے کے لیے ہمیں اپنے اِن دوستوں کے ساتھ اس قدر ناانصافی نہیں کرنی چاہیے۔ اور یہ بچارے تو ہم سے کم تر مخلوق ہیں جنھیں ہم جانور اور پرندے کہتے ہیں۔

اس معاملے کو ایک اور پہلو سے دیکھیں، جانور ہمیں سستی اور محفوظ کھاد فراہم کرتے ہیں۔ یہ کھاد کیمیائی کھادوں کے مقابلے میں قدرتی بھی ہوتی ہے اور صحت کے لیے نقصان دہ بھی نہیں ہوتی۔ کیمیائی کھادیں ہمیں بہت مہنگی بھی پڑتی ہیں۔ میں نے پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا تھا، میں دوبارہ اسی معاشی پہلو کی طرف آرہا ہوں۔ ہم کھادوں کے لیے

انتہائی گراں قیمت کیمیکل درآمد کر رہے ہیں جو کہ ہمارے قومی خزانے پر بوجھ ہے۔

دوستو! اب میں آپ کے سامنے مختصراً، جغرافیائی اور تاریخی پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا کہ مثال کے طور پر اسکیموز کے پاس پہلے گوشت کا کوئی متبادل موجود نہیں تھا۔ وہ ایسے خشک اور لق ودق علاقے میں موجود ہیں جہاں میلوں تک صحرا پھیلا ہوا ہے اور نباتات موجود نہیں ہیں۔ ان علاقوں میں رہنے والوں کے لیے گوشت خوری ایک جغرافیائی مجبوری تھی۔

لیکن اب جب ہمارے پاس ایک بہتر متبادل موجود ہے جو زیادہ صحت بخش ہے، جو زیادہ ارزاں ہے، جو ماحول کے لیے بہتر ہے تو پھر اس قسم کی غذا کیوں نہ استعمال کی جائے۔

اور دوستو! اب میں اپنی گفتگو کے سب سے اہم نکتے کی طرف آتا ہوں جس سے میرا موقف بلاشک وشبہ ثابت ہو جائے گا۔ اور وہ نکتہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر ہی سبزی خور ہے۔ میں اس حوالے سے ۱۴ نکات پیش کر سکتا ہوں، جن کے ذریعے ہمارے جسمانی نظام کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر تریویدی نے نوک دار دانتوں اور چپٹے دانتوں کے حوالے سے اس موضوع پر گفتگو کا آغاز کر دیا تھا۔ سب سے پہلے ہم سبزی خور جانوروں کے دانتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان جانوروں کے دانت چھوٹے، چپٹے اور ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ جب کہ گوشت خور جانوروں کے دانت نوک دار، لمبے اور تکونی شکل کے ہوتے ہیں۔ دو یا چار نوکیلے دانت جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کتے کے دانتوں کی طرح ہیں وہ گوشت کے لیے نہیں ہیں۔ اس قسم کے دانت بندروں اور لنگوروں کے بھی ہوتے ہیں۔ یہ دانت پھل توڑنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔

اسی طرح نوک دار پنجوں کا معاملہ ہے۔ سبزی خور جانوروں کے پنجے میں نوک دار ناخن ہوتے ہیں۔ یہ پنجے صرف پھل کھانے کے ہی کام آ سکتے ہیں جب کہ گوشت خور جانوروں کے پنجوں میں تیز نوکیلے ناخن ہوتے ہیں جو شکار کی چیر پھاڑ میں مدد دیتے ہیں۔

جبڑے کی ساخت اور چبانے کا طریقہ کار بھی گوشت خور اور سبزی خور جانوروں میں مختلف ہوتا ہے۔ سبزی خور جانوروں کے جبڑے اوپر نیچے، دائیں بائیں ہر طرف حرکت کر سکتے ہیں۔ یہ جانور اپنی غذا کو چبانے کے بعد نگلتے ہیں جب کہ گوشت خور جانوروں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ ان کا صرف نچلا جبڑا اوپر نیچے حرکت کرتا ہے۔ یہ جانور اپنی غذا کو چبائے بغیر ہی نگل لیتے ہیں۔

دوستو! اسی طرح سبزی خور جانوروں اور گوشت خور جانوروں کا تقابل کرتے چلے جائیں۔ میرے پڑھے، لکھے دوست خود دیکھ سکتے ہیں کہ انسان کا جسم اور جسمانی اعضا، کس کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتے ہیں؟

زبان کا معاملہ یہ ہے کہ سبزی خور جانوروں کی زبان ہموار جب کہ گوشت خوروں کی زبان کھردری ہوتی ہے۔ ایک نہایت اہم چیز پانی پینے کا طریقہ ہے۔ ڈاکٹر پارس دلال نے مجھے بتایا کہ سبزی خور جانور اپنے ہونٹوں کی مدد سے پانی پیتے ہیں جب کہ گوشت خور جانور زبان کی مدد سے پانی منہ میں لے کر جاتے ہیں۔ ہم انسان کبھی بھی زبان کی مدد سے پانی منہ میں نہیں لے کر جاتے۔

اب ہم آنتوں کی لمبائی کی جانب آتے ہیں۔ سبزی خور جانوروں کی آنتوں کی لمبائی ان کے جسم کی لمبائی سے تقریباً چار گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ آنتیں لحمیاتی غذا کو جلد جسم میں سے نہیں نکال سکتیں۔ جب کہ گوشت خور جانوروں کی آنتیں نسبتاً چھوٹی ہوتی ہیں جن کی طوالت تقریباً جسم کی لمبائی کے برابر ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ لحمیاتی غذا کو جلد از جلد، یعنی خراب ہونے سے پیشتر ہی جسم سے باہر نکال دیتی ہیں۔

سبزی خور جانوروں میں جگر اور گردے بھی نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں لہٰذا یہ ضرورت سے زیادہ فاضل مادوں کی بروقت صفائی نہیں کر سکتے۔ جب کہ گوشت خور حیوانات میں جگر اور گردوں کا سائز نسبتاً زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ زیادہ فاضل مادوں کو بروقت خارج کر سکتے ہیں۔

نظامِ ہضم بھی گوشت خور اور سبزی خور جانوروں میں یکساں نہیں ہوتا۔ سبزی خور جانوروں کے نظامِ ہضم میں تیزاب کم ہوتا ہے لہٰذا لحمیاتی غذا آسانی سے ہضم نہیں ہوسکتی۔ جب کہ گوشت خور جانوروں کے نظامِ ہضم میں تیزابیت بہت زیادہ ہوتی ہے لہٰذا وہ آسانی سے گوشت کو ہضم کرسکتے ہیں۔ انسانی نظامِ ہضم کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا۔

سبزی خور جانوروں کا لعابِ دہن ہمیشہ Alkaline ہوتا ہے اور اس میں Vitaline نامی ایک جزو پایا جاتا ہے جو کاربوہائیڈریٹ کو ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جب کہ تمام گوشت خور جانوروں کا لعابِ دہن تیزابی ہوتا ہے۔

خون کی نوعیت میں بھی فرق موجود ہے۔ انسان اور دیگر تمام سبزی خور جانوروں کے خون کا PH ہمیشہ Alkaline ہوتا ہے جب کہ گوشت خور جانوروں کا PH ہمیشہ Acidic ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی خون میں پائے جانے والے Lipoproteins کی ساخت بھی سبزی خور حیوانات کے خون میں پائے جانے والے Lipoproteins کے مشابہ ہوتی ہے، گوشت خور جانوروں کے خون میں پائے جانے والے Lipoproteins کی ساخت کے مشابہ نہیں ہوتی۔

سبزی خور جانوروں کے حواس خصوصاً بصارت کی حس کمزور ہوتی ہے جب کہ گوشت خور جانوروں کی حسیات نہایت تیز ہوتی ہیں۔ سبزی خور جانوروں کے مقابلے میں گوشت خور جانوروں کی آواز نہایت خوفناک ہوتی ہے۔ انسانی آواز بھی خوفناک نہیں ہے بشرطیکہ ہم خود اسے خوفناک بنانے کی کوشش نہ کریں۔ جب کہ اس کے مقابلے میں شیر اور چیتے وغیرہ کی آواز کرخت اور ڈراؤنی ہوتی ہے۔

سبزی خور جانوروں کے بچے پیدائش کے وقت سے ہی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یعنی نوزائیدہ بچوں کی بصارت بھی صحیح کام کرتی ہے جب کہ گوشت خور جانوروں کے بچے پیدائش کے بعد تقریباً ایک ہفتے تک بصارت سے محروم رہتے ہیں۔

دوستو! اب آپ خود تقابل کرسکتے ہیں اور فیصلہ کرسکتے ہیں کہ انسان فطری طور پر

سبزی خور ہے یا گوشت خور؟

اب میں آپ کو کچھ عظیم انسانوں کے بارے میں بتاؤں گا جو گوشت خوری کے خلاف تھے یعنی لحمیاتی غذا کی مذمت کرتے تھے۔

اگر ہم تاریخ عالم کا جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ بہت سے عظیم مفکر، فلسفی، آئن سٹائن جیسے سائنسدان، لیونارڈو ڈاونچی جیسے فنکار، ملٹن، پوپ اور شیلے جیسے شاعر، جارج برنارڈ شا جیسے ادیب اور متعدد مذہبی علما ایسے ہیں جو کہ خالص سبزی خور تھے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ ریاضی دان فیثا غورث، پلوٹارک، نیوٹن اور آئن سٹائن جیسے سائنسدان، ڈاکٹر اینے بسنت، ڈاکٹر والٹر والش، جارج برنارڈ شا، یونانی فلسفی سقراط اور ارسطو، یہ سب روشن خیال لوگ تھے۔ اور اس کے باوجود ان لوگوں کا کہنا یہی ہے کہ:

”خوش بخت ہیں وہ لوگ جن میں رواداری، ہمدردی، محبت اور عدم تشدد جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور جو گوشت خور نہیں ہیں۔“

دوستو میں یہاں جارج برنارڈ شا کا ایک معروف مقولہ بھی دہرانا چاہوں گا۔ اس نے کہا تھا:

”ہم مقتول جانوروں کی زندہ قبریں ہیں۔“

میں یہ بات پھر دہرانا چاہتا ہوں، سنیے:

”ہم مقتول جانوروں کی زندہ قبریں ہیں۔“

وہ جانور جنھیں ہم نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے ذبح کر ڈالا۔ کوؤں کی طرح ہم گوشت کھاتے ہیں اور جانوروں کے دکھ درد سے لاپروا رہتے ہیں۔ برنارڈ شا ایک دفعہ شدید بیمار ہوا۔ ڈاکٹروں نے اسے گوشت کی یخنی پینے کا مشورہ دیا۔ برنارڈ شا نے کہا:...... ”میں گوشت خوری پر موت کو ترجیح دوں گا۔“ ...... یقین کیجیے دوستو کہ برنارڈ شا صحت یاب ہو گیا اور وہ ڈاکٹر سبزی خور بن گیا۔

اسی طرح ایک دفعہ مہاتما گاندھی کا بیٹا شدید بیمار ہوا۔ اسے بھی یخنی پلانے کا مشورہ

دیا گیا لیکن مہاتما گاندھی نے انکار کر دیا اور اس کے باوجود ان کا بیٹا صحت یاب ہو گیا۔ میں آپ کو یہ باتیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ترویدی صاحب نے کہا تھا کہ جو کچھ ہمیں ڈاکٹر بتائیں ہمیں قبول کر لینا چاہیے۔ بالکل درست بات ہے لیکن جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا بہت سی باتیں اضافی ہوتی ہیں یعنی انھیں دوسری باتوں کی نسبت سے دیکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر اگر کوئی بات کرے گا تو وہ صرف طبی نقطۂ نگاہ ہی کو سامنے رکھے گا۔ لیکن دوستو ہم اس دنیا میں صرف زندہ رہنے کے لیے نہیں آئے۔ اگرچہ ہماری بقا بھی اہم ہے لیکن یہ بقا دوسروں کی زندگی کی قیمت پر نہیں ہونی چاہیے۔

دوستو! آپ کا بہت شکریہ۔ اکیسویں صدی یقیناً سبزی خوروں کی صدی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنا نقطہ نظر آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں، میں یہاں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو باقاعدہ گوشت خور ہیں، ان کا تعلق بالعموم کسی ایسے معاشرے، خاندان یا عقیدے سے ہوتا ہے جس میں گوشت خوری کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ خود بھی اس مسئلے پر غور و فکر ہی نہیں کرتے۔ جیسا کہ ترویدی صاحب نے کہا، آیئے ہم آج اپنے دماغ سے کام لیں۔ مذہبی لحاظ سے، سماجی لحاظ سے بھی۔ میں نے تو دیکھا ہے کہ ہمارے بعض جین دوست بھی جب تقریبات میں جاتے ہیں تو سماجی تقاضے پورے کرنے کے لیے گوشت کھانے لگتے ہیں۔ میں اس بات کو قطعاً پسند نہیں کرتا لیکن ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ ہر کسی نے خود کرنا ہے کہ وہ سبزی خور رہنا چاہتا ہے یا گوشت خور۔ لہٰذا اس معاملے پر غور و فکر کریں۔ ہر پہلو سے جائزہ لیں اور پھر فیصلہ کریں کہ گوشت خوری جائز ہے یا ناجائز؟ حفظانِ صحت کے پہلو سے، قومی پہلو سے، سماجی پہلو سے، ماحولیاتی پہلو سے اور سب سے بڑھ کر ہمدردی کے پہلو سے دیکھیں۔ دوستو! تمام جاندار فطرت کی تخلیق ہیں۔ انسان اور دیگر حیوانات برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسری مخلوق کو قتل کر دے، صرف اس لیے کہ اپنی اشتہا کی تسکین کر سکے۔

آپ کا بہت بہت شکریہ

دوسرا خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن. اَمَّا بَعْدُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ٥ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ٥

[المائدہ: ۱]

محترم جناب رشمی بھائی زادیری، تریویدی صاحب، ڈاکٹر محمد نائیک، دیگر محترم شخصیات، میرے بزرگو، بھائیو اور بہنو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ آپ سب پر رحم فرمائے۔ ہمارے آج کے مباحثے کا عنوان ہے:

کیا انسان کے لیے گوشت خوری جائز ہے یا ناجائز؟

بحث یہ نہیں ہو رہی کہ سبزی خوری بہتر ہے یا گوشت خوری، یا کون سی خوراک صحت کے لیے زیادہ اچھی ہے۔ اگر میں یہ ثابت کردوں کہ ''سیب''، ''آم'' کے مقابلے میں بہتر ہے تو اس سے آم کھانا ممنوع یا ناجائز نہیں ہو جائے گا۔ میرے خیال میں تو اتنی بات بھی اس مباحثے کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے لیکن مجھے جواب تو دینا ہے۔ ''نان ویجی ٹیرین'' یا ''گوشت خور'' سے مراد وہ شخص ہے جو حیوانی ذرائع سے حاصل کردہ خوراک استعمال کرتا

ہے۔ نہ کہ وہ شخص جو سبزیاں اور پھل بطور غذا استعمال نہیں کرتا۔

یہ بات آپ سب پر واضح ہو جانی چاہیے۔ ایک نسبتاً زیادہ تکنیکی اور سائنسی اصطلاح ہے Omnivorous یا ہمہ خور۔ یعنی ایسا شخص جو ہر قسم کی غذا استعمال کرتا ہے خصوصاً لحمیاتی اور نباتاتی غذائیں۔

جیسا کہ رشمی بھائی زاویری صاحب نے بجا طور پر کہا Vegitarian کا لفظ Vegitables سے نہیں بلکہ Vegitus سے نکلا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ''زندگی اور حیات سے بھرپور''۔ لیکن انھوں نے بہتر وضاحت نہیں کی۔ ہم اس حوالے سے مزید گفتگو کر سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ سبزی خوروں کی بھی متعدد اقسام ہیں۔ ایک تو ثمر خور (Fuitorians) ہیں جو صرف پھل اور میوہ جات ہی کھاتے ہیں۔ پھر ویدانتی ہیں جو کسی بھی حیوانی ذریعے سے حاصل ہونے والی خوراک استعمال نہیں کرتے۔ پھر لیکٹو ویجی ٹیرین ہیں، اور میرا خیال ہے زاویری صاحب بھی انھی میں شامل ہیں، جو دودھ پی لیتے ہیں۔ اسی لیے کچھ سبزی خور انڈا کھا لیتے ہیں اور کچھ انڈا اور دودھ دونوں استعمال کرتے ہیں۔ مزید برآں Pesco Vegitarians بھی ہوتے ہیں جو مچھلی سے پرہیز نہیں کرتے۔ پھر Semivegitarians ہیں جو مرغی کا گوشت کھاتے ہیں۔

یہ ساری تقسیم میری کی ہوئی نہیں ہے بلکہ خود ویجی ٹیرین سوسائٹی نے کی ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ بیس مزید اقسام بھی بیان کی جا سکتی ہیں لیکن وقت کی کمی مجھے اجازت نہیں دیتی۔

یہاں میں امریکی کونسل برائے سائنس اور صحت (ACSH) کے مشیر ڈاکٹر ولیم ٹی جارڈس کا ایک بیان پیش کرنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب لوما لنڈا یونیورسٹی میں Public Health & Preventive Medicine کے پروفیسر ہیں۔ مزید برآں وہ National Council Against Health Frauds کے بانی اور چیئرمین بھی ہیں۔ یہی نہیں وہ ایک کتاب کے شریک مرتب بھی ہیں۔ اس کتاب کا عنوان ہے:

{The Health Robbers}

A Closer Look at Quakery in America.

ڈاکٹر ولیم کے بیانات امریکہ کے بارے میں ہیں۔ وہ سبزی خوری کی اقسام کا تعین رویے کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سبزی خوروں کی دو اقسام ہیں۔

1- Pragmatic Vegitarian.

2- Ideological Vegitarian.

ایک Pragmatic یا نتائج وعواقب کو مدنظر رکھنے والا سبزی خور وہ ہوتا ہے جو معروضی حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی صحت کے لیے بہترین غذا کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کا رویہ جذباتی نہیں بلکہ منطقی ہوتا ہے۔

دوسری طرف Ideological یا نظریاتی سبزی خور ہے جو اپنی غذا کا انتخاب ایک اصول کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس اصول کی بنیاد ایک نظریے پر ہوتی ہے۔ ایسا سبزی خور منطق کم اور جذباتی زیادہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ولیم کا کہنا یہ ہے کہ آپ ایک جذباتی یا نظریاتی سبزی خور کو بڑی آسانی سے پہچان سکتے ہیں، اس طرح کہ وہ ہمیشہ سبزی خوری کے فواید بڑھا چڑھا کر بیان کرے گا۔

اور آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ میری گفتگو سے پہلے یہی کچھ ہوا...... سبزی خوری کے فواید کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا۔ اور اسی طرح نظریاتی سبزی خور کے ہاں شک وشبہ کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کیا جاتا ہے کہ انتہا پسندانہ قسم کی سبزی خوری آپ کی صحت کے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر ولیم مزید کہتے ہیں کہ ایک نظریاتی سبزی خور سائنسدان دکھائی دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن درحقیقت اس کا رویہ ایک وکیل کی مانند ہوتا ہے۔ وہ منتخب قسم کی معلومات جمع کرتے ہیں جو ایسی معلومات کی نفی کرتی ہیں جو ان کے نظریے سے متصادم ہیں۔ اس قسم کا رویہ ایک ایسے مباحثے میں تو مفید ثابت ہوسکتا ہے جیسا مباحثہ ہم آج کر رہے ہیں لیکن ہماری سائنسی آگاہی میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر ولیم ٹی جارویں مزید کہتے ہیں کہ نظریاتی سبزی خوری، مفروضوں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں اس قدر شدت پسندی پائی جاتی ہے کہ سائنسدان اور ڈاکٹر تک اس سے محفوظ نہیں رہ پاتے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ذاویری نے بھی کہا کہ گوشت خوری متعدد بیماریوں کا سبب ہے۔ میں ان کے ہر دعوے کا رد کروں گا اگر وقت نے اجازت دی۔ وہ سائنس کے بارے میں بات کر رہے تھے لیکن ان کا طریقہ کار سائنسی نہیں تھا۔ طب کا اصول یہ ہے کہ؛ ''پرہیز علاج سے بہتر ہے''۔ لیکن وقت محدود ہونے کی وجہ سے میں یہاں طبی تفصیلات میں نہیں جا سکتا۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی جوابی گفتگو میں ان تمام باتوں کا ذکر کروں۔

سب سے پہلے ہم اس بات کا تجزیہ کرتے ہیں کہ کسی شخص کی غذائی عادت کا تعین کس طرح ہوتا ہے۔ اس کی مذہبی وجوہات بھی ہو سکتی ہیں، جغرافیائی اسباب بھی ہو سکتے ہیں، محض ذاتی پسند ناپسند بھی ہو سکتی ہے، جسمانی اور طبی تقاضے بھی ہو سکتے ہیں۔ ذہنی رویے بھی ہو سکتے ہیں۔ معاشی حالات اور ماحولیاتی اسباب بھی ممکن ہیں۔ اسی طرح غذائی افادیت اور سائنسی وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم مذہبی اسباب کا جائزہ لیتے ہیں۔ ترویدی صاحب نے کہا تھا کہ مذہب کو اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے کہ ہمیں کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا ہے۔ اور یہ کہ اس بات کا فیصلہ ڈاکٹر پر چھوڑ دینا چاہیے۔ میں ان کی بات سے یہاں تک اتفاق کرتا ہوں کہ بیشتر مذاہب کے معاملے میں تو ایسا ہی ہے۔ لیکن اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ ہر معاملے میں حرف آخر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اگر جس خدا کی آپ عبادت کرتے ہیں، وہ سب سے بڑا طبیب نہیں ہے تو پھر آپ کو اس پر ایمان ہی نہیں رکھنا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ؛ ''یہ بات ڈاکٹر پر چھوڑ دیں'' لیکن ہم مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق ہے اور خالق کا علم آج تک کے تمام ڈاکٹروں کے مجموعی علم سے بھی زیادہ ہے۔

ڈاکٹر ذاویری صاحب ڈاکٹروں کے حوالے دے رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کے بیشتر حوالے ان کتابوں میں سے ہیں جو اس ہال کے باہر برائے فروخت موجود ہیں۔

میں ان کے بیان کردہ تمام نکات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا کیوں کہ ان میں سے کچھ تو فرضی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں کچھ غیر متعلقہ ہیں۔ بعض غیر مصدقہ ہیں اور بعض نیم پختہ حقائق پر مشتمل ہیں۔

یہاں ایک بات میں بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میں آج یہاں یقیناً یہ ثابت کروں گا کہ گوشت خوری انسانوں کے لیے قطعاً ممنوع نہیں ہے۔ لیکن میں سبزی خوروں کے جذبات مجروح کرنے کا ذرا بھی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں منطقی اور سائنسی طور پر یہ ثابت کروں گا کہ انسان کے لیے گوشت کھانا جائز ہے اور اگر اس بات سے کسی سبزی خور کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو میں اس کے لیے پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔ میں آپ سب کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن ظاہر ہے کہ مجھے پہلے مقرر کی گفتگو کا جواب بھی دینا ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو بات یہ ہے کہ اسلام گوشت خوری کو فرض قرار نہیں دیتا۔ ایک مسلمان سبزی خور ہوتے ہوئے بھی ایک بہترین مسلمان رہ سکتا ہے۔ لیکن جب ہمارا پروردگار ہمیں یہ اجازت دیتا ہے کہ ہم گوشت کھا سکتے ہیں تو پھر ہم گوشت کیوں نہ کھائیں؟

میں نے اپنی گفتگو کا آغاز قرآنِ مجید کی اس آیت سے کیا تھا:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اَوْفُوا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ ۝

[المائدہ: ۱]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بندشوں کی پوری پابندی کرو۔ تمہارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے۔ سوائے ان کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لیے حلال نہ کرلو۔ بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔"

قرآنِ کریم میں آگے چل کر مزید ارشاد ہوتا ہے:

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُوْنَ ٥

[النحل: ۵]

"اور اس نے جانور پیدا کیے، جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی۔ اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔"

سورۂ مومنون میں دوبارہ فرمایا گیا:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَأْكُلُوْنَ ٥ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ٥

[المومنون: ۲۱، ۲۲]

"اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے، ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے، اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں، اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فایدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔"

اب ہم آتے ہیں جغرافیائی عوامل کی جانب۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ عوامل غذائی عادات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ساحلی علاقوں کے رہنے والے مچھلی زیادہ کھاتے ہیں۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان کے رہنے والے چاول زیادہ کھاتے ہیں۔ اسی طرح صحرائی علاقوں کے رہنے والے لوگوں کو بھی گوشت پر انحصار کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہاں نباتات بہت کم ہوتی ہیں۔ برفانی علاقوں میں بھی نباتات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں، لہٰذا قطبین میں رہنے والے لوگوں (Eskimo) کی غذا سمندری حیات پر مشتمل ہوتی ہے۔

زاویری صاحب نے کہا: ......"میں جانتا ہوں کہ دنیا کے بعض علاقوں میں سبزیاں دستیاب نہیں ہوتیں لیکن چونکہ اب ذرائع نقل و حمل بہت ترقی کر چکے ہیں لہٰذا ہمیں ان علاقوں میں سبزیاں فراہم کرنی چاہئیں۔" ...... میں انڈین ویجی ٹیرین کانفرنس سے

درخواست کروں گا کہ وہ صرف اسکیموز ہی کو سبزیاں فراہم کر کے دکھادیں یا کم از کم نقل وحمل کا خرچہ ہی برداشت کرلیں۔ یا سعودی عرب کو سبزیاں فراہم کردیں۔ سعودی عرب میں سبزیاں مل جاتی ہیں لیکن بہت گراں ہوتی ہیں۔ اس گرانی کی وجہ کیا ہے۔ یہی کہ وہاں سبزیاں بھجوانے کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ لہٰذا سبزیاں بہت مہنگی پڑتی ہیں۔ یہ بات قطعاً غیر منطقی اور غیر سائنسی ہوگی، اگر ہم یہ کہیں کہ کم غذائیت والی خوراک حاصل کرنے کے لیے زیادہ قیمت ادا کی جائے۔

جہاں تک ہمدردی یا اخلاقی وجوہات کا تعلق ہے تو ان کا جائزہ بھی لے لیتے ہیں۔ خالص سبزی خور حضرات کا کہنا ہے کہ........."ہر قسم کی زندگی مقدس ہے"......"لہٰذا کسی بھی جاندار کو مارا نہیں جانا چاہیے۔"......... وہ اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ بات آج عالمی سطح پر تسلیم کی جاتی ہے کہ پودے بھی جاندار ہیں۔ ان میں بھی زندگی ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی بنیادی دلیل کہ جاندار کو مارا نہیں جانا چاہیے، آج کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ آج سے ایک دو صدیاں پہلے تک شاید یہ دلیل کچھ وزن رکھتی ہوگی لیکن آج اس دلیل کی کوئی حیثیت نہیں۔ اب سبزی خور حضرات یہ بات کرتے ہیں کہ ٹھیک ہے، پودے بھی جاندار ہیں لیکن چونکہ پودے تکلیف کا احساس نہیں رکھتے اس لیے پودوں کا "قتل" ایک چھوٹا جرم ہے، ایک معمولی گناہ ہے۔

لیکن آج سائنس مزید ترقی کر چکی ہے۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ پودے بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں، وہ روتے بھی ہیں لیکن انسانی کان پودے کی آواز نہیں سن سکتے کیوں کہ انسانی سماعت کی ایک مخصوص حد ہے۔ اس حد سے کم یا زیادہ فریکونسی کی آواز انسانی کان کے لیے سننا ممکن نہیں ہوتا۔ جانور کی آواز سننا انسان کے لیے ممکن ہے اور پودے کی آواز سننا ممکن نہیں، تو کیا محض اس بنیاد پر کہ پودے کی فریاد آپ کو سنائی نہیں دیتی آپ کو یہ حق مل جاتا ہے کہ آپ پودوں کو تکلیف پہنچائیں یا ان کی جان لیں۔

ایک دفعہ اسی قسم کے ایک نظریاتی سبزی خور سے میری بحث ہوئی۔ وہ کہنے لگا کہ ڈاکٹر

بھائی، بات یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ پودے جاندار ہیں اور تکلیف بھی محسوس کرتے ہیں لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ پودوں میں جانوروں کے مقابلے میں دو حسیات کم ہیں؟ میں نے کہا چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن میں ایک سادہ سا سوال پوچھتا ہوں۔ فرض کرو تمہارا ایک بھائی پیدائشی گونگا بہرا ہے۔ وہ سن بھی نہیں سکتا اور بول بھی نہیں سکتا۔ جب وہ بڑا ہوتا ہے تو کوئی اسے قتل کر دیتا ہے۔ کیا اس وقت بھی تم جا کر جج سے یہی کہو گے کہ:

''جج صاحب! مجرم کو تھوڑی سزا دیجیے، کیوں کہ میرے بھائی میں دو حسیات کم تھیں۔''

درحقیقت آپ کہیں گے کہ اس نے تو معصوم کو مارا ہے لہٰذا اسے نسبتاً زیادہ سزا دی جائے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اگر آپ تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام جانداروں کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلے طبقے میں انسان ہیں اور دوسرے طبقے میں دیگر تمام جاندار۔ جہاں تک انسانی جان کا تعلق ہے، اس حوالے سے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۝ [المائدہ: ۳۲]

''جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔''

اگر کوئی شخص کسی انسان کو قتل کرتا ہے، اس سے قطع نظر کہ مقتول مسلمان تھا یا غیر مسلم، بشرطیکہ مقتول زمین میں فساد پھیلانے یعنی فتنہ انگیزی کرنے یا کسی کو قتل کرنے کا مجرم نہ ہو تو قرآن کے الفاظ میں یہ ایسا ہی ہے جیسے پوری انسانیت کو قتل کر دیا جائے۔ دوسری طرف کسی ایک انسان کی جان بچانے کو قرآن پوری انسانیت کی جان بچانے کے برابر قرار دیتا ہے۔

جہاں تک انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کا تعلق ہے، کسی انسان کو یہ اجازت نہیں ہے کہ بلا وجہ انھیں نقصان پہنچائے یا اُن کی جان لے۔ انھیں محض اپنی تفریح کے لیے، کھیل تماشے کے طور پر، نشانہ بازی کی مشق کے لیے، نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہے، البتہ

اپنے تحفظ کے لیے، اپنی جان بچانے کے لیے آپ انھیں نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں بلکہ ان کی جان بھی لے سکتے ہیں۔اسی طرح آپ اپنی غذا کی جائز ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی ان کی جان لے سکتے ہیں لیکن محض تفریح طبع کی خاطر نہیں۔لہٰذا اگر میں یہ تسلیم کرلوں کہ پودے بھی ایک جاندار مخلوق ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سو افراد کو کھانا کھلانے کے لیے مجھے ایک جانور کی جان لینی ہوگی یا بصورت دیگر ایک سو پودوں کو ''قتل'' کرنا پڑے گا۔ یہ بتائیں کہ کون سا جرم بڑا ہے؟ آپ خود فیصلہ کرسکتے ہیں۔

سو معذور انسانوں کا قتل بڑا گناہ ہوگا یا ایک صحت مند انسان کا قتل؟ آپ خود فیصلہ کریں۔سبزی خوروں کی ایک تنظیم ہے جس کا نام ہے:

" World Foundation on Reverence for all life."

زاویری صاحب نے جو اقتباسات پیش کیے وہ بیش تر بلکہ تقریباً تمام ہی اس تنظیم کے شایع کردہ تین کتابچوں سے لیے گئے تھے۔اس تنظیم کا نام رکھتے ہوئے انھیں آخر میں خطوطِ وحدانی میں (Except Plant Life) بھی لکھنا چاہیے تھا، جو شاید وہ بھول گئے ہیں۔یہ تنظیم کہتی ہے کہ...... ''تمام مخلوق ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے، ہر جان مقدس ہے۔''

...... یہ کس قسم کا نظریہ ہے کہ سب ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن خاندان کے بعض افراد کا قتل ممنوع ہے اور بعض ارکان کا قتل جائز؟ یہ غیر منطقی بھی ہے اور غیر سائنسی بھی۔کیا آپ کو پتہ ہے کہ امریکہ میں سبزی خوروں کی بعض تنظیمیں بچوں کو مذبح خانوں میں لے جاتی ہیں اور وہاں جانوروں کو ذبح ہوتے ہوئے دکھا کر انھیں گوشت خوری سے متنفر کرتی ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر چھوٹی بچیوں کو پیدائش کا کوئی مشکل اور پیچیدہ کیس دکھائے اور پھر انھیں کہے کہ...... ''تمھیں نہ تو شادی کرنی چاہیے اور نہ ہی کبھی ماں بننا چاہیے۔''...... یہ کسی کے ذہن پر اثر انداز ہونے کا غیر اخلاقی طریقہ ہے۔گویا یہ بالکل ایک غیر اخلاقی رویہ ہے۔

درحقیقت ہمیں بچوں کو یہ سمجھانا چاہیے کہ جب ہم اپنی غذائی ضرورت کے لیے پودے

کاشت کر سکتے ہیں تو جانور کیوں نہیں پال سکتے؟ میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہر جان قیمتی ہے اور بلاوجہ کسی کی جان لینا جائز نہیں ہے لیکن اپنی جائز غذائی ضروریات پوری کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اب ہم آتے ہیں جسمانی اور ذہنی اثرات کی جانب۔ زاویری صاحب نے اس حوالے سے بہت سی چیزیں گنوائیں لیکن آپ جانتے ہیں وہ کسی کاغذ سے سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پڑھ رہے تھے۔ میں نے نوٹ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن نوٹ نہیں کر سکا کہ انھوں نے کتنی بیماریوں کا نام لیا۔

میں ایک ڈاکٹر ہوں لیکن کتنی بیماریوں کی وضاحت کرنا میرے لیے ممکن ہوگا؟ دس بیماریوں کے نام لینے میں چند سیکنڈ لگتے ہیں لیکن جواب دینے کے لیے گھنٹہ چاہیے۔ لیکن بہرحال میں کوشش کروں گا۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ اگر آپ مستند طبی کتابوں سے رجوع کریں، مستند کتابوں سے، نہ کہ نظریاتی سبزی خوروں کی تحقیقات سے، تو آپ کو زاویری صاحب کے اٹھائے ہوئے بیش تر سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔

جہاں تک جسمانی ساخت کا تعلق ہے، زاویری صاحب نے بالکل ٹھیک کہا کہ سبزی خور جانوروں مثال کے طور پر گائے، بھیڑ، بکری وغیرہ کے دانت چپٹے ہوتے ہیں کیونکہ انھوں نے غذا کو چبانا ہوتا ہے، جگالی کرنی ہوتی ہے اور یہ جانور صرف سبزی کھاتے ہیں۔ دوسری طرف اگر آپ گوشت خور (Carnivorous) جانوروں یعنی شیر، چیتے اور تیندوے وغیرہ کے دانتوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے دانت نوکیلے ہوتے ہیں کیونکہ انھوں نے صرف گوشت کھانا ہوتا ہے۔ یہ گوشت خور جانور ہیں، انھیں "غیر سبزی خور" Non Vegitarion جانور کہنا غلط ہے۔ اگر آپ انسانی جبڑے کا جائزہ لیں تو اس میں دونوں طرح کے دانت موجود ہیں۔ نوکدار بھی اور چپٹے بھی۔ اگر اللہ تعالیٰ، ہمارا خالق یہ چاہتا کہ ہم صرف سبزیاں کھائیں تو وہ ہمیں نوکدار دانت کیوں دیتا؟ اور ڈاکٹر زاویری کہتے ہیں کہ لفظ Canine کا تعلق کتے سے نہیں بلکہ بندر سے ہے۔ انھیں اس لفظ

کے سائنسی مفہوم ہی کا علم نہیں ہے۔ Canine کا لفظ لاطینی لفظ Cananas سے نکلا ہے جس کا مطلب ہی ''کتے سے متعلقہ'' ہوتا ہے۔ اور Canine کا مطلب ہوتا ہے ایک خاص خاندان سے تعلق رکھنے والے جانور مثلاً کتا اور بھیڑیا وغیرہ۔ ڈاکٹروں نے ان دانتوں کو یہ نام دیا ہے لیکن زاویری صاحب کہتے ہیں کہ یہ دانت بندروں کے مشابہ ہیں۔ چلیے ان کی بات مان لیتے ہیں لیکن کون کہتا ہے کہ تمام بندر سبزی خور ہوتے ہیں؟ وہ گوشت خور بھی ہوتے ہیں، انھیں جوئیں کھاتے ہوئے تو آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ باقاعدہ گوشت خوری بھی کرتے ہیں، درحقیقت بندر یا بن مانس ایک ہمہ خور جانور ہے، بلکہ بعض تو آدم خور بندر بھی کہلاتے ہیں۔

اسی طرح اگر آپ انسانی نظام ہضم کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لحمیاتی اور نباتاتی ہر دو طرح کی غذا ہضم کرسکتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ چاہتا کہ ہم صرف سبزیاں اور پھل کھائیں تو وہ ہمیں گوشت کو ہضم کرنے والا نظامِ ہضم ہی کیوں عطا کرتا؟ زاویری صاحب کہیں گے کہ ہم کچا گوشت ہضم نہیں کرسکتے، بالکل درست، لیکن بہت سی نباتاتی غذائیں بھی ایسی ہیں جنہیں ہم کچا نہیں کھاسکتے۔ مثال کے طور پر گندم، چاول، دالیں وغیرہ۔ کیا آپ ان چیزوں کو کچا کھاسکتے ہیں؟ نہیں، یقیناً آپ کو بدہضمی ہوجائے گی۔

تو پھر یہ دلیل ہی کیا ہے۔ آپ دال کچی نہیں کھاسکتے۔ پہلے پکانا پڑتا ہے۔ ورنہ مسئلہ ہوگا، لہٰذا پہلے پکانا پڑتا ہے۔ اسی طرح گوشت بھی پکا کر کھانا پڑتا ہے۔ لہٰذا ہم لوگ گوشت کو پکا کر ہی کھاتے ہیں تاکہ وہ آسانی سے ہضم ہوسکے۔ لیکن ایسے انسان بھی ہیں جو کچا گوشت بھی ہضم کرسکتے ہیں۔ اسکیموز کا نام انھوں نے خود لیا تھا۔ لیکن انھوں نے اس لفظ Eskimos کا مطلب نہیں بتایا۔ اسکیموز کا لفظ جس لفظ سے مشتق ہے اس کا مطلب ہی ''کچا گوشت کھانے والے'' ہوتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو کچا گوشت کھاسکتے ہیں کیوں کہ انھوں نے اس کی عادت ڈال لی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کل کلاں کو آپ کچی گندم یا کچے چاول کھانے کی عادت ڈال لیں تو آپ کا معدہ ان چیزوں کو بھی ہضم کرنے لگے۔ لیکن عام طور پر بیش تر

لوگ بعض سبزیاں کچی حالت میں ہضم نہیں کر سکتے تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم گندم کھانا چھوڑ دیں؟ چاول کھانا چھوڑ دیں؟

سبزی خور جانوروں کے نظامِ ہضم میں ایک خاص قسم کے خامرے پیدا ہوتے ہیں جو سیلولوز خامرے کہلاتے ہیں۔ ہر نباتاتی غذا میں سیلولوز نامی عنصر پایا جاتا ہے لہٰذا یہ سیلولوز خامرے تمام نباتاتی غذاؤں کو ہضم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہمارے یعنی انسانوں کے نظامِ ہضم میں یہ خامرے موجود نہیں ہوتے لہٰذا نباتاتی غذاؤں کا ایک حصہ غیر ہضم شدہ رہ جاتا ہے جسے ہم ریشے (Fibres) کہتے ہیں۔

دوسری طرف متعدد خامرے ایسے ہیں جو لحمیاتی غذا کو ہضم کرنے کے کام آتے ہیں مثال کے طور پر Lipase, Trapezes, Kinotrapeges وغیرہ۔ اور یہ خامرے ہمارے جسم میں پائے جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ نہ چاہتا کہ ہم گوشت کھائیں تو وہ ہمارے نظامِ انہضام میں یہ تمام خامرے کیوں پیدا فرماتا؟

اسی طرح جیسا کہ فاضل مقرر اور مہمانِ خصوصی دونوں نے اپنی گفتگو کے دوران فرمایا کہ ابتدائی دور کا انسان گوشت خور تھا۔ یہ بات آثارِ قدیمہ کے مطالعے سے بھی ثابت ہو چکی ہے۔ ہوموسیپین، اسکیموز، آسٹریلیا کے ایب اوریجنیز وغیرہ سب گوشت خور تھے۔ تو پھر اب یہ تبدیلی کیوں؟ ہمارے دانت بھی وہی ہیں اور نظامِ انہضام بھی وہی۔

زاویری صاحب نے متعدد دیگر باتیں بھی کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہمیں سبزیاں کھانی چاہئیں۔ اور میں ان کی بات سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔ ہم نے یہ کب کہا ہے کہ سبزیاں مت کھائیں؟ ''گوشت خور'' کا مطلب ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو نباتاتی اور لحمیاتی ہر دو طرح کی غذائیں استعمال کرتا ہے یا بالفاظِ دیگر گوشت خوری سے مراد ہمہ خوری ہے۔

انھوں نے کہا کہ گوشت خور جانوروں کے جگر اور گردے بڑے ہوتے ہیں جب کہ انسان کا جگر اور گردے سبزی خور جانوروں کی طرح نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جانوروں نے کچا گوشت کھانا ہوتا ہے لہٰذا، اسے ہضم کرنا مشکل ہوتا ہے جب کہ ہم

نے گوشت کو چوں کہ پکا کر کھانا ہوتا ہے لہٰذا ہمیں بڑے جگر یا بڑے گردوں کی ضرورت نہیں ہوتی اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ اعضا نسبتاً چھوٹے دیے ہیں جو کہ پکائی ہوئی لحمیاتی اور نباتاتی غذاؤں کو بخوبی ہضم کرنے کے لیے کافی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ گوشت خور جانور زبان سے چاٹتے ہیں جب کہ سبزی خور جانور گھونٹ بھرتے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ انسان دونوں کام کرتا ہے۔ جب ہم پانی پیتے ہیں تو گھونٹ بھرتے ہیں لیکن جب آئس کریم کھانی ہو تو کیا کرتے ہیں؟ ہم زبان سے بھی چاٹتے ہیں۔

یعنی انسان دونوں کام کرسکتا ہے اور غذا کی نوعیت کے لحاظ سے فیصلہ کرتا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ زاویری صاحب کے دیگر دلائل کا ہے۔ دانتوں کا ایک دوسرے کے قریب ہونا، اس وجہ سے ہے کہ ہمیں دونوں طرح کی غذائیں کھانی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ ہم صرف گوشت کھائیں اور نباتاتی غذائیں بالکل نہ کھائیں تو پھر شاید ہمارے دانت بھی دور دور ہوتے۔ لیکن اس نے ہمیں دونوں طرح کی غذائیں کھانے کی اجازت دی ہے۔ قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں مختلف طرح کی غذائی اشیا کا ذکر آیا ہے۔ مثال کے طور پر انار اور کھجور اور سبزیوں وغیرہ کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ ہمیں یہ ساری چیزیں کھانی چاہییں۔

بعض سبزی خور حضرات کا کہنا ہے کہ پودے کاٹنے کے بعد دوبارہ بڑھنے لگتے ہیں لہٰذا انھیں کاٹنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بات جزوی طور پر درست ہے۔ بعض پودے ایسے ہوتے ہیں جو کاٹنے کے بعد پھر بڑے ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بے سروپا دلیل ہے۔ چھپکلی کی دم بھی کاٹنے کی صورت میں دوبارہ آجاتی ہے تو کیا محض اس وجہ سے آپ چھپکلی کی دم کھانا پسند کریں گے؟ اور ایسے لوگ موجود ہیں جو چھپکلی کھاتے ہیں مثال کے طور پر آسٹریلیا کے قدیم باشندے Aboriginies۔ لیکن کیا آپ یہ پسند کریں گے؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کا جواب ہوگا ''نہیں''۔

کیا آپ جانتے ہیں اس وقت میں کیا کر رہا ہوں۔ میرا رویہ اس وقت بالکل ایک

وکیل کی طرح کا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس قسم کی باتوں کا جواب دینا پڑ رہا ہے لیکن کیا کیا جائے، مجبوری ہے، کیوں کہ بہر حال یہ ایک مباحثہ ہے۔ اور چوں کہ میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ ہم دوستانہ ماحول میں ایک دوسرے کا موقف درست طور پر سمجھ سکیں، لہٰذا مجھے منطقی اور سائنسی طریقہ کار کے ساتھ وکیلانہ یا مناظرانہ انداز گفتگو بھی اپنانا پڑے گا۔ کیونکہ فریق مخالف کی طرف سے اسی نوعیت کے دلائل سامنے آئے ہیں۔ کوئی بھی شخص جس کے پاس کافی جنرل نالج ہو، زاویری صاحب کے دلائل کا جواب دے سکتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بیش تر لوگوں کے پاس جنرل نالج بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ یہ دلائل بہت سے لوگوں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

یہ دلائل ان کتابوں میں سے دیے جا رہے ہیں جو انڈین ویجی ٹیرین کانگرس اور جین آرگنائزیشن تقسیم کر رہی ہے۔ ''انڈے کے بارے میں سو حقائق''، ''گوشت خوری! سو حقائق''، ''گوشت خوری یا سبزی خوری؟'' ان کتابوں میں دی گئی ایک ایک دلیل کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ یہ کتابیں مسٹر زاویری نے مجھے بھی دی ہیں۔ یقیناً کچھ بیماریاں ایسی ہیں جو لحمیاتی غذا کے نتیجے میں لاحق ہو سکتی ہیں لیکن ان سے بچاؤ ممکن ہے۔

اب ہم آتے ہیں ''کردار یا طرزِ عمل پر مرتب ہونے والے اثرات'' کی جانب۔ زاویری صاحب نے متعدد باتیں کیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ ہم جو کچھ کھاتے ہیں اس کا اثر ہمارے کردار اور رویوں پر ہوتا ہے۔ میں کسی حد تک ان سے اتفاق کرتا ہوں۔ جو کچھ ہم کھاتے ہیں اس کا اثر ہمارے رویے پر ہو سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمان صرف اور صرف سبزی خور جانوروں مثلاً بھیڑ بکری وغیرہ کا گوشت کھاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں یہ سب امن پسند قسم کے جانور ہیں اور ہم بھی امن پسند ہی رہنا چاہتے ہیں۔

ہم گوشت خور جانوروں مثلاً شیر، چیتے، کتے وغیرہ کا گوشت بالکل نہیں کھاتے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ نے ان جانوروں کو واضح طور پر حرام بتایا ہے۔ ہم امن پسند لوگ ہیں لہٰذا انھی جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں جو امن پسند ہیں۔

اگر آپ کی دلیل اُلٹا دی جائے تو کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ آپ صرف سبزیاں کھاتے ہیں لہٰذا آپ سبزیوں جیسے ہوجاتے ہیں۔ آپ کے حواس کمزور ہوجاتے ہیں اور آپ ایک کمتر درجے کی مخلوق بن جاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بات سائنسی طور پر غلط ہے۔ لیکن میں یہاں ایک وکیل کی طرح جواب دے رہا ہوں۔ ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ بات کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ سبزیاں کھانے سے آپ سبزیوں جیسے ہوجاتے ہیں۔ لیکن چونکہ انھوں نے یہی دلیل دی ہے لہٰذا اس کا ردّ کرنے کے لیے مجھے اس قسم کی دلیل آپ کے سامنے پیش کرنی پڑی کہ اگر آپ سبزی کھائیں گے تو پودوں کی مانند ہوجائیں گے، کمزور اور مجبور، حرکت آپ کے لیے مشکل ہوجائے گی۔

مجھے افسوس ہے اور اگر میری بات سے کسی سبزی خور کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں لیکن مجھے زاویری صاحب کی باتوں کا جواب تو دینا ہے۔

مزید برآں انھوں نے کچھ امن پسند لوگوں کی فہرست پیش کی ہے جو کہ سبزی خور تھے، مثال کے طور پر مہاتما گاندھی۔ میں مہاتما گاندھی کی عزت کرتا ہوں کیوں کہ انھوں نے ہندوستان اور انسانیت کے لیے کچھ اچھے کام کیے ہیں۔ لیکن مہاتما گاندھی کے امن پسند ہونے سے کیا یہ ثابت ہوتا ہے کہ سبزی خوری آپ کو امن پسند بنا دیتی ہے؟

اگر آپ ان لوگوں کی فہرست کا جائزہ لیں جنھیں دورِ حاضر میں امن کا نوبل انعام دیا گیا تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ان میں سے بیش تر بلکہ تقریباً سب ہی گوشت خور تھے۔ مثال کے طور پر یاسر عرفات، انور سادات، مدر ٹریسا وغیرہ یہ سب لوگ سبزی خور نہیں تھے۔ مدر ٹریسا بھی گوشت خور تھی۔ دوسری طرف میں آپ سے ایک سادہ سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ تاریخ عالم میں کون سا شخص سب سے زیادہ قتل وغارت کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے؟ جواب ہوگا ہٹلر، ایڈولف ہٹلر جسے ساٹھ لاکھ یہودیوں کے قتل کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، وہ کیا تھا؟ گوشت خور یا سبزی خور؟ وہ ایک سبزی خور تھا۔

اب اس حوالے سے انٹرنیٹ پر بحثیں ہوتی ہیں۔ ایک فریق کہتا ہے کہ ہٹلر خالص سبزی خور نہیں تھا۔ وہ لحمیاتی غذا بھی استعمال کر لیتا تھا۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں وہ سبزی خور ہی تھا، لحمیاتی غذا اسی صورتِ حال میں استعمال کرتا تھا جب اسے گیس ہو جاتی تھی۔ بہر حال اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سبزی خور تھا یا گوشت خور۔ سائنسی طور پر تجزیہ کیا جائے تو اس کی غذا ہرگز ساٹھ لاکھ یہودیوں کے قتل کا سبب ثابت نہیں ہوگی۔

بحیثیت ایک ڈاکٹر کے، مجھے یہ جاننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہٹلر سبزی خور تھا یا گوشت خور۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ یہ دلیل کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اسے ان ظالمانہ اقدامات پر دیگر عوامل نے مجبور کیا تھا، غذا نے نہیں۔

اس حوالے سے متعدد تحقیقات بھی ہوئی ہیں۔ امریکہ میں ''خالص سبزی خور'' اور ''گوشت خور'' طالب علموں کے دو گروہوں پر ہونے والی تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہو چکا ہے کہ گوشت خور طلبا زیادہ پر امن اور خوش اخلاق تھے۔ لیکن اس قسم کی تحقیقات محض مطالعات ہی ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان کے نتائج ''سائنسی حقائق'' ہوں۔ لہٰذا میں ایسی کسی تحقیق کو دلیل کے طور پر استعمال نہیں کروں گا۔

میں ایک ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر ہی رہنا چاہتا ہوں لیکن چوں کہ ہم ایک مناظرہ کر رہے ہیں لہٰذا وکیل بننا بھی ضروری ہے۔ مطالعات تو ہوتے رہتے ہیں لیکن مطالعات کو ''سائنسی حقائق'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور زاویری صاحب نے جو گفتگو کی وہ زیادہ تر مطالعات ہی کے بارے میں تھی، سائنسی حقائق کے بارے میں نہیں۔ کوئی ایک بھی ایسی مستند طبی کتاب موجود نہیں جو گوشت خوری سے عمومی طور پر منع کرتی ہو۔ کوئی ایک بھی نہیں۔ یہ تمام مطالعات ہیں، جس کی ایک مثال میں نے بھی دی، ایک امریکی تحقیق کے بارے میں۔

پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ نباتاتی غذا آپ کو ذہین بناتی ہے۔ اور انھوں نے عظیم ناموں کی ایک فہرست بھی پیش کی۔ البرٹ آئن سٹائن اور آئزک نیوٹن وغیرہ۔ لیکن اگر آپ نوبل انعام حاصل کرنے والوں کی مکمل فہرست سامنے رکھیں تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی کہ ان کی

غالب اکثریت گوشت خور تھی۔

جانوروں پر تحقیق کرنے والے محققین تو اب یہ بھی کہتے ہیں کہ گوشت خور جانور ہمیشہ زیادہ ذہین ہوتے ہیں کیوں کہ انھوں نے شکار کر کے کھانا ہوتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ شکار کرنے والا جانور، شکار ہونے والے سے زیادہ ذہین ہو۔

بہر حال میں اس قسم کی باتوں کو دلیل کے طور پر استعمال نہیں کروں گا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ گوشت خوری آپ کو ذہین بنا دیتی ہے۔ کیوں کہ یہ چیزیں انسان پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتی ہیں۔ غذا انسانی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح زاویری صاحب نے اپنے دلائل میں کہا۔ ان دلائل میں کوئی وزن نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس بات میں بھی کوئی حقیقت نہیں کہ ''لحمیاتی غذا آپ کو صحت مند بناتی ہے۔'' لیکن یہ تو ایک سائنسی حقیقت ہے جو علم طب کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ ''لحمیاتی غذا صحت کے لیے مفید ہے۔'' جہاں تک بیماریوں کا تعلق ہے، ان سے بچاؤ ممکن ہے۔ پروٹین کے بارے میں گفتگو میں بعد میں کروں گا۔

انھوں نے ایک مثال یادوناتھ سنگھ کی دی ہے۔ کیا آپ سب میں سے کسی نے کبھی یہ نام سنا ہے؟ آرمی کے یادوناتھ سنگھ کا نام؟ گوپی ناتھ اگروال کی کتاب ''گوشت خوری یا سبزی خوری! خود انتخاب کریں'' میں اس کی مثال دی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ آرمی کا ایک پہلوان یادوناتھ سنگھ جو کہ سبزی خور تھا، اس نے دو گوشت خور پہلوانوں کو کشتی میں شکست دی لہٰذا ثابت ہوا کہ سبزی خوری آپ کو صحت مند بناتی ہے۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے کہ مجھے اس کا جواب دیتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔ چند سبزی خور پہلوان بھی موجود ہیں لیکن اگر آپ پوری دنیا کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ریسلنگ کے بیش تر بلکہ تقریباً تمام عالمی اعزازات گوشت خور پہلوانوں کے پاس ہیں۔

باڈی بلڈنگ یا تن سازی کے حوالے سے دنیا کا معروف ترین نام کون سا ہے؟ آرنلڈ شوارزینگر، جس کے پاس ۱۳ عالمی اعزازات موجود ہیں۔ وہ سات مرتبہ مسٹر اولمپیا

بنا۔ پانچ مرتبہ مسٹر یونیورس اور ایک بار مسٹر ورلڈ۔ اور وہ کیا تھا؟ ایک گوشت خور۔ اسی طرح باکسر محمد علی کلے بھی گوشت خور تھا۔ مائک ٹائی سن بھی گوشت خور تھا۔ انھوں نے گوشت خوری کرتے ہوئے یہ اعزازات حاصل کیے تھے۔ اور ایک واضح بات ہے کہ لحمیاتی غذا آپ کی صحت کے لیے بہتر ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بیماری کے فوراً بعد عموماً لحمیاتی غذا کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ لازمی نہیں ہے لیکن بہرحال انڈے وغیرہ کو ترجیح ضرور دی جاتی ہے۔ میں بعد میں دوبارہ اس طرف آؤں گا۔

پھر وہ ایک اور پہلوان کی مثال دیتے ہیں، پروفیسر رام مورتی۔ جس کا میں نے کبھی نام بھی نہیں سنا۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کا مشہور پہلوان۔ اس مشہور پہلوان کو کون جانتا ہے؟ کیا آپ میں سے کوئی جانتا ہے؟ پتہ نہیں انھیں یہ خبر کہاں سے ملی ہے کہ رام مورتی مشہورِ عالم پہلوان ہے۔ پھر انھوں نے لندن کے پرم جیت سنگھ کی مثال دی ہے جو سبزی خور ہے اور روزانہ دو ہزار مرتبہ رسہ پھلانگتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ سبزیاں کھانے سے آپ ایتھلیٹ بن جاتے ہیں۔ اگر یہ علمی دلائل ہیں تو پھر میں شرمندہ ہی ہو سکتا ہوں۔

اتھلیٹکس کی دنیا میں جتنے بھی ریکارڈ بنے ہیں وہ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں موجود ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں، اور پڑھ سکتے ہیں۔ میں یہ اپنے ساتھ لایا ہوں اور میں نے اس کا سرسری جائزہ بھی لیا ہے۔ اس میں سب کچھ موجود ہے باڈی بلڈنگ، اتھلیٹکس وغیرہ تمام شعبوں کے لوگوں کا ریکارڈ اس کتاب میں موجود ہے۔ اور اگر شک کی گنجائش نکال کر بھی دیکھا جائے تو تقریباً نوے فی صد ریکارڈ ہولڈر گوشت خور ہی نکلیں گے۔ لیکن میں فاتر العقل ہوں گا اگر میں یہ کہوں کہ ان لوگوں نے یہ ریکارڈ محض اس لیے بنائے ہیں کہ یہ گوشت خور تھے۔ کچھ ریکارڈ ایسے بھی ہوں گے جن میں غذا کا کردار زیادہ ہوگا لیکن سب میں نہیں۔

انھوں نے ایک دلیل یہ دی کہ گوشت خور جانوروں کی قوت بصارت اور قوت شامہ تیز ہوتی ہے اور انسان کی یہ حسیات کمزور ہیں لہٰذا انسان سبزی خور ہے۔ لیکن ایسے سبزی خور بھی

ہو سکتے ہیں جن کی یہ حسیات بہت تیز ہوں مثال کے طور پر شہد کی مکھی جس کی قوتِ شامہ غیر معمولی ہوتی ہے۔ اس کی حس بصارت بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ یہ دلائل سائنسی دلائل نہیں ہیں، ان دلائل کے ذریعے غیر منطقی طور پر لوگوں کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آج ان کا جواب دینے کے لیے یہاں آیا ہوں۔

ایک دلیل انھوں نے یہ بھی دی کہ گوشت خور جانوروں کی آواز کرخت اور بری ہوتی ہے جب کہ سبزی خور جانوروں کی آواز نرم اور اچھی ہوتی ہے۔ میں یہاں ایک سیدھا سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ جانوروں میں سب سے زیادہ ناگوار اور کرخت آواز کس جانور کی ہوتی ہے؟ گدھے کی۔ اور گدھا گوشت خور ہوتا ہے یا سبزی خور؟ ظاہر ہے کہ سبزی خور۔ بہرحال میں ثابت کرنے کی کوشش قطعاً نہیں کروں گا کہ گوشت خوری سے آواز خوبصورت ہو جاتی ہے۔ اگر آپ اچھے گلوکاروں کی ایک فہرست بنائیں تو اس میں دونوں طرح کے لوگ موجود ہوں گے، سبزی خور بھی اور گوشت خور بھی۔ اب ان میں سے سبزی خور گلوکاروں کے نام پیش کر کے یہ کہہ دینا کہ ''سبزی خوری کے نتیجے میں آپ کی آواز خوبصورت ہو جاتی ہے'' ایک غیر منطقی بات ہوگی۔ یقین کیجیے مجھے اس قسم کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے بھی شرمندگی ہو رہی ہے۔

اب ہم ''معاشی وجوہات'' کی جانب آتے ہیں۔ زاویری صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں نباتاتی غذائیں ہی کھانی چاہئیں کیونکہ یہ سستی پڑتی ہیں۔ انھوں نے اس حوالے سے بہت سے اعداد و شمار بھی پیش کیے۔ اتنی کیلوریز ہوتی ہیں، اتنا یہ ہوتا ہے، اتنا وہ ہوتا ہے، اتنی پروٹین ہوتی ہے۔ اب خدا ہی جانتا ہے کہ یہ اعداد و شمار انھوں نے کہاں سے حاصل کیے ہیں۔ انھوں نے پروٹین کا ذکر کیا جو کہ ان کی شائع کردہ کتاب میں بھی موجود ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ایک کلو لحمیاتی پروٹین حاصل کرنے کے لیے آپ کو اتنے پودے کاشت کرنے پڑتے ہیں اور اتنے پودوں میں سات کلو پروٹین ہوتی ہے، لہٰذا ایک کلو لحمیاتی پروٹین حاصل کرنے کے لیے ۷ کلو نباتاتی پروٹین کی قربانی دینی پڑتی ہے لہٰذا نباتاتی پروٹین

لحمیاتی پروٹین سے سستی پڑتی ہے۔

میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ پروٹین کے کلوگرام سے ان کی کیا مراد ہے؟ کیا یہ پروٹین کا ایک کلو کہنا چاہتے ہیں یا خوراک کا؟ میں ایک ڈاکٹر ہونے کے باوجود یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ لیکن اگر اس کے باوجود میں ان کی بات تسلیم کرلوں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے دو اور دو پانچ تسلیم کرلوں۔ چلو پھر بھی گفتگو کو آگے چلانے کے لیے میں یہ مان لیتا ہوں کہ دو ہزار روپے اور دو ہزار روپے، پانچ ہزار روپے ہوتے ہیں تو پھر بھی سبزی خور حضرات کو ہمارا یعنی گوشت خوروں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ آپ پوچھیں گے وہ کس طرح؟ تو وہ اس طرح کہ اگر ہم لوگ جانوروں کو اپنی خوراک کے لیے ذبح نہ کرتے تو یہ جانور پانچ سات سال مزید زندہ رہتے اور اس دوران ہر جانور روزانہ چھ سات سبزی خوروں کے حصے کی غذا کھا جاتا۔ لہٰذا آپ کو ہمارا ممنون ہونا چاہیے کہ ہماری وجہ سے آپ کی غذا کی بچت ہو رہی ہے۔

مزید برآں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ انسانی خوراک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے درکار زمین کے مقابلے میں جانوروں کے چرنے کے لیے ۱۴ گنا زیادہ زمین درکار ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ اطلاع بھی انھیں کہاں سے فراہم ہوئی ہے۔ اسی طرح کی کچھ اور مثالیں بھی دی گئی ہیں کہ ایک ٹن گوشت کی پیداوار کے لیے جتنی زمین درکار ہوتی ہے اس پر ۲۰ ٹن سبزیاں کاشت کی جا سکتی ہیں اور اس سے، اتنے خاندانوں کی غذائی ضروریات پوری ہوسکتی ہیں وغیرہ۔ یوں تو میں نے جو دلائل پہلے دیے ہیں وہ یہاں بھی کافی ہیں لیکن میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے یہ نظریاتی سبزی خور ایک بات کو بالکل نظرانداز کردیتے ہیں اور وہ یہ کہ جانور بالعموم ایسی زمینوں میں چرتے ہیں جو دیگر فصلوں کے لیے کارآمد ہی نہیں ہوتی۔ جو پودے جانور بطور خوراک استعمال کرتے ہیں وہ انسانی خوراک کے طور پر استعمال ہی نہیں ہوسکتے۔ جانور البتہ انسانی غذا کے طور پر استعمال ہونے والی فصلوں کو ضرور کھا سکتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ اس مقصد کے لیے کسی کھیت میں داخل ہوتے ہیں، کسان انھیں

فوراً باہر نکال دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں جب ضرورت سے زیادہ پیداوار ہو جائے تو بعض حکومتیں ان فصلوں کو بھی چارے کے طور پر استعمال کرنے کی ہدایت کرتی ہیں۔ اسی طرح بہت سے خانہ بدوش لوگوں کا ذریعہ معاش ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر مزروعہ زمینوں میں جانوروں کو چراتے ہیں۔ اور وہ پودے جو انسانی خوراک کے کام نہیں آسکتے، ان مویشیوں کی خوراک کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں کی گزر بسر کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت قابل کاشت زمین کا تقریباً ۲۳ فی صد حصہ چراگاہوں کے طور پر استعمال ہوتا ہے، تقریباً اتنے ہی حصے پر فصلیں کاشت ہوتی ہیں، دس فی صد زمین پر جنگلات ہیں جب کہ باقی ماندہ زمین غیر آباد پڑی ہوئی ہے۔ اس غیر آباد زمین کو کیوں آباد نہ کیا جائے؟ آخر جانوروں کے حصے کی زمین پر قبضہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ان معصوموں کی خوراک کیوں ختم کرنا چاہتے ہیں؟ انھیں رہنے دیں، انھیں کھانے پینے دیں۔

اور اگر بالفرض، گوشت خور لوگ جانوروں کو ذبح کرنا چھوڑ دیں تو کیا ہوگا، مویشیوں کی تعداد حد سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے جانوروں کو لوگ گوشت حاصل کرنے کے لیے ہی پالتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ان کی افزائش میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود فرض کریں کہ آج سے دنیا بھر کے گوشت خور یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کسی جانور کو ذبح نہیں کیا جائے گا اور مزید جانور بھی نہیں پالے جائیں گے پھر بھی جانوروں کی آبادی بہت زیادہ تیزی سے بڑھے گی۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ کیوں؟ دیکھیے، آپ کو علم ہے کہ دنیا میں انسانی آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ فیملی پلاننگ کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہو رہا ہے۔ برتھ کنٹرول کے طریقوں اور ''ہم دو، ہمارے دو'' جیسے نعروں سے بھی اس اضافے میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی۔ ہماری آبادی پھر بھی بڑھ رہی ہے۔ لیکن جانوروں میں تو فیملی پلاننگ بھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح جانوروں میں حمل کا دورانیہ بھی انسانوں کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔ ۵ ماہ یا ۶ ماہ یا ۸

ماہ۔ اور مویشیوں کی شرح افزایش بھی انسانوں کے مقابلے میں قدرتی طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر ہم جانوروں کو ذبح کرنا چھوڑ دیں تو چاہے ہم انھیں نہ بھی پالیں، چند دہائیوں میں ہی ہمارے لیے آبادی کے شدید مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ انسانی آبادی کے نہیں بلکہ مویشیوں کی کثرتِ آبادی کے مسائل۔ ان مسائل کو ہم کس طرح حل کریں گے؟

متعدد غذائی پہلو بھی ہیں۔ پروٹین کی بات تو انھوں نے خود بھی کی۔ اور اگر مجھے موقع ملا تو میں اس کی تردید بھی کروں گا لیکن میں یہاں ڈاکٹر George R.Kar کا ایک بیان پیش کرنا چاہوں گا جو میرے خیال میں صحت کے حوالے سے زاویری صاحب کے جملہ نکات کا جواب دینے کے لیے کافی ہے۔ ڈاکٹر جارج امریکہ کی یونیورسٹی آف ٹیکساس میں Nutrition یعنی غذائیت کے پروفیسر ہیں۔ میں ان کا عہدہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کو احساس ہو جائے کہ یہی لوگ غذا اور غذائیت کے حوالے سے ہونے والے فراڈ پکڑنے میں اختصاص رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ:

> ”علاج بالغذا پر لکھنے والے تقریباً تمام مصنفین ایسے مفروضے پیش کرتے ہیں جو غیر مصدقہ، نیم مصدقہ، غیر ثابت شدہ، فرضی اور دور از کار قسم کے ہوتے ہیں۔“

میں ڈاکٹر جارج کا یہ بیان دوبارہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا:

> ”علاج بالغذا کے حوالے سے لکھنے والے تقریباً تمام مصنفین ایسے مفروضے پیش کرتے ہیں جو غیر مصدقہ، نیم مصدقہ، غیر ثابت شدہ، فرضی اور دُور از کار قسم کے ہوتے ہیں۔“

میرے پاس وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ میں امریکہ کی کونسل برائے سائنس اور صحت کا ایک بیان بھی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ محض ایک بیان ہے۔ دیکھیے یہ لوگ اپنے شعبوں کے ماہرین ہیں۔ اور اس قسم کے بیانات محض بیانات ہوتے ہیں۔ جس طرح بیماریوں کے حوالے سے بات کی گئی تو بات یہ ہے کہ ان میں بیشتر تو محض مفروضے ہیں، کچھ سائنسی حقائق بھی ہیں لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ان بیماریوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

باقی باتیں مثلاً اِتنا رقبہ اور اُتنا رقبہ وغیرہ تو محض چند لوگوں کے ذاتی مطالعات کے نتائج ہیں اور اس قسم کے مطالعات خواہ پی ایچ ڈی کی سطح پر کیے جائیں ان نتائج پر غور تو ضرور کیا جاتا ہے لیکن انھیں حقائق کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی امریکی کونسل برائے سائنس وصحت کے بیان کے بارے میں، تو کونسل کا کہنا یہ ہے کہ؛

''اچھی صحت کے لیے، لحمیاتی غذا سے پرہیز کرنا ضروری نہیں ہے۔''

اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارا موضوع یہ نہیں ہے کہ صحت کے لیے نباتاتی غذا بہتر ہے یا لحمیاتی بلکہ موضوع یہ ہے کہ؛ ''کیا گوشت خوری جائز ہے یا نہیں؟'' اب میں اپنے نکات کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ زاویری صاحب کو جواب دینے میں آسانی ہو۔ میری گفتگو کے بنیادی نکات درج ذیل تھے:

۱) دنیا میں کوئی بھی اہم مذہب ایسا نہیں جو ہر قسم کی گوشت خوری سے کلی ممانعت کا حکم دیتا ہو۔

۲) قطبین جیسے جغرافیائی خطوں میں آباد اسکیموز جیسے لوگوں کو نباتاتی غذائیں کیوں کر فراہم کی جاسکتی تھیں۔ اور اب کس طرح فراہم کی جاسکتی ہیں، جب کہ نقل وحمل مزید مہنگی ہوتی جارہی ہے۔

۳) اگر ہر جان مقدس ہے تو پھر آپ پودوں کی جان کیوں لیتے ہیں؟ آخر وہ بھی تو جان دار ہیں۔

۴) پودے بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

۵) اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ پودوں کے حواس کم ہوتے ہیں تو پھر بھی کیا کم حواس والی مخلوق کی جان لینا، منطقی طور پر درست ہے؟

۶) کیا ایک جاندار یعنی کسی مویشی کی جان لینا بہتر ہے یا پودوں کی صورت میں سو جانداروں کی جان لینا؟

۷) تھوک، خون کا PH، جگر، گردوں اور لیو پروٹین وغیرہ سے متعلق ہر دلیل کی تردید ممکن

ہے۔ان تمام دلائل کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔

۸) انسانی جبڑے کے دانت ہمہ خورنوعیت کے ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے ذریعے نباتاتی اور لحمیاتی دونوں طرح کی غذائیں کھائی جاسکتی ہیں۔

۹) اسی طرح انسانی نظامِ ہضم بھی اس طرح کا ہے جو کہ لحمیاتی اور نباتاتی دونوں طرح کی غذائیں ہضم کرسکتا ہے۔ اور میں نے یہ بات خامروں کے حوالے سے ثابت کی ہے۔

۱۰) ابتدائی دور کا انسان گوشت خور ہی تھا۔ لہٰذا آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ''گوشت خوری انسان کے لیے ناجائز ہے''۔ کیوں کہ انسان تو وہ بھی تھے۔

۱۱) جو غذا آپ کھاتے ہیں وہ آپ کے رویوں پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن یہ کہنا قطعی طور پر غیر سائنسی ہے کہ گوشت خوری انسان کو متشدد بنا دیتی ہے۔

۱۲) اس قسم کی باتیں کہ سبزی خوری آپ کو طاقتور بناتی ہے یا امن پسند بنا دیتی ہے یا ذہین بنا دیتی ہے یا یہ کہ آپ ایتھلیٹک ہو جاتے ہیں، محض مفروضے ہیں۔

۱۳) سبزی خور جانوروں کے مقابلے میں گوشت خور جانوروں کی حس بصارت یا قوتِ شامہ کا تیز ہونا یا گوشت خور جانوروں کی آواز کا برا ہونا سب غیر منطقی دلائل ہیں۔

۱۴) یہ دلیل ''کہ نباتاتی غذا سستی ہوتی ہے'' بھی غلط ثابت کر دی گئی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بعض ممالک مثلاً ہندوستان وغیرہ کی حد تک یہ بات درست ہوسکتی ہے لیکن اگر آپ باہر جائیں تو تازہ سبزیاں انتہائی مہنگی ہیں۔

۱۵) یہ بات کہ جانوروں کی چراگاہوں کی وجہ سے فصلوں کے لیے زمین کی کمی ہو جاتی ہے، بالکل غلط ہے۔

۱۶) اگر گوشت خور حضرات گوشت کھانا چھوڑ دیں تو جانوروں کی آبادی میں ضرورت سے زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

۱۷) ڈاکٹر کار کے بیان کے مطابق ماہرینِ غذائیت کی لکھی ہوئی کتابیں بالعموم ناقابل اعتبار ہوتی ہیں۔ اور آپ کے فراہم کردہ بیش تر اعداد و شمار اسی قسم کی کتابوں سے

لیے گئے ہیں۔

۱۸) کسی بھی مستند طبی کتاب میں ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے کہ گوشت خوری عموی طور پر نقصان دہ ہے یا اس پر پابندی ہونی چاہیے۔

۱۹) امریکی کونسل برائے سائنس اور صحت کا بھی یہی کہنا ہے کہ؛

''اچھی صحت کے لیے خالص نباتاتی غذائیں استعمال کرنا ضروری نہیں۔''

۲۰) دنیا کی کسی بھی حکومت نے آج تک گوشت خوری پر پابندی عاید نہیں کی۔

میرا خیال ہے کہ گوشت خوری کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ سائنسی اور منطقی دلائل کافی ہیں۔ اگر زاویری صاحب کو ان سے اتفاق نہیں ہے تو میں انھیں دعوت دوں گا کہ وہ سائنسی طور پر مجھے غلط ثابت کریں، محض تقابل یا مطالعات کی روشنی میں نہیں۔ اور اگر رشمی بھائی زاویری صاحب ان بیس نکات کا جواب نہ دے سکیں تو پھر بھی میں انھیں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ گوشت خوری شروع کر دیں۔ کیوں کہ میں قطعاً ایک متعصب گوشت خور نہیں ہوں، اگر وہ سبزی خور ہی رہنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ ان کا اپنا انتخاب ہوگا۔ لوگوں کا اپنا اپنا ذوق ہوتا ہے۔ ہر کسی کو انتخاب کا حق حاصل ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ سبزی خور حضرات جو یہ پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ فلاں چیز بہتر ہے وغیرہ، وہ یہ چھوڑ دیں اور اس قسم کی گمراہ کن کتابیں تقسیم کرنا بھی بند کر دیں۔ میں اپنی گفتگو کا اختتام قرآنِ مجید کی اس آیت کے ساتھ کرنا چاہوں گا۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝ [النحل: ۱۲۵]

''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔''

جوابی خطاب

رشمی بھائی زاویری

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ کیا منطقی ہے اور کیا غیر منطقی اور نہ ہی سوال انتخاب کا ہے۔ یہ تمام چیزیں اضافی ہیں، جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو کے دوران میں بھی وضاحت کی تھی اور آپ کو اس موضوع کو اسی تناظر میں سمجھنا چاہیے۔

اب ڈاکٹر ذاکر نائیک کی ایک بات جس کی میں، معذرت کے ساتھ قطعی تردید کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ؛ ''دنیا کا کوئی مذہب گوشت خوری سے منع نہیں کرتا''۔ میں ایک ماہر ہوں۔ میں بات کرسکتا ہوں کیوں کہ میں اس موضوع کا طالب علم ہوں، میں نے ''جین مت'' میں ایم اے کیا ہے۔ میں اپنے مذہبی نقطہ نظر سے آپ کو بتا سکتا ہوں کہ نہ صرف مہاویر نے بلکہ ہمارے تمام چوبیس ترتھنکروں نے سختی کے ساتھ گوشت خوری سے منع کیا ہے۔ میں پہلے بھی آپ کے سامنے یہ بات بیان کرچکا ہوں۔

دیکھیے ڈاکٹر ڈین آرنش کے بیش تر بیانات اس حقیقت پر مبنی ہیں کہ گوشت میں ضرورت سے زاید پروٹین، کولسٹرول اور Saturated Fat ہوتے ہیں لہٰذا ایک صحت مند اور پرسکون طرزِ زندگی کے لیے آپ کو نباتاتی غذائیں استعمال کرنی چاہئیں۔

ایک بات انھوں نے یہ کی کہ پودے بھی جاندار ہیں۔ بالکل، یہ بات نہ صرف ڈاکٹر جگدیش چندر بوس ثابت کرچکے ہیں بلکہ ہمارے بھگوان مہاویر نے آج سے ڈھائی ہزار برس قبل یہ کہا تھا کہ نہ صرف پودے بلکہ ہوا، پانی، آگ اور ارضی عناصر سب جان رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے آپ اِن جانداروں کی جان

لے سکتے ہیں۔ لیکن یہ ہے کہ وہ ایک عملی ترتھنکر تھے لہٰذا انھوں نے کہا وہ لوگ جو ترک دنیا کر کے جین متی نہیں بن سکتے ...... آپ جانتے ہیں جین متی کون ہوتے ہیں۔ وہ پودوں کی جان بھی نہیں لیتے۔ وہ حیوانات، نباتات غرض کسی بھی چیز کی جان نہیں لیتے۔ وہ اپنی غذا مانگ کر گزارا کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہمارے گھروں میں پکا ہوتا ہے۔ اب ہم اس تفصیل میں نہیں جائیں گے کہ کسی نے تو جاندار کو مارا ہوتا ہے یا یہ آپ خود ایک جاندار کی جان لینے کے بعد اُسے دے دیتے ہیں۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ لیکن مہاویر کی تعلیمات بالکل واضح ہیں اور وہ یہ کہ آپ نے کسی جاندار مخلوق کو نقصان نہیں پہنچانا، چاہے وہ حیوان ہو یا نباتات۔ اب جو لوگ ترک دنیا نہیں کر سکتے تھے ان کے لیے مہاویر نے کہا کہ وہ کم از کم جہاں تک ممکن ہے قتل سے بچیں۔ اس نے کہا کہ اگر آپ پودے کو بھی غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو یہ بھی تشدد ہے۔ یہ بھی ''ہنسا'' ہے لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں، لہٰذا انھوں نے صرف غیر ضروری قتل و غارت سے منع کیا۔

دوستو! یہ فرق بہت باریک سا ہے لیکن نہایت اہم بھی ہے۔ لہٰذا اسے مدنظر رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ جب متبادل موجود ہو تو پھر ہمیں قطعاً اپنی ساتھی مخلوق کو قتل کر کے اپنی غذا نہیں بنانا چاہیے۔ دوسری بات پودوں کے متعلق یہ ہوئی کہ پودوں کا کوئی حصہ کاٹ لیا جائے تو وہ دوبارہ تخلیق ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک نے کہا کہ چھپکلی کی دم بھی دوبارہ آ جاتی ہے۔ دیکھیے چھپکلی کی دم والا معاملہ ایک استثنائی معاملہ ہے۔ جب کہ پودوں میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ پھل توڑتے ہیں اور نئے پھل آ جاتے ہیں۔ آپ شاخ تراشی کرتے ہیں اور نئی شاخیں آ جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنی گفتگو یہیں تک محدود کر لینی چاہیے کیوں کہ یہ بات لامحدود حد تک جا سکتی ہے۔

اب جہاں تک طبی نقطہ نظر کا تعلق ہے تو اس حوالے سے انھوں نے بھی کچھ باتیں کی ہیں اور اس سے قبل میں نے بھی کچھ باتیں عرض کی تھیں۔ اب یہ ہمارے قابل اور محترم حاضرین کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ ان کی کہی گئی باتیں درست ہیں یا جو باتیں میں نے

کی تھیں وہ درست ہیں۔ جو فیصلہ سامعین کرنا چاہیں۔

اچھا یہ بات وہ بھول ہی گئے کہ میں نے کہا تھا کہ جب ہم حیوانی غذا استعمال کرتے ہیں تو ہم میں کچھ حیوانی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں یہ بات اس لیے کر رہا ہوں کہ میں نے ان کی گفتگو کا جواب دینا ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں لیکن یہ ایک نفسیاتی پہلو ہے۔ آپ اپنے جواب میں اس بات کے حوالے سے ضرور گفتگو کریں۔ اب بیشتر ڈاکٹر بھی کچی سبزیاں کھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ جہاں تک پکانے کا تعلق ہے بیش تر ڈاکٹر صحت بخش غذا کے طور پر سبزیاں کچی کھانے کا مشورہ دیتے ہیں، صرف وہ غذائیں اور اجناس جنھیں خام یا کچی حالت میں نہیں کھایا جا سکتا، انھی کو پکا کر کھانے کو کہا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک ممکن ہو کچی سبزیاں کھانا ہی بہتر ہے۔ اور ہم انڈین ویجی ٹیرین کانفرنس کی ہر میٹنگ میں صرف کچی سبزیاں ہی کھانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ زیادہ صحت بخش ہوتی ہیں، جہاں تک ہماری رائے ہے۔

رہا کتابوں کا سوال، تو ڈاکٹر ذاکر نائیک کو یہ کتابیں میں نے نہیں بلکہ میرے دوست سلیچا صاحب نے دی تھیں۔ جنھوں نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ بہرحال یہ بات غیر اہم ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اب میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ محض شور شرابا کر کے حقائق کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ ٹھیک ہے اگر آپ کو میرے دلائل مضبوط محسوس ہوں تو آپ مجھے داد دیں گے، اگر آپ کو فریق مخالف کے دلائل متاثر کریں تو آپ اسے داد دیں گے لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ محض اس بات سے حقیقت تبدیل نہیں ہوگی کہ آپ کو ایک بات بہت اچھی لگ رہی ہے اور آپ زور و شور سے اس کی داد دے رہے ہیں۔

میں نے ایک کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر دیپک چوپڑا کی لکھی ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب ایک فزیشن ہیں اور مطب بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں اور ڈاکٹر ڈین آرنش کی طرح وہ بھی ایک باقاعدہ ڈاکٹر ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیقات کی

روشنی میں ایک نظریہ پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ ہمارے جذبات و احساسات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ ہماری ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی نشوونما کو بھی متاثر کرتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ بیش تر نفسیاتی اور ذہنی عارضوں اور پیچیدگیوں کا سبب وہ لحمیاتی غذا ہوتی ہے جو لوگ کھاتے ہیں، اسی لیے اس سے منع کیا گیا ہے۔

یہ بات بالکل غیر منطقی ہے کہ جانوروں کو ذبح کر کے آپ سبزی خوروں کی مدد کر رہے ہیں۔ ہمیں جانوروں کی آبادی کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کا انتظام فطرت خود کر سکتی ہے۔ لیکن ہم تو خود جانوروں کی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں تا کہ انھیں ذبح کر سکیں، اسی لیے ایسا ہو رہا ہے اگر ہم یوں نہ کریں تو پھر کیا ہوگا؟ آپ جنگل کی طرف دیکھیں، وہاں ہر چیز ایک قدرتی نظام کے تحت چل رہی ہے۔ لہٰذا ہر چیز خود ہی توازن میں آ جائے گی۔ اس کے بارے میں کسی کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔

اب جہاں تک انسانی تاریخ کا تعلق ہے، جس کا ذکر ترویدی صاحب نے بھی کیا اور ذاکر نائیک صاحب نے بھی، تو اس کے بارے میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ قدیم تاریخ کے بارے میں جین مت کا ایک اپنا تناظر ہے۔ ہمارے متونِ مقدسہ میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ کے لوگ ایک بہت بڑے درخت کے نیچے رہتے تھے اور انھیں کافی مقدار میں نباتاتی خوراک دستیاب ہو جاتی تھی، انھیں اپنی خوراک کے لیے شکار نہیں کرنا پڑتا تھا۔

دوستو! یقیناً میرے پاس مزید وقت موجود ہے لیکن میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ ہمیں مزید اس قسم کا مباحثہ نہیں کرنا چاہیے اور حاضرین کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ گفتگو میں شریک ہو سکیں۔ سوالات و جوابات کے لیے زیادہ وقت ہونا چاہیے۔

شکریہ

☆......☆......☆

جوابی خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

معزز مہمانانِ گرامی، بزرگو، بھائیو اور بہنو! میں آپ سب کو دوبارہ خوش آمدید کہتا ہوں۔
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

میں کچھ بھی نہیں بھولا، اگر آپ کو یاد ہو تو میں نے اپنے مقررہ وقت سے ایک منٹ زیادہ لیا، لہٰذا آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں بھول گیا ہوں گا۔ اگر آپ مجھے پانچ گھنٹے بھی مزید دیں، اور آپ یہاں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں تو میں بولنے کے لیے تیار ہوں، کیوں کہ وقت آپ نے ہی محدود کیا تھا۔ مجھے اپنے پچاس منٹ کے لیے انتخاب کرنا تھا۔ میں تو دو گھنٹے مزید بولنا چاہوں گا، بلکہ پورا دن بولنا چاہوں گا کیوں کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔ میں مسلسل تقریر کر سکتا ہوں کیوں کہ خدا کا شکر ہے کہ میں گوشت خور ہوں۔

زاویری صاحب نے کہا کہ میں نے کہا تھا...... ''کوئی مذہب گوشت خوری سے منع نہیں کرتا'' ...... حالاں کہ میں نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ...... ''کوئی بھی مذہب گوشت خوری سے منع نہیں کرتا''، میں نے یہ کہا تھا کہ...... ''کوئی بھی اہم مذہب گوشت خوری سے منع نہیں کرتا'' ...... یہ گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے میں نے کہا تھا کہ! ...... ''کوئی بھی اہم مذہب ......'' اور جین مت کوئی بڑا یا اہم مذہب نہیں ہے۔ جو کتابیں آپ نے خود مجھے دی ہیں ان کے مطابق جین ہندوستان کی آبادی کا ۰٫۴ فی صد ہیں۔ اعشاریہ چار فی صد، یعنی ایک فی صد بھی نہیں۔ تو کیا آپ جین مت کو ایک اہم مذہب کہہ سکتے ہیں۔ پوری دنیا کو تو چھوڑیے کیا آپ اسے ہندوستان کی حد تک بھی ایک اہم مذہب قرار دے سکتے ہیں؟ پوری دنیا میں تو معاملہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

میں جین مت کے حوالے سے کی گئی باتوں کا بھی جواب دے سکتا ہوں۔ لیکن اس پروگرام

کے ناظم مجھے اجازت نہیں دیں گے۔ مجھے اسلام تک محدود رکھا گیا ہے۔ حالاں کہ آپ جانتے ہیں میں تقابلِ ادیان کا طالب علم ہوں اور جین مت کے حوالے سے بات کر سکتا ہوں۔

ڈاکٹر رشمی بھائی زاویری نے یہ بھی کہا کہ میں نے ان کی اس بات کا جواب نہیں دیا کہ گوشت کھانے سے حیوانی جبلت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے جواب دیا تھا، میرا خیال ہے آپ نے سنا نہیں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ ہم بھیڑ، بکری جیسے پر امن جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں کیوں کہ ہم خود بھی پر امن رہنا چاہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب میں نے گفتگو کا آغاز کیا تو میں نے کہا کہ السلام علیکم یعنی آپ سب پر سلامتی ہو۔

مزید برآں انھوں نے کہا کہ میں نے ڈاکٹر ڈین آرنش کا ذکر نہیں کیا۔ میں انھیں چیلنج کرتا ہوں کہ کیا کسی بھی میڈیکل کالج کے نصاب میں ڈاکٹر آرنش کی کتاب شامل ہے۔ میں نے کہا تھا ''مستند کتاب'' محض غذائیت کے حوالے سے لکھی گئی کتاب نہیں۔ ایسی کتابوں کے بارے میں تو میں ڈاکٹر ولیم ٹی جارڈس کے حوالے سے پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ سائنسدان اور طب سے وابستہ حضرت بھی سبزی خوروں کے نظریات سے مکمل طور پر محفوظ نہیں ہیں۔ میرے الفاظ بالکل واضح تھے۔ یہ علم طب کی کتاب نہیں ہے۔ غالباً اس نے غذا اور غذائیت کے حوالے سے کتاب لکھی ہوگی۔ ڈاکٹر ڈین آرنش یا جو کچھ بھی موصوف کا نام ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بہت مشہور ہوں، لیکن میں نے ان کا نام نہیں سنا۔ میں بات کو الجھا نہیں رہا، واضح بات کر رہا ہوں، میں ان کا نام پہلی دفعہ سن رہا ہوں، لہٰذا میں زاویری صاحب سے کہوں گا کہ وہ چیک کریں کہ کیا ان کی کتاب علم طب کی نصابی کتاب کے طور پر کسی کالج میں پڑھائی جا رہی ہے؟ اس بات سے اس کتاب کے مستند ہونے کا پتہ چلے گا۔

انھوں نے کہا کہ ہمیں مویشیوں کے بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے لیکن ہم کہاں پریشان ہو رہے ہیں؟ پریشان تو آپ لوگ ہو رہے ہیں۔ ہم کیوں پریشان ہوں گے۔ قدرت نے انھیں بنایا ہی اسی طرح ہے۔ آپ جتنے جانوروں کو ماریں گے ان کی جگہ مزید مویشی لے لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بنایا ہے، اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے۔

اگر ہم شیر، چیتوں وغیرہ کو مارنا شروع کر دیں تو ان کی نسل معدوم ہو جائے گی، لہٰذا ہم ان کا گوشت نہیں کھاتے۔ مویشیوں کا گوشت ہم کھاتے ہیں۔ کیوں کہ خدا نے انھیں اسی طرح بنایا ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر نہ چلیں تو ان کی آبادی زیادہ ہو جائے گی۔ جہاں تک پودوں کو کاٹنے کا تعلق ہے، لوگ کہتے ہیں کہ...... ''اگر آپ کسی پودے کا پھل توڑ بھی لیں تو ماں تو زندہ ہے'' ...... اسی طرح مویشیوں کا معاملہ ہے کہ ہم ان کا گوشت کھاتے ہیں کیوں کہ ان کی ماں تو زندہ ہے۔ لہٰذا اگر اس منطق کو تسلیم کر بھی لیا جائے کہ پودوں کی بقا کو خطرہ نہیں ہے تو پھر مویشیوں کی بقا کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مزید برآں میں کہتا ہوں کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ اور میں ڈاکٹر آرنش کی اس بات سے بھی پورا اتفاق کرتا ہوں کہ بعض بیماریوں کے لیے سبزیاں مفید ہیں۔ میں بھی یہی کہتا ہوں، میں نے کب کہا کہ ایسا نہیں ہے۔ ہمارا موضوع یہ نہیں ہے کہ کون سی غذا صحت کے لیے بہتر ہے؟ بلکہ بات تو اس حوالے سے ہو رہی ہے کہ گوشت کھانا جائز ہے یا ناجائز؟

اور میں ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی مستند طبی کتاب ایسی دکھا دیں جو گوشت پر پابندی لگاتی ہو۔ وہ کتابیں نہیں جو رشبھ فاؤنڈیشن یا انڈین ویجی ٹیرین کانگریس والے بانٹ رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کتابوں میں ایسی باتیں موجود ہیں جو کہ غیر مصدقہ، نیم مصدقہ یا غیر ثابت شدہ ہیں۔ پھر یہ کہ اسلام کا ایک طریقہ کار ہے جو کہ ''پرہیز علاج سے بہتر ہے'' کے اصول کے مطابق ہے اور بہت سے سوالوں کا جواب بھی فراہم کر دیتا ہے۔ جب ہم کسی جانور کو ذبح کرنا چاہیں تو باقاعدہ ''ذبیحہ'' کرتے ہیں۔ ہم گلے کی تمام رگیں کاٹ دیتے ہیں لیکن ریڑھ کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جب ریڑھ کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچتا اور تمام رگیں سانس کی نالی سمیت کاٹ دی جاتی ہیں تو دل کچھ دیر تک دھڑکتا رہتا ہے۔ اور یوں دل جسم کا تمام خون باہر نکال دیتا ہے۔

خون جراثیم وغیرہ کے لیے ایک بہت اچھا واسطہ ہوتا ہے۔ اگر جانور کو اس طریقے

سے ذبح کیا جائے تو بہت سی بیماریاں جو خون کے ذریعے منتقل ہوتی ہیں اور جن کا آپ نے نام بھی لیا، اُن سے محفوظ رہا جاسکتا ہے، گوشت نسبتاً زیادہ عرصے تک محفوظ رہتا ہے، اگر آپ جانور کو اسلامی طریقے سے ذبح کریں۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو بے رحمی ہے۔ تم لوگ اتنی بے رحمی سے مارتے ہو۔ جانور تکلیف دہ موت مرتا ہے۔

حالاں کہ جب ہم اسلامی طریقے سے جانور کو ذبح کرتے ہیں تو تمام رگیں کٹ جانے کی وجہ سے تکلیف کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اعصاب کی وجہ سے ہم تکلیف محسوس کرتے ہیں، ان کی طرف خون کی روانی ختم ہو جاتی ہے۔ جانور کے پھڑکنے کی وجہ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ خون تیزی سے نکلنے کی وجہ سے اس کا جسم اچھلتا ہے۔ جانور تکلیف کی شدت سے نہیں مرتا بلکہ وہ ایک غیر تکلیف دہ موت مرتا ہے۔ ایک تو اسلام ذبیحہ کے ذریعے خون سے منتقل ہونے والی بیماریوں کا سدّ باب کر دیتا ہے۔ دوسرا آپ کے علم میں ہوگا کہ بعض ممالک میں جانوروں کو کچھ ہارمون دیے جاتے ہیں تاکہ وہ موٹے تازے ہو جائیں اور جانور پالنے والے لوگوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ قیمت مل سکے۔ اس کا ذکر زاویری صاحب نے بھی کیا لیکن اس ہارمون کا نام نہیں بتایا۔ اسے DES (Diacecerol Beseserol) کہتے ہیں۔ اسلام نے اس کام کو بھی قطعی حرام قرار دیا ہے۔ یہ ہارمون جانور کے جسم میں داخل کرنے کے بعد اگر آپ درست طریقے سے ذبیحہ کریں تو بھی یہ جانور حرام ہی رہیں گے، حلال نہیں ہوں گے۔

لہٰذا اگر مویشیوں کو یہ ہارمون دیے جاتے ہیں یا انھیں غیر نباتاتی غذا کھلائی جاتی ہے تو ان مویشیوں کا گوشت کھانا ہمارے لیے جائز نہیں۔ مزید برآں اگر حفظانِ صحت کے اصولوں کا خیال رکھا جائے اور گوشت کو صحیح طریقے سے پکایا جائے تو ڈاکٹر زاویری نے جن بیماریوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بیش تر کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

غیر نباتاتی غذاؤں میں سے جو غذا سب سے خطرناک ہے اور عام طور پر کھائی بھی جاتی ہے وہ خنزیر کا گوشت ہے۔ یہ ۷۰ سے زاید مختلف بیماریوں کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر آپ لحم خنزیر کھاتے ہیں تو آپ کو ۷۰ بیماریوں میں سے کوئی بھی بیماری لگ سکتی

ہے۔ ان بیماریوں میں امراضِ قلب بھی شامل ہیں جیسا کہ زاویری صاحب نے کہا؛ کیوں کہ سور کا گوشت انسانی جسم میں پٹھے نہیں بلکہ چربی بناتا ہے۔ یہ چربی شریانوں کی دیواروں پر جم جاتی ہے اور Artherssclerosis اور Hyper Tension وغیرہ کا سبب بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں چار مقامات پر خنزیر کے گوشت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

فرمایا گیا ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ

[البقرہ: ۱۷۳]

"اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ، خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو۔"

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۝

[المائدہ: ۳]

"تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا گیا ہو، وہ جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مر گیا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی تمہارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔"

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ

[النحل: ۱۱۵]

"اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ

جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔"

چوں کہ سور کے گوشت کو حرام کیا گیا ہے، اس لیے ہم اس سے دور رہتے ہیں اور یوں اس کے گوشت کے ذریعہ پھیلنے والی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝ [طٰهٰ: ۸۱]

"کھاؤ ہمارا دیا ہوا پاک رزق اور اسے کھا کر سرکشی نہ کرو، ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا اور جس پر میرا غضب ٹوٹا وہ پھر گر کر ہی رہا۔"

جن بیماریوں کا ذکر زاویری صاحب نے کیا، ان میں سے بیش تر افراط اور زیادتی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر نباتاتی غذا بھی ضرورت سے زیادہ کھائی جائے تو وہ بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور میں کوئی نظریاتی یا شدت پسند گوشت خور بھی نہیں ہوں۔ لہٰذا میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ اگر آپ ضرورت سے زیادہ خوراک سے پرہیز کریں گے تو بیش تر بیماریوں سے بھی محفوظ رہیں گے۔ اگر آپ اسلامی ہدایات کی پابندی کریں گے، جانور کو اسلامی طریقے سے ذبح کریں گے، جانور کا خون پوری طرح نکلنے دیں گے، مویشیوں کو ہارمون دینے سے اجتناب کریں گے، غذا کو حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق اچھے طریقے سے پکائیں گے، سور کے گوشت سے دور رہیں گے اور ضرورت سے زیادہ کھانے سے پرہیز کریں گے تو بیش تر بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔ اس بات سے بیش تر دلائل کا جواب مل جاتا ہے۔

کچھ باتیں رہ گئیں ہیں لیکن سوالات کے وقفے کے دوران اگر وقت کافی ہوا اور آپ نے ان کے بارے میں سوالات پوچھے تو میں جواب دوں گا۔ آپ کو علم ہے یہ لوگ صحت بخش غذا کا ذکر کر رہے ہیں اور اس حوالے سے مختلف مطالعات و تجربات کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں صرف ان چیزوں کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر ولیم کے مطابق، یہ بھی کوئی بہت مشہور صاحب ہوں گے، سبزی خوری سے انسان کی عمر چھ سال بڑھ جاتی ہے۔

یعنی اگر آپ لحمیاتی غذا کی بجائے سبزیاتی غذا استعمال کریں گے تو چھ سال زیادہ زندہ رہیں گے۔ یہ کیا ہے؟ مفروضے، محض مفروضے۔

اگر آپ تجزیہ کرنا چاہیں، تو اس حوالے سے کچھ اعداد و شمار اکٹھے کیے گئے تھے۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں تھے جنھوں نے ۱۰۰ سال سے زیادہ عمر پائی۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۳۲ء اور ۱۹۵۲ء کے درمیان جمع کیے گئے۔ اور ان اعداد و شمار کی روشنی میں Osegares نامی ایک شخص نے ایک کتاب لکھی، جس کا نام ہے "Living to be Hundered"۔ ایسے بارہ سو لوگ تھے جنھوں نے سو سال سے زیادہ عمر پائی، اور یہ کیوں کر ممکن ہوا؟ ہر بات بتائی گئی ہے۔ اس کتاب میں ہر تفصیل موجود ہے۔ ان کی غذا کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ان ۱۲۰۰ لوگوں میں کتنے سبزی خور تھے؟ ذرا اندازہ لگائیں۔ چار، جی ہاں، صرف چار لوگ۔ اور یہ سروے سبزی خوری یا گوشت خوری کے حوالے سے نہیں کیا گیا تھا۔ سروے کی وجوہات مختلف تھیں۔ لیکن غذا کے بارے میں معلومات موجود تھیں اور یہ محض "مطالعات" نہیں بلکہ "حقائق" ہیں۔

بیس سال کے عرصے کے دوران میں جو لوگ ایک سو برس سے زیادہ عمر تک زندہ رہے ان میں سے صرف چار لوگ سبزی خور تھے۔

کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ "الکحل" کیا ہوتی ہے؟ یہ لحمیاتی شے ہے یا نباتاتی؟ "الکحل" ایک نباتاتی خوراک ہے۔ کیوں کہ پھلوں کے رس سے بنائی جاتی ہے اور صرف "الکحل" کی وجہ سے ہونے والی بیماریاں تمام لحمیاتی غذاؤں سے ہونے والی بیماریوں کی مجموعی تعداد سے بھی بہت زیادہ ہیں۔ صرف ایک نباتاتی غذا سے۔ تو کیا الکحل کی وجہ سے مجھے یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ تمام نباتاتی غذاؤں پر پابندی لگا دی جائے؟

آج سائنسدان اس بات پر متفق ہیں اور زاویری صاحب بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اموات کی سب سے اہم وجہ "الکحل" ہے۔ لہٰذا میں یہ نہیں کہتا کہ تمام نباتاتی غذاؤں پر پابندی لگا دی جائے بلکہ میں وہی کہتا ہوں جو قرآنِ مجید کہتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ

مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ [المائدہ: ۹۰]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے اور شیطانی کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔''

الکحل یا شراب پینا ایک شیطانی عمل ہے، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ میں صرف شراب سے منع کرتا ہوں، تمام نباتاتی غذاؤں سے نہیں۔ اسی طرح دوسرے نمبر پر تمباکو نوشی ہے۔ تمباکو، لحمیاتی شے ہے یا نباتاتی؟ کیا آپ شراب کے نقصانات سے بچ سکتے ہیں؟ کیا آپ تمباکو کے نقصان سے بچ سکتے ہیں؟ صرف ایک ہی صورت میں، یعنی ان چیزوں سے اجتناب کر کے، اگر لوگ اجتناب نہیں کرتے تو پھر پابندی کا مرحلہ آتا ہے۔ لہٰذا شراب کو حرام کر دیا گیا۔

تقریباً چار سو مسلمان علمائے کرام تمباکو نوشی کے خلاف بھی فتویٰ دے چکے ہیں۔ تمباکو نوشی پر پابندی لگا دی گئی کیوں کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ آپ نے ''کیسری دال'' کے بارے میں سنا ہے؟ ہندوستان کی حکومت نے اس پر پابندی لگا دی ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے Spastic Paraplegia نامی بیماری ہو جاتی ہے جو کہ موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

اس طرح متعدد حکومتوں نے شراب پر پابندی لگا دی ہے۔ حکومت سعودی عرب اور دیگر کئی ممالک نے پابندی لگائی ہوئی ہے۔ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں بھی شراب نوشی پر پابندی ہے۔ سنگاپور میں عوامی مقامات، دفاتر میں اور دورانِ سفر تمباکو نوشی کرنا جرم ہے۔ ہندوستان کی حکومت نے کیسری دال پر پابندی لگا دی۔ اگر کسی چیز کے نقصانات سے بچاؤ کی کوئی صورت نہ ہو تو پھر اس پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے میں کسی ایک بھی ایسی حکومت کے بارے میں نہیں جانتا جس نے تمام لحمیاتی غذاؤں پر بلا استثنا پابندی لگا دی ہو۔ ہاں کسی مخصوص چیز پر پابندی ہو سکتی ہے، جس طرح سعودی عرب میں سور کے گوشت پر پابندی ہے۔ جب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہوتی تو

آپ پابندی لگادیتے ہیں۔

اور ہمارے مباحثے کا موضوع یہ نہیں تھا کہ: ''سبزی خوری بہتر ہے یا گوشت خوری'' بلکہ یہ تھا کہ ''گوشت خوری جائز ہے یا ناجائز؟'' اور میں نے بیس نکات کی ایک فہرست پیش کی تھی اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ رشمی بھائی زاویری نے اپنی گفتگو پانچ منٹ پہلے ہی ختم کردی تاکہ انھیں ان نکات کا جواب نہ دینا پڑے۔ مجھے اگر آپ ایک گھنٹہ بھی مزید دیں گے تو میں گفتگو کروں گا۔ متعدد پودے ایسے ہیں جو کہ زہریلے ہیں، دھتورا ایک پودا ہے اور زہریلا ہے۔ اس مسئلے کا حل کیا ہے، یہی کہ ان چیزوں سے دور رہا جائے۔ احتیاط کی جائے۔

پانی بے شمار بیماریوں کو پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ہیضہ، ٹائیفائیڈ وغیرہ۔ اس میں کئی طرح کے جراثیم اور بیکٹیریا ہوسکتے ہیں۔ میں آپ کو بہت سے نقصانات بتاسکتا ہوں جو کہ پانی کی وجہ سے ہوسکتے ہیں۔ تو آپ کیا کریں گے؟ کیا پانی پر پابندی لگادیں گے؟ نہیں، بلکہ آپ ان نقصانات سے بچاؤ کی کوشش کریں گے۔ آپ پانی صاف کریں گے تاکہ ان بیماریوں سے بچ سکیں۔

اسی طرح کیا آپ دودھ کے بارے میں جانتے ہیں، دودھ بھی بہت سی بیماریوں کا سبب بن سکتا ہے۔ میں آپ کو ان بیماریوں کی ایک طویل فہرست سنا سکتا ہوں۔ سو آپ کیا کرتے ہیں؟ کیا آپ دودھ پر پابندی لگادیتے ہیں؟ نہیں بلکہ آپ اسے جراثیم سے پاک کرتے ہیں، پیسچرائز کرتے ہیں، آپ دودھ کو ناجائز قرار نہیں دے دیتے۔ کیوں کہ یہ ایک طبی رویہ نہیں ہوگا۔ یہاں میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ دودھ نباتاتی غذا ہے یا لحمیاتی۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر نقصانات سے بچاؤ ممکن نہ ہو تو آپ پابندی لگاتے ہیں، میں نے متعدد وجوہات بیان کی تھیں، جن کا کوئی جواب زاویری صاحب نے نہیں دیا، جن کی وجہ سے دنیا کی کسی حکومت نے یا دنیا کے کسی اہم مذہب نے آج تک گوشت خوری پر عام پابندی نہیں لگائی۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ:

''گوشت خوری انسان کے لیے جائز ہے۔''

فاضل مقرر کی گفتگو کا جواب دیتے ہوئے اگر میں نے سبزی خور حضرات کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہو تو اس کے لیے میں خلوصِ دل سے معذرت خواہ ہوں، میں اپنی گفتگو کا اختتام قرآنِ مجید کی اس آیت پر کرنا چاہوں گا۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

[بنی اسرائیل: ۸۱]

''اور اعلان کردو کہ؛ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔''

☆......☆......☆

حصہ دوم

سوالات وجوابات

سوال نمبر ۱:...... محترم مہمانِ خصوصی اور زاویری صاحب، میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے مختلف زاویوں سے اس موضوع پر گفتگو کی کہ گوشت خوری انسان کے لیے ممنوع ہے اور آپ نے مہاویر کی بات کی کہ انھوں نے جانوروں کو مارنے اور اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی زندگی لینے سے منع کیا ہے۔ براہِ مہربانی مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کے بھگوان مہاویر نے یہ کہا ہے کہ آپ سبزیاں کھا سکتے ہیں؟ میرا مطلب ہے وہ خود تو پھل اور سبزیاں توڑ کر نہیں کھاتے تھے۔ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہتے تھے اور درخت سے ٹوٹ کر گرنے والے پھل ہی ان کی غذا تھے۔ آپ یہ وضاحت کیجیے کہ جین مت کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

رشمی بھائی زاویری:...... میں آپ کا سوال سمجھ گیا ہوں اور جواب عرض کرتا ہوں۔ دیکھیے بات یہ ہے کہ، جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا، بھگوان مہاویر نے کہا ہے کہ پودے بھی جاندار ہوتے ہیں۔ لہٰذا جین مت کے متونِ مقدسہ کی رُو سے ایک جین متی کے لیے سبزی خوری بھی ممنوع ہے۔ لیکن مجبوریوں کی وجہ سے ہر شخص جین متی نہیں بن سکتا۔ اسی لیے مہاویر نے کہا کہ کم از کم غیر ضروری ہلاکت تو نہ کی جائے یعنی جانوروں کی جان تو نہ لی جائے۔ ایک جین متی کو کبھی پودے کی جان لینے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔

سوال نمبر ۲:...... میرا سوال یہ ہے کہ ایک ویجی ٹیرین سوسائٹی کی جانب سے متعدد کتابچے تقسیم کیے گئے ہیں۔ ان میں قرآنِ مجید کی سورۂ حج سے یہ آیت پیش کی گئی ہے کہ...... ''نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں اور نہ خون، مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''...... اور اس آیت سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ اسلام گوشت خوری کے خلاف ہے۔ ان میں قرآن وحدیث سے جانوروں کے حق میں متعدد دیگر حوالے بھی موجود ہیں، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... میں اس بہن کا شکریہ ادا کرتا ہوں کیوں کہ انھوں نے ایک بڑا بنیادی نوعیت کا سوال پوچھا ہے۔ متعدد تنظیمیں ایسا لٹریچر تقسیم کر رہی ہیں جن میں قرآن وحدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلام گوشت خوری

کے خلاف ہے اور مسلمانوں کو گوشت خوری نہیں کرنی چاہیے۔ اور اس مباحثے کی وجہ آغاز بھی یہی بات بنی تھی۔ میں نے اس حوالے سے بات نہیں کی، کیوں کہ مجھے مذہبی مباحثے سے پرہیز کرنے کو کہا گیا تھا۔ لیکن اب چوں کہ مجھ سے سوال پوچھا گیا ہے، لہٰذا مجھے جواب بھی دینا ہوگا۔

یہ کتابچہ مجھے دھن راج سلیچا صاحب نے دیا تھا۔ اس کتابچے میں قرآنِ مجید کی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ کتابچے میں تو حوالہ کچھ غلط چھپا ہے، لیکن دراصل یہ قرآنِ مجید کی بائیسویں سورۃ یعنی سورۂ حج کی سینتیسویں آیت ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ط

[الحج : ۳۷]

''نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''

میں اس بات سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔ اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اسلام میں قربانی کا تصور بعض دیگر مذاہب کی طرح نہیں ہے۔ کچھ مذاہب کا خیال ہے کہ خدا کو زندہ رہنے کے لیے گوشت اور خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ آیت بتاتی ہے کہ جب آپ قربانی کرتے ہیں تو جانور کا خون یا گوشت اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتا بلکہ آپ کی نیت، آپ کا تقویٰ اور وہ تدین جس کے تحت آپ قربانی کرتے ہیں، وہی اللہ تعالیٰ تک پہنچتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ہم عیدالضحیٰ کے موقع پر قربانی کرتے ہیں تو گوشت کا کم از کم ایک تہائی حصہ غریب، ضرورت مند لوگوں کو دیتے ہیں، ایک تہائی رشتہ داروں اور دوستوں کو دیتے ہیں اور ایک تہائی اپنے ذاتی استعمال میں لاتے ہیں۔ اس میں کوئی ''اللہ کا حصہ'' نہیں رکھا جاتا۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ط [الانعام : ۱۴]

''کہو، اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر

جو زمین و آسمان کا خالق ہے، اور جو روزی دیتا ہے، روزی لیتا نہیں ہے؟''

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو رزق فراہم کرنے والا ہے۔ وہ خود کھانے پینے کی ضرورت سے پاک ہے۔ اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جب آپ قربانی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کی نیت کو دیکھتا ہے، اسے قربان کیے جانے والے جانور کے گوشت اور خون کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک حوالہ اور ہے۔ حوالے تو خیر کئی ہیں لیکن اگر میں ہر ایک کا جواب دوں تو تقریباً ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔ لہٰذا میں صرف ایک حوالے کا ذکر کروں گا۔

سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ [البقرہ: ۲۰۵]

''جب وہ پلٹتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل (انسانی) کو تباہ کرے۔ حالاں کہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔''

اس آیت کا حوالہ دینے کے بعد نیچے لکھا گیا ہے...... ''لہٰذا آپ کو گوشت خوری سے پرہیز کرنا چاہیے۔'' یہ ان کی اپنی تعبیر ہے۔ ترجمہ بھی درست نہیں کیا گیا، لیکن بہر حال اگر آپ آیت کو اس کے سیاق و سباق میں دیکھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ فسادی ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور فصلوں کو خراب کرتے ہیں۔ مویشیوں کو یا نسل انسانی کو تباہ کرتے ہیں۔ یہاں ذکر خوراک کے ذبح کرنے کا نہیں بلکہ تباہ کرنے کا ہے۔ اور اللہ ایسے فسادیوں کو پسند نہیں کرتا۔

لہٰذا اگر آپ محض فساد کی نیت سے کسی جانور کو قتل کرتے ہیں یا کوئی پودا ہی اکھاڑتے ہیں تو آپ غلط کرتے ہیں اور اللہ اسے پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ نہیں جناب اس سے حصول خوراک کے لیے جانور کو مارنے کی بھی ممانعت ثابت ہوتی ہے تو میں یہ کہوں گا

کہ جناب اس آیت میں تو فصلوں کا بھی ذکر ہے۔

یہ دلیل دینے کا انتہائی غلط طریقہ ہے۔ اپنی بات کا تجزیہ تو یہ لوگ کرتے ہی نہیں۔ اس آیت میں فصلوں کا یعنی نباتات کا بھی ذکر ہے۔ اگر آپ اس آیت سے گوشت خوری کی ممانعت ثابت کرنے کی کوشش کریں گے تو سبزی خوری کی ممانعت بھی ثابت ہوگی۔ حالاں کہ اصل یہ ہے کہ اس آیت میں سبزی خوری سے منع کیا گیا اور نہ ہی گوشت خوری سے، جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، ان کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ باقی چیزوں کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَـٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○ [البقرہ: ١٦٨]

''اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انھیں کھاؤ اور شیطان کے بنائے ہوئے راستوں پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

جہاں تک جانوروں کے ساتھ سلوک کا تعلق ہے، احادیثِ مبارکہ میں ہمیں اس حوالے سے متعدد ہدایات ملتی ہیں۔ بخاری شریف کی ایک حدیث کا مفہوم ہے:

''ایک شخص نے پیاسے کتے کو پانی پلایا۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس شخص کو اس کام کا اجر ملے گا۔'' صحابہؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ: ''کیا ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر بھی اجر ملتا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''ہاں! جانور کے ساتھ نیکی کرنا بھی موجب اجر وثواب ہے۔''

ذرا تصور کیجیے، آج سے چودہ سو برس پہلے، وہ دور جسے دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے، جب انسانوں کے ساتھ بھی جانوروں والا سلوک ہوتا تھا۔ اس وقت ہمارے پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ ﷺ نے جانوروں کے حقوق کی نشان دہی فرمائی۔ آپ ﷺ نے جانوروں پر ایک خاص حد سے زیادہ بوجھ لادنے سے منع فرمایا۔ آج ہندوستان میں ایک بیلوں کی جوڑی کے لیے ۵۰۰ کلوگرام کی حد مقرر ہے، لیکن ان پر ایک ٹن سے بھی زیادہ بوجھ لاد دیا جاتا

ہے۔ اسی طرح جانوروں کو ظالمانہ طریقے سے مارنے کی بھی ممانعت بخاری و مسلم کی احادیث میں وارد ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کے لیے ہمیشہ تیز دھار چھری استعمال کی جائے۔ مختصراً یہ کہ جانوروں کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے، لیکن بہرحال وہ ہماری جائز غذا ہیں۔

سوال نمبر ۳:...... ''انڈے کے بارے میں سو حقائق'' نامی کتابچے کے صفحہ ۸ اور صفحہ ۹ پر حقیقت نمبر ۱۳ کے ذیل میں تحریر ہے کہ...... ''ایتھوپیا کے رہنے والوں کا خیال ہے کہ اگر حاملہ عورت انڈا کھائے تو اس کا بچہ گنجا پیدا ہوگا اور یہ بچہ افزائش کے لحاظ سے بھی کمزور ہوگا۔''...... اسی طرح حقیقت نمبر ۱۸ کے ذیل میں تحریر ہے کہ...... ''اگر کوئی بچہ دانت نکلنے سے قبل انڈا کھالے تو وہ ذہنی طور پر معذور ہو جائے گا۔''...... کیا یہ حقائق ہیں یا محض توہمات؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ یہ سائنسی حقائق ہیں تو برائے مہربانی انھیں باقاعدہ ثابت کریں اور اگر آپ کے خیال میں یہ محض توہمات ہیں تو پھر ''انڈے کے سو حقائق'' جیسی کتابیں کیوں پھیلا رہے ہیں؟

رشمی بھائی زاویری:...... شکریہ میری بہن! پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کتاب میں نے نہیں لکھی۔ دوسری بات یہ کہ میں نے وہ کتاب آپ کو دی بھی نہیں اور اس کتاب میں سے کسی بات کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ میں خاص طور پر اس کتاب کے حوالے سے جواب دوں۔ لیکن میں یہ بات ضرور کہوں گا جو میں نے پہلے بھی کی تھی کہ انڈے میں چوں کہ ضرورت سے زیادہ پروٹین، کولسٹرول اور Saturated Fats ہوتے ہیں، اس لیے انڈا انسانی صحت کے لیے مفید نہیں ہے۔ خاص طور پر حاملہ خواتین اور بچوں کی صحت کے لیے۔

سوال نمبر ۴:...... میں ڈاکٹر ذاکر نائیک سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا امراضِ قلب کی واحد وجہ لحمیاتی غذا ہی ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے ایک بہت اچھا سوال پوچھا ہے اور وہ یہ کہ کیا امراضِ قلب کی واحد وجہ لحمیاتی غذا ہے؟ یہ بات دراصل زاویری صاحب نے کہی تھی کہ

گوشت، وہ بڑا ہو یا چھوٹا یا مرغی کا ہو، وہ دل کے امراض کا باعث بنتا ہے۔ ان کی بات ٹھیک ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ نباتاتی غذاؤں میں کولسٹرول نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ امراضِ قلب کی وجہ غذا میں چکنائی اور کولسٹرول کی زیادتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ نباتاتی چکنائی اور کولسٹرول ہو یا لحمیاتی۔ نباتاتی غذاؤں میں بھی زیادہ کولسٹرول ہوسکتا ہے، مثال کے طور پر مختلف میوہ جات، گھی اور مکھن وغیرہ میں۔ ایک عام خاتون خانہ کو بھی اس بات کا علم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ذرائع ابلاغ میں اس قسم کے اشتہارات آتے رہتے ہیں کہ فلاں تیل استعمال کریں، یہ امراضِ قلب کا باعث نہیں بنتا۔ یعنی دوسرے تیل امراضِ قلب کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہ سادہ سی بات ہے جسے سمجھنے کے لیے ڈاکٹر ہونا ضروری نہیں۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور اس حیثیت سے چیلنج کرتا ہوں، میں زاویری صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ بتائیں کہ مکھن میں چکنائی ہوتی ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر امراضِ قلب میں مبتلا مریضوں کو مکھن اور مختلف مغزیات کے تیل وغیرہ استعمال کرنے سے منع کرتے ہیں۔ یہ بات ان کتابوں میں لکھی ہوئی ہے جو مجھے دی گئیں، جو میرے بھائی کو دی گئیں۔ ان میں لکھا ہوا ہے کہ نباتاتی غذاؤں میں کولسٹرول نہیں ہوتا۔ یہ کتابیں زاویری صاحب نے نہیں دیں، سلیچا صاحب نے دیں، لیکن بہرحال انھیں چھاپا جین تنظیموں نے ہی ہے۔ جو کہ افسوس ناک ہے۔

دیکھیے بہت سی باتیں کی گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انڈا امراضِ قلب کا سبب ہے۔ دیکھیے، انڈے میں کولسٹرول ہوتا ہے اور زیادہ ہوتا ہے، لیکن بنیادی سبب انڈا نہیں ہے۔ جدید تحقیق اور ڈاکٹر حضرات بھی یہی رائے دیتے ہیں کہ انڈے میں موجود کولسٹرول اصل مجرم نہیں ہے بلکہ اصل مجرم وہ Saturated Fats ہیں جن میں انڈے کو فرائی کیا جاتا ہے۔ اگر آپ انڈے کو گھی، مکھن وغیرہ میں تل کر نہ کھائیں تو امراضِ قلب کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ انسانی آبادی کا دوتہائی حصہ تو ایسا ہے جن کا جسمانی نظام کولسٹرول سے مطابقت پیدا کرسکتا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنتا۔ ایک تہائی لوگوں کو

کولسٹرول سے پریشانی ہوتی ہے، انھیں انڈے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ بصورتِ دیگر ایک آدھ انڈا روزانہ کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ سور کے گوشت کے ساتھ انڈا کھائیں گے یا روغنیات میں تل کر انڈا کھائیں گے تو پھر ظاہر ہے کہ آپ کے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔

جہاں تک گنجے پن کا تعلق ہے تو میں مثالیں نہیں دینا چاہتا۔ میں آپ کے سامنے مثالیں پیش نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ اس حال میں بھی دیکھیں تو بہت سے لوگ گنجے ہوں گے۔ دنیا کے کچھ عظیم فلسفی بھی گنجے تھے۔ میں ان کے نام نہیں لینا چاہتا کہ یوں آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ لہٰذا یہ بات محض غیر منطقی مفروضوں پر مبنی ہے۔ اور تحقیق ہمیشہ عملی ہونی چاہیے۔ مزید یہ کہ امراضِ قلب کے اسباب میں شراب نوشی اور تمباکو نوشی بھی اسی قدر اہم ہیں۔ ہاں امریکہ میں گوشت خوروں میں امراضِ قلب کی شرح زیادہ ہے، کیوں کہ وہاں چکنائی کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ اگر قرآنی ہدایات کی روشنی میں افراط سے پرہیز کیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ امریکہ میں سبزی خوروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، کیوں کہ وہاں سبزی خور ہونا ایک طرح سے فیشن بن گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں وہاں نباتاتی خوراک مہنگی ہوتی ہے۔ اگر آپ کے پاس مرسڈیز کار ہے تو آپ کا ایک سماجی مقام ہے۔ اسی طرح اگر آپ سبزی خور ہیں تو آپ کا ایک سماجی مقام ہے۔ امریکہ کی کل آبادی کا دو سے تین فی صد سبزی خوروں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ امیر لوگ ہیں اور اپنی صحت کا بہتر خیال رکھتے ہیں، لہٰذا ان میں امراضِ قلب کی شرح کم ہے۔ اسی طرح بہت سے سبزی خور شراب اور تمباکو سے بھی پرہیز کرتے ہیں جن میں ہمارے رشمی بھائی زاویری بھی شامل ہوں گے۔

لیکن کوئی بھی شخص اگر زیادہ چکنائی اور کولسٹرول والی غذائیں استعمال کرے گا، خواہ وہ نباتاتی ہوں یا لحمیاتی تو اسے امراضِ قلب کا خطرہ درپیش رہے گا۔ اگر آپ اس سے بچاؤ چاہتے ہیں تو قرآنی ہدایات پر عمل کریں اور افراط سے پرہیز کریں۔ اس سے مجھے ایک کہانی یاد آئی کہ ایک مذہبی شخصیت (پنڈت جی) نے کسی تقریب میں حسب عادت پُرخوری کا مظاہرہ

کیا اور چونسٹھ لڈو کھا لیے۔ گھر آئے تو بیوی نے کہا کہ کوئی چورن وغیرہ کیوں نہیں کھایا، انھوں نے جواب دیا:

ارے بھولی! عقل نہ آئی بن کے چھ بچوں کی ماتا
اگر چورن کی جگہ ہوتی تو میں دو لڈو اور نہ کھاتا

سوال نمبر ۵:...... دیکھیے میرے پاس ایک کتاب ہے جسے جین پبلی کیشنز نے چھاپا ہے، اس کا نام ہے ''گوشت خوری، سو حقائق''۔ اس کتاب میں گوشت خوروں کے کارٹون بنائے گئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ توہین آمیز ہے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا جین لوگوں کے لیے اس طرح لوگوں کی تذلیل کرنا جائز ہے؟ کیا ایسی کتابیں چھاپنا اچھا کام ہے جس میں اس طرح لوگوں کے جذبات مجروح کیے گئے ہوں؟

ڈاکٹر محمد نائیک:...... مقرر اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے۔ ہم نے انھیں یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کر سکتے ہیں۔ میں سوال پوچھنے والوں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اشتعال میں نہ آئیں۔

سوال نمبر ۶:...... سبزی خوری کی ترویج کے لیے لکھی جانے والی یہ کتاب جس کے مصنف گوپی ناتھ اگروال ہیں، اس کے صفحہ ۱۵ اور ۱۶ پر مصنف کہتے ہیں کہ ایک گائے اپنی ساری زندگی میں ۹۰ ہزار لوگوں کو غذا فراہم کر سکتی ہے لیکن جب اسے گوشت کے لیے ہلاک کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ ہزار لوگوں کو غذا فراہم کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ہلاک کرنا کوئی سمجھداری کی بات نہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... اب میں جواب کا آغاز کرتا ہوں۔ وقت کا آغاز بھی اب کیا جائے، میں گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ جواب کے درمیان اگر اس طرح ڈسٹرب کیا جائے گا تو پھر مجھے زیادہ وقت دیا جائے۔

سوال پوچھنے والی بہن نے ایک دلیل کے بارے میں سوال کیا ہے۔ یہ دلیل صرف اسی کتاب میں پیش نہیں کی گئی بلکہ دیگر کتابوں میں بھی موجود ہے۔ انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ انٹرنیٹ پر جائیں تو بھی سبزی خوری کے حق میں یہ دلیل نظر آئے گی۔ سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دودھ لحمیاتی غذا ہے یا نباتاتی؟

میں ژاویری صاحب پر تنقید نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ کتاب کہتی ہے کہ دودھ لحمیاتی غذا ہے اور دودھ سے فلاں فلاں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، لہٰذا ہمیں دودھ نہیں پینا چاہیے۔ لیکن سبزی خوروں کی ایک دوسری تنظیم جو خود کو لیکٹو سبزی خور کہتے ہیں وہ دودھ پیتے ہیں۔ لہٰذا میں پہلا سوال تو یہ پوچھنا چاہوں گا کہ دودھ لحمیاتی غذا ہے یا نباتاتی؟

آپ جانور کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے۔ لیکن دودھ دوہنے سے بھی اسے تکلیف تو ہوتی ہے، خصوصاً مشینوں کے ذریعے دودھ دوہنے سے تو جانور کو شدید تکلیف ہوتی ہے۔ آپ کسی دودھ پلانے والی ماں سے پوچھ سکتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے مصنوعی طور پر دودھ نکالنا پڑے تو یہ کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب آپ جانوروں کا دودھ دوہتے ہیں تو انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ اگر آپ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ جانور ہماری غذا کا ذریعہ ہیں تو آپ ان کا دودھ کس طرح دوہ سکتے ہیں؟ یہ تو مویشیوں کو لوٹنے والی بات ہوئی۔

اگر آپ جانوروں کو اپنی غذا کا ذریعہ نہیں سمجھتے اور پھر بھی ان کا دودھ دوہتے ہیں تو آپ ان کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ ان کے بچوں یعنی بچھڑوں وغیرہ کا حق مار رہے ہیں۔

جہاں تک اس مثال کا تعلق ہے کہ ایک گائے روزانہ دس کلوگرام دودھ دیتی ہے اور سالانہ تقریباً تین ہزار کلو دودھ دیتی ہے، جسے چھ ہزار لوگ پی سکتے ہیں، یوں اپنی پوری زندگی میں گائے نوے ہزار لوگوں کو ایک وقت کی خوراک فراہم کر سکتی ہے لیکن اس کا گوشت زیادہ سے زیادہ ایک ہزار لوگوں کو غذا فراہم کرتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ دودھ کو کلوگرام میں کون ماپتا ہے۔ دودھ کو تو لیٹر میں ماپا جاتا ہے، خیر اس بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، آپ مصنف سے پوچھیں۔ لیکن اس کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ ایک ہزار لوگوں کی غذا بہتر

ہے یا نوے ہزار لوگوں کی؟ اور یہ کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو کیوں مارا جائے؟

میں ان سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن یہاں توجہ کے قابل بات یہ ہے کہ دودھ دینے والی گائے کو کون ذبح کرتا ہے۔ کوئی گوالا کبھی کوئی دودھ دینے والی گائے قصائی کے حوالے نہیں کرے گا۔ اور کوئی قصائی بھی کبھی دودھ دینے والی گائے گوشت کے لیے نہیں خریدے گا۔ کیوں کہ دودھ دینے والی گائے کی قیمت کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ بمبئی میں ایک دودھ دینے والی گائے کی قیمت بیس پچیس ہزار روپے ہے جبکہ وہ گائے جس کی دودھ دینے کی عمر گزر چکی ہو تین سے پانچ ہزار روپے میں مل جاتی ہے۔ لہٰذا ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم گوشت خور لوگ کرتے یہ ہیں کہ جب تک مویشی دودھ دیتا ہے، اس وقت تک ہم اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور اس سے دودھ حاصل کرتے ہیں لیکن جب جانور بوڑھا ہو جاتا ہے تو ہم اسے ذبح کر کے اس کا گوشت بھی کھا لیتے ہیں۔ یوں ہمیں انڈے بھی مل جاتے ہیں اور مرغی بھی یا بالفاظ دیگر سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ایک تیر سے دو شکار۔ ہم زیادہ ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

پھر یہ لوگ کہتے ہیں کہ دیکھیں ان جانوروں سے اور کام لیے جا سکتے ہیں، انھیں بار برداری کے لیے اور زراعت وغیرہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپ کو واقعی جانوروں سے اس قدر محبت ہے تو آپ ان پر اضافی بوجھ کیوں ڈالنا چاہتے ہیں؟ مزید برآں ہندوستانی اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں موجود مویشیوں کی صرف ۲۵ فی صد تعداد افزائش کے قابل ہے۔ باقی ۷۵ فی صد افزائش کے قابل نہیں یا تو ان کی دودھ دینے کی عمر گزر چکی ہے اور یا وہ نر جانور ہیں۔

اب اس ۷۵ فی صد تعداد کے ساتھ آپ کیا کریں گے؟ ایک صورت یہ ہے کہ ان جانوروں کو ان کی طبعی عمر تک پالا جائے۔ لیکن اُن کے اپنے اعداد و شمار کے مطابق ایک بیل وغیرہ کی دیکھ بھال پر سالانہ اوسطاً اٹھارہ ہزار روپے کا خرچ آتا ہے۔ اچھا، گائیں بھینس دودھ دینے کی عمر گزرنے کے بعد چار پانچ سال تک زندہ رہتی ہیں۔ وہ کون سا کسان ہوگا جو

ان پر چار پانچ سال تک اٹھارہ ہزار روپے ہر سال خرچ کرتا رہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انھیں ''جیودیا'' والوں کے حوالے کر دیا جائے، وہ انھیں کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور پھر یہ جانور لوگوں کی فصلیں خراب کرتے رہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ کہ انھیں جنگل میں لے جا کر چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ گوشت خور جانوروں کی خوراک بن جائیں۔ آخری صورت ہی بہترین ہے کہ جب ان کی دودھ دینے کی عمر گزر جائے تو انھیں ذبح کر کے اپنی خوراک بنا لیا جائے۔ اس طرح کسان کا بھی فایدہ ہے کہ اسے کچھ رقم مل جاتی ہے اور جانور انسان کے زیادہ کام آتا ہے۔ کیوں کہ اس کا گوشت، کھال یہاں تک ہڈیاں بھی انسانی استعمال میں آجاتی ہیں۔

سوال نمبر ۷:...... کستور چند جین کے مطابق ''بائیسویں ترتھنکر نمی ناتھ کی شادی کے موقع پر جانوروں اور پرندوں کا گوشت کھایا گیا تھا اور شاستروں کے مطابق دلہا دلہن دونوں جین تھے۔ ایک اور واقعے کے مطابق ''چیپیا'' جو کہ مہاویر کے ہم عصر بھیم سین کی بیوی تھی، اس نے دورانِ حمل اپنے شوہر کا دل کھانے کی خواہش ظاہر کی اور بھیم سین کے بڑے بیٹے ابھے کمار نے اسے کسی جانور کا دل کھلا دیا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ تحریر کس قدر مستند ہے لیکن اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

<u>رشمی بھائی زاویری</u> :...... سب سے پہلے تو میں تقریب کے ناظم سے گزارش کرنا چاہوں گا کہ صرف وہی سوالات پوچھے جانے کی اجازت دیں جو میری گفتگو سے متعلق ہوں، کسی دوسری کتاب یا حوالے وغیرہ کا میں ذمہ دار نہیں۔ اس کے بارے میں نہ پوچھا جائے۔ لیکن چوں کہ میں ایک سچا جین ہوں لہٰذا میں یقیناً جین تاریخ کے بارے میں بھی علم رکھتا ہوں اور نمی ناتھ ترتھنکر کے بارے میں بھی۔ یہ واقعہ درست ہے اور اسی وجہ سے وہ ترک دنیا ہو کر جین متی بن گئے تھے، کہ میری شادی کے لیے اس قدر معصوم مخلوق کیوں ہلاک کر دی گئی۔ مجھے اپنے لیے کسی ایسی دعوت کی ضرورت نہیں۔ وہ جین متی اور بالآخر ترتھنکر بن گئے اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ تمام جین ترتھنکروں نے گوشت خوری کی قطعی ممانعت کی ہے۔ شکریہ۔ اور برائے مہربانی اپنے سوالات میری گفتگو تک محدود رکھیے۔

کیوں کہ مجھے لگتا ہے کہ جو کتابیں اچھی نیت سے دی گئی تھیں وہ ان لوگوں میں بانٹ دی گئیں اور انھیں میں سے سوالات کیے جا رہے ہیں۔

سوال نمبر ۸:...... میں ذاکر صاحب سے پوچھنا چاہوں گا کہ سبزی خوروں کی جانب سے جو ڈائٹ چارٹ تقسیم کیے جاتے ہیں، ان کے مطابق سبزیوں میں پروٹین اور آئرن وغیرہ کی مقدار گوشت کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بھائی نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے، میں اس کا جواب دوں گا، لیکن اس سے قبل میں زاویری صاحب کے سوال کا جواب دوں گا۔ جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے تو یہ کتابیں ہمیں یعنی اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کو رشبھ فاؤنڈیشن والوں نے دی تھیں۔ اور ان کے ساتھ تحریری طور پر یہ کہا گیا تھا کہ یہ کتابیں مفت بانٹنے کے لیے بڑی مقدار میں بھی فراہم کی جاسکتی ہیں تا کہ انھیں ممبئی کے مسلمانوں میں تقسیم کیا جاسکے۔ جی ہاں ''مفت''۔

بھائی کا سوال یہ ہے کہ غذائی چارٹ تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ جی ہاں ان کی بات درست ہے۔ ہمیں بھی یہ چارٹ ملے ہیں۔ ہم نے کسی ردّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ کیوں کہ ہمارے خیال میں یہ اس قدر اہم بات نہیں تھی۔ لیکن جب رشبھ فاؤنڈیشن کی طرف سے درخواست آئی کہ کیا آپ تیار ہیں؟ تو مجھے ہاں کرنی پڑی۔ آپ جانتے ہیں یہ کوئی سائنسی موضوع تو ہے نہیں۔ یہ تو ایک طے شدہ سی بات ہے لیکن انھوں نے کہا کہ ہم مباحثہ کرنا چاہتے ہیں اور میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اور آج میں جواب دینے کے لیے یہاں موجود ہوں، لوگوں کو اشتعال کس بات پر آ رہا ہے؟

مجھ سے آپ کسی بھی کتاب کے بارے میں سوال کریں۔ اگر سوال موضوع سے متعلق ہوگا تو میں ان شاء اللہ جواب دوں گا۔ اگر میں نہیں جانتا ہوں گا تو کہہ دوں گا کہ میں نہیں جانتا۔ اور اگر جانتا ہوں گا تو کہوں گا کہ جانتا ہوں۔ جی ہاں میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔ یہ چارٹ میرے پاس موجود ہے جس کے مطابق سبزیوں یا نباتاتی

غذاؤں میں پروٹین کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور یہ بات زاویری صاحب نے اپنے خطاب کے دوران میں بھی کی تھی۔ زاویری صاحب نے کہا تھا کہ تین ضروری امینوایسڈز ہوتے ہیں، آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھ لیں، تین نہیں آٹھ ہوتے ہیں۔ آٹھ امینوایسڈز ایسے ہیں جو جسم کے اندر تیار نہیں ہوتے اور بیرونی طور پر حاصل کرنا پڑتے ہیں۔ یعنی خوراک کے ذریعے فراہم کرنے ہوتے ہیں۔

لحمیاتی پروٹین حیاتیاتی لحاظ سے مکمل ہوتی ہے، اسی لیے انھیں Higher Protiens کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان میں آٹھوں ضروری امینوایسڈز موجود ہوتے ہیں۔ جب کہ نباتاتی پروٹین میں ہمیشہ ان میں سے ایک یا ایک سے زیادہ امینوایسڈز کم ہوتے ہیں۔ یہ ایک سائنسی جواب ہے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے مقدار زیادہ ہو، لیکن یہ پروٹین مکمل نہیں ہوتی۔ لحمیاتی پروٹین اعلیٰ معیار کی اور مکمل ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر آپ تجزیہ کریں تو جو فولاد آپ کو غذا کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، وہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو ''Hem Iron'' اور دوسرا ''Non Hem Iron''۔ ہیم آئرن آسانی سے جسم کا حصہ بن جاتا ہے۔ جب کہ نان ہیم آئرن آسانی سے جسمانی نظام میں جذب نہیں ہوتا۔ لحمیاتی غذاؤں میں Hem Iron اور Non Hem Iron دونوں ہوتے ہیں، جب کہ نباتاتی غذاؤں میں Non Hem Iron ہوتا ہے جو کہ آسانی سے جذب نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں اتفاق کرتا ہوں کہ بظاہر تو واقعی فولاد کی مقدار نباتات میں زیادہ نظر آتی ہے، پروٹین کی بھی مقدار زیادہ ہوسکتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ نباتاتی خوراک زیادہ صحت بخش ہوتی ہے، غلط ہوگا۔ یہ لوگوں کو گمراہ کرنے والی بات ہے بلکہ میں سیدھی سادی انگریزی میں یہ کہوں گا کہ یہ ''فراڈ'' ہے۔ اور یہ فراڈ کر کون رہا ہے؟ چند سبزی خور تنظیمیں۔ اور فراڈ یا دھوکہ دہی ہر مذہب میں ممنوع ہے۔ وہ چھوٹا مذہب ہو یا بڑا۔ کوئی اہم مذہب ہو یا غیر اہم۔ فراڈ ہر جگہ ناجائز ہے۔ میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں آپ دس دس روپے کے بیس نوٹ لینا پسند کریں گے یا پانچ سو کا ایک نوٹ؟ قدر کس

کی زیادہ ہوگی؟

امید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

سوال نمبر۹ :......زاوری صاحب، آپ نے اپنی گفتگو کے دوران میں کہا کہ گوشت کے ذریعے بیماریاں انسانوں تک منتقل ہوتی ہیں۔ لیکن پودے بھی تو مختلف بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں، لہٰذا آپ پودوں یا نباتاتی خوراک کے ذریعے بھی تو بیماریوں کا شکار ہوسکتے ہیں۔ آپ نے ڈاکٹر دیپک چوپڑا اور ڈاکٹر ڈین آرنش وغیرہ کا حوالہ دیا۔ لیکن ڈاکٹروں کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب میں چھوٹا تھا اور مجھے بخار ہوا تو ڈاکٹر نے نہانے سے منع کیا لیکن آج ڈاکٹر نہانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر نے امریکہ کے اعداد و شمار کا حوالہ دیا، تو کیا آپ کے پاس ہندوستان کے حوالے سے بھی کوئی اعداد و شمار موجود ہیں جن سے پتہ چلے کہ دل کی بیماریاں سبزی خوروں میں زیادہ ہوتی ہیں یا گوشت خوروں میں......؟

رشمی بھائی زاوری :...... دیکھیے جہاں تک امراضِ قلب کا تعلق ہے، تو یقیناً پودوں سے بھی اگر آپ گلے سڑے اور خراب پودے استعمال کریں گے تو وہ بھی جراثیم پیدا کرنے کا باعث بنیں گے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جانوروں میں موجود جراثیم زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور زیادہ بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ دوسری بات جو میں نے پہلے بھی کی یہ ہے کہ لحمیاتی غذا میں زیادہ پروٹین کولسٹرول اور Saturated Fats ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس طرح دو چیزیں یکجا ہوجاتی ہیں جو لحمیاتی غذا کو ناقابلِ قبول بنادیتی ہیں۔

جہاں تک اعداد و شمار کا تعلق ہے تو میرے پاس کتاب بھی موجود ہے اور مکمل اعداد و شمار بھی موجود ہیں لیکن یہ اعداد و شمار پیش کرنے کا موقع نہیں ہے۔ ہم یہاں اعداد و شمار پر بحث نہیں کرسکتے۔ میرے پاس جو اعداد و شمار ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ گوشت خوری زیادہ امراضِ قلب کا سبب بنتی ہے لیکن یہ اعداد و شمار میں اس وقت فراہم نہیں کرسکتا۔ آپ بعد میں حاصل کرسکتے ہیں۔ شکریہ۔

سوال نمبر ۱۰:...... میرا سوال یہ ہے کہ گوپی ناتھ اگروال کی کتاب ''گوشت خوری یا سبزی خوری انتخاب خود کیجیے'' میں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب عیسائیت اور ہندومت کے ایسے حوالے دیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ گوشت خوری ممنوع ہے لیکن آپ اسے جائز قرار دیتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے کہ اس کتاب میں جو حوالے دیے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ گوشت خوری دنیا کے بڑے بڑے مذاہب یعنی ہندومت اور عیسائیت وغیرہ میں ناجائز ہے تو پھر میں یہ کس طرح کہتا ہوں کہ دنیا کا کوئی اہم مذہب گوشت خوری کو مکمل طور پر ناجائز قرار نہیں دیتا۔ میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت تو کر چکا ہوں کہ اس کتاب میں سیاق وسباق سے ہٹ کر مطلب اخذ کرنے اور غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں اتنا تو تسلیم کرتا ہوں کہ بعض اوقات، مخصوص حالات میں گوشت خوری کی جزوی ممانعت موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ○

[المائدہ: ۱]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بندشوں کی پوری پابندی کرو۔ تمہارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے۔ سوائے ان کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے۔ لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لیے حلال نہ کرلو۔ بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔''

اسی طرح اگر آپ ماہِ رمضان کے روزے رکھ رہے ہیں تو آپ فجر سے مغرب تک کوئی بھی چیز نہیں کھا سکتے، نہ لحمیاتی اور نہ نباتاتی۔ اگر میں کہوں کہ روزے کے دوران گوشت خوری نہ کرو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ گوشت خوری ناجائز ہے۔ بلکہ صرف اس

مخصوص وقت کے لیے ممنوع ہے۔

لہٰذا اسی طرح دیگر متون مقدسہ میں ایسے بیانات موجود ہیں جن میں بعض مخصوص اوقات میں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے میں مذکورہ کتاب پڑھ چکا ہوں، اس لیے جواب دے سکتا ہوں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انجیل میں حکم دیا گیا ہے کہ: ''تم مردہ غذا نہیں کھا سکتے۔'' خطوط وحدانی میں ''گوشت'' کے لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا کہ یہ بات کہاں سے لی گئی ہے۔ لیکن میں تقابل ادیان کا طالب علم ہوں اور آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ بات عہد نامہ قدیم کی کتاب استثنا باب ۱۴ آیت نمبر ۲۱ میں کی گئی ہے۔

''جو جانور آپ ہی مر جائے تم اسے مت کھانا۔''

یہی بات بائبل میں ایک اور مقام پر بھی کی گئی ہے۔ یہاں صرف مردار گوشت کو حرام کیا گیا ہے۔ لیکن وہ یہ کرتے ہیں کہ پہلے تو مردہ غذا لکھتے ہیں اور بریکٹ میں گوشت کا لفظ لکھتے ہیں، حالاں کہ یہاں واضح طور پر مردار جانور کے گوشت سے منع کیا جا رہا ہے۔

یہ بات قرآن میں بھی متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ سورہ بقرہ ۱۷۳، سورۂ مائدہ ۳، سورۂ انعام ۱۴۵ اور سورۂ نحل ۱۱۵ وغیرہ میں یہ حکم موجود ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

[النحل: ۱۱۵]

''اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ البتہ بھوک سے مجبور اور بے قرار ہو کر اگر کوئی چیزوں کو کھا لے بغیر اس کے کہ وہ قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کا خواہش مند ہو یا حد ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو تو یقیناً اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔''

اگر آپ بائبل کی کتاب پیدائش باب ۹، آیت ۲ اور ۳ کا مطالعہ کریں تو ان میں کہا گیا ہے:

"اور زمین کے کل جانداروں اور ہوا کے کل پرندوں پر تمہاری دہشت اور تمہارا رعب ہوگا۔ اور یہ تمام کیڑے جن سے زمین بھری پڑی ہے اور سمندر کی کل مچھلیاں تمہارے ہاتھ میں کی گئیں، ہر چلتا پھرتا جاندار تمہارے کھانے کو ہوگا، ہری سبزی کی طرح میں نے سب کا سب تم کو دے دیا۔"

کتاب استثنا باب ۱۴، آیت ۹ اور ۱۰ میں کہا گیا:

"آبی جانوروں میں سے تم ان ہی کو کھانا جن کے چھلکے اور پر ہوں، لیکن جس کے پر اور چھلکے نہ ہوں تم اسے مت کھانا، وہ تمہارے لیے ناپاک ہے۔"

اس سے اگلی آیت میں بتایا گیا:

"پاک پرندوں میں سے تم جسے چاہو کھا سکتے ہو۔"

اسی باب کی آیت ۲۰ میں پھر بتایا گیا:

"اور پاک پرندوں میں سے تم جسے چاہو کھا سکتے ہو۔"

لوقا، باب ۲۴، آیت ۴۱، ۴۳ میں بیان کیا گیا:

"جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے) ان سے کہا، کیا یہاں تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ انھوں نے اسے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اس نے لے کر ان کے روبرو کھایا۔"

رومیوں کے نام خط باب ۱۴، آیات ۲، ۳ میں کہا گیا:

"ایک کو اعتقاد ہے کہ ہر چیز کا کھانا روا ہے اور کمزور ایمان والا ساگ پات ہی کھاتا ہے۔ کھانے والا، اس کو جو نہیں کھاتا، حقیر نہ جانے اور جو نہیں کھاتا وہ کھانے والے پر الزام نہ لگائے کیوں کہ خدا نے اس کو قبول کرلیا ہے۔"

ہندو متون میں سے اگر آپ منو کے قانون کا مطالعہ کریں تو اس میں واضح طور پر تحریر ہے:

"کھانے والا کسی بھی زندہ مخلوق کو کھا سکتا ہے۔ بے شک وہ روزانہ کھائے۔

ہمارے خالق نے کچھ مخلوقات کو کھانے کے لیے بنایا ہے اور کچھ کو کھائے جانے کے لیے۔" [منو، باب ۵، نمبر ۳۰]

اسی طرح منوسمرتی، باب ۵، نمبر ۳۵ میں بھی گوشت کھانے کی اجازت ہے۔ رگ وید کتاب دہم، مناجات نمبر ۱۶ میں بھی گوشت کھانے کی اجازت موجود ہے۔ مناجات نمبر ۸۶ میں بھی اجازت دی گئی ہے۔ مہا بھارت کے باب نمبر ۸۸ میں بھیشم کی گفتگو پڑھیں۔ منوسمرتی کا باب نمبر ۳ پڑھیں۔ اس میں آباؤ اجداد کی روحوں کو خوش کرنے کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ نباتات کی قربانی انھیں ایک ماہ تک خوش رکھے گی، مچھلی دو ماہ تک، ہرن تین ماہ تک، چھوٹا گوشت چار مہینے تک، پرندوں کا گوشت ۵ مہینے تک یہاں تک کہ گینڈے کی قربانی ہمیشہ کے لیے انھیں خوش کرنے کا باعث ہوگی۔ میں ایسی لامتناہی مثالیں دے سکتا ہوں۔

سوال نمبر ۱۱:...... جناب زاویری صاحب، آپ نے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ جین متی پودوں کی جان نہیں لیتے، وہ بھیک مانگتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دوسروں کو پودوں کی جان لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ تو اپنے منہ پر نقاب ڈال کر جراثیم کو مارنے سے بچ جاتے ہیں لیکن دوسرے جراثیم کی جان لیتے رہتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟

رشمی بھائی زاویری:...... میری بہن، آپ نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ آج جتنے سوال پوچھے گئے، میں یقیناً اس سوال کو پہلے نمبر پر قرار دوں گا۔ جین مذہب کی تعلیمات یہ ہیں کہ آپ کسی کو قتل نہیں کریں گے، دوسرے کو قتل کی اجازت نہیں دیں گے اور اگر کوئی قتل کرتا ہے تو آپ اس کی تعریف بھی نہیں کریں گے۔ یہ تینوں باتیں جین مت میں موجود ہیں، لہٰذا اگر کسی جین متی کو پتہ چل جائے کہ کھانا اسی کے لیے تیار کیا گیا ہے تو وہ اسے قبول نہیں کرے گا۔ یہ ایک جین متی کا اصول ہے۔ جب وہ بھیک مانگنے ہمارے پاس آتے ہیں تو واضح طور پر پوچھتے ہیں کہ "کیا آپ نے ہمارے لیے کچھ پکایا ہے؟" ہمیں بھی علم ہوتا ہے کہ وہ یہ پوچھیں گے۔ ہمیں پوری ایمان داری سے جواب

دینا ہوتا ہے کہ ہم نے ان کے لیے کچھ نہیں پکایا۔ صرف اپنے لیے کھانا پکایا ہے۔ فرض کیجیے ہم نے چار چپاتیاں پکائی ہیں تو وہ صرف ایک چپاتی لے گا۔ اور تین ہمارے لیے رہیں گی۔ یہ ایک جین متی کے مانگنے کا طریقہ ہے۔ وہ نہ جان لیتا ہے نہ دوسرے کو جان لینے کی اجازت یا ترغیب دیتا ہے۔ اگر اسے پتہ چل جائے کہ یہ کھانا جین متی ہی کے لیے پکایا گیا ہے تو وہ کبھی نہیں کھائے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ روشن خیال حاضرین کے مجمع میں مجھے ''جین مت'' کے تصور کی وضاحت کا موقع ملا۔ بہت بہت شکریہ۔

سوال نمبر ۱۲:...... ذاکر صاحب، میں نے ایک فلم دیکھی تھی ''خانۂ خدا''۔ اس فلم کے مطابق حاجی حضرات جو تھے وہ گوشت خوری نہیں کر رہے تھے۔ بال نہیں کاٹتے تھے، وہ مکمل ''برہمچاری اور سنیاسی'' لگ رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کیا؟ تین دن کے لیے پورے سنیاسی بن گئے، انھوں نے کہا یہ خانۂ خدا تھا۔ میں نے کہا ''مسلمان بھائیو، سارا سنسار خانۂ خدا ہے میرا سوال یہ ہے کہ پوری دنیا ہی خانۂ خدا ہے تو قتل و غارت ہر جگہ بند کیوں نہیں ہو سکتی، خصوصاً ہندوستان میں؟

<u>ڈاکٹر ذاکر نائیک</u>: یہ بہت اچھا سوال ہے۔ کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ میں ضمانت دیتا ہوں کہ کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جو جھگڑے کا باعث بنے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ سبزی خوری اور گوشت خوری کی وجہ سے احمد آباد اور گجرات وغیرہ میں فسادات ہو چکے ہیں۔ لیکن یہاں میں منطقی بات کروں گا جو کسی فساد کا باعث نہیں بنے گی۔

بھائی نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حاجی تین دن تک گوشت نہیں کھاتے۔ یہ محض غلط فہمی ہے۔ میں نے متعدد مرتبہ حج کیا ہے۔ جس نے بھی آپ کو یہ بات بتائی ہے، غلط بتائی ہے کہ ہم حج کے دوران میں گوشت نہیں کھاتے۔ بات یہ ہے کہ وہ ایک مقدس جگہ ہے، لہٰذا ان مخصوص دنوں میں آپ وہاں شکار نہیں کر سکتے۔ آپ کسی جانور کو شکار کے لیے نہیں مار سکتے اور یہ ممانعت بھی مخصوص دنوں کے لیے ہے۔

لیکن گوشت کھانے کی کوئی ممانعت نہیں ہوئی۔ میں خود وہاں گیا ہوں اور میں نے خود گوشت کھایا ہے۔ کون کہتا ہے کہ آپ وہاں گوشت خوری نہیں کر سکتے۔

ہاں، ہم وہاں محض دو ان سلے کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں۔ کیوں؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ کیوں؟ کیوں کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا سالانہ اجتماع ہوتا ہے، جس میں لوگ امریکہ اور کینیڈا سے بھی آتے ہیں اور پاکستان، ہندوستان اور انڈونیشیا سے بھی۔ یہ تمام لوگ ایک ہی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں، یعنی دو ان سلے کپڑوں میں۔ بالکل یکساں۔ آپ اپنے برابر کھڑے شخص کے بارے میں بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ بادشاہ ہے یا فقیر۔ عالمی بھائی چارہ قایم کرنے کے لیے اور محض زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر بھائی چارہ قایم کرنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ ہم نماز ادا کرتے ہیں تو کندھے سے کندھا ملا کر۔ کھانا کھاتے ہیں تو اکٹھے بیٹھ کر اور گوشت بھی کھاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کو یہ اطلاع کس سے ملی ہے۔ کسی مسلمان سے یا غیر مسلم سے۔ لیکن جس کسی نے بھی بتایا ہے اس نے جھوٹ بولا ہے۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں، اور میں نے متعدد مرتبہ حج اور عمرے کیے ہیں۔ اور عالمی بھائی چارہ قایم کرنے کے لیے ہم وہاں جاتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک کے لوگ آپ کو وہاں ملیں گے۔

انسانیت کی سطح پر تمام انسانوں میں بھائی چارہ ہونا چاہیے اور عقیدے کی سطح پر تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

سوال نمبر ۱۳ :...... میں زاویری صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے گوشت خور اور سبزی خور جانوروں میں کوئی سولہ فرق بیان کر دیے۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم انسان بھی سبزی خور ہیں۔ لیکن دوسری طرف تمام سبزی خور جگالی کرتے ہیں لیکن میں نے آج تک کسی انسان کو جگالی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تو پھر آپ کو گوشت خور اور سبزی خور جانوروں میں فرق بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

رشمی بھائی زاویری :...... جی ہاں، میں یہی بتانا چاہتا تھا کہ انسان کے اعضا کی مشابہت سبزی خور جانوروں سے ہے۔ اب یہ تو صائب الفکر حاضرین کا کام ہے کہ وہ میری

باتیں سن کر فیصلہ کریں کہ وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر آپ اتفاق کرتے ہیں تو بہت اچھا اور اگر آپ اتفاق نہیں کرتے تو بھی بہت اچھا۔ میں یہ کہنے والا کون ہوتا ہوں کہ آپ لازماً کسی نکتے پر مجھ سے اتفاق ہی کریں۔ جو کچھ میں نے بیان کیا وہ سائنسی حقائق تھے جن کے لیے دلائل اور ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔ لیکن یہ تو حاضرین نے خود دیکھنا ہے کہ وہ ان باتوں سے متفق ہیں یا نہیں۔

میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انسان قدرتی طور پر زیادہ بلکہ سو فی صد سبزی خور واقع ہوا ہے۔ اور بعض مخصوص حالات یا دیگر عوامل کی وجہ سے وہ گوشت خور بن گیا ہے۔

دوستو، اب میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مجھے آج یہاں آ کر انتہائی خوشی ہوئی ہے۔ ہمیں تبادلہ خیال کا موقع ملا ہے۔ اور فاضل مقرر ڈاکٹر ذاکر نائیک کے ذریعے اسلام کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئی ہیں۔ ہمیں قطعی علم نہیں تھا کہ اسلام میں یہ سب باتیں موجود ہیں۔ اور اس کے لیے میں اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کا شکر گزار ہوں۔ میں اپنے دوست رشبھ فاؤنڈیشن کے سلیچا صاحب کا بھی شکر گزار ہوں۔

وقت کی کمی کی وجہ سے میں اور ترویدی صاحب اب اجازت چاہیں گے۔ ہماری کچھ دیگر مصروفیات ہیں جن کی وجہ سے ہمارے لیے مزید ٹھہرنا ممکن نہیں، میں ایک بار پھر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سوال نمبر ۱۴:......میری پہلی درخواست تو یہ ہے کہ میں آپ کے بیس کے بیس سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں۔ مجھے کسی بھی وقت موقع دیجیے۔ میں آپ کے بیس سوالات کے منطقی جوابات دوں گا۔ دوسرے یہ کہ ہم سب کو خدا نے بنایا ہے اور سیدھی سی بات ہے کہ اگر بھگوان نے ہمیں جنم دیا ہے تو اس نے ہمارے لیے زندہ رہنے کا بندوبست بھی کیا ہے۔ کچھ اصول بھی بنائے ہیں۔ ہمیں ہوا کی ضرورت ہے تو وافر ہوا موجود ہے۔ ہمیں پانی کی ضرورت ہے تو پانی دستیاب ہے۔ ہمیں غذا کی ضرورت ہے تو بھگوان نے ہمیں غذا بھی دی ہے اور علاقے کے مطابق دی ہے۔ کشمیر میں بادام، کاجو، پستہ دیا ہے جو وہاں

ضروری ہے۔ راجھستان میں تربوز اور خربوزہ ملے گا۔ یہاں ہمیں کیلے کی صورت میں حلوہ بنا کر دے دیا ہے۔ جو کچھ اس نے ہمیں دے دیا ہے وافر اور سستا ہے۔ اور جس سے ہمیں وہ روکنا چاہتا ہے وہ چیز کم ہے اور مہنگی ہے۔ تو کیا ہم خدائی ہدایات کی پابندی کر رہے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... میں سوال سمجھ گیا ہوں۔ یہ اگرچہ ایک بہت لمبا سوال ہے لیکن اچھا سوال ہے۔ جہاں تک سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے کہ آپ میرے بیس نکات کا جواب دے سکتے ہیں، تو میرے متعدد شاگرد ہیں۔ میں اپنے شاگردوں میں سے کسی کو کہہ دوں گا اور وہ اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن میں آپ سے گفتگو کرے گا۔ کسی بھی وقت۔ کسی بھی دن۔ میرا خیال ہے اگلا اتوار ٹھیک رہے گا۔ ٹھیک ہے اگلے اتوار کو ساڑھے دس بجے صبح آپ اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن تشریف لائیں اور میں نہیں لیکن میرا کوئی شاگرد آپ سے وہاں گفتگو کرے گا۔

جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ خدا نے ہمیں ہوا، روشنی، پانی وغیرہ دیے ہیں اور ہر چیز آسانی سے دستیاب ہے تو پھر ہم ان چیزوں کے پیچھے کیوں جائیں جو مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں اور مہنگی ہیں۔ بہت اچھا سوال ہے، لیکن یہ سوال زاوری صاحب سے ہونا چاہیے کیوں کہ وہی یہ کہہ رہے ہیں کہ سبزیاں قطبین پر بھجوائی جانی چاہئیں اور صحراؤں میں بھجوائی جانی چاہئیں۔ آپ انھیں بتائیں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر سبزیاں دستیاب ہیں تو سبزیاں کھائیں، اگر گوشت دستیاب ہے تو گوشت کھائیں۔ لہٰذا آپ کو چاہیے کہ زاوری صاحب سے یہ سوال پوچھیں۔

دوسری بات یہ کہ آپ مجھے کہہ رہے ہیں کہ جب سستی چیز دستیاب ہو تو مہنگی نہیں کھانی چاہیے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آپ کسی امیر آدمی سے کہیں کہ وہ ایک ایسی اچھی جگہ پر کیوں رہتا ہے جہاں زمین ۲۵۰۰۰ روپے مربع فٹ ہے۔ وہ ایسی جگہ کیوں نہیں رہتا جہاں ہزار روپے مربع فٹ جگہ مل جاتی ہے۔ اگر ایک امیر آدمی اچھی چیز خریدنا افورڈ کرتا ہے تو اسے اچھی چیز استعمال کرنے دیں۔

اسی طرح اگر کوئی لحمیاتی غذا افورڈ کرتا ہے جو کہ پروٹین کے حوالے سے اور متعدد

دیگر حوالوں سے اعلیٰ معیار کی ہے تو آپ اسے کیوں کر روکتے ہیں۔ ہاں اگر آپ افورڈ نہیں کرتے تو پھر سبزیاں ہی استعمال کریں۔

امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

سوال نمبر ۱۵:......میرا سوال یہ ہے کہ کیا لحمیاتی غذا، غذائیت کے لحاظ سے کم تر ہوتی ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے کہ کیا لحمیاتی غذا غذائیت کے لحاظ سے کم تر درجے کی ہوتی ہے۔ جی ہاں۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ میں کوئی متعصب گوشت خور نہیں ہوں لہٰذا یہ نہیں کہوں گا کہ ایسا نہیں ہے۔ لحمیاتی غذا کاربوہائیڈریٹ اور حیاتین کی مقدار کے لحاظ سے کم تر ہوتی ہے۔ یہ چیزیں نباتاتی غذا کے ذریعے باآسانی دستیاب ہوتی ہیں۔ سبزیوں اور پھلوں کے ذریعے ان چیزوں کی کمی باآسانی پوری ہوسکتی ہے۔ آپ کو پھل ضرور کھانے چاہئیں۔

لیکن اگر ایک عام تقابل کیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ لحمیاتی غذا میں اعلیٰ معیار کی پروٹین موجود ہوتی ہے۔ یہ پروٹین مکمل بھی ہوتی ہے اور اس کا معیار بھی برتر ہوتا ہے۔ اسی طرح فولاد بھی۔

انڈا بھی ایک بہت اچھی غذا ہے جس کی اتنی مخالفت کی گئی۔ ایک بڑے انڈے میں تقریباً چھ گرام پروٹین ہوتی ہے اور انڈے کی سفیدی پروٹین کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ مثالی پروٹین ہوتی ہے۔ مثالی سے مراد یہ ہے کہ دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والی پروٹین کا معیار اس سے تقابل کر کے پرکھا جاتا ہے۔ اس میں تمام ضروری امینو ایسڈز بھی موجود ہوتے ہیں۔ مزید برآں اس میں یہ اجزا بھی موجود ہوتے ہیں۔

(A) Riboflavin. (B) Iron. (C) Flourin. (D) Vitamin B12.

(E) Vitamin D. (F) Vitamin E.

انڈا ان چند غذاؤں میں سے ایک ہے جن میں وٹامن ڈی پایا جاتا ہے۔ بیمار اور

بیماری سے صحت یاب ہونے والوں کے لیے انڈا تجویز کیا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس میں تمام ضروری اجزا موجود ہوتے ہیں اور یہ زُود ہضم بھی ہوتا ہے۔

آپ سبزیوں کے ذریعے بھی اپنی غذائی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے آپ کو اپنی غذا کا انتخاب بڑی سمجھ داری کے ساتھ کرنا پڑے گا، اگر آپ درست انتخاب کے ذریعے غذا کو متوازن رکھتے ہیں تو آپ کی صحت اچھی رہے گی۔

لیکن اگر آپ لحمیاتی غذائیں بھی استعمال کرتے ہیں تو یہ توازن بالعموم خود ہی برقرار رہے گا۔

امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال نمبر ۱۶:...... ڈاکٹر ذاکر نائیک نے اپنی گفتگو کے دوران میں ڈاکٹر ڈین آرنش کی تحقیقات کے مقابلے میں دیگر ڈاکٹر حضرات کے بیانات پیش کیے۔ ڈاکٹر ڈین آرنش اَب ایک معروف ڈاکٹر ہیں اور امراضِ قلب کے علاج کے حوالے سے خصوصی شہرت رکھتے ہیں، وہ صدر امریکہ کے مشیر ہیں اور امراضِ قلب کا علاج نباتاتی غذاؤں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈین آرنش کی تحقیق کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے ایک بہت اچھا سوال پوچھا ہے کہ میں ڈاکٹر ڈین آرنش کے بارے میں کیا کہنا چاہتا ہوں جو بہت مشہور ہیں اور امراضِ قلب کا علاج نباتاتی غذاؤں کے ذریعے کرتے ہیں۔ میں آپ سے اتفاق کر لیتا ہوں لیکن کیا اس طرح لحمیاتی غذا ممنوع اور ناجائز قرار پا جاتی ہے۔ میرے بھائی آپ نے Maltese Diabetes کا نام سنا ہے۔ اگر کوئی شخص ذیابیطس کی اس شدید قسم کا شکار ہو تو اسے لازماً انسولین استعمال کرنا ہوگی۔ انسولین جانوروں کے لبلبے سے بنائی جاتی ہے۔ اگر وہ انسولین استعمال نہیں کرے گا تو اس کی جان جا سکتی ہے۔ اب اگر ایک لحمیاتی چیز ذیابیطس کا علاج ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ غیر لحمیاتی یا نباتاتی غذاؤں کا استعمال ہی ناجائز ہو گیا ہے۔

میں ڈاکٹر ڈین آرنش سے اتفاق کرتا ہوں کہ امراضِ قلب کا علاج نباتاتی غذاؤں کی مدد سے ممکن ہے۔ لیکن رشمی بھائی زاویری تو یہ کہتے ہیں کہ لحمیاتی خوراک کی عام ممانعت ہونی چاہیے۔ دل کے مریضوں کے لیے تو ٹھیک ہے انھیں پرہیز کے لیے کہا جا سکتا ہے، اگرچہ بعض ڈاکٹر اس سے بھی اختلاف کریں گے لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ نباتاتی غذائیں چوں کہ امراضِ قلب کے لیے بہتر ہیں، لہٰذا گوشت خوری پر عام پابندی ہونی چاہیے تو پھر حکومت امریکہ گوشت خوری پر پابندی کیوں نہیں لگاتی؟

ڈاکٹر ڈین آرنش حکومت امریکہ کے مشیر ہیں تو پھر حکومت امریکہ ان کے مشورے پر عمل کیوں نہیں کرتی؟ پھر یہ کہ ان کی کیا تحقیقات ہیں اور ان تحقیقات کا درجہ کیا ہے۔ محض کسی کا نام لے کر یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ اس نے گوشت خوری کو ناجائز قرار دیا ہے۔ مجھے تو اس پر بھی شبہ ہے کہ ڈاکٹر آرنش نے گوشت خوری کی واقعی عام ممانعت کی ہوگی۔ کیا انھوں نے یہ کہا ہے کہ کسی بھی شخص کو کسی بھی حال میں گوشت خوری نہیں کرنی چاہیے۔ میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں کہ مجھے کوئی ایسا بیان دکھا دیں۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے دل کے مریضوں کے لیے ممانعت کی ہوگی۔

پھر یہ کہ دیگر ماہرین بھی ہیں۔ میں نے ڈاکٹر ولیم ٹی جارویس اور ڈاکٹر کے جیری کا حوالہ دیا لیکن بہت سے لوگ مزید بھی ہیں۔

لیکن میں منطقی بات کروں گا۔ میں اُن سے اتفاق کرتے ہوئے کہوں گا کہ امراضِ قلب کے شکار لوگوں کو گوشت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن یہ کوئی عام اصول نہیں ہے۔

امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال نمبر ۱۷:...... امریکہ میں ہونے والی پندرہ سالہ تحقیقات کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ سرخ گوشت کینسر کا سبب بنتا ہے۔ کیا آپ اس بارے میں ہمیں کچھ بتائیں گے؟

__ڈاکٹر ذاکر نائیک__:...... بہن نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے کہ ایک ہسپتال میں

ہونے والی پندرہ سالہ تحقیقات کے یہ نتائج سامنے آئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہاں پھر تحقیقات کا ذکر ہے ثابت شدہ حقائق کا نہیں۔ اور ان دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جس تحقیق کا آپ حوالہ دے رہی میں اس کا مطالعہ کر چکا ہوں، اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اگر آپ زیادہ مقدار میں گوشت کھائیں گے تو آپ کو Cancer of Colon کا خطرہ ہوگا۔ آپ کو یہ کینسر ہو سکتا ہے لیکن ایسا اسی صورت میں ہوگا جب آپ کی غذا میں کافی مقدار میں Fibers موجود نہ ہوں۔ اگر Fibers موجود ہیں تو گوشت کھانے کے باوجود آپ کو کینسر کا خطرہ نہیں ہوگا۔

لہٰذا اگر آپ ایک متوازن خوراک استعمال کر رہے ہیں تو محض گوشت کھانے سے کینسر نہیں ہوگا لیکن اسلام ضرورت سے زیادہ کھانے کی ممانعت کرتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ قرآن کے خلاف جاتے ہیں، وہ بیمار ہوں گے۔ گویا یہ کہنے میں حرج نہیں کہ؛

''ضرورت سے زیادہ گوشت خوری ناجائز ہے۔''

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

☆......☆......☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام میں خواتین کے حقوق
جدید یا فرسودہ؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

سید امتیاز احمد

دار النوادر
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۲۰۰۶ء

کتاب: اسلام میں خواتین کے حقوق

مصنف: ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم: سید امتیاز احمد

اہتمام: دار النوادر، لاہور

مطبع: موٹر وے پریس، لاہور

قیمت: ۵۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

ڈسٹری بیوٹرز
کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ترتیب

☆......☆......☆

جسٹس ایم ایم قاضی

تعارف

جناب ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب، ڈاکٹر محمد نائیک صاحب، سابق گورنر اور سفیر تلیار خان صاحب، غیر ملکی مہمانانِ گرامی اور معزز خواتین و حضرات،

السلام علیکم!

سب سے پہلے تو میں اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کے ذمہ دار حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے مجھے اس تقریب کی صدارت کی دعوت دی۔ جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے آج ہمارا موضوع ہے:

''اسلام میں خواتین کے حقوق''...... جدید یا فرسودہ؟

ویسے تو جدید سے مراد ہر وہ چیز لی جاتی ہے جو قدیم نہ ہو۔ لیکن آج کی تقریب کے تناظر میں دیکھا جائے تو سوال یہ بنتا ہے کہ اسلام نے عورت کو آج سے چودہ سو سال پہلے جو حقوق عطا کیے تھے کیا وہ آج بھی کافی ہیں یا نہیں۔

ویسے تو سماج میں عورت کے مقام کا موضوع صدیوں سے موضوعِ گفتگو ہے لیکن ماضی قریب میں ان مباحث نے خاصی سنجیدہ صورت اختیار کر لی ہے۔ بعض مسائل کے حوالے سے تو صورتِ حال خاصی پیچیدہ ہو چکی ہے۔

طلاق، کثرتِ ازدواج اور خواتین کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں شرکت ایسے موضوعات ہیں جن پر میڈیا میں بالعموم بحث جاری رہتی ہے۔ اگرچہ کسی حد تک حقیقی مسائل بھی ہیں لیکن بہت سے معاملات ایسے ہیں جنھیں میڈیا ضرورت سے زیادہ اچھال رہا ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ مغربی عورت بالآخر سماجی، قانونی، معاشی اور سیاسی حقوق

کے حصول میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس کے لیے اسے طویل مدت تک مسلسل اوران تھک جدوجہد کرنا پڑی۔ جس کے نتیجے میں اسے مذکورہ حقوق تو حاصل ہو گئے ہیں لیکن میں عرض کرنا چاہوں گا کہ اس دوران وہ بہت کچھ گنوا بیٹھی ہے۔

میرے دوستو! اگر آپ مغربی معاشرے کا بغور تجزیہ کریں تو آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ مغربی عورت بہت کچھ کھو چکی ہے۔ وہ خاندانی نظام زندگی سے محروم ہوئی، ذہنی سکون سے محروم ہوئی اور یہاں تک کہ وہ اپنے وقار اور نسوانیت سے بھی محروم ہو گئی۔

دوسری طرف اگر آپ اسلام کا جائزہ لیں تو آپ کو علم ہو گا کہ اسلام نے آج سے چودہ سو برس پہلے ہی عورت کو بے شمار حقوق عطا کر دیے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب دنیا کی دیگر تہذیبیں یہ سوچ رہی تھیں کہ عورت کو انسان بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس مسئلے کا جامع، غیر جانبدارانہ اور غیر جذباتی انداز میں جائزہ لے کر یہ فیصلہ کریں کہ اسلام خواتین کو جو حقوق دیتا ہے وہ کافی ہیں یا ناکافی اور یہ کہ وہ حقوق جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہیں یا نہیں۔

آپ لوگوں کی خوش نصیبی ہے کہ نامور دانشور ڈاکٹر ذاکر نائیک آج اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔ چونکہ وہ مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں گے لہٰذا میرے لیے ضروری نہیں کہ میں اس حوالے سے تمام قرآنی آیات آپ کے سامنے پیش کروں یا ان تمام احادیث نبویہ ﷺ کا حوالہ دوں جو حقوق نسواں کے موضوع سے متعلق ہیں اور پیغمبرِ اسلام ﷺ سے روایت کی گئی ہیں۔

لیکن دو آیات کا قرآنی حوالہ ضرور دینا چاہوں گا۔ تا کہ یہ بات سامنے آ سکے کہ اسلام نے عورت کو کس قدر باوقار اور آبرومندانہ مقام عطا کیا ہے۔ قرآنِ مجید کی سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ (۲:۲۲۸)

"عورتوں کے لیے بھی معروف طریقہ پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور سب پر اللہ غالب اختیار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔"

میں چاہوں گا کہ آپ اس آیت کا ایک ایک لفظ ذہن میں رکھیں کیونکہ اس آیت میں واضح طور پر بتایا جا رہا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے ایک دوسرے پر یکساں حقوق ہیں۔ اور اس بات کی نفی قرآن میں کسی دوسرے مقام پر بھی نہیں کی گئی۔ البتہ اسی آیت میں ایک بات اور بھی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ مردوں کو عورتوں پر ایک طرح کی فضیلت حاصل ہے۔ ان الفاظ پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بہت اہم الفاظ ہیں۔ اور ان الفاظ کا مطلب اخذ کرنے میں بعض اوقات غلطی بھی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان الفاظ میں فریقین کے حقوق کا ذکر نہیں کیا جا رہا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، حقوق کے بارے میں تو اس آیت کے پہلے حصے میں ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔ جہاں تک آیت کے دوسرے حصے کا تعلق ہے یعنی "مردوں کو ایک درجہ حاصل ہونے" کا، اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک اور آیت مبارکہ کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ سورۂ نساء میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ (۴:۳۴)

"مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔"

اس آیت سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ چونکہ عورت صنفِ نازک ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مرد کو اس کا (قوام) محافظ بنایا ہے۔ علم انسانیات کی رو سے دیکھا جائے یا حیاتیات کا نقطہ نظر سامنے رکھا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرد جسمانی طور پر عورت سے مختلف واقع ہوا

ہے۔ کیونکہ وہ کم از کم جسمانی لحاظ سے زیادہ طاقتور واقع ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اسے زیادہ ذمہ داری دی گئی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا مرد کو جو درجہ دیا گیا ہے اس کا تعلق حقوق سے نہیں فرائض سے ہے۔ لہٰذا مرد کو ملنے والا یہ درجہ نہ عورت کے حقوق میں کمی کا باعث بنتا ہے اور نہ ہی اس کی اہمیت گھٹاتا ہے۔ لہٰذا میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ اس سنجیدہ مسئلے پر غور وفکر کے بعد ہی کوئی نقطہ نظر اپنائیں۔

میرے خیال میں عورت کو تحفظ فراہم کرنا ہی مرد کی سب سے اہم اور نازک ذمہ داری ہے۔ اور اس ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہونا نہایت ضروری ہے لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔ اس ذمہ داری کی حدود بہت وسیع ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ مرد اپنی یہ ذمہ داری کما حقہ پوری نہیں کر رہے۔ ادر اپنا بنیادی فرض، یعنی عورت کو تحفظ فراہم کرنا، ادا نہیں کر رہے۔

میں یہاں اس حوالے سے کوئی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا کہ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ کیونکہ میرے پاس وقت محدود ہے۔ کسی حد تک اس کی ذمہ داری خواتین پر بھی ہو سکتی ہے لیکن بات وہیں رہتی ہے کہ اس صورت حال کے نتیجے میں خواتین کے حوالے جرائم اور استحصال کے معاملات سامنے آ رہے ہیں۔ ہمیں ہندوستانی سماجی اخلاقیات کے پس منظر میں عورت کو وہ تقدس واحترام دینا ہے جس کی وہ حق دار ہے۔ کیونکہ اس پس منظر میں کوئی عورت آزادی کے بدلے میں عزت، احترام اور تقدیس سے دست بردار ہونا نہیں چاہے گی۔ اور اسی طرح کوئی مرد بھی بطور محافظ اپنی ذمہ داریوں سے جان چھڑانا نہیں چاہے گا۔

مرد اور عورت کے تعلقات کے اس نازک پہلو کی وضاحت عظیم مفکر اور شاعر علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں کچھ یوں کی ہے:

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا جانے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ میرے پاس وقت بہت محدود ہے اور ڈاکٹر ذاکر نائیک یہاں موجود ہیں جو زیر نظر موضوع پر پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ گفتگو کریں گے۔ البتہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ قرآن نے عورت کو بہت عزت مندانہ مقام عطا کیا ہے۔ اصل مسئلہ ہماری جہالت اور قرآن سے لاعلمی کا ہے اور اس مسئلے کا حل تعلیم اور آگاہی ہے۔ لوگوں میں علم اور آگاہی کا پھیلانا ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔

مجھے یہاں تھامس جیفرسن کا ایک قول یاد آ رہا ہے اس نے کہا تھا:

''وہ قوم جو جاہل رہ کر آزاد رہنا چاہتی ہے، وہ ایک ایسی خواہش کر رہی ہے جو نہ کبھی پوری ہوئی ہے اور نہ کبھی پوری ہوگی۔''

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

اب میں آپ سے ڈاکٹر ذاکر نائیک کا تعارف کروانا چاہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب بمبئی سے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک ڈاکٹر ہیں لیکن انھوں نے اپنی زندگی تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دی ہے۔ وہ اسلام کو اس کے اصل اور درست تناظر میں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

وہ اپنی تقاریر کے سلسلے میں، ملک میں اور ملک سے باہر بہت سے اسفار کر چکے ہیں۔ نوجوانی ہی میں قرآن کے حوالے سے بڑی گہری آگاہی رکھتے ہیں۔ میں یہاں ان کے والدین کو بھی خراجِ تحسین پیش کرنا چاہوں گا۔ جن کی کوششوں اور دعاؤں سے ڈاکٹر ذاکر اس مقام تک پہنچے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۹۱ء میں قائم ہونے والی اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کے جنرل سیکریٹری ہیں۔

شکریہ

☆......☆......☆

حصہ اوّل

اسلام میں خواتین کے حقوق

ڈاکٹر ذاکر نائیک کی گفتگو

اسلام میں خواتین کے حقوق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾ (۳۵:۳۳)

’’بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزے رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے اُن کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔‘‘

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میں محترم جسٹس ایم ایم قاضی صاحب، اپنے محترم بزرگوں اور عزیز بہن بھائیوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے:

’’اسلام میں خواتین کے حقوق‘‘...... جدید یا فرسودہ؟

سب سے پہلے تو ہم اس موضوع کے بنیادی الفاظ کے معانی دیکھتے ہیں۔ لوکسفو ڈکشنری کے مطابق حقوقِ نسواں (Women's Rights) سے مراد وہ حقوق ہیں ’’

عورتوں کو وہی قانونی اور سماجی مقام دلائیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ Modernize کا مطلب اوکسفرڈ ڈکشنری کے مطابق ہے "جدید بنانا، جدید مذاق وغیرہ کے مطابق ڈھالنا، دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا"

اور ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق "جدید بنانا یا ایک نئی شکل وصورت دینا، مثال کے طور پر نظریات کو جدید شکل دینا۔"

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدت ایک ایسا عمل ہے جس میں تازہ ترین معلومات کی روشنی میں موجودہ صورتِ حال میں بہتری لانے کی کوشش کی جائے گی۔ گویا موجودہ صورتِ حال بذاتِ خود "جدت" نہیں کہلائے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم اپنے مسائل کے حل کی خاطر اور پورے عالم انسانیت کو ایک نیا طرز زندگی دینے کے لیے جدیدیت پسندی اختیار کر سکتے ہیں؟

میں اپنی گفتگو کے دوران جدید نظریات سے غرض نہیں رکھوں گا اور نہ ہی میری گفتگو کا انحصار ماہرین اور نام نہاد مفکرین کے بیانات پر ہوگا جو کرسی پر بیٹھ کر ایسے نظریات وضع کرتے رہتے ہیں جن کی کوئی عملی افادیت نہیں ہوتی۔

یہ حضرات بالعموم آرام کرسی پر بیٹھ کر، بغیر کسی عملی تجربے کے نظریات اخذ کرتے ہیں اور ان کی روشنی میں فیصلہ کرتے ہیں کہ خواتین کو اپنی زندگی کس طرح گزارنی چاہیے۔

میں اپنے بیانات اور نتائج ایسے حقائق سے اخذ کرنا چاہوں گا جنھیں تجربے کی روشنی میں ثابت بھی کیا جا سکے۔

عملی تجربات اور صورتِ حال کے غیر متعصبانہ تجزیے سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ نظریات کی چمک دمک کے پیچھے حقیقت کا سونا موجود ہے یا نہیں۔

ہمیں اپنے خیالات کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھتے رہنا چاہیے بصورتِ دیگر ہمارے خیالات ہمیں باآسانی گمراہی کی جانب بھی لے جا سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کسی زمانے میں دنیا کے ذہین ترین افراد بھی یہ سمجھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے۔

جہاں تک ”اسلام میں حقوقِ نسواں“ کا تعلق ہے، اگر ہم صورتِ حال کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح اس کی عکاسی مغربی ذرائع ابلاغ کی جانب سے کی جارہی ہے تو لامحالہ ہمیں بھی اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ اسلام نے جو حقوق خواتین کو دیے ہیں وہ واقعی فرسودہ اور ناکافی ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے مغرب میں ”خواتین کی آزادی“ کے نام پر جو کچھ ہورہا ہے وہ درحقیقت عورت کے احترام کی نفی اور اس کی روح اور جسم کا استحصال ہے جس پر آزادی نسواں کا خوش نما پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔

مغربی معاشرہ مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ خواتین کو حقوق دیے جائیں لیکن خود اس معاشرے نے خواتین کو کیا دیا ہے؟ یہی کہ عملی طور پر اسے داشتہ اور طوائف کی سطح پر لے آیا ہے۔ اسے ایک ایسی شے بنا ڈالا ہے جس سے مرد لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آرٹ اور کلچر کے خوبصورت پردوں کے پیچھے اس کا اس قدر استحصال کیا جاتا ہے کہ عملاً وہ جنس کے متلاشیوں اور کاروباریوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی ہے جس کا اسے احساس بھی نہیں۔

اور اسلام نے کیا کیا؟ آج سے چودہ سو برس پہلے عہد جاہلیت میں، اسلام کی انقلابی تعلیمات نے عورت کو اس کے حقیقی حقوق اور مرتبہ عطا کیا۔

اپنے آغاز سے لے کر آج تک، اسلام کا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ خواتین کے حوالے سے ہماری سوچ، ہمارے خیالات ہمارے احساسات اور ہمارے طرزِ زندگی میں بہتری لائی جائے اور معاشرے میں خاتون کا مقام بلند سے بلند تر کیا جائے۔

اس سے پہلے کہ میں اپنے موضوع کے حوالے سے گفتگو کو آگے بڑھاؤں چند نکات کا واضح کردینا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

☆ اس وقت دنیا کی آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

☆ مسلمانوں کی یہ آبادی بہت سے معاشروں میں تقسیم ہے۔ ان معاشروں کا طرزِ زندگی یکساں نہیں ہے۔ کچھ معاشروں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جاتا ہے تو کچھ

معاشرے اسلامی تعلیمات سے دور ہیں۔

☆ ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' کیا ہیں۔ اس بات کا فیصلہ ان مسلمان معاشروں کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا بلکہ شریعت اسلامی کے حقیقی مصادر سے رہنمائی لی جائے گی۔

☆ اسلامی تعلیمات کے مستند اور بنیادی مصادر قرآن اور سنت ہیں۔ قرآن جو کلام اللہ ہے اور سنت جو نبی کریم ﷺ کی احادیث سے مستنبط ہے۔

☆ قرآن میں تضاد بیانی موجود نہیں ہے۔ اور نہ ہی صحیح احادیث میں تضاد ممکن ہے۔ اسی طرح صحیح حدیث اور قرآن کی آیات میں بھی تضاد موجود نہیں۔

☆ بعض اوقات علما کے مابین کسی بات پر اختلاف ہوتا ہے۔ ایسے اختلافات بالعموم آسانی سے دور کیے جاسکتے ہیں اگر قرآن وسنت کی تعلیمات کو مجموعی طور پر سامنے رکھا جائے۔

☆ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ایک جگہ بات مجمل طریقہ سے بیان ہوئی ہے تو دوسری جگہ اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ کسی نکتے کو سمجھنے کے لیے ان تمام مقامات کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے جہاں اس نکتے کا ذکر موجود ہے۔ بعض لوگ قرآنی تعلیمات کو مجموعی تناظر میں دیکھنے کی بجائے کسی ایک نکتے کو پیش نظر رکھتے ہیں اور غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

☆ آخری نکتہ یہ کہ ہر مسلمان مرد و عورت کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرے اور دنیا میں اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بندہ بن کر گزارے اور اپنے نفس کو تسکین پہنچانے یا محض شہرت حاصل کرنے کے لیے کوئی عمل نہ کرے۔ یعنی ریاکاری سے دور رہے۔

اب ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔

اسلام مرد اور عورت کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ لیکن یہ حقوق مساوی ہیں، یکساں نہیں ہیں۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے

تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ ان کے درمیان شراکت کار ہونی چاہیے، گویا اگر دونوں اپنا کردار اسلامی احکام کے مطابق ادا کریں تو نہ ان کے درمیان رقابت ہوگی اور نہ مخالفت۔

جہاں تک اسلام میں حقوقِ نسواں کا تعلق ہے میں ان حقوق کو چھ بنیادی درجات میں تقسیم کرتا ہوں۔ یہ درجات یا اقسام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ روحانی حقوق
۲۔ معاشی حقوق
۳۔ معاشرتی حقوق
۴۔ تعلیمی حقوق
۵۔ قانونی حقوق
۶۔ سیاسی حقوق

آئندہ ابواب میں ان تمام حقوق کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

☆......☆......☆

پہلا باب

اسلام میں عورت کے مذہبی اور روحانی حقوق

اسلام نے عورت کو بہت حقوق دیے ہیں۔ سب سے پہلے ہم عورت کے روحانی اور مذہبی حقوق کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ دینی حیثیت سے اسلام عورت کو کیا مقام عطا کرتا ہے۔

مغربی دنیا میں اسلام کے حوالے سے جو غلط فہمیاں عام ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام میں جنت کا تصور صرف مرد کے لیے ہے عورت کے لیے نہیں۔ بالفاظ دیگر وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں بہشت صرف مردوں کے لیے مخصوص ہے اور عورت جنت میں نہ جا سکے گی۔ یہ ایک صریح غلط فہمی ہے جس کی تردید قرآن کی درج ذیل آیات بخوبی کر دیتی ہیں۔

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ ﴾ (۴:۱۲۴)

''اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ کی جائے گی۔''

اسی سے ملتی جلتی بات قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں بھی کی گئی ہے۔ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (۱۶:۹۷)

''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن،

اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔"

مندرجہ بالا آیات سے بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں جنت کے حصول کے لیے جنس کی کوئی شرط موجود نہیں ہے۔ اب آپ بتائیں کہ کیا اس نکتے کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کو فرسودہ (یا غیر منصفانہ) قرار دیا جاسکتا ہے؟

اسی طرح مغربی ذرائع ابلاغ بالعموم یہ کہتے ہیں کہ مذہب عورت میں روح کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ یہ بات مطلق مذہب کے حوالے سے یوں کرتے ہیں کہ اس کا اطلاق اسلام پر بھی ہوجاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ مسیحیوں کا ہے۔

سترھویں صدی میں روم میں ہونے والی کونسل کے اجلاس میں عیسائی علما اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عورت میں روح موجود نہیں ہوتی۔ ❶

جہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے اس حوالے سے اسلام عورت اور مرد میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اس بات کی وضاحت قرآنِ مجید میں سورۂ نساء کی پہلی آیت سے بخوبی ہوتی ہے۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ٱلَّذِى تَسَآءَلُونَ بِهِۦ وَٱلْأَرْحَامَ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ ﴾ (۴:۱)

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو۔ اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین

---

❶ اگرچہ بہ حیثیت مسلمان ہمیں یقین ہے کہ مسیحی علما کا یہ عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقی تعلیمات کے مطابق نہیں ہوسکتا۔ مترجم

جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔''

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں فرماتا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ﴾ (۱۶:۷۲)

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں۔''

اسی طرح سورۂ الشوریٰ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ (۴۲:۱۱)

''آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے اور اسی طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے اور اس طریقہ سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔''

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ روحانی حوالے سے اسلام مرد اور عورت کی فطرت میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، اسلام کی تعلیمات میں جدت موجود ہے یا یہ فرسودہ ہیں؟ تخلیق آدم کے حوالے سے قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴾

(۱۵:۲۹)

''جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں

تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔"

اسی طرح کی بات قرآنِ مجید کی سورۂ سجدہ میں بھی کی گئی ہے۔ یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ (۹:۲۳)

"پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے اور آنکھیں دیں اور دل دیے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

ان آیات میں "روح پھونکنے" کے الفاظ سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اسلام "حلول" وغیرہ جیسے عقاید کی تعلیم دیتا ہے۔ یہاں بات صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس تعلق کی ہو رہی ہے جو بندے کو اپنے خالق کے قریب تر کر دیتا ہے۔

اس حوالے سے مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ یہ بات آدم اور حوا علیہما السلام دونوں کے حوالے سے کی جا رہی ہے۔ دونوں اس لحاظ سے ہر طرح برابر ہیں۔

اسی طرح قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ زمین پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت عطا کی ہے۔ نیابت و خلافت کا یہ اعزاز انسان کو بلا تفریق جنس دیا گیا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷:۷۰)

"یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں ذکر آدم علیہ السلام کی تمام اولاد کا ہو رہا ہے وہ مرد ہو یا عورت۔

زیر بحث موضوع کا ایک اور پہلو سے بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ کچھ مذہبی صحائف میں زوال آدم یا جنت سے آدم علیہ السلام کے زمین پر آنے کا سبب عورت کو قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر انجیل مقدس میں آدم علیہ السلام کے باغ بہشت سے اخراج کا باعث عورت کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اسلام کا نقطۂ نظر اس حوالے سے قطعاً مختلف ہے۔

اگر آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو ایک درجن مقامات پر آپ کو اس واقعے کا ذکر ملے گا مثال کے طور پر سورۂ اعراف کی انیسویں آیت۔ ان تمام مقامات پر آدم وحوا علیہما السلام کا طرزِ عمل یکساں ہی بتایا گیا ہے۔ دونوں سے غلطی ہوئی، دونوں کو اپنی غلطی پر ندامت ہوئی۔ دونوں معافی کے خواستگار ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کی توبہ قبول فرمائی۔

اس کے مقابلے میں اگر آپ بائبل کا نقطہ نظر جاننا چاہیں تو کتاب پیدائش کے تیسرے باب کا مطالعہ کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس واقعے کی تمام تر ذمہ داری حوا علیہا السلام پر عاید کر دی گئی ہے۔ یہی نہیں حوا علیہا السلام کی اس غلطی کو گناہ حقیقی قرار دے دیا گیا اور یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا ہے کہ ہر انسان ہی گناہ گار پیدا ہوتا ہے۔

کتاب پیدائش کی مندرجہ ذیل آیت میں اس حوالے سے بائبل کا نقطۂ نظر مندرجہ ذیل بیان میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

> ''پھر اُس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا، تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔'' (پیدائش، باب ۳، آیت ۱۶)

گویا نہ صرف یہ کہ آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کا سبب عورت کو بتایا جارہا ہے بلکہ حمل اور اولاد کی پیدائش کی تکالیف کو عورت کی سزا بتایا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان بیانات سے عورت کے وقار اور مرتبے میں اضافہ تو ہوتا نہیں۔ دوسری طرف اگر اس حوالے سے قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام ان تکالیف کو عورت کی عظمت اور وقار میں اضافے کا سبب بتاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان آیات مبارکہ کا مطالعہ کیجیے۔

سورۂ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو۔ اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔'' (۱:۴)

اسی طرح سورۂ لقمان میں آتا ہے:

''اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔'' (۱۴:۳۱)

سورۂ احقاف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ط ﴾ (۱۵:۴۶)

''اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا آیاتِ قرانی سے واضح ہوتا ہے، اسلام ماں بننے کے عمل کی عظمت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے عورت کو اس حوالے سے انتہائی اعلیٰ اور ارفع مقام عطا کرتا ہے۔ ان آیات مبارکہ کو پڑھنے کے بعد آپ کی رائے کیا بنتی ہے؟ اسلام عورتوں کو جو حقوق دیتا ہے، کیا وہ واقعی فرسودہ ہیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں برتری کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری اور نیکی ہی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے

ہاں مقام کا تعین ہوتا ہے۔

سورۂ حجرات میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے:

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب سے زیادہ جاننے والا اور باخبر ہے۔'' (۴۹:۱۳)

جنس، رنگ، نسل اور مال و دولت اسلام میں عزت کا معیار نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں معیار ایک ہی ہے اور وہ ہے ''تقویٰ''۔ محض جنس کی بنیاد پر نہ اللہ کے ہاں سزا ملے گی اور نہ جزا۔

سورۂ آل عمران میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ ﴾ (۳:۱۹۵)

جواب میں ان کے رب نے فرمایا: ''میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور میں معاف کردوں گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔''

سورۂ احزاب میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِينَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِينَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِينَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِينَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِينَ وَالصّٰئِمٰتِ وَالْحٰفِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِينَ اللّٰهَ كَثِيرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيمًا ۝ ﴾ (۳۳:۳۵)

”بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“

اس آیت مبارکہ سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اسلام مرد اور عورت کے درمیان نہ تو اخلاقی اور روحانی ذمہ داریوں کے حوالے سے کوئی تفریق روا رکھتا ہے اور نہ ہی فرائض و واجبات کے لحاظ سے۔ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا اور زکوٰۃ دینا جس طرح مرد پر فرض ہے، اسی طرح عورت پر بھی لازم ہے۔

البتہ عورت کو کچھ اضافی سہولتیں ضرور دی گئی ہیں۔

ایام مخصوصہ کے دوران عورت کو نماز کی رخصت دی گئی ہے۔ یہ نمازیں اسے معاف ہیں اسی طرح حیض ونفاس کے دوران چھوٹنے والے روزے بھی وہ بعد میں رکھ سکتی ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام عورت اور مرد پر یکساں اخلاقی ذمہ داریاں عاید کرتا ہے اور ایک ہی جیسی حدود و قیود نافذ کرتا ہے۔ سو آپ کے خیال میں اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟

اسلام کے عطا کردہ حقوق نسواں جدید ہیں یا فرسودہ؟

دوسرا باب

اسلام میں عورت کے معاشی حقوق

گزشتہ باب میں ہم نے عورت کے روحانی حقوق کا جائزہ لیا یعنی یہ دیکھا کہ اسلام عورت کو دینی، مذہبی اور روحانی حوالوں سے کیا مقام ومرتبہ عطا کرتا ہے۔

اب ہم زیر نظر موضوع یعنی ''اسلام میں حقوق نسواں'' کا جائزہ ایک اور پہلو سے لیں گے اور دیکھیں گے کہ معاشی حوالے سے عورت کو اسلام کیا حقوق عطا کرتا ہے۔

اس حوالے سے تجزیہ کیجیے تو سب سے پہلے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اسلام نے آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے عورت کو معاشی حقوق دیے۔ ان حقوق میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عاقل بالغ مسلمان عورت جائداد خرید سکتی ہے، رکھ سکتی ہے، بیچ سکتی ہے۔ خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ وہ بغیر کسی پابندی کے اپنی مرضی سے اپنے مال کے بارے میں وہ تمام فیصلے کرسکتی ہے جو ایک مرد کرسکتا ہے۔

اسلام نے عورت کو جائداد رکھنے اور اس کی خرید و فروخت کرنے کا حق آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے دیا تھا جب برطانیہ میں یہی حق عورت کو ۱۸۷۰ء میں آ کر ملا۔

میں مانتا ہوں کہ چونکہ عورت کو یہ حقوق اسلام نے چودہ سو برس پہلے دے دیے تھے لہٰذا ہم انھیں عورت کے ''قدیم حقوق'' بھی کہہ سکتے ہیں لیکن کیا قدیم ہونے کی وجہ سے یہ حقوق فرسودہ ہوگئے ہیں؟ کیا یہ حقوق جدید ترین معیار پر پورے نہیں اترتے؟

جہاں تک عورت کے کام کرنے اور روزی کمانے کا تعلق ہے، اسلام اس کی بھی پوری اجازت دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں کہیں بھی عورت کے کام کرنے پر پابندی عاید نہیں کی گئی۔ شرط یہ ہے کہ یہ کام جائز ہو اور شرعی حدود کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کیا جائے۔ اور

خصوصاً پردے کی رعایت کی جائے۔

لیکن قدرتی بات ہے کہ اسلام عورت کو کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دے گا جس میں عورت کے حسن و جمال کو نمایاں کیا جائے مثال کے طور پر اداکاری اور ماڈلنگ وغیرہ۔

اسی طرح بہت سے کام ایسے ہیں جو اسلام نے مردوں کے لیے بھی حرام کر دیے ہیں ظاہر ہے ایسے کاموں کی اجازت عورت کو بھی نہیں دی جا سکتی۔ مثال کے طور پر شراب کے کاروبار سے متعلق پیشے یا قمار بازی سے تعلق رکھنے والے پیشے۔ ایسے پیشے مردوں کے لیے بھی اسی طرح ممنوع ہیں جس طرح عورتوں کے لیے۔

ایک حقیقی اسلامی معاشرے میں بہت سے پیشے ایسے ہیں جنھیں خواتین اختیار کر سکتی ہیں مثال کے طور پر طب کا شعبہ ہی دیکھیے۔ خواتین کے علاج کے لیے ہمیں ماہر خواتین ڈاکٹروں اور نرسوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح تعلیم کے شعبہ میں خواتین اساتذہ کا ہونا ضروری ہے۔

دوسری طرف اسلام تمام تر معاشی ذمہ داریاں مرد کو سونپتا ہے اور عورت پر کمانے کی ذمہ داری بالکل نہیں عاید کرتا۔ گویا اسے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ عورت کو اپنی روزی خود کمانی پڑے تو اسلام اسے اس سے روکتا بھی نہیں۔

متذکرہ بالا شعبوں کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں جو عورت کر سکتی ہے۔ عورت اپنے گھر میں بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے کام شروع کر سکتی ہے۔

جہاں تک فیکٹریوں اور دیگر اداروں میں کام کرنے کا تعلق ہے اس میں کوئی جرج نہیں بشرطیکہ ان اداروں کا انتظام اسلامی اصولوں کے مطابق چل رہا ہو۔ یعنی مردوں اور عورتوں کے شعبے بالکل الگ الگ ہوں۔ کیونکہ اسلام عورتوں اور مردوں کے اختلاط کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

اسی طرح اسلام عورت کو کاروبار کی اجازت دیتا ہے لیکن جہاں نامحرموں سے اختلاط کا موقع ہو وہاں اسے کسی محرم مرد، مثال کے طور پر باپ، بھائی یا شوہر کی مدد حاصل کرنا ہوگی۔

اس سلسلے میں ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی مثال ہمارے سامنے ہے وہ اپنے دور میں مکہ کی مالدار کاروباری خواتین میں شمار ہوتی تھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جانب سے کاروباری ذمہ داریاں سرانجام دیتے رہے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے اسلام خاندان میں عورت کو زیادہ معاشی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی آپ کے سامنے وضاحت کی، اسلام بنیادی طور پر فکر معاش کی ذمہ داری خاندان کے مرد پر عاید کرتا ہے۔ عورت پر ایسی کسی ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالا گیا۔

شادی سے پہلے یہ اس کے باپ یا بھائیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی تمام ضروریات اپنی استطاعت کی حد تک پوری کریں شادی کے بعد یہ ذمہ داری اس کے شوہر کی طرف منتقل ہوجاتی ہے کہ وہ اس کے کھانے پینے، پہننے اور رہنے سہنے کا بندوبست کرے اگر شوہر فوت ہوجائے تو یہ ذمہ داری اس کے بیٹے پر عاید ہوجاتی ہے۔ گویا جب تک کوئی مرد موجود ہے کمانے کی ذمہ داری اسی کی ہے۔

شادی کے موقع پر بھی دیکھا جائے تو اسلامی اصولوں کی روشنی میں عورت ہی فائدے میں رہتی ہے۔ کیونکہ نکاح کے موقع پر اسے حق مہر کی صورت میں ایک تحفہ ملتا ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نساء میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو البتہ اگر وہ اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمہیں معاف کردیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔'' (۴:۴)

مہر شریعت اسلامی کی رو سے نکاح کی ایک لازمی شرط ہے۔ اگرچہ اب ہمارے معاشرے میں مہر کی روح کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ جس شادی کی تقریب پر لاکھوں روپے خرچ کیے جارہے ہوتے ہیں وہاں حق مہر چند سو روپے مقرر کرلیا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ بات ٹھیک ہے کہ اسلام میں مہر کی رقم کے لیے کوئی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ مقدار معین نہیں ہے یعنی بالائی یا زیریں حد مقرر نہیں کی گئی۔ لیکن بہرحال حق مہر کا فریقین کی مالی حیثیت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ ایک سو اکیاون روپے یا سات سو چھیاسی روپے حق مہر کا کوئی تک نہیں بنتا۔

ایک المیہ یہ ہوا ہے کہ بعض مسلمان معاشروں پر دیگر ثقافتوں کے اثرات کچھ زیادہ ہی مرتب ہوئے ہیں جس کی ایک مثال برصغیر پاک و ہند کا معاشرہ ہے۔ یہاں ''مہر'' تو بہت کم مقرر کیا جاتا ہے لیکن توقع یہ رکھی جاتی ہے لڑکی اپنے ساتھ بہت سا جہیز لے کر آئے گی۔ ٹی وی اور فریج سے لے کر کار اور فلیٹ تک کی توقع کی جاتی ہے۔

لڑکے والے اپنی حیثیت کے مطابق مہر تو دیتے نہیں البتہ اپنی حیثیت کے مطابق جہیز کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔ لڑکے کی قیمت مقرر کی جاتی ہے۔ اگر وہ گریجویٹ ہے تو ایک لاکھ اگر ڈاکٹر یا انجینئر ہے تو تین یا پانچ لاکھ۔ لیکن ان باتوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں جہیز کا مطالبہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ، کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔

اگر لڑکی کے والدین اپنی خوشی سے اپنی بیٹی کو کوئی تحفہ دینا چاہیں تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن اس مقصد کے لیے دباؤ ڈالنا کسی صورت جائز نہیں ہے۔ اسلام ایسی حرکتوں سے سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔

عورت کے لیے کمانا ضروری نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ کچھ کماتی ہے تو یہ مکمل طور پر اس کی ذاتی ملکیت ہوگی۔ اسے اپنے گھر والوں پر ایک پائی بھی خرچ کرنے کا پابند نہیں کیا گیا۔ وہ اپنی کمائی، اپنی مرضی سے جیسے چاہے خرچ کر سکتی ہے۔

اسلامی اصول یہ ہے کہ بیوی کتنی ہی مال دار کیوں نہ ہو، کھانا اور روٹی، کپڑے، مکان کا بندوبست کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے کیونکہ معاشی ذمہ داری اسلام صرف اور صرف مرد کے کاندھوں پر ڈالتا ہے۔ اور شوہر کو اپنی یہ ذمہ داری بہرصورت ادا کرنی ہوتی ہے۔

طلاق یا علیحدگی کی صورت میں بھی ''عدت'' کے دوران بیوی کے نفقے کا ذمہ دار مرد

ہے۔ اگر بچے موجود ہیں تو ان کے اخراجات پورے کرنا بھی اسی کا فرض ہے۔

اسلام نے آج سے صدیوں پہلے ہی عورت کو وراثت کا حق دیا۔ اگر آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ سورۂ بقرہ، سورۂ نسا اور سورۂ مائدہ میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ عورت بیوی کی حیثیت سے، ماں کی حیثیت سے، بہن اور بیٹی کی حیثیت سے وراثت میں حصہ دار ہے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کا حصہ قرآن میں مقرر فرما دیا ہے۔

میں جانتا ہوں اس حوالے سے سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ خواتین کے حوالے سے اسلام کا قانونِ وراثت منصفانہ نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے پاس وقت محدود ہے لہٰذا میں یہاں اس حوالے سے گفتگو نہیں کروں گا۔ ان شاء اللہ جب اس حوالے سے سوالات ہوں گے تو میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ جواب دوں گا۔

☆......☆......☆

تیسرا باب

اسلام میں عورت کے معاشرتی حقوق

اس باب میں ہم معاشرتی اور سماجی حوالوں سے عورت کو دیے گئے حقوق کا تجزیہ کریں گے۔ ان حقوق کی تقسیم اس طرح بھی کی جاسکتی ہے:

ا اسلام میں عورت کے حقوق بحیثیت بیٹی

ب اسلام میں عورت کے حقوق بحیثیت بیوی

ج اسلام میں عورت کے حقوق بحیثیت ماں

د اسلام میں عورت کے حقوق بحیثیت بہن

سب سے پہلے ہم دین اسلام میں بیٹی کو دیے گئے معاشرتی حقوق کا ذکر کرتے ہیں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام نے بیٹی کو جان کی حفاظت فراہم کی اور بیٹیوں کو قتل کرنے کی قبیح روایت کا خاتمہ کیا۔ اسلام یہ حفاظت بیٹے اور بیٹی دونوں کے لیے فراہم کرتا ہے۔ اور قتل اولاد کو حرام قرار دیتا ہے۔ سورۃ التکویر میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝ ﴾ (۸۱: ۸،۹)

''اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ﴾ (۶: ۱۵۱)

’’اے نبی ﷺ! ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عاید کی ہیں۔ یہ کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔‘‘

اسی طرح حکم ہمیں سورۂ بنی اسرائیل میں بھی ملتا ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ ﴾ (۱۷:۳۱)

’’اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔‘‘

ظہورِ اسلام سے قبل، دور جاہلیت کے عرب معاشرے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کردیا کرتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اسلام نے آ کر اس مکروہ اور ظالمانہ رسم کا خاتمہ کردیا۔ عرب تہذیب میں تو اسلام نے یہ رسم ختم کردی لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک ہندوستان میں آج بھی بیٹیوں کو قتل کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ عالمی نشریاتی ادارے بی بی سی نے ایک رپورٹ تیار کی ہے۔ اس پروگرام کا عنوان تھا ’’اُسے مرنے دو‘‘ (Let Her Die.) بی بی سی کی ایک خاتون رپورٹر Emily Beckenen نے برطانیہ سے ہندوستان آ کر اس موضوع پر تحقیقات کیں اور یہ رپورٹ تیار کی۔ یہ پروگرام کافی عرصہ قبل سٹار ٹی وی پر بھی دکھایا گیا اور شکر ہے کہ بار بار دکھایا جارہا ہے۔ کچھ ہی دن قبل بھی یہ پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا ہے۔

اس پروگرام میں جو اعداد و شمار فراہم کیے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ روزانہ تقریباً تین ہزار حمل ضایع کیے جارہے ہیں۔ والدین بچے کی جنس معلوم کرتے ہیں اور جب پتہ چلتا ہے کہ بچی پیدا ہونے والی ہے تو حمل ضایع کروادیا جاتا ہے۔

اگر یہ اعداد و شمار درست ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر سال تقریباً ۱۰ لاکھ بیٹیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔

تامل ناڈو اور راجھستان وغیرہ جیسی ریاستوں میں ایسے بورڈ اور پوسٹر نظر آ رہے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے:

''پانچ سو روپے خرچ کریں اور پانچ لاکھ روپے بچائیں۔''

کیا آپ جانتے ہیں اس جملے کا کیا مطلب ہے؟ کہ پانچ سو روپے طبی معائنے پر خرچ کریں اور یہ معلوم کریں کہ بچہ پیدا ہونے والا ہے یا بچی۔ یعنی پیدائش سے قبل ہی بچے کی جنس معلوم کرلیں۔ اگر ماں کے پیٹ میں بچی پرورش پا رہی ہو تو حمل ضایع کروا دیں اور یوں بچی کی پرورش اور بعد ازاں جہیز کی صورت میں خرچ ہونے والے لاکھوں روپے بچالیں۔

تامل ناڈو کے سرکاری ہسپتال کی رپورٹ یہ ہے کہ ہر دس میں سے پانچ بیٹیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا شاید ہمیں اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ہندوستان میں عورتوں کی آبادی مردوں سے کم ہے۔

بچیوں کے قتل کا یہ سلسلہ نیا نہیں ہے۔ صدیوں سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اگر آپ ہندوستان میں ۱۹۰۱ء میں ہونے والی مردم شماری کے اعداد و شمار کا جائزہ لیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اس وقت بھی ہندوستان میں ۱۰۰۰ مردوں کے مقابلے میں ۹۷۲ عورتیں تھیں۔

اس کے بعد اگر آپ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ تناسب مزید بگڑ چکا ہے۔ کیونکہ ۱۹۸۱ء میں ۱۰۰۰ مردوں کے مقابلے میں ۹۳۴ عورتیں تھیں۔

عورتوں کی آبادی کا تناسب مزید کم ہوتا جا رہا ہے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں یہ ۱۰۰۰ کے مقابلے میں ۹۲۷ تک جا پہنچا ہے اور سب سے زیادہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ سائنس کی ترقی نے بجائے اس عمل کو روکنے کے اس میں مزید سہولت پیدا کر دی ہے۔

اب آپ ہی بتائیں کہ اسلام جب قتل اولاد پر پابندی لگاتا ہے قطع نظر اس کے کہ

اولاد بچہ ہے یا بچی، تو آپ کے نزدیک اسلام کا یہ طرزِ عمل جدید تر ٹھہرتا ہے یا فرسودہ؟

اسلام صرف بچی کے قتل پر ہی پابندی نہیں لگاتا۔ اسلام تو اس طرزِ عمل کی بھی سختی سے مذمت کرتا ہے کہ بچے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جائیں اور بچی کی پیدائش کی خبر سن کر افسوس کیا جائے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کسی کو کیا منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ اللہ کے بارے میں لگاتے ہیں۔'' (۱۶:۵۹،۵۸)

مزید یہ کہ اسلام بیٹی کی تعلیم و تربیت اچھے طریقے سے کرنے کا بھی حکم دیتا ہے۔ مسند احمد کی ایک حدیث نبوی ﷺ کا مفہوم کچھ یوں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اپنی دو بیٹیوں کی خوش اسلوبی سے پرورش کرتا ہے وہ قیامت کے دن اس طرح میرے ساتھ ہوگا۔ آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیاں اکٹھی کر کے دکھایا۔''

ایک اور حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے:

''جس شخص نے اپنی دو بیٹیوں کی اچھی طرح پرورش کی اور ان کا خیال رکھا اور محبت کے ساتھ انھیں پالا وہ شخص جنت میں داخل ہوگا۔''

اسلام بیٹوں اور بیٹیوں میں فرق روا رکھنے کے بھی خلاف ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

''ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک شخص نے اپنے بیٹے کو پیار کیا اور اپنی گود میں بٹھا لیا، لیکن اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ نبی کریم ﷺ نے

فوراً فرمایا کہ تو ظالم ہے تجھے چاہیے تھا کہ اپنی بیٹی کو بھی پیار کرتا اور اسے بھی اپنی گود میں بٹھاتا۔“

نبی کریم ﷺ صرف زبانی احکامات نہیں دیتے تھے۔ آپ کے اسوۂ حسنہ سے بھی ایسے ہی طرزِ عمل کا ثبوت ملتا ہے۔

اب ہم آتے ہیں عورت کے بحیثیت بیوی معاشرتی حقوق کی جانب!

اگر اسلام سے پہلے کے مذاہب اور تہذیبوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں عورت کو شیطان کا آلہ کار سمجھا جاتا تھا۔ یعنی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شیطان عورت کے ذریعے انسان کو گمراہ کرتا ہے۔

اسلام میں عورت کا تصور اس کے بالکل الٹ ہے۔ کیونکہ اسلام عورت کو ”محصنہ“ قرار دیتا ہے یعنی شیطان سے بچنے کا ذریعہ خیال کرتا ہے۔ جب ایک مرد کی شادی ایک اچھی اور نیک عورت سے ہوتی ہے تو وہ عورت اس کے لیے شیطانی ترغیبات سے بچنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اسے اس راہ پر چلانے کا باعث بنتی ہے جسے قرآن نے صراطِ مستقیم قرار دیا ہے۔

اسی طرح صحیح بخاری کی روایت کردہ ایک حدیث کا مفہوم ہے:

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ہر مسلمان جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو ضرور نکاح کرے۔ اس طرح ان کے لیے اپنی نگاہ کی حفاظت اور پاک دامنی برقرار رکھنا آسان ہو جائے گا۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے:

”جس نے نکاح کر لیا اس نے اپنا آدھا دین محفوظ کر لیا۔“

یہ حدیث سن کر ایک دفعہ ایک صاحب کہنے لگے:

”کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں دو نکاح کر لوں تو میرا ایمان مکمل ہو جائے گا؟“

یہ صاحب بالکل غلط سمجھے تھے۔ دراصل حدیث میں کہی گئی بات سو فیصد درست ہے۔ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نکاح سے آدھا دین محفوظ ہو جاتا ہے تو ان کی مراد یہ تھی کہ نکاح کر لینے سے ایک مسلمان کے لیے بدکرداری، بداخلاقی، بے راہ روی، زنا کاری اور ہم جنس پرستی جیسے جرائم سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کے نصف جرائم انھی اسباب کے باعث ہوتے ہیں۔

شادی کے بعد آپ پر بیوی، شوہر، ماں اور باپ کی حیثیت سے بھی ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں۔ اسلام ان ذمہ داریوں کو بھی نہایت اہم قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داریاں نکاح کے بعد ہی پوری کی جا سکتی ہیں۔

بہر حال آپ ایک شادی کریں، دو کریں، تین کریں یا چار، آپ کا آدھا ایمان ہی محفوظ ہوتا ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے کہ میاں بیوی کے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت رکھ دی گئی ہے۔

اگر آپ سورۂ روم کا مطالعہ کریں تو یہ ارشادِ باری تعالیٰ دیکھیں گے:

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔'' (۳۰:۲۱)

سورۂ نسا کی اکیسویں آیت میں نکاح کو ایک پختہ عہد (میثاق غلیظ) قرار دیا گیا ہے۔

اسی سورۂ کی انیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ ﴾ (۴:۱۹)

''ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ

دی ہو۔"

نکاح کے لیے فریقین کی رضا مندی ایک لازمی شرط ہے یعنی مرد اور عورت دونوں کو اس رشتے کے لیے راضی ہونا چاہیے۔ کوئی بھی ...... خواہ وہ لڑکی کا والد ہی کیوں نہ ہو، اپنی بیٹی کی شادی زبردستی نہیں کر سکتا۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث کے مطابق ایک عورت کا نکاح اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف کر دیا تھا۔ یہ عورت رسول اکرم ﷺ کے پاس گئی اور فریاد کی۔ آپ ﷺ نے اس نکاح کو فسخ قرار دیا۔

احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی روایت کردہ ایک حدیث کا مفہوم بھی اس سے ملتا جلتا ہے، جس کے مطابق ایک عورت بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئی اور شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ وہ اگر چاہے تو اس نکاح کو برقرار رکھے اور چاہے تو فسخ کر دے۔

مندرجہ بالا احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نکاح کے لیے فریقین کی رضا مندی ضروری قرار دیتا ہے۔

اسلام میں عورت کا تصور خاندان تشکیل دینے والی شخصیت کا ہے بیوی کی حیثیت سے وہ مکان کو گھر بناتی ہے۔ مغربی دنیا میں بیوی کے لیے House wife کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جو غلط ہے کیونکہ اس کی شادی گھر کے ساتھ نہیں ہوئی۔ لوگ اصطلاحات بناتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔ "ہاؤس وائف" کا مطلب ہے "مکان کی بیوی"۔

میں امید رکھتا ہوں کہ میری بہنیں آیندہ خود کو ہاؤس وائف (House Wife) کہلوانے کی بجائے ہوم میکر (Home maker) کہلوانا پسند کریں گی۔

اسلام میں بیوی کی حیثیت باندی کی نہیں ہوتی بلکہ اسے شوہر کے ساتھ بالکل مساوی حیثیت ملتی ہے۔

ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کردہ ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کا سلوک اپنے گھر والوں سے اچھا ہے۔''

اسلام نے مرد اور عورت کی سماجی حیثیت میں کوئی بھی فرق نہیں رکھا سوائے ایک پہلو کے، اور وہ پہلو قیادت کا ہے۔ جسٹس قاضی صاحب نے بھی بالکل درست نشاندہی کی کہ قرآن شوہر اور بیوی کو مکمل برابری کی حیثیت دیتا ہے لیکن اس نے گھر یا خاندان کا سربراہ مرد کو بنایا ہے۔

سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ ﴾ (۲:۲۲۸)

''عورتوں کے لیے بھی معروف طریقہ پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔''

یہاں میں جسٹس ایم ایم قاضی سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ بیشتر مسلمان اس آیت کا مفہوم غلط اخذ کرتے ہیں۔ خصوصاً مرد کو ایک درجہ حاصل ہونے کی بات کو بالعموم غلط سمجھا گیا۔ حالانکہ، جس طرح کہ میں نے پہلے عرض کیا کسی بھی حکم کو سمجھنے کے لیے پورے قرآن میں متعلقہ بیانات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

سورۂ نساء میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ (۴:۳۴)

''مرد عورتوں پر قوام ہیں۔''

لوگ بالعموم ''قوام'' کا ترجمہ ''ایک درجہ برتر'' کرتے ہیں۔ یا یہ کہ مرد ایک درجہ افضل ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوام کا لفظ اقامہ سے نکلا ہے مثال کے طور پر نماز سے پہلے اقامت ہوتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ گویا اقامہ کے

معنی ہوئے کھڑے ہو جانا۔ اور جہاں تک قوام کے معنی کا تعلق ہے تو اس لفظ کے معانی یہ نہیں ہیں کہ مرد کو عورت پر ایک درجہ برتری یا فضیلت حاصل ہے بلکہ یہ ہیں کہ مرد کی ذمہ داریاں ایک درجہ زیادہ ہیں۔

اگر آپ تفسیر ابن کثیر کا مطالعہ کریں تو آپ یہی لکھا پائیں گے کہ مرد کی ذمہ داری ایک درجہ زیادہ ہے نہ کہ بلحاظ فضیلت کوئی برتری ہے۔ اور یہ ذمہ داری فریقین کو باہمی رضا مندی سے برضا و رغبت ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط ﴾ (۲:۱۸۷)

''وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔''

لباس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ لباس کا مقصد پردہ بھی ہوتا ہے اور زینت بھی۔ اسی طرح میاں بیوی کو ایک دوسرے کے عیبوں پر پردہ ڈالنے والا اور ایک دوسرے کے لیے باعث زینت ہونا چاہیے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ ﴾ (۴:۱۹)

''اور ان کے ساتھ معروف طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔''

گویا حکم قرآنی کے مطابق اگر آپ کو اپنی بیوی ناپسند ہو پھر بھی آپ کو اس کے ساتھ خوش اخلاقی ہی سے پیش آنا چاہیے۔ اور برابری کی سطح پر ہی رہنا چاہیے۔

ہماری اب تک کی گفتگو سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اسلام عورت کو بحیثیت بیوی کے کیا حقوق عطا کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ کی کیا رائے ہے؟ یہ حقوق جدید ہیں یا فرسودہ؟

اب ہم آتے ہیں والدہ کے حقوق کی جانب۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد اہمیت والدین کے احترام کی ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں، بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو نہ انھیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ ''پروردگار، ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔'' (۱۷:۲۴،۲۳)

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔'' (۴:۱)

سورۂ لقمان میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے:

''اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔'' (۳۱:۱۴)

سورۂ احقاف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ ﴾ (۴۶:۱۵)

''اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا۔ اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔''

احمد اور ابن ماجہ سے روایت ہونے والی ایک حدیث کا مفہوم ہے:

''جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔''

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ راستے پر چلتے ہوئے جو کچھ ماں کے پاؤں تلے آتا ہے وہ سب جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے بلکہ اس کے معانی یہ ہیں کہ اگر آپ فرائض دینی ادا کرتے ہیں اور اس کے بعد ماں کی عزت کرتے ہیں، خدمت کرتے ہیں فرماں برداری کرتے ہیں تو آپ یقیناً جنت میں جائیں گے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک روایت کا مفہوم ہے:

''ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ مجھ پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری ماں کا۔'' اس نے پوچھا اس کے بعد؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری ماں کا۔ اس شخص نے تیسری بار پوچھا: اس کے بعد؟ آپ ﷺ نے پھر فرمایا: ''تیری ماں کا۔'' جب اس نے چوتھی مرتبہ دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرے باپ کا۔''

گویا اس حدیث کی روشنی میں پچھتر فی صد عزت و احترام کی مستحق ماں ٹھہرتی ہے اور پچیس فی صد کا باپ۔

یا یوں کہیے کہ تین چوتھائی محبت ماں کے حصے میں اور ایک چوتھائی باپ کے حصے میں آتی ہے۔

مختصراً سونے کا تمغہ ماں کے حصے میں آتا ہے چاندی کا تمغہ بھی ماں کے حصے میں، کانسی کا تمغہ بھی ماں کے حصے میں آتا ہے اور حوصلہ افزائی کا انعام باپ کو ملتا ہے۔

آپ نے اسلام میں ماں کے حقوق ملاحظہ فرمائے۔ اب فیصلہ کریں کہ یہ حقوق جدید

ہیں یا فرسودہ؟

اسی طرح اسلام نے عورت کو بہن کی حیثیت سے بھی نہایت محترم قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ ﴾ (۹:۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔''

لفظ اولیا کے معنی یہاں رفیق اور مددگار ہیں۔ بالفاظِ دیگر مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں بہن بھائی ہیں، اگر ان کے درمیان کوئی اور رشتہ نہ ہو تو۔

خواتین کو اس قدر معاشرتی حقوق دیے گئے ہیں کہ ہم ان کے حوالے سے ہفتوں گفتگو کر سکتے ہیں لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ہم متعدد اہم موضوعات مثلاً کثرتِ ازدواج اور طلاق وغیرہ پر گفتگو نہیں کریں گے۔ کیونکہ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ ان موضوعات کے حوالے سے سوالات ضرور کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ اس وقت ان کی وضاحت ہو جائے گی۔

☆......☆......☆

چوتھا باب

اسلام میں عورت کے تعلیمی حقوق

اب ہم ان حقوق کا تذکرہ کریں گے جو اسلام نے تعلیم کے حوالے سے خواتین کو عطا کیے ہیں۔ قرآنِ مجید کی جو سب سے پہلے آیات نازل ہوئیں وہ سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات تھیں۔ ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ ﴾ (۹۶: ۱،۵)

''پڑھو! (اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

اور یہ بات ذہن میں رکھیے کہ بات آج سے چودہ سو برس پہلے کی ہو رہی ہے جب خواتین کو کسی بھی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ ان کی حیثیت ذاتی املاک سے بڑھ کر نہ تھی۔ اسلام نے اُس وقت خواتین کی تعلیم پر زور دیا جس وقت دنیا میں تعلیم نسواں کا کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں ہمیں متعدد عالمہ خواتین کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ سب سے اہم مثال تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں اور امہات المومنین میں شامل تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ

سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور خلفائے راشدین تک ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے رہے۔

آپ کے ممتاز ترین شاگرد عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ کہتے ہیں:

"میں نے تفسیر قرآن، فرائض، حلال و حرام، ادب و شعر اور تاریخ عرب کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں دیکھا۔"

وہ نہ صرف یہ کہ علوم دینیہ کی ماہر تھیں بلکہ دیگر علوم مثلاً طب پر بھی ماہرانہ دسترس رکھتی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے والے وفود جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو کرتے تھے تو آپ رضی اللہ عنہا اس گفتگو سے حاصل ہونے والی معلومات کو ذہن نشین کر لیتی تھیں۔

انھیں علم ریاضی سے بھی دلچسپی تھی۔ اور متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے "میراث" کے مسائل آپ سے دریافت فرمائے اور آپ رضی اللہ عنہا نے ہر وارث کا حصہ شریعت کے مطابق انھیں بتایا۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ آپ کو چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی رہنمائی کا بھی موقع ملا۔ متعدد مرتبہ آپ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی رہنمائی فرمائی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے تقریباً ۲۲۱۰ احادیث مروی ہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جو خود ایک بہت بڑے عالم ہیں، فرماتے ہیں:

"جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی معاملے کے بارے میں علم نہ ہوتا تو ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کرتے اور وہ ہماری رہنمائی کرتیں۔"

آپ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۸۸ علما نے آپ سے تعلیم حاصل کی۔ یعنی آپ کو "استاذ الاساتذہ" کا مقام حاصل ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ بھی متعدد صحابیات کے علم و فضل کی شہادت ملتی ہے۔ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو بھی علم فقہ میں مہارت حاصل تھی۔ امام نووی رحمہ اللہ کے بقول وہ اپنے وقت کی سب سے عالم خاتون تھیں۔

اسی طرح ایک اور مثال ام المؤمنین حضرت ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا کی ہے۔ ان کے بارے میں ابن حجر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ۳۲ علما نے آپ سے تعلیم حاصل کی۔

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن کسی مسئلے پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آپ سے سارا دن بحث ہوتی رہی، لیکن وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غلط ثابت نہیں کر سکے۔

امام نووی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ فاطمہ بنت قیس ابتدائی مہاجرین میں شامل تھیں اور وسیع علم رکھتی تھیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا بھی انتہائی عالم خاتون تھیں اور دعوت میں خصوصی مہارت رکھتی تھیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی پوتی سعیدہ نفیسہ رحمہا اللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی آپ سے تعلیم حاصل کی۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ وہ عالم ہیں جنہوں نے فقہ اسلامی کے چار بڑے مکاتب فکر میں سے ایک کا آغاز کیا۔

اسی طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ام الدرداء رضی اللہ عنہا جو حضرت ابوالدرداء کی زوجہ تھیں، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں علوم عقلیہ میں کمال حاصل تھا۔ ان کے علم وفضل کی گواہی امام بخاری رحمہ اللہ جیسے عالم نے بھی دی ہے۔

مزید مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ اور یہ ذکر اس دور کا ہو رہا ہے جب عورت کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب لوگ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفنا دیا کرتے تھے۔ اور اسی دور میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف علم دین بلکہ طب اور سائنس جیسے علوم کی ماہر خواتین بھی موجود تھیں۔

اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اسلام ہر عورت کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دیتا ہے۔ اس صورتِ حال میں آپ کی رائے کیا بنتی ہے؟

اسلام کے دیے ہوئے حقوقِ نسواں جدید ہیں یا فرسودہ؟

پانچواں باب

اسلام میں عورت کے قانونی حقوق

اسلامی قانون کے لحاظ سے مرد اور عورت بالکل برابر ہیں۔ اسلامی شریعت مرد اور عورت کی جان اور مال کو یکساں تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو اسے بھی سزائے موت ہی دی جائے گی۔ یعنی اسے بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا جیسے کسی مرد کے قاتل کو سزائے موت ملتی ہے۔ اور اگر کوئی عورت قتل کی مرتکب ہوتی ہے تو اس کے لیے بھی وہی سزا ہے۔

سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ○ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰـاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○ ﴾ (۲:۱۷۸،۱۷۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے۔ ہاں، اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو تو معروف طریقہ کے مطابق خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے۔ اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خون بہا ادا کرے۔ یہ تمہارے

رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے اس کے لیے دردناک سزا ہے۔ عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ اُمید ہے تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔"

اسلامی قانون میں جسمانی نقصان پہنچانے کی سزا بلا تفریق جنس ایک ہی ہے اور اس سلسلے میں مرد اور عورت میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔

اسلامی قانون قصاص کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر بھی سامنے آتا ہے کہ اگر کسی مقتول کی وارث عورت ہو تو اسے وہی حقوق حاصل ہیں جو کسی مرد وارث کو حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اگر چاہے تو قصاص لے سکتی ہے چاہے تو "دیت" حاصل کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مکمل آزادی حاصل ہے۔

اگر ورثا میں اختلاف ہو، کچھ ورثا دیت قبول کرنے کے حق میں ہوں اور کچھ قصاص میں قاتل کے قتل کیے جانے پر اصرار کریں تو اس صورت میں قتل کرنے سے روکا جائے گا اور دیت دلوائی جائے گی۔ لیکن یہاں بھی عورت اور مرد کی رائے کو یکساں اہمیت حاصل ہو گی اور بحیثیت وارث عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

جہاں تک دیگر جرائم کا تعلق ہے وہاں بھی عورت اور مرد میں کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی۔

سورۂ مائدہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾ (۵:۳۸)

"اور چور خواہ عورت ہو یا مرد دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع ید کی سزا مرد اور عورت دونوں کے لیے

ہے۔ جو بھی سرقے کا مرتکب ہوگا اسے سزا ملے گی اور جنس کے حوالے سے کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

اسی طرح سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِی فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِاْئَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ (۲:۲۴)

''زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کو سزا دیتے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود ہو۔''

یہاں بھی جنس کے حوالے سے کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ کنوارہ زانی مرد ہو یا عورت اسلامی شریعت دونوں کے لیے ایک ہی سزا مقرر کرتی ہے سو کوڑے زانی مرد کو بھی لگائے جائیں گے اور زانیہ عورت کو بھی۔ اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں رجم کیا جائے۔

اب ہم آتے ہیں قانون شہادت کی جانب۔ اسلام نے عورت کو گواہی کا حق دیا ہے اور تصور کیجیے کہ یہ حق اسلام نے عورت کو آج سے چودہ سو برس پہلے دیا تھا۔

یہودی ربی حضرات بیسویں صدی میں غور وفکر کر رہے تھے کہ عورت کو گواہی دینے کا حق ہونا چاہیے یا نہیں؟ جب کہ اسلام عورت کو یہ حق ڈیڑھ ہزار برس پہلے دے چکا تھا۔

سورۂ نور میں ہی ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ﴾ (۴:۲۴)

''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی

فاسق ہیں۔''

ایک عام جرم میں دو گواہوں کی شہادت درکار ہوتی ہے جبکہ بڑے جرائم میں چار گواہوں کی گواہی لازم ہے۔ اسلام نے کسی عورت پر بہتان طرازی کے معاملے میں چار گواہوں کی شہادت لازمی قرار دی ہے۔ گویا اسلام کی نظر میں کسی عورت کی عصمت وعفت پر انگلی اٹھانا ایک بہت بڑا جرم ہے۔

آج کے جدید معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جس کا جی چاہتا ہے شریف عورتوں پر الزام تراشی کرنے لگتا ہے۔ ان کے کردار اور اخلاق کے بارے میں جو جس کے دل میں آتا ہے کہے جاتا ہے۔ لیکن ایک اسلامی ریاست میں اگر آپ نے کسی عورت کو بدکردار کہہ دیا تو پھر آپ کو اپنا الزام ثابت کرنا ہوگا اور عدالت میں چار گواہ پیش کرنے ہوں گے، اگر آپ ایسا نہ کر پائے تو پھر نہ صرف آپ کو اسّی (۸۰) کوڑے پڑیں گے بلکہ آئندہ کے لیے کسی معاملے میں بھی آپ کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ اگر چار گواہوں میں سے کوئی ایک گواہ بھی درست شہادت نہ دے سکا تو چاروں کو سزا دی جائے گی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام عورت کی عزت اور وقار کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ شادی کے بعد عورت شوہر کا نام اپنے نام کے ساتھ لکھتی ہے لیکن اسلام نے اس معاملے میں بھی اسے آزادی دی ہے۔ وہ چاہے تو شوہر کا نام اختیار کرسکتی ہے اور چاہے تو باپ کا نام ہی استعمال کرسکتی ہے۔ بلکہ شادی سے پہلے والے نام ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آج بھی متعدد مسلمان معاشروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ شادی کے بعد بھی عورت اپنا پہلا نام ہی برقرار رکھتی ہے۔ اور اس کا سبب اسلام میں عورت اور مرد کی مساوات اور برابری ہے۔

اس صورت حال میں آپ کیا سمجھتے ہیں؟

اسلام میں عورت کے حقوق جدید ہیں یا فرسودہ؟

☆......☆......☆

چھٹا باب

اسلام میں عورت کے سیاسی حقوق

سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾

(۹:۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔''

مرد اور عورت محض سماجی سطح پر ہی نہیں بلکہ سیاسی سطح پر بھی ایک دوسرے کے لیے مدد معاون ہیں۔ اسلام عورت کو سیاسی معاملات میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق بھی دیتا ہے۔

سورۂ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (۶۰:۱۲)

''اے نبیؐ! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور

اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

یہاں بیعت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بیعت کے لفظ میں آج کل کے الیکشن کا مفہوم بھی شامل ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے رسول بھی تھے اور سربراہِ مملکت بھی تھے۔ اور بیعت سے مراد انہیں سربراہِ حکومت تسلیم کرنا تھا۔ اس طرح اسلام نے اسی دور میں عورت کو ووٹ دینے کا حق بھی تفویض کر دیا تھا۔

اسی طرح اسلام نے خواتین کو قانون سازی میں حصہ لینے کی اجازت بھی دی ہے، ایک مشہور روایت ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ صحابہ کرام کے ساتھ حق مہر کے مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ حق مہر کی بالا حد مقرر کر دی جائے کیونکہ نوجوانوں کے لیے نکاح کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک بوڑھی عورت اُٹھی اور اس نے قرآن مجید کی سورۂ نساء کی بیسویں آیت پڑھی:

﴿ وَإِنْ أَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ﴾

''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کر ہی لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔''

اس کے بعد اس عورت نے کہا کہ جب قرآن یہ اجازت دیتا ہے کہ مہر میں مال کا ڈھیر بھی دیا جا سکتا ہے تو عمر رضی اللہ عنہ کون ہوتا ہے حد مقرر کرنے والا۔

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور کہنے لگے کہ عمر

غلط تھا اور یہ عورت درست کہہ رہی تھی۔''

اندازہ کیجیے کہ عام عورت کو بھی اتنا حق حاصل تھا۔ وہ یقیناً ایک عام عورت تھی۔ اگر وہ کوئی مشہور خاتون ہوتی تو یقیناً اس کا نام لیا جاتا لیکن چونکہ نام نہیں لیا گیا لہٰذا پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی عام خاتون تھی، اور پھر بھی اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ خلیفۂ وقت سے اختلاف کی جرأت کر سکے اور اس پر اعتراض کر سکے۔

اگر آج کل کی تکنیکی اصطلاحات میں بات کی جائے تو ہم کہیں گے کہ اس خاتون نے ''آئین کی خلاف ورزی'' پر اعتراض کیا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کا آئین تو قرآن ہے۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عورت کو قانون سازی میں شرکت کا بھی حق دیتا ہے۔

مسلمان خواتین میدانِ جنگ میں بھی خدمات سرانجام دیتی رہی ہیں۔ بخاری شریف کا ایک پورا باب میدانِ جہاد میں کام کرنے والی خواتین کے بارے میں ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین میدانِ جنگ میں مجاہدین کو پانی پلاتی رہی ہیں اور زخمی مجاہدین کو طبی امداد دیتی رہیں۔

اُحد کے میدان میں جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی سعادت حاصل ہوئی ان میں ایک صحابیہ حضرت نصیبہ رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

لیکن چونکہ اسلام نے مرد کو عورت کا محافظ قرار دیا ہے اس لیے عام حالات میں عورت کو میدانِ جنگ میں نہیں بھیجا جانا چاہیے۔ صرف مخصوص صورتِ حال اور ناگزیر صورتِ حال میں ہی عورت کو میدانِ جنگ میں خدمات سرانجام دینی چاہیے۔ عام حالات میں جہاد بالسیف مرد ہی کی ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری اسی کو ادا کرنی چاہیے بصورتِ دیگر وہی کچھ ہوگا جو کچھ ہم نے امریکہ میں ہوتے ہوئے دیکھا۔

امریکہ میں خواتین کو میدانِ جنگ میں آنے کی اجازت ۱۹۰۱ء میں دی گئی لیکن انھیں اس لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ وہ نرس کے طور پر کام کرتی تھیں۔ بعد ازاں تانیثیت کی تحریک سامنے آئی اور اس تحریک کی طرف سے یہ مطالبہ سامنے آیا کہ خواتین کو بھی

عملی طور پر میدانِ جنگ میں آنے کی اجازت دی جائے۔ ۱۹۷۳ء سے یہ مطالبہ سامنے آیا اور ۱۹۷۶ء میں حکومت امریکہ نے خواتین فوجیوں کو دورانِ جنگ باقاعدہ محاذ پر لڑنے کی اجازت دے دی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ ۲۳ اپریل ۱۹۹۳ء کو جاری ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ایک فوجی کنونشن کے دوران ۹۰ افراد کو جنسی طور پر ہراساں کیا گیا جن میں سے ۸۳ خواتین تھیں۔ ۱۱۷ فوجیوں کے خلاف محکمانہ کارروائی کی گئی۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ ایک کنونشن کے دوران ۸۳ پر جنسی حملے ہوئے ۱۱۷ افراد اجتماعی طور پر ان حملوں میں شریک تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں ان لوگوں نے کیا کیا؟

انھوں نے خواتین کے لباس پھاڑ دیے، انہیں برہنہ پریڈ کرنے پر مجبور کر دیا گیا، ان کے ساتھ سرعام زیادتی کی گئی۔

کیا یہ ''حقوقِ نسواں'' ہیں؟ کیا خواتین کے حقوق اسی کا نام ہے؟ اگر ان لوگوں کے خیال میں یہی خواتین کے حقوق ہیں تو ہم ان حقوق کو دور سے ہی سلام کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔

ہم نہیں چاہتے کہ ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے۔ امریکہ میں اس معاملے کے بعد احتجاج بھی ہوا۔ پارلیمنٹ میں اس حوالے سے گفتگو ہوئی اور اس وقت کے صدر امریکہ بل کلنٹن نے اس واقعے پر معافی مانگی اور اعلان کیا کہ ذمہ داروں کے خلاف ضرور کارروائی کی جائے گی۔

اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ جب سیاستدان کہتے ہیں کہ ضروری کارروائی کی جائے گی تو کیا ہوتا ہے؟

تو بات یہ ہے کہ اسلام ناگزیر صورتِ حال میں ہی خواتین کو میدانِ جنگ میں آنے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن وہاں بھی انھیں اسلامی اُصولوں کی پاسداری کرنی ہوگی۔ حجاب اور دیگر اسلامی اُصولوں اور اخلاقی معیار کی پابندی اور پاسداری کرنا ہوگی۔

اپنی بات سمیٹنے سے قبل میں ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ میں نے بالکل آغاز میں یہ بات واضح کی تھی کہ اسلام مرد اور عورت کی برابری پر یقین رکھتا ہے لیکن یکسانیت پر نہیں۔ برابری، یکسانیت کو نہیں کہتے۔

فرض کیجیے ایک کلاس کے دو طالب علم پہلی پوزیشن پر آ جاتے ہیں۔ طالب علم ''A'' کے نمبر بھی ۸۰ فیصد ہیں اور طالب علم ''B'' کے نمبر بھی اسی فیصد ہیں۔ کل طلبا کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ لیکن یہ دو طالب علم ''اے'' اور ''بی'' اوّل آئے ہیں۔

اب آپ پرچہ سوالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ پرچے میں کل دس سوالات ہیں۔ ہر سوال کے دس نمبر ہیں۔

پہلے سوال میں طالب علم A نے دس میں سے نو نمبر لیے ہیں اور طالب علم B نے دس میں سے سات نمبر لیے ہیں لہٰذا پہلے سوال کے جواب کے معاملے میں طالب علم A بہتر ہے۔

دوسرے سوال میں طالب علم A نے دس میں سات اور طالب علم B نے دس میں سے نو نمبر لیے ہیں۔ چنانچہ دوسرے جواب میں طالب علم B، طالب علم A سے بہتر اور برتر ہے۔

تیسرے سوال میں دونوں طالب علموں نے دس میں سے آٹھ نمبر لیے ہیں لہٰذا یہاں دونوں طالب علم برابر ہیں۔

جب تمام سوالوں کے نمبر جمع کیے جائیں تو دونوں کے نمبر ۸۰ ہیں لہٰذا مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی سوال میں A اور B دونوں کے نمبر برابر ہیں کسی میں A کے زیادہ ہیں اور کسی میں B کے زیادہ ہیں لیکن مجموعی طور پر دونوں طالب علموں کے نمبر برابر ہیں۔

اسی طرح کا معاملہ مرد اور عورت کا ہے۔ بعض معاملات میں مرد برتر ہے اور بعض میں عورت۔ لیکن مجموعی طور پر برابری ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے بالعموم مرد کو زیادہ قوت جسمانی دی ہے۔ فرض کیجیے آپ کے گھر میں کوئی چور آ جاتا ہے۔ کیا آپ یہ پسند

کریں گے کہ آپ کی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کو اس چور سے مقابلہ کرنا پڑے آپ مرد اور عورت کی برابری پر کتنا ہی یقین کیوں نہ رکھتے ہوں پھر بھی چور کا مقابلہ آپ ہی کریں گے۔ گھر کی خواتین آپ کی مدد تو کر سکتی ہیں لیکن آپ کو ہی آگے بڑھ کر اس چور کے مقابلے میں آنا ہوگا۔ کیونکہ جسمانی قوت آپ کو زیادہ دی گئی ہے لہٰذا قدرتی طور پر یہ آپ کا فرض بنتا ہے۔

اس مثال میں ہم نے دیکھا کہ جسمانی قوت کے لحاظ سے مرد کو عورت پر ایک درجہ برتری حاصل ہے۔

اب ہم ایک اور مثال پیش کرتے ہیں۔ اسلام نے والدین کی عزت اور احترام پر بہت زور دیا ہے۔ لیکن والد اور والدہ کو اس معاملے میں برابر قرار نہیں دیا گیا بلکہ ماں کے احترام پر تین گنا زیادہ زور دیا گیا ہے۔

گویا اس معاملے میں عورت کو مرد پر ایک درجہ برتری حاصل ہے اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورت اور مرد برابر ضرور ہیں لیکن ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔

ہم نے اپنی گفتگو کو انتہائی مختصر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وقت محدود ہونے کی وجہ سے تفاصیل پیش نہیں کی جا سکیں اور اجمالی طور پر صورتِ حال آپ کے سامنے واضح کی گئی اور اسلام میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے نمایاں نکات کی وضاحت آپ کے سامنے پیش کی گئی۔

اب جو کچھ مسلمان معاشروں میں عملی طور پر ہوتا ہے وہ ایک مختلف معاملہ ہے۔ بہت سے مسلمان معاشروں میں خواتین کو ان کے حقوق نہیں مل رہے۔ کیونکہ یہ معاشرے قرآن وسنت کی تعلیمات سے دور ہٹ چکے ہیں۔

اس صورتِ حال کی ذمہ داری مغربی معاشرے پر بھی آتی ہے کیونکہ مغرب میں عورت کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ردِّ عمل میں بعض معاشرے عورت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ متعصب اور سخت ہو گئے۔ کچھ معاشروں میں مغرب کی پیروی بھی کی گئی

اور مغربی تہذیب وثقافت کو اپنایا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسری انتہا ہے۔

آخر میں مغرب کو یہ بتانا چاہوں گا کہ آپ اگر قرآن وسنت میں عورت کو عطا کیے گئے حقوق کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام عورت کو جو حقوق دیتا ہے وہ فرسودہ نہیں بلکہ جدید تر تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔

میں آخر میں اپنے تمام دوستوں اور مددگاروں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، میں آج جو کچھ ہوں اگر اس کا سبب کسی ایک انسان کو قرار دیا جائے تو وہ ہوں گی میری والدہ مسز روشن نائک کیونکہ یہ ان کی محبت، توجہ اور رہنمائی ہی تھی جس کی وجہ سے میں آج اس مقام پر ہوں۔

یہ ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے والد ڈاکٹر عبدالکریم نائک کا ذکر نہ کروں اور اسی طرح میں دیگر اقارب خصوصاً میرے بھائی ڈاکٹر محمد نائک۔

میں اپنی اہلیہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جو شادی کے بعد سے مسلسل میری ہمت افزائی کر رہی ہیں۔

شکریہ

☆......☆......☆
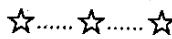
حصہ دوم

اسلام میں خواتین کے حقوق

جدید یا فرسودہ؟

سوالات و جوابات

سوال: اگر مرد کو جنت میں حور ملے گی تو عورت کو جنت میں کیا ملے گا؟

جواب: میری بہن نے پوچھا ہے کہ جب مرد جنت میں داخل ہوگا تو اسے ''حور'' یا ایک خوبصورت عورت ملے گی۔ جب ایک عورت جنت میں داخل ہوگی تو اسے کیا ملے گا؟

قرآن میں حور کا لفظ چار مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

سورۂ دخان آیت ۵۴

سورۂ طور آیت ۲۵

سورۂ رحمان آیت ۵۰ اور ۷۲

سورۂ واقعہ آیت ۲۲

بیشتر تراجم و تفاسیر خصوصاً اُردو تراجم و تفاسیر میں لفظ حور کے معنی خوبصورت عورت ہی بتائے گئے ہیں۔ اگر اس لفظ کے معنی واقعی صرف ایک خوبصورت عورت ہی ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو جنت میں کیا عطا ہوگا؟

لیکن دراصل معاملہ یہ ہے کہ اس لفظ کے معنی صرف خوبصورت عورت نہیں ہیں۔ یہ لفظ حور اصل میں جمع ہے جس کا واحد اَحْوَرَ بھی ہے اور حَوَرْ بھی۔ ان میں سے ایک لفظ مذکر ہے اور ایک مؤنث جب کہ جمع دونوں کی حور ہی ہے۔

لفظ کا لغوی مطلب ہے ''بڑی خوبصورت آنکھیں''۔ اسی مقصد کے لیے قرآن میں مختلف مقامات پر ازواج کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر:

سورۂ بقرہ، آیت ۲۵

سورۂ نساء، آیت ۵۷

ازواج کا لفظ زوج کی جمع ہے اور زوج کا مطلب ہے ساتھی، شریک زندگی مرد کے لیے عورت زوج ہے اور عورت کے لیے مرد زوج ہے۔ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کرنے والوں نے بالعموم اس لفظ کا ترجمہ درست کیا ہے۔ مثال کے طور پر محمد اسد حور کا ترجمہ

Spouse کرتے ہیں۔ عبداللہ یوسف علیؒ نے لفظ حور کا ترجمہ Companion کیا ہے۔ یہ دونوں لفظ ایسے ہیں جن کی کوئی جنس مخصوص نہیں ہے یہ لفظ مذکر کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور مؤنث کے لیے بھی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرد کو جنت میں ایک بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت شریک زندگی ملے گی اور عورت کو بھی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والا ساتھی ملے گا۔

....

سوال: میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ عورت کی گواہی مرد سے آدھی کیوں ہے یعنی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کیوں قرار دی جاتی ہے؟

جواب: میرے بھائی نے ایک بہت اہم سوال پوچھا ہے کہ دو خواتین کی گواہی اسلام میں ایک مرد کی گواہی کے برابر کیوں ہے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر معاملے میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر نہیں قرار دی جاتی۔ ایسا صرف چند مخصوص صورتوں میں ہی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں کم از کم پانچ مقامات ایسے ہیں جہاں گواہی کا ذکر موجود ہے بغیر کسی قسم کی جنسی تفریق کے۔

بعض مقامات ایسے ہیں جہاں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی گئی ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى ﴾ (۲۸۲:۲)

”اور اپنے میں سے دو مردوں کو (ایسے معاملے میں) گواہ کر لیا کرو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ پسند کرو (کافی ہیں) کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔“

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں ذکر صرف مالی معاملات کا ہو رہا ہے۔ صرف مالی اور

معاشی نوعیت کے معاملے میں ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کے برابر دی جا رہی ہے۔ بلکہ کہا یہ جا رہا ہے کہ مالی معاملات میں دو مردوں کی گواہی بہتر ہے اور اگر دو مرد گواہی دینے والے نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنیں۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ فرض کریں آپ کوئی سرجری کروانا چاہتے ہیں یا کوئی آپریشن کروانا چاہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے آپ کی خواہش ہوگی کہ سرجری سے قبل کم از کم دو ماہر ڈاکٹروں کے ساتھ مشورہ کریں۔ اب فرض کیجیے آپ کو صرف ایک ماہر سرجن دستیاب ہے۔ اس صورت میں آپ ایک سرجن کی رائے کے ساتھ دو عام ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کی رائے بھی جاننا چاہیں گے۔ اس کا سبب یہی ہوگا کہ آپریشن کے بارے میں ایک عام ایم بی بی ایس ڈاکٹر کے مقابلے میں ایک سرجن کا علم زیادہ ہوتا ہے۔

ایسا ہی معاملہ گواہی کا ہے۔ چونکہ اسلام نے فکر معاش کا ذمہ دار مرد کو بنایا ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں معاشی معاملات کے بارے میں مرد کو علم زیادہ ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ معاشی معاملات میں دو مردوں کی گواہی کو ترجیح دی گئی ہے اور اگر آپ سورۂ مائدہ کی تلاوت کریں تو وہاں یہ ارشاد باری تعالیٰ موجود ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ ﴾ (۵:۱۰۶)

”مومنو! جب تم میں سے کسی کی موت آ موجود ہو تو شہادت (کا نصاب) یہ ہے کہ وصیت کے وقت تم مسلمانوں میں سے دو مرد عادل (یعنی صاحب اعتبار) گواہ ہوں یا اگر (مسلمان گواہ نہ ملیں اور) تم سفر کر رہے ہو اور (اس وقت) تم پر موت کی مصیبت واقع ہو تو کسی دوسرے مذہب کے دو (شخصوں کو) گواہ (کر لو)۔“

یہاں بھی چونکہ معاملہ معاشی نوعیت کا ہے لہٰذا مرد کی گواہی کو ترجیح دی گئی ہے۔ بعض علمائے قانون کی رائے یہ ہے کہ "قتل" کے معاملے میں بھی جرم کی مخصوص نوعیت کے پیش نظر اور عورت کی فطرت کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے یہی اُصول لاگو ہونا چاہیے۔ یعنی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے مساوی قرار دی جانی چاہیے۔

صرف دو معاملات ایسے ہیں جہاں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی گئی ہے یعنی: (۱) مالی معاملات (۲) قتل کا معاملہ

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہر جگہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہو گی لیکن اگر قرآنی ہدایات کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی۔

آیئے دیکھتے ہیں قرآن ہمیں اس بارے میں کیا احکامات دیتا ہے۔

سورۂ نور میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصَّادِقِيْنَ ٥ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ٥ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ ٥ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ ٥ ﴾ (۲۴:۶-۹)

"اور جو لوگ اپنی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور خود ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہوں تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار بار اللہ کی قسم کھائے کہ بے شک سچا ہے۔ اور پانچویں (بار) یہ (کہے) کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔ اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے کہ وہ پہلے چار بار اللہ کی قسم کھائے کہ بے شک یہ جھوٹا ہے۔ اور پانچویں (دفعہ) یوں (کہے) کہ اگر یہ سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب (نازل ہو)۔"

مندرجہ بالا آیت سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ بیوی شوہر پر الزام

لگائے یا شوہر بیوی پر۔ دونوں کی ذاتی گواہی اس معاملے میں مساوی ہے۔

اسی طرح رویت ہلال کے معاملے میں بھی عورت اور مرد کی گواہی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ بعض فقہا کا کہنا ہے کہ رمضان کے چاند کی رویت کے لیے ایک اور شوال کے چاند کے لیے دو گواہ درکار ہوں گے لیکن گواہ کے مرد یا عورت ہونے سے وہاں بھی فرق کوئی نہیں پڑتا۔

کچھ معاملات میں صرف عورت ہی گواہی دے سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر معاملہ غسل میت کا ہو، کیونکہ جب تک کوئی عورت دستیاب ہو عورت کو غسل میت عورت ہی دے گی۔ یعنی اس معاملے میں گواہی کی ضرورت پڑے تو عورت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

میں اُمید رکھتا ہوں کہ معاملہ آپ کے ذہنوں میں واضح ہو چکا ہوگا۔

سوال: میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اسلام میں کثرت ازدواج کی اجازت کیوں دی گئی ہے؟ یعنی مرد کو ایک سے زاید شادیوں کی اجازت کیوں ہے؟

جواب: میری بہن نے پوچھا ہے کہ اسلام میں کثرت ازدواج کی اجازت کیوں دی گئی ہے یا دوسرے لفظوں میں مرد ایک سے زیادہ بیویاں کیوں رکھ سکتا ہے؟ بہن نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ ہے Polygamy۔ پولی گیمی کا مطلب ہے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا۔ اس کی دو اقسام ہیں۔ ایک لفظ ہے Polygamy جو ایک مرد کے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور دوسرا لفظ ہے Polyendry جو عورت کے ایک سے زاید شوہر رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا دو طرح کی کثرت ازدواج ممکن ہے جن میں ایک کے بارے میں بہن نے سوال پوچھا ہے۔ یعنی یہ کہ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کیوں کر سکتا ہے؟

میں سب سے پہلے تو یہ کہنا چاہوں گا کہ قرآن دنیا کی واحد الہامی کتاب ہے جو ایک ہی شادی کی ترغیب دیتی ہے اور کوئی ایسی مقدس کتاب موجود نہیں ہے جو ایک شادی کا حکم

دیتی ہو۔

آپ پوری ''گیتا'' پڑھ جائیں، پوری ''راماین'' پڑھ لیں، پوری ''مہابھارت'' پڑھ لیں۔ کہیں آپ کو یہ لکھا نہیں ملے گا کہ ایک شادی کرو حتی کہ بائبل میں بھی آپ ایک شادی کا حکم تلاش نہیں کرسکیں گے۔

بلکہ اگر آپ ہندوؤں کے متون مقدسہ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بیشتر راجوں، مہاراجوں کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ ''دشرتھ'' کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں، کرشنا کی بھی بہت سی بیویاں تھیں۔

اگر آپ یہودی قانون کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہودیت میں گیارھویں صدی عیسوی تک مرد کو کثرت ازدواج کی اجازت حاصل رہی ہے۔ یہاں تک ربی گرشم بن یہوواہ نے اس پر پابندی عاید کردی۔ اس کے باوجود عرب علاقوں میں آباد یہودی ۱۹۵۰ء تک ایک سے زیادہ شادیاں کرتے رہے لیکن ۱۹۵۰ء میں اسرائیل کے علما نے کثرت ازدواج پر مکمل پابندی لگادی۔

اسی طرح عیسائی انجیل بھی کثرت ازدواج کی اجازت دیتی ہے۔ یہ تو چند صدیاں پہلے عیسائی علما نے ایک سے زاید شادیوں پر پابندی لگائی ہے۔

اگر آپ ہندوستانی قانون کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پہلی دفعہ ۱۹۵۴ء میں کثرت ازدواج پر پابندی لگائی گئی اس سے قبل ہندوستان میں قانونی طور پر بھی مرد کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت تھی۔

۱۹۵۴ء میں ہندو میرج ایکٹ نفاذ ہوا جس میں ہندوؤں کے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر پابندی عاید کردی گئی۔

اگر آپ اعداد وشمار کا تجزیہ کریں تو صورتِ حال آپ کے سامنے واضح ہوجائے گی۔ یہ اعداد و شمار ''اسلام میں عورت کا مقام'' کے عنوان سے تحقیق کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں شایع ہونے والی رپورٹ کے صفحہ ۶۶ اور صفحہ ۶۷ پر ایک سے زاید

شادیوں کے حوالے سے اعداد و شمار دیے گئے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں میں ایک سے زاید شادیوں کی شرح ۵۶ء۵ فی صد تھی جبکہ مسلمانوں میں یہ شرح ۳۱ء۴ فی صد تھی۔

لیکن چھوڑیے اعداد و شمار کو۔ ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ آخر اسلام میں مرد کو ایک سے زاید شادیوں کی اجازت کیوں دی گئی ہے؟ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا اس وقت قرآن ہی دنیا میں وہ واحد مذہبی کتاب ہے جو ایک شادی کا حکم دیتی ہے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ ﴾ (۴:۳)

”اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو، یا تین تین، یا چار چار ان سے نکاح کر لو اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (ہی کافی ہے) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔ اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔“

یہ حکم کہ پھر ایک ہی شادی کرو، قرآن کے علاوہ کسی صحیفۂ مقدسہ میں نہیں دیا گیا۔ عربوں میں اسلام سے قبل مرد بہت سی شادیاں کیا کرتے تھے۔ بعض مردوں کی تو سیکڑوں بیویاں تھیں۔

اسلام نے ایک تو بیویوں کی حد مقرر کر دی اور زیادہ سے زیادہ تعداد چار معین کر دی اور ایک سے زاید شادیوں کی صورت میں ایک بہت سخت شرط بھی عاید کر دی وہ یہ کہ اگر آپ ایک سے زاید شادیاں کرتے ہیں تو پھر آپ کو اپنی دونوں، تینوں یا چاروں بیویوں کے درمیان پورا عدل کرنا ہوگا بصورتِ دیگر ایک ہی شادی کی اجازت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سورۂ نساء میں فرماتا ہے:

﴿ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ ﴾ (۱۲۹:۴)

''اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کر سکو گے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی کی طرف ڈھل جاؤ اور دوسری کو (ایسی حالت میں) چھوڑ دو کہ گویا لٹک رہی ہے اور اگر آپس میں موافقت کر لو اور پرہیزگاری کرو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

گویا ایک سے زیادہ شادیاں کوئی اُصول نہیں ہے بلکہ ایک استثنائی صورت حال ہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک سے زیادہ شادیوں کا حکم دیتا ہے۔

لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اسلام میں اعمال کے پانچ درجے یا اقسام ہیں:

پہلا درجہ ''فرض'' ہے۔ یعنی وہ کام جن کا کرنا ضروری اور لازمی ہے۔

دوسرا درجہ مستحب اُمور کا ہے ان کاموں کا جنہیں فرض تو نہیں کیا گیا لیکن ان کے کرنے کی تاکید یا حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

تیسرے درجے میں وہ کام آتے ہیں جن کی نہ حوصلہ افزائی کی گئی اور نہ روکا گیا ہے۔

چوتھے درجہ میں مکروہ اُمور آتے ہیں اور

پانچواں درجہ حرام کاموں کا ہے یعنی جن سے قطعی طور پر منع کر دیا گیا ہے۔

ایک سے زیادہ شادیوں کا معاملہ تیسرے یا درمیان والے درجے میں آتا ہے۔ یعنی وہ کام جن کے کرنے کی نہ تو قرآن و سنت میں تاکید کی گئی ہے اور نہ ہی منع کیا گیا ہے۔

پورے قرآن میں اور اسی طرح احادیث میں بھی، ہمیں کوئی ایسا بیان نہیں ملتا جس میں کہا گیا ہو کہ جو مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرتا ہے وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جو ایک ہی شادی کرتا ہے۔

آیئے تجزیہ کرتے ہیں کہ اسلام مرد کو ایک سے زاید شادیوں کی اجازت کیوں دیتا

ہے؟

قدرتی طور پر مرد اور عورتیں تقریباً مساوی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں لیکن جدید علم طب ہمیں بتاتا ہے کہ بچیوں میں قوت مدافعت بچوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک بچی جراثیم اور بیماریوں کا مقابلہ بہتر طریقے سے کر سکتی ہے بہ نسبت ایک بچے کے۔ صحت کے لحاظ سے عورت مرد کے مقابلے میں بہتر صنف ہے۔ لہٰذا ہوتا یہ ہے کہ شیر خوارگی کی سطح پر ہی بچیوں کی تعداد بچوں سے کچھ زیادہ ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جنگیں ہوتی رہتی ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ دورانِ جنگ مردوں کی اموات عورتوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ حالیہ دور میں ہم نے دیکھا کہ افغانستان میں ایک طویل جنگ ہوئی۔ اس جنگ کے دوران تقریباً پندرہ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ ان مرنے والوں میں غالب اکثریت مردوں کی تھی۔ شہداء کی کثیر تعداد مردوں پر ہی مشتمل تھی۔

اس طرح اگر آپ حادثات کے اعداد و شمار کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حادثات میں جاں بحق ہونے والوں کی اکثریت بھی مردوں پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ منشیات کے استعمال سے ہونے والی اموات میں بھی غالب اکثریت مردوں ہی کی ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام عوامل و اسباب کے نتیجے میں دنیا میں مردوں کی آبادی عورتوں کے مقابلے میں کم ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے چند ایک ممالک کے علاوہ پوری دنیا میں ہی عورتوں کی آبادی مردوں سے زیادہ ہے۔ جن ممالک میں عورتوں کی آبادی کم ہے ان میں سے ایک اہم ملک ہندوستان ہے۔ اور ہندوستان میں عورتوں کی آبادی مردوں کے مقابلے میں کم ہونے کا بنیادی سبب ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں۔ یہاں ہر سال دس لاکھ سے زیادہ اسقاط حمل کیے جاتے ہیں اور یہ معلوم ہوتے ہی کہ پیدا ہونے والی بچی ہوگی اسقاط کروا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح بچیوں کو قتل کیے جانے کی وجہ سے ہی مردوں کی آبادی زیادہ ہے۔

اگر آج یہ کام بند ہو جائے تو چند ہی دہائیوں میں آپ دیکھیں گے کہ ہندوستان میں بھی عورتوں کی تعداد مردوں سے بڑھ جائے گی۔ جیسا کہ باقی ساری دنیا میں ہے۔

اس وقت صرف امریکہ کے شہر نیو یارک میں عورتوں کی تعداد مردوں سے ایک لاکھ زیادہ ہے۔ پورے امریکہ میں صورت حال یہ ہے کہ مردوں کے مقابلے میں ۷۸ لاکھ خواتین زیادہ ہیں۔ مزید برآں کہا جاتا ہے کہ نیو یارک میں ایک تہائی مرد ہم جنس پرست ہیں۔ پورے امریکہ میں ہم جنس پرست مردوں کی تعداد ڈھائی کروڑ سے زیادہ ہے۔

برطانیہ کا معاملہ بھی مختلف نہیں۔ وہاں بھی مردوں کے مقابلے میں چالیس لاکھ عورتیں زیادہ ہیں۔ جرمنی میں یہ فرق اس سے بھی زیادہ ہے۔ وہاں مردوں کے مقابلے میں پچاس لاکھ عورتیں زیادہ موجود ہیں۔ روس میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں ستر لاکھ زیادہ ہے۔

اسی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پوری دنیا میں مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں کس قدر کم ہے۔ فرض کیجیے میری بہن امریکہ میں رہتی ہے اور تعداد کے اس فرق کی وجہ سے وہ ان خواتین میں شامل ہے جنہیں شادی کے لیے شوہر نہیں مل سکتا۔ کیونکہ تمام مرد ایک ایک شادی کر چکے ہیں۔ اس صورت حال میں اس کے پاس دو ہی راستے باقی بچتے ہیں۔

پہلی صورت تو یہ ہے کہ وہ کسی شادی شدہ مرد سے شادی کر لے اور دوسری یہ کہ وہ عوامی ملکیت بننے کے راستے پر چل پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔ اور یہی دونوں راستے باقی بچتے ہیں۔ میں نے بے شمار لوگوں سے یہ سوال پوچھا سب نے ایک ہی جواب دیا کہ ایسی صورت حال میں وہ پہلی صورت کو ہی ترجیح دیں گے۔ آج تک کسی نے دوسری صورت کو پسند نہیں کیا۔ البتہ بعض ذہین لوگوں نے یہ جواب دیا کہ وہ پسند کریں گے کہ ان کی بہن ساری عمر کنواری ہی رہے۔

لیکن علم طب ہمیں بتاتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ مرد یا عورت کسی کے لیے بھی ساری عمر کنوارا رہنا بہت مشکل ہے اور اگر ایسا کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ بدکرداری ہی کی صورت

میں برآمد ہوگا۔ کیونکہ اور کوئی صورت ہے ہی نہیں۔

وہ "عظیم" جوگی اور سنت جو تارک الدنیا ہو جاتے ہیں اور شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں کی جانب نکل جاتے ہیں ان کے ساتھ دیوداسیاں بھی نظر آتی ہیں، کیوں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ایک رپورٹ کے مطابق چرچ آف انگلینڈ سے وابستہ پادریوں اور ننوں کی اکثریت، جی ہاں اکثریت بدکرداری اور ہم جنس پرستی وغیرہ میں ملوث ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ کوئی تیسرا راستہ موجود ہی نہیں یا تو شادی شدہ مرد سے شادی ہے اور یا جنسی بے راہ روی ہے۔

....

سوال: ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کے لیے کیا شرائط اور وجوہات ہیں؟

جواب: سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کے لیے کیا کیا شرائط ہیں۔ ایک ہی شرط عاید کی گئی ہے اور وہ یہ کہ شوہر اپنی دونوں، یا تینوں یا چاروں بیویوں میں پورا انصاف کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ عدل کر سکتا ہے تو اسے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے۔ بصورتِ دیگر اسے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا ہوگا۔

متعدد ایسی صورتیں ہیں جن میں مرد کے لیے ایک سے زاید شادیاں کرنا بہتر ہوتا ہے۔ پہلی صورت تو وہی ہے جس کا ذکر گزشتہ سوال کے جواب میں کیا گیا۔ چونکہ خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لیے خواتین کی عفت اور عصمت کی حفاظت کے حوالے سے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد صورتیں ہیں۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے ایک نوجوان خاتون کی شادی ہوتی ہے اور شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر معذور ہو جاتی ہے، اور اس کے لیے وظایف زوجیت ادا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اب اس صورت حال میں شوہر کے پاس دو راستے ہیں یا تو وہ اپنی اس معذور بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لے اور یا اس بیوی کو بھی رکھے اور دوسری شادی بھی کر لے۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں؟ فرض کر لیجیے کہ خدانخواستہ یہ بدقسمت خاتون جو حادثے

کا شکار ہوئی ہے، آپ کی بہن ہے۔ آپ ان دونوں صورتوں میں سے کون سی صورت پسند کریں گے؟ یہ کہ آپ کے بہنوئی دوسری شادی کر لیں یا یہ کہ وہ آپ کی بہن کو طلاق دے کر پھر دوسری شادی کرے؟

اسی طرح اگر بیماری یا کسی اور وجہ سے بیوی اپنے فرائض سرانجام دینے سے قاصر ہو جاتی ہے تو اس صورت میں بھی بہتر یہی ہے کہ شوہر دوسری شادی کر لے۔ اور یوں یہ دوسری بیوی نہ صرف اپنے شوہر کی بلکہ پہلی بیوی کی بھی دیکھ بھال کرے اور اگر پہلی بیوی کے بچے موجود ہیں تو ان بچوں کی بھی پرورش کرے۔

بہت سے لوگ یہاں یہ کہیں گے کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شوہر اس مقصد کے لیے، یعنی بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ملازمہ یا آیا وغیرہ بھی تو رکھی جا سکتی ہے۔ بات درست ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں بچوں اور معذور بیوی کا خیال رکھنے کے لیے تو ملازمہ رکھی جا سکتی ہے لیکن خود شوہر کا خیال کون رکھے گا؟

عملاً یہی ہوگا کہ بہت جلد ملازمہ اس کا بھی ''خیال رکھنا'' شروع کر دے گی۔ لہٰذا بہترین صورت یہی ہے کہ پہلی بیوی کو بھی رکھا جائے اور دوسری شادی بھی کر لی جائے۔

اسی طرح بے اولادی بھی ایک ایسی صورت ہے جس میں دوسری شادی کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ طویل عرصے تک اولاد نہ ہونے کی صورت میں جب کہ شوہر اور بیوی دونوں اولاد کی شدید خواہش بھی رکھتے ہوں بیوی خود شوہر کو دوسری شادی کا مشورہ دے سکتی ہے۔

یہاں بعض لوگ کہیں گے کہ وہ کسی بچے کو گود بھی تو لے سکتے ہیں۔ لیکن اسلام اس عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا جس کی متعدد وجوہات ہیں۔ ان وجوہات کی تفصیل میں، میں یہاں نہیں جاؤں گا۔ لیکن اس صورت میں بھی شوہر کے پاس دو ہی راستے باقی بچتے ہیں یعنی یا تو وہ پہلی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرے اور یا پہلی شادی کو برقرار رکھتے ہوئے دوسری شادی کرے، اور دونوں کے ساتھ پورا عدل کرے۔

میرے خیال میں یہ کافی وجوہات ہیں۔

سوال: کیا عورت سربراہِ مملکت بن سکتی ہے؟

جواب: میرے بھائی نے سوال پوچھا ہے کہ کیا عورت سربراہِ مملکت بن سکتی ہے؟ میرے علم کی حد تک قرآن میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں، کوئی ایسا حکم موجود نہیں کہ عورت ''سربراہِ حکومت نہیں بن سکتی۔''

لیکن متعدد احادیث ایسی موجود ہیں مثال کے طور پر ایک حدیث جس کا مفہوم ہے:

''وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے اپنا سربراہ عورت کو بنایا۔''

بعض علما کا کہنا ہے کہ ان احادیث کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔ یعنی ان کا حکم اسی زمانے کے لیے محدود ہے جس زمانے میں فارس میں عورت حکمران تھی۔ جب کہ دیگر علما کی رائے مختلف ہے۔ وہ اس حکم کو ہر زمانے کے لیے عام سمجھتے ہیں۔

آیئے ہم تجزیہ کر کے دیکھتے ہیں کہ ایک عورت کے لیے سربراہِ حکومت بننا اچھا ہے یا نہیں؟ اگر ایک اسلامی ریاست میں عورت سربراہِ حکومت ہوگی تو لازماً اسے نمازوں کی امامت بھی کروانی ہوگی۔ اور اگر ایک عورت نماز باجماعت کی امامت کرواتی ہے تو اس سے لازماً نمازیوں کی توجہ بھٹکے گی۔ کیونکہ نماز کے متعدد ارکان ہیں۔ مثلاً قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ۔ جب ایک عورت مرد نمازیوں کی امامت کروائے گی اور یہ ارکان ادا کرے گی تو مجھے یقین ہے کہ نمازیوں کے لیے پریشانی پیدا ہوگی۔

اگر عورت ایک جدید معاشرے میں سربراہِ حکومت ہوگی، جیسا کہ ہمارا آج کل کا معاشرہ ہے تو بسا اوقات اسے بحیثیت سربراہِ مملکت دوسرے سربراہانِ مملکت سے ملاقاتیں کرنی ہوں گی جو کہ بالعموم مرد حضرات ہوتے ہیں۔ اس طرح کی ملاقاتوں کا ایک حصہ عموماً بند کمرے کی ملاقات بھی ہوتا ہے۔ جس میں دونوں سربراہان تنہائی میں ملاقات کرتے ہیں جس کے دوران کوئی اور موجود نہیں ہوتا۔ اسلام ایسی ملاقات کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کسی عورت کو تنہائی میں کسی نامحرم سے ملاقات کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام مرد و عورت کے اختلاط کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ بحیثیت سربراہ حکومت عورت کو

منظر عام پر رہنا ہوتا ہے۔ اس کی تصاویر بنتی ہیں۔ اس کی ویڈیو فلمیں بنتی ہیں۔ ان تصاویر میں وہ نامحرم مردوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ کوئی بھی عورت مثال کے طور پر مارگریٹ تھیچر اگر سربراہِ حکومت ہو تو آپ کو اس کی بے شمار تصاویر مل سکتی ہیں جن میں وہ مردوں سے ہاتھ ملا رہی ہوگی۔ اسلام اس طرح کے آزادانہ اختلاط کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔

بحیثیت سربراہِ مملکت ایک عورت کے لیے عوام کے قریب رہنا اور ان سے مل کر ان کے مسائل معلوم کرنا بھی مشکل ہوگا۔

جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ ایام حیض کے دوران عورت میں متعدد نفسیاتی، ذہنی اور رویے سے متعلق تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ جنسی ہارمون ایسٹوجن ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ عورت سربراہِ مملکت ہے تو یہ تبدیلیاں یقیناً اس کی قوت فیصلہ پر اثر انداز ہوں گی۔ سائنس ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ عورت میں بولنے کی، گفتگو کی صلاحیت مرد کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ جبکہ مرد میں ایک خاص صلاحیت Spacialagility زیادہ ہوتی ہے۔ اس صلاحیت سے مراد ہوتی ہے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے، مستقبل کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت۔ یہ صلاحیت ایک سربراہِ حکومت کے لیے از حد ضروری ہے۔ عورتوں کو گفتگو کی صلاحیت مردوں کے مقابلے میں زیادہ دی گئی ہے کیونکہ یہ صلاحیت بحیثیت ماں کے اس کے لیے ضروری ہے۔

ایک عورت حاملہ بھی ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسے چند ماہ کے لیے آرام کرنا ہوگا، اس دوران اس کے فرائض کون ادا کرے گا۔ اس کے بچے ہوں گے اور ماں کے فرائض نہایت اہم ہیں۔ ایک مرد کے لیے سربراہِ حکومت کی ذمہ داریاں اور ایک باپ کی ذمہ داریاں بیک وقت ادا کرنا زیادہ قابل عمل ہے۔ جب کہ ایک عورت کے لیے سربراہِ مملکت اور ماں کی ذمہ داریاں بیک وقت ادا کرنا بہت مشکل ہے۔

ان وجوہات کے باعث میری رائے ان علمائے کرام کے زیادہ قریب ہے جو کہتے ہیں کہ عورت کو سربراہِ مملکت نہیں بنایا جانا چاہیے۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عورت فیصلوں میں حصہ نہیں لے سکتی یا قانون سازی کے عمل میں شریک نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا عورت یقیناً قانون سازی کے عمل میں حصہ لے سکتی ہے۔ اسے ووٹ دینے کا حق بھی حاصل ہے۔ صلح حدیبیہ کے دوران حضرت ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیتی رہیں۔ ایک ایسے وقت میں جب تمام مسلمان پریشان تھے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی بھی فرمائی اور انھیں مشورے بھی دیے۔

آپ جانتے ہیں کہ سربراہِ حکومت تو صدر یا وزیر اعظم ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات سیکرٹری یا PA کو بہت سے فیصلے کرنے ہوتے ہیں لہٰذا یقیناً ایک عورت مرد کی مدد ضرور کرا سکتی ہے۔ اور اہم فیصلے کرنے میں اسے مفید مشورے اور رہنمائی فراہم کرسکتی ہے۔

....

سوال: اگر اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہیں تو پھر عورت کو پردے کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟

جواب: میری بہن نے ایک بہت اچھا سوال پوچھا ہے کہ اگر اسلام حقوق نسواں میں یقین رکھتا ہے، اگر اسلام مرد اور عورت کو برابر سمجھتا ہے تو پھر اسلام پردے کا حکم کیوں دیتا ہے؟ اور دونوں جنسوں یعنی مرد اور عورت کو الگ رکھنے کی تاکید کیوں کرتا ہے۔

میں پردے کے حکم کے بارے میں گفتگو تھوڑی دیر بعد کروں گا، میں اپنی بہن کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جس نے یہ سوال پوچھا ہے کیونکہ میں پردے یا حجاب کے بارے میں گفتگو نہیں کر پایا تھا۔

اگر آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ عورت کو حجاب کا حکم دینے سے پہلے قرآن مرد کو حجاب کا حکم دیتا ہے۔

سورۂ نور میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذٰلِكَ

اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝﴾ (۲۴:۳۰)

''مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لیے بڑی پاکیزگی کی بات ہے (اور) جو کام یہ کرتے ہیں اللہ ان سے خبردار ہے۔''

اور اس کے بعد اگلی ہی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ .... ﴾ (۲۴:۳۱)

''اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی آرائش (یعنی زیور کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہو اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں..........''

اس کے بعد رشتہ داروں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ خواتین بھی اس میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اسے تمام لوگوں سے پردہ کرنا ہے۔ یعنی ''حجاب'' کے اُصولوں پر عمل کرنا ہے۔ اسلامی حجاب کے یہ اُصول قرآن مجید اور احادیث میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ اُصول تعداد میں چھ ہیں:

❀ پہلا اُصول حجاب کی حد یا معیار کا ہے۔ جو کہ مرد اور عورت کے لیے مختلف ہیں۔ مرد کے لیے ستر عورت کی حد ناف سے گھٹنے تک ہے جبکہ عورت کے لیے سارا جسم ہی ستر عورت میں شامل ہے۔ جو اعضا نظر آ سکتے ہیں وہ صرف چہرہ اور کلائیوں تک ہاتھ ہیں۔ ان کے علاوہ سارے جسم کا حجاب یعنی چھپایا جانا ضروری ہے۔ اگر وہ چہرہ اور ہاتھ بھی چھپانا چاہے تو اسے منع نہیں کیا گیا لیکن ان اعضا کا محرم کے سامنے چھپانا لازم نہیں ہے۔ یہ وہ واحد اُصول ہے جو مرد اور عورت کے لیے مختلف ہے۔ باقی تمام

اُصول دونوں کے لیے یکساں ہیں۔

❀ دوسرا اُصول یہ ہے کہ عورت کا لباس تنگ اور چست نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی اس قسم کا لباس نہیں پہننا چاہیے جس سے جسم کے نشیب وفراز واضح طور پر نظر آنے لگیں۔

❀ تیسر اُصول یہ ہے کہ عورت کا لباس شفاف نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی ایسا لباس نہیں پہننا چاہیے جس میں سے آر پار نظر آئے۔

❀ چوتھا اُصول یہ ہے کہ لباس بہت زیادہ شوخ اور بھڑکیلا نہیں ہونا چاہیے یعنی ایسا لباس بھی نہیں ہونا چاہیے جو جنس مخالف کو ترغیب دینے والا ہو۔

❀ پانچواں اُصول یہ ہے کہ جنس مخالف سے مشابہت رکھنے والا لباس نہیں پہننا چاہیے یعنی مردوں کو عورتوں جیسے اور عورتوں کو مردوں جیسے لباس پہننے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جس کی ایک مثال مردوں کا کانوں میں بالیاں وغیرہ پہننا ہے۔ اگر آپ ایک کان میں بالی پہنتے ہیں تو اس سے مراد کچھ اور لی جاتی ہے لیکن اگر دونوں کانوں میں پہنی جائے تو اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ اس سے اسلام میں منع کیا گیا ہے۔

❀ چھٹا اور آخری اُصول یہ ہے کہ آپ کو ایسا لباس بھی نہیں پہننا چاہیے جس میں کفار سے مشابہت ہوتی ہو۔

مندرجہ بالا نکات میں اسلامی حجاب کے بنیادی اُصول بیان کر دیے گئے ہیں۔ اب ہم اصل سوال کی جانب آتے ہیں۔ یعنی یہ کہ عورتوں پر پردے کی پابندی کیوں لگائی گئی ہے اور دوسرے یہ کہ دونوں جنسوں کے اختلاط سے کیوں روکا گیا ہے؟

اس مقصد کے لیے ہم دونوں طرح کے معاشروں کا تجزیہ کرتے ہیں یعنی وہ معاشرے جن میں پردہ کیا جاتا ہے اور وہ معاشرے جن میں پردہ موجود نہیں ہے۔ دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ جرائم جس ملک میں ہوتے ہیں وہ ملک امریکہ ہے۔

امریکی تحقیقاتی ادارے ''فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن'' کی ۱۹۹۰ء میں سامنے آنے والی ایک رپورٹ کے مطابق اس ایک سال کے دوران ایک ہزار دو سو پچاس زنا بالجبر کی

وارداتیں ہوئیں۔ یہ وہ واقعات ہیں جن کی رپورٹ ہوئی۔ اور یہی رپورٹ کہتی ہے کہ صرف ۱۶ فی صد واقعات رپورٹ ہوئے۔ اس حساب سے اگر آپ اصل تعداد معلوم کرنا چاہیں تو وہ خود ضرب تقسیم کرلیں، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ صرف ایک سال کے عرصے میں کتنی خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کے واقعات ہوئے، بعد میں یہ تعداد مزید بڑھ گئی اور یہاں تک پہنچی کہ روزانہ ایک ہزار نو سو واقعات ہونے شروع ہوگئے۔

شاید امریکی زیادہ بولڈ ہوگئے ہوں گے۔

۱۹۹۳ء کی رپورٹ کے مطابق ہر ۱ء۳ منٹ کے بعد ایک خاتون کے ساتھ زنا بالجبر کا واقعہ ہو رہا ہے۔

لیکن ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

امریکہ نے خواتین کو زیادہ حقوق دیے ہیں اور وہاں زیادتی کے واقعات زیادہ ہو رہے ہیں۔

مزید افسوس ناک بات یہ ہے کہ صرف دس فی صد مجرم گرفتار ہوتے ہیں۔ یعنی صرف ۱۶ فی صد واقعات رپورٹ ہوتے ہیں اور دس فی صد گرفتاریاں ہوتی ہیں یعنی عملاً صرف ۶ء۱ فی صد ملزم گرفتار ہوتے ہیں۔ ان گرفتار ہونے والوں میں سے بھی نصف باقاعدہ کوئی کیس چلنے سے قبل ہی رہا کر دیے جاتے ہیں یعنی اعشاریہ آٹھ فی صد مجرموں کے خلاف باقاعدہ کیس چلتا ہے۔

اس سارے تجزیے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سو پچیس خواتین کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے تو امکان یہ ہے کہ ایک دفعہ اس کے خلاف باقاعدہ قانونی کارروائی کی جائے گی۔

اس صورت میں بھی پچاس فی صد امکان یہ ہے کہ اسے ایک سال سے بھی کم قید کی سزا ہوگی۔

اگر امریکی قانون میں زنا بالجبر کی سزا عمر قید ہے لیکن اگر مجرم پہلی مرتبہ گرفتار ہوا ہے تو

قانون اسے ایک موقع دینے کے حق میں ہے اور اسی لیے پچاس فی صد واقعات میں مجرم کو ایک سال سے بھی کم سزا سنائی جاتی ہے۔

خود ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ نیشنل کرائم بیورو کی ایک رپورٹ کے مطابق، جو یکم دسمبر ۱۹۹۲ء کو شایع ہوئی ہے، ہندوستان میں ہر ۵۴ منٹ کے بعد زنا بالجبر کا ایک کیس رپورٹ ہوتا ہے۔ اسی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ہر ۲۶ منٹ کے بعد جنسی استحصال کا ایک واقعہ ہوتا ہے اور ہر ایک گھنٹہ ۴۳ منٹ کے بعد جہیز کی وجہ سے قتل کی ایک واردات ہوتی ہے۔

اگر ہمارے ملک میں ہونے والی زنا بالجبر کی وارداتوں کی کل تعداد معلوم کی جائے تو تقریباً ہر دو منٹ کے بعد ایک واردات کی اوسط نکلے گی۔

اب میں ایک سادہ سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ بتایئے کہ اگر امریکہ کی ہر عورت پردہ کرنا شروع کر دے تو کیا ہوگا؟

کیا زنا بالجبر کی وارداتوں کی شرح یہی رہے گی؟

کیا ان وارداتوں میں اضافہ ہوگا؟

یا ان وارداتوں میں کمی واقع ہوگی؟

پھر یہ کہ اسلامی تعلیمات کو ان کے مجموعی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ قطع نظر اس کے کہ کوئی عورت پردہ کرے یا نہ کرے، مرد کے لیے بہر حال لازم ہے کہ وہ نظریں نیچی رکھے۔

اور اگر کوئی مرد زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے تو اسلام میں اس کے لیے سزائے موت ہے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ ''وحشیانہ سزا'' ہے؟

میں نے یہ سوال بہت سے لوگوں سے کیا ہے اور آپ سے بھی کرنا چاہتا ہوں۔ فرض کیجیے آپ کی بہن کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اور آپ کو جج بنا دیا جاتا ہے۔ اب اس سے قطع نظر کہ اسلامی قانون کیا کہتا ہے اس سے بھی قطع نظر کہ ہندوستانی قانون کیا کہتا ہے اور اس

سے بھی قطع نظر کہ امریکی قانون کیا کہتا ہے؟ آپ بتایئے کہ اگر آپ کو جج بنا دیا جاتا ہے تو آپ مجرم کو کیا سزا سنائیں گے؟

ہر کسی نے ایک ہی جواب دیا: ''سزائے موت''

بعض تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور کہا کہ وہ مجرم کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنا پسند کریں گے۔

میں دوبارہ پوچھتا ہوں کہ اگر امریکہ میں اسلامی شریعت نافذ کر دی جائے تو ان وارداتوں میں اضافہ ہوگا؟ کمی ہوگی؟ یا ان کی تعداد یہی رہے گی؟

اگر ہندوستان میں اسلامی قانون کا نفاذ کر دیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا زنا بالجبر کی شرح یہی رہے گی؟ کمی ہوگی یا بڑھ جائے گی؟

اگر ہم عملی تجزیہ کریں تو جواب واضح ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ آپ نے عورت کو حقوق دیے ہیں۔ مگر یہ حقوق محض نظری طور پر دیے گئے ہیں عملاً آپ نے عورت کو ایک طوائف اور ایک داشتہ کی حیثیت دے دی ہے۔

میں محض پردے کے موضوع پر کئی دن تک گفتگو کر سکتا ہوں۔ لیکن میں اپنا جواب مختصر رکھتے ہوئے ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔

فرض کیجیے دو خواتین ہیں جو آپس میں جڑواں بہنیں ہیں۔ اور دونوں خواتین یکساں خوبصورت ہیں۔ دونوں ایک گلی میں سے گزر رہی ہیں۔ گلی کی نکر پر ایک بدمعاش کھڑا ہے۔ جو لڑکیوں کو چھیڑتا ہے، تنگ کرتا ہے۔ یہ دونوں خواتین یکساں خوبصورت ہیں لیکن ایک اسلامی لباس میں ہے، یعنی اس نے پردہ کیا ہوا ہے جب کہ دوسری مغربی لباس میں ہے یعنی اس نے منی سکرٹ وغیرہ پہنا ہوا ہے۔ اب یہ بدمعاش ان میں سے کسے چھیڑے گا؟ ظاہر ہے کہ مغربی لباس والی خاتون کو۔

یا فرض کیجیے کہ ان میں سے ایک خاتون تو پردے میں ہے اور دوسری بھی شلوار قمیض میں ہے لیکن اس کا لباس تنگ ہے، سر سے دوپٹہ غائب ہے، اس صورت میں بھی وہ کسے

چھیڑے گا؟ پردہ دار خاتون کو یا بے حجاب خاتون کو؟ صاف ظاہر ہے کہ دوسری خاتون کو۔

یہ اس بات کا ایک عملی ثبوت ہے کہ اسلام نے عورت کو حجاب کا حکم اس کی عزت اور وقار کی حفاظت کے لیے دیا ہے اس کی عزت گھٹانے کے لیے نہیں۔

....

سوال: اسلام مسلمان مردوں کو تو اہل کتاب خواتین سے شادی کی اجازت دیتا ہے لیکن مسلمان عورتوں کو اہل کتاب مردوں سے شادی کی اجازت نہیں دیتا، ایسا کیوں ہے؟

جواب: بھائی نے سوال پوچھا ہے کہ قرآن مسلمان مردوں کو تو اہل کتاب عورت سے شادی کی اجازت دیتا ہے لیکن مسلمان عورت کو اہل کتاب مرد سے شادی کی اجازت نہیں دیتا، ان کی بات بالکل درست ہے۔

سورۂ مائدہ میں اس حوالے سے ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ﴾ (۵:۵)

”آج تمہارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا بھی تم کو حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کو حلال ہے اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاک دامن اہل کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جب کہ ان کا مہر دے دو۔ اور ان سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ چھپی دوستی کرنی اور جو شخص ایمان کا منکر ہوا اس کے عمل ضایع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہو گا۔“

اس آیت کی روشنی میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ مسلمان مرد اہل کتاب عورت سے شادی کر سکتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک اہل کتاب عورت، یہودی یا عیسائی عورت ایک مسلمان مرد سے شادی کرے گی تو اس کا خاوند یا اس کے خاوند کے اہل خاندان اور گھر والے اس عورت کی مقدس ترین ہستیوں یعنی انبیائے کرام کی توہین یا ان کی شان میں کسی گستاخی کے مرتکب نہیں ہوں گے کیونکہ بحیثیت مسلمان ہم یہودیوں اور عیسائیوں کے انبیائے کرام یعنی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی بھی عزت اور احترام کرتے ہیں۔ جن انبیاء علیہم السلام پر ان کا ایمان ہے ان پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت داؤد، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام پر ہم بھی ایمان رکھتے ہیں۔

چونکہ اس اہل کتاب عورت کے انبیائے کرام ہمارے لیے بھی محترم ہیں اس لیے مسلمان خاندان میں اس عورت کا مذاق نہیں اُڑایا جائے گا۔ لیکن اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے۔ لہٰذا اگر ایک مسلمان عورت اہل کتاب خاندان میں جائے گی تو وہاں اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام اور تقدس ملحوظ نہیں رکھا جائے گا اور عین ممکن ہے کہ اس کے عقاید کا مذاق اُڑایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان عورت کو اہل کتاب مرد سے شادی کی اجازت نہیں دی گئی جب کہ مسلمان مرد کو اہل کتاب عورت سے شادی کی اجازت ہے۔

سوال پوچھنے والے بھائی نے ایک اور آیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ سورۂ بقرہ کی ایک آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (۲۲۱:۲)

''اور (مومنو) مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرنا کیونکہ مشرک عورت خواہ تم کو کیسی ہی بھلی لگے اس سے مومن لونڈی بہتر ہے اور (اسی طرح) مشرک مرد جب تک ایمان نہ لائیں مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں نہ دینا کیونکہ مشرک (مرد) سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی بھلا لگے، مومن غلام بہتر ہے۔ یہ (مشرک لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی مہربانی سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور اپنے حکم لوگوں سے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ نصیحت حاصل کریں۔''

گویا ایک کافر عورت دنیا کی امیر ترین عورت کیوں نہ ہو۔ دنیا کی خوبصورت ترین عورت کیوں نہ ہو وہ برطانیہ کی ملکہ ہی کیوں نہ ہو ایک مسلمان لونڈی اس سے بہتر ہے۔

اس آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ مشرک مرد سے اپنی بیٹیوں کا نکاح نہ کرو کیونکہ ایک کافر مرد کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو ایک مسلمان غلام بھی اس سے بہتر ہے۔

ہمیں قرآنی احکامات کو ان کے مجموعی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

سورۂ مائدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝﴾ (۷۲:۵)

''وہ لوگ بے شبہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مریم کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) مسیح خدا ہیں۔ حالاں کہ مسیح علیہ السلام یہود سے یہ کہا کرتے تھے کہ اے بنی اسرائیل! اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی (اور جان رکھو کہ) جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے گا اللہ اس پر بہشت کو حرام کر

دے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ (۳:۱۱۰)

''(مومنو!) جتنی اُمتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہت اچھا ہوتا۔ ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں (لیکن تھوڑے) اور اکثر بے ایمان ہیں۔''

گویا قرآن کا حکم یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے بھی انھی خواتین سے شادی کرنے کی اجازت ہے جو ایمان لانے والی ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ کو خدا یا خدا کا بیٹا نہیں بلکہ پیغمبر تسلیم کرتی ہیں۔ اور ایک اللہ پر ایمان رکھتی ہیں۔

سوال: اسلام میں عورت کو، خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ وصیت کرنے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

جواب: بہن نے پوچھا ہے اسلام میں عورت کو وصیت کرنے کی اجازت کیوں نہیں ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو کے دوران بھی عرض کیا، اسلام نے عورت کو پورے معاشی حقوق دیے ہیں اور یہ حقوق اس نے مغرب کے مقابلے ۱۴۰۰ برس پہلے ہی دے دیے تھے۔

میں نے اپنی گفتگو کے دوران واضح طور پر کہ کوئی بھی عاقل اور بالغ عورت اپنے ان حقوق کا استعمال کرسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عاقل اور بالغ ہونے والی شرط تو لازماً ہوگی۔

کوئی بھی عاقل اور بالغ عورت، اس سے قطع نظر کہ وہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ، یہ حق رکھتی ہے کہ آزادی سے اپنی جائداد کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کر سکے۔ وہ چاہے تو اس سلسلے میں کسی سے مشاورت کر سکتی ہے ورنہ اس کی بھی پابندی نہیں۔

اسے وصیت کرنے کا بھی حق حاصل ہے اور اسلام اس سے قطعاً منع نہیں کرتا۔

....

سوال: اگر اسلام مرد اور عورت کو برابر سمجھتا ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مرد کو تو چار شادیوں کی اجازت دی گئی ہے لیکن عورت کو یہ اجازت نہیں دی گئی؟

جواب: میرے بھائی نے سوال پوچھا ہے کہ اگر اسلام مرد کو چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے تو عورت کو یہ اجازت کیوں نہیں دیتا؟ عورت کیوں مرد کی طرح ایک سے زاید شادیاں نہیں کر سکتی؟

اس سلسلے میں آپ کو چند نکات ذہن میں رکھنے چاہئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مرد میں جنسی خواہش اور جذبہ عورت کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دونوں جنسوں کی حیاتیاتی ساخت میں فرق اس نوعیت کا ہے کہ مرد کے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ زندگی گزارنا آسان ہے جب کہ عورت کے لیے بہت مشکل طبی سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ ایام حیض کے دوران کچھ ذہنی اور نفسیاتی تبدیلیوں سے گزرتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان بیش تر جھگڑے انہی دنوں میں ہوتے ہیں۔

خواتین کے جرائم کے بارے میں ایک رپورٹ امریکہ سے شایع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مجرم خواتین کی اکثریت ایام حیض کے دوران جرائم کی مرتکب ہوئی۔

اس لیے اگر ایک عورت کے ایک سے زیادہ خاوند ہوں تو اس کے لیے ذہنی طور پر اس

صورتِ حال سے نپٹنا بہت مشکل ہے۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ جدید علم طب کے مطابق اگر ایک عورت ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ جنسی روابط رکھتی ہے تو اس کے بیماریوں کے شکار ہونے اور یہ بیماریاں پھیلانے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ جب اگر ایک مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرتا ہے تو ایسے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر ایک مرد کی ایک سے زیادہ بیویوں سے اولاد ہے تو اس کے ہر بچے کو اپنی ماں کا بھی علم ہو گا اور باپ کا بھی۔ یعنی یہ بچہ اپنے والدین کی یقینی شناخت کر سکے گا۔ دوسری طرف اگر ایک عورت کے شوہر ایک سے زیادہ ہیں تو اس کے بچوں کو اپنی ماں کا تو علم ہو گا لیکن باپ کا علم نہیں ہو گا۔

اسلام والدین کی شناخت کو بھی بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے، اور ماہرین نفسیات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ایک بچے کو اپنے والدین کا علم نہ ہو تو یہ بات اس کے لیے ذہنی صدمے کا باعث بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدکردار عورتوں کے بچوں کا بچپن بالعموم بہت برا گزرتا ہے۔

اگر ایک ایسے بچے کو آپ سکول میں داخل کروانا چاہیں تو کیا کریں گے۔ ولدیت کے خانے میں دو نام لکھنے پڑیں گے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ایسے بچے کو کیا کہہ کر پکارا جائے گا؟

میں جانتا ہوں کہ آپ جواباً کچھ دلائل پیش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر بے اولادی کی وجہ سے، بیوی کے بانجھ ہونے کی وجہ سے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت ہے تو شوہر میں کوئی خرابی ہونے کی صورت میں بیوی کو دوسری شادی کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

اس سلسلے میں آپ کو بتانا چاہوں گا کہ کوئی مرد سو فی صد نامرد نہیں ہوتا۔ اگر وہ جنسی عمل سرانجام دے سکتا ہے تو اس کے باپ بننے کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ خواہ وہ نس

بندی ہی کیوں نہ کروا لے۔ لہٰذا اولاد کی ولدیت میں شک بہر حال موجود رہے گا کوئی بھی ڈاکٹر آپ کی سو فی صد گارنٹی نہیں دے سکتا کہ یہ شخص باپ نہیں بن سکتا۔

اسی طرح آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر بیوی کے حادثے کا شکار ہونے یا شدید بیمار ہونے کی صورت میں شوہر دوسری شادی کرسکتا ہے تو شوہر کے کسی حادثے کا شکار ہونے یا بیمار ہونے کی صورت میں یہی اجازت بیوی کو بھی ہونی چاہیے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ ایسی کسی صورت حال کے دو طرح کے اثرات ظاہر ہوں گے۔ ایک تو یہ ہوگا کہ شوہر کے لیے بیوی بچوں کے اخراجات پورے کرنا ممکن نہیں رہے گا اور دوسرے یہ کہ وہ بیوی کے ازدواجی حقوق ادا نہیں کر سکے گا۔

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے اسلام ایسی کسی صورت حال کے لیے ''زکوٰۃ'' کا ذریعہ فراہم کرتا ہے۔ وہ لوگ جن کے پاس مالی وسائل نہیں ہیں ان کی مدد زکوٰۃ کی رقوم سے کی جانی چاہیے۔

دوسرے مسئلے کا معاملہ یہ ہے کہ طبی سائنس کی تحقیقات کے مطابق عورت میں جنسی خواہش مرد کے مقابلے میں کم ہوتی ہے لیکن اگر عورت سمجھے کہ وہ غیر مطمئن ہے تو اسکے پاس ''خلع'' کے ذریعے علیحدگی کا راستہ موجود ہے۔ وہ اپنے شوہر سے خلع لے کر دوسری شادی کرسکتی ہے۔ اس طرح عورت کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ کیونکہ خلع کے ذریعے علیحدہ ہونے والی عورت صحت مند ہوتی ہے۔ اور دوبارہ شادی کر سکتی ہے۔ بصورتِ دیگر، اگر وہ خود بیمار یا معذور ہو تو کون اس سے شادی کرے گا۔

....

سوال: یوں تو تمام مذاہب کی مقدس کتابوں میں اچھی باتیں لکھی ہوئی ہیں لیکن عملاً ان مذاہب کے ماننے والوں کا رویہ عورت کے ساتھ غیر منصفانہ رہا ہے۔ اصل اہمیت کتابوں میں لکھی ہوئی تعلیمات کی ہے یا عملی رد یے کی؟

جواب: میرے بھائی نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کتب مقدسہ

میں تو اچھی باتیں ہی لکھی ہوئی ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ لوگ عملاً کیا کرتے ہیں۔ یقیناً ہمیں نظری گفتگو سے زیادہ اہمیت عمل کو دینی چاہیے۔ لہٰذا میں اس بات کی پوری حمایت کرتا ہوں۔ اور یہی ہم کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو کے دوران بھی واضح کیا بہت سے مسلمان معاشرے قرآن وسنت کی تعلیمات سے دور ہٹ چکے ہیں اور ہم یہی کر رہے ہیں کہ لوگوں کو دعوت دیں کہ وہ دوبارہ قرآن وسنت کی طرف لوٹ آئیں۔

جہاں تک سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے کہ تمام مذہبی کتابوں میں اچھی باتیں ہی لکھی ہوئی ہیں تو میں اس بات سے قطعاً اتفاق نہیں کرتا۔ میں آپ کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ تمام متون مقدسہ میں اچھی باتیں ہیں اور ہمیں ان کے بارے میں بات ہی نہیں کرنی چاہیے۔

میں ''اسلام اور دیگر مذاہب میں عورت کا مقام'' کے موضوع پر ایک لیکچر دے چکا ہوں جس میں میں نے اسلام میں عورت کے مقام کا تقابل بدھ مت، ہندومت، عیسائیت اور یہودیت میں عورت کے مقام کے ساتھ کیا تھا۔ آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میرا وہ لیکچر سن کر آپ خود یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سا مذہب خواتین کو زیادہ حقوق دیتا ہے۔ اب ہمیں کرنا یہ ہے کہ ان تعلیمات پر عمل بھی کریں۔

اور جزوی طور پر ان تعلیمات پر عمل کیا بھی جا رہا ہے۔ بعض پہلوؤں پر عمل ہو رہا ہے اور بعض پر نہیں۔ مثال کے طور پر جہاں تک حدود کے نفاذ اور اسلامی نظامِ تعزیرات کا تعلق ہے۔ سعودی عرب میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ الحمد للہ سعودی حکومت اس حوالے سے بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ اگرچہ بعض معاملات میں وہ بھی قرآن سے دور ہٹ گئے ہیں۔ ہمیں کرنا یہ چاہیے کہ سعودی عرب کے نظامِ قانون کی مثال سامنے رکھیں، اس کا جائزہ لیں اور اگر یہ نظام مؤثر ہے تو پوری دنیا میں اس پر عمل کیا جائے۔

اسی طرح اگر کسی اور معاشرے میں اسلام کے معاشرتی قانون پر عمل ہو رہا ہے تو اس کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے اور اگر وہ مؤثر ہے تو پوری دنیا میں اس کا نفاذ ہونا

چاہیے۔

میرے بھائی ہم یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ آپ کو بتا سکیں کہ اسلامی قانون ہی بہترین قانون ہے۔ اگر ہم اس قانون پر عمل نہیں کر رہے ہیں تو یہ ہمارا قصور ہے، دین اسلام کا نہیں۔ اسی لیے ہم نے لوگوں کو بلایا ہے۔ تاکہ لوگ قرآن وحدیث کی تعلیمات کو صحیح تناظر میں سمجھ سکیں اور ان تعلیمات پر عمل کر سکیں۔

میں اُمید رکھتا ہوں کہ سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

سوال: اسلام کے مطابق کوئی عورت پیغمبر کیوں نہیں ہو سکتی؟

جواب: میری بہن نے سوال پوچھا ہے کہ اسلام میں کسی عورت کو پیغمبر کا درجہ کیوں نہیں ملا؟ اگر ''پیغمبر'' سے آپ کی مراد کوئی ایسی شخصیت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا وحی نازل ہوتی ہو اور وہ کسی قوم کی رہنمائی بھی کرے تو پھر آپ کی بات درست ہے کہ اسلام میں ایسی کوئی خاتون پیغمبر موجود نہیں ہے۔ قرآن واضح طور پر بتاتا ہے کہ خاندان کا سربراہ مرد ہے۔ سو اگر خاندان اور گھر کا سربراہ مرد ہے تو پھر قوم کی سربراہی عورت کس طرح کر سکتی ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا سربراہی کی صورت میں عورت کو امامت بھی کرنی پڑے گی۔ اگر ایک عورت امام ہے اور مقتدی مرد ہیں تو پھر ارکانِ نماز یعنی رکوع وسجود کے دوران لازماً نمازیوں کو پریشانی ہوگی۔ ایک پیغمبر کو عام لوگوں کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہنا ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک عورت پیغمبر ہوتی تو اس کے لیے یہ ممکن نہ ہوتا۔ کیونکہ اسلام مرد وعورت کے آزادانہ اختلاط ہی کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح اگر ایک عورت پیغمبر ہو اور وہ حاملہ ہو جائے تو ظاہر ہے کہ کچھ عرصے تک وہ اپنے فرائض سرانجام نہیں دے سکے گی۔ ایک مرد کے لیے ایک ہی وقت میں بہ طور باپ اور بہ طور پیغمبر اپنی ذمہ داریاں نبھانا آسان تھا جب کہ عورت کے لیے ایسا کرنا بہت مشکل تھا۔

لیکن اگر پیغمبر سے آپ کی مراد کوئی مقدس اور متبرک ہستی ہے تو پھر ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ بہترین مثال جو میں آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں وہ حضرت مریم کی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ان کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۴۲:۳)

''اور جب فرشتوں نے (مریم سے) کہا، کہ مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور پاک بنایا ہے اور جہان کی عورتوں میں منتخب کیا ہے۔''

لہٰذا اگر آپ پیغمبر سے مراد اللہ کی منتخب کردہ کوئی برگزیدہ ہستی لیتے ہیں تو پھر حضرت مریم یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ مزید مثالیں بھی موجود ہیں۔

اگر آپ قرآن مجید کی سورۂ تحریم کا مطالعہ کریں تو آپ یہ آیت بھی دیکھیں گے:

﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ (۱۱:۶۶)

''اور مومنوں کے لیے (ایک) مثال (تو) فرعون کی بیوی کی بیان فرمائی کہ اس نے اللہ سے التجا کی کہ اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات بخش اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے۔''

ذرا اندازہ لگایئے حضرت آسیہ فرعون کی بیوی ہیں یعنی اپنے وقت کے طاقتور ترین شخص کی ملکہ اور وہ تمام آسائشوں اور سہولتوں کو رد کر کے جنت کے گھر کی دعا فرما رہی ہیں۔ اسلام میں حضرت مریم اور حضرت آسیہ علیہا السلام کے علاوہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسی برگزیدہ خواتین بھی موجود ہیں۔

میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

سوال: آپ نے کہا کہ اسلام میں زیادہ سے زیادہ چار شادیوں کی اجازت ہے تو پھر پیغمبر اسلام ﷺ نے گیارہ شادیاں کیوں کیں؟

جواب: بھائی نے سوال پوچھا ہے کہ اسلام میں تو زیادہ سے زیادہ چار شادیوں کی اجازت ہے تو پھر رسول کریم ﷺ نے گیارہ شادیاں کیوں کیں؟

بھائی کی یہ بات بالکل درست ہے کہ اسلام میں زیادہ سے زیادہ چار شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾

(۴:۳)

''تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔''

لیکن سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بھی ملتا ہے:

﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۝ ﴾ (۳۳:۵۲)

''(اے نبی ﷺ) اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ اُس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ، خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو، البتہ لونڈیوں کی تمہیں اجازت ہے۔ اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔''

قرآنِ مجید کی یہ آیت حضور اکرم ﷺ کو اپنی تمام موجود بیویاں رکھنے کی اجازت دے رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مزید نکاح کرنے سے روک بھی رہی ہے۔ علاوہ لونڈیوں کے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نہ صرف یہ کہ مزید شادیاں نہیں کر سکتے تھے بلکہ ان بیویوں کو بھی

طلاق نہیں دے سکتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں یعنی امہات المؤمنین ہیں۔ لہٰذا رسول اکرم ﷺ کے وصال کے بعد بھی کوئی ان سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔

اگر آپ رسولِ خدا ﷺ کی تمام شادیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شادیاں یا تو معاشرتی اصلاحات کے لیے کی گئی تھیں اور یا سیاسی وجوہات سے۔ اپنی خواہش کی تسکین کے لیے یہ شادیاں ہرگز نہیں کی گئیں تھیں۔

آپ ﷺ نے پہلا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کیا۔ اس وقت نبی کریم ﷺ کی اپنی عمر ۲۵ سال تھی، جب کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۴۰ سال تھی۔ جب تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حیات رہیں، آپ ﷺ نے دوسرا نکاح نہیں فرمایا۔ آنحضور ﷺ کی عمر ۵۰ سال تھی، جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔

اپنی عمر کے ۵۳ ویں سال سے ۵۶ سال کے درمیان آپ ﷺ نے تمام نکاح فرمائے۔ اگر ان شادیوں کی وجوہات جنسی ہوتیں تو آپ ﷺ نوجوانی میں زیادہ نکاح فرماتے۔ کیونکہ علم طب تو یہ کہتا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ جنسی خواہش گھٹتی چلی جاتی ہے۔

صرف دو نکاح ایسے ہیں جو آپ ﷺ نے اپنی مرضی سے فرمائے۔ حضرت خدیجہ کے ساتھ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ۔ باقی تمام نکاح حالات کے پیش نظر اور سیاسی معاشرتی اصلاح کے لیے کیے گئے تھے۔

صرف دو امہات المؤمنین کے علاوہ باقی سب کی عمریں ۳۶ اور ۵۰ سال کے درمیان تھیں۔ ہر نکاح کی وجوہات اور اسباب بیان کیے جاسکتے ہیں۔

مثال کے طور پر حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ دیکھیے۔ آپ کا تعلق قبیلہ بنی مصطلق سے تھا۔ اس قبیلے کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات بہت خراب تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے ان پر حملہ کرکے انھیں شکست دی۔ اس کے بعد جب حضور اکرم ﷺ نے حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیا تو مسلمانوں نے قبیلۂ بنی مصطلق کے تمام قیدیوں کو یہ کہہ کر رہا

کر دیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے رشتہ داروں کو کس طرح قید رکھ سکتے ہیں؟ اس واقعے کے بعد اس قبیلہ کے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھے ہو گئے۔

اسی طرح حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا قبیلۂ نجد کے سردار کی بہن تھیں۔ یہ وہی قبیلہ ہے جس نے مسلمانوں کے ایک ۷۰ افراد پر مشتمل وفد کو شہید کر دیا تھا۔ یہ قبیلہ مسلمانوں کے شدید ترین مخالفین میں شمار ہوتا تھا لیکن اس شادی کے بعد اس قبیلہ نے مدینے کو اپنا مرکز اور رسول خدا ﷺ کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔

ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا مکہ کے سردار ابوسفیان کی صاحبزادی تھیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس نکاح نے فتح مکہ کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا۔

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ایک اہم یہودی سردار کی بیٹی تھیں۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سے نکاح کر لینے کے بعد مسلمانوں کے تعلقات یہودیوں کے ساتھ خوشگوار ہو گئے تھے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے مختلف سیاسی اور معاشرتی وجوہات کے پیش نظر یہ نکاح فرمائے۔ حضرت زینب کے ساتھ شادی یہ غلط تصور ختم کرنے کے لیے کی گئی کہ متبنّٰی اصل بیٹے کی طرح ہوتا ہے اور اس کی مطلقہ کے ساتھ شادی نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی تمام شادیوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ نکاح جنسی خواہش کی وجہ سے ہرگز نہیں کیے تھے۔

میں اُمید رکھتا ہوں کہ سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

....

سوال: اسلام مرد کو ایک سے زاید شادیوں کی اجازت دیتا ہے تو اس میں عورت کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: آپ نے سوال پوچھا ہے کہ مرد کو زیادہ شادیوں کے اجازت دینے میں عورت کا کیا فائدہ ہے۔ عورت کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح وہ پاک باز رہتی ہے۔ کیونکہ جیسا

کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ اگر ہر مرد صرف ایک شادی کرے تو لاکھوں عورتیں غیر شادی شدہ رہ جائیں گی۔ کیونکہ انھیں کوئی غیر شادی شدہ مرد نہیں مل سکے گا۔

اس طرح ان خواتین کے پاس سوائے عوامی ملکیت بن جانے کے کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا۔ اسی لیے اسلام نے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی ہے تاکہ خواتین کی عفت محفوظ رہ سکے۔ اور انھیں بدکرداری سے محفوظ رکھا جاسکے۔

سوال: کیا اسلام میں بچے کو گود لینے کی اجازت ہے؟

جواب: بھائی پوچھتے ہیں کہ کیا اسلام میں بچے کو گود لینے Adoption کی اجازت ہے یا نہیں۔ اگر تو گود لینے سے مراد یہ ہے کہ آپ ایک غریب اور بے سہارا بچے کا سہارا بنیں اور اس کو روٹی کپڑا مکان مہیا کریں تو یقیناً اسلام اس کے حق میں ہے بلکہ قرآن میں غریب اور ضرورت مند لوگوں کی مدد پر بڑا زور دیا گیا ہے۔

اگر آپ اس طرح کسی بچے کے لیے پدرانہ شفقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے کام آنا چاہتے ہیں تو اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے لیکن جہاں تک تعلق ہے قانونی طور پر متبنّٰی کرنے کی تو اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ قانونی طور پر اس بچے کی ولدیت کے خانے میں اپنا نام نہیں لکھوا سکتے۔ اس بات کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قانونی طور پر اس بچے کو آپ کی اولاد قرار دے دینے کے نتیجے میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس بچے یا بچی کی اپنی شناخت بالکل ختم ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ کہ اگر آپ بے اولادی کی وجہ سے بچے کو گود لیتے ہیں اور اس کے بعد آپ کی اپنی اولاد پیدا ہو جاتی ہے تو اس گود لیے ہوئے بچے کے ساتھ آپ کے رویے میں تبدیلی آجائے گی۔

تیسری بات یہ کہ اگر آپ کی اپنی اولاد اور متبنّٰی بچے کی جنس مختلف ہے تو پھر ایک ہی

گھر میں رہتے ہوئے بھی مشکلات پیش آئیں گی کیونکہ وہ بہر حال حقیقی بہن بھائی تو نہیں ہیں۔ اسی طرح بالغ ہو جانے کے بعد مسائل مزید پیچیدہ ہو جائیں گے، کیونکہ اگر وہ لڑکا ہے تو گھر کی خواتین کو پردہ کرنا پڑے گا۔ اور اگر لڑکی ہے تو اسے اپنے نام نہاد باپ سے بھی پردہ کرنا پڑے گا کیونکہ وہ اس کا حقیقی باپ تو نہیں ہے۔

مزید براں اس طرح وراثت کے مسائل بھی پیدا ہوں گے۔ وفات کے بعد فوت ہونے والے کی تمام جائداد اُس قانون کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے جو قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اگر گود لیے ہوئے بچے کو یہ مال ملتا ہے تو گویا دیگر رشتہ داروں کا حق مارا جاتا ہے۔

اگر گود لینے والے شخص کی اپنی اولاد بھی موجود ہے تو پھر اس اولاد کا حق مارا جائے گا اور اگر اولاد نہیں ہے تو بیوی اور دیگر رشتہ داروں کا۔

اسی پیچیدگی سے بچنے کے لیے اسلام نے بچوں کو قانونی طور پر گود لینے کی اجازت نہیں دی ہے۔

سوال: آپ نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ طلاق کے بعد جب تک عورت کی عدت پوری نہیں ہوتی، شوہر عورت کے نان ونفقہ مہیا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ سوال یہ ہے کہ عدت کے بعد عورت کے اخراجات کا ذمہ دار کون ہوگا؟

جواب: میری بہن نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ طلاق کی صورت میں دورانِ عدت یہ مرد کا فرض ہے کہ وہ عورت کے اخراجات برداشت کرے اور اسے نان ونفقہ فراہم کرے۔ یہ مدت غالبًا تین ماہ یا اگر عورت حاملہ ہے تو وضع حمل تک ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ یہ باپ اور بھائی کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کو تمام ضروریاتِ زندگی فراہم کریں۔

اگر بالفرض والدین اور بھائی یہ فرض ادا نہیں کر سکتے تو اس صورت میں یہ دیگر قریبی رشتہ داروں کا فرض بنتا ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ بھی ایسا نہیں کر سکتے تو اس صورت میں یہ

مسلم امت کا فریضہ بن جاتا ہے۔ بحیثیت مسلمان یہ ہم سب کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ ایسے ادارے تشکیل دیں اور زکوٰۃ کی تقسیم کا ایسا نظام بنائیں کہ ان خواتین کو بنیادی ضروریات کی فراہمی یقینی بنائی جا سکے۔

امید ہے کہ سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

سوال: آپ نے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ مرد اور عورت برابر ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر دونوں کو جائداد میں برابر حصہ کیوں نہیں ملتا؟

جواب: بھائی کا سوال یہ ہے کہ اپنی گفتگو کے دوران میں نے کہا تھا کہ اسلام میں مرد اور عورت کو مساوی معاشی حقوق حاصل ہیں۔ اگر ایسا ہے تو وراثت کی تقسیم کے وقت اسے برابر حصہ کیوں نہیں ملتا؟ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عورت کا حصہ مرد سے آدھا ہے۔

اس سلسلے میں قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

''خدا تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر اولادِ میت صرف لڑکیاں ہی ہوں یعنی (دو یا) دو سے زیادہ تو کل ترکے میں سے ان کا دو تہائی اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف۔ اور میت کے ماں باپ کا یعنی دونوں میں سے ہر ایک کا ترکے میں چھٹا حصہ بشرطیکہ میت کے اولاد ہو اور اگر اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ اور اگر میت کے بھائی بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ (اور یہ تقسیم ترکہ میت کی) وصیت (کی تعمیل) کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرض کے (ادا ہونے کے بعد جو اس کے ذمے ہو عمل میں آئے گی) تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ دادوں اور بیٹوں پوتوں میں سے فائدے کے لحاظ سے کون تم سے زیادہ قریب ہے۔ یہ حصے خدا کے مقرر کیے ہوئے ہیں اور خدا سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔'' (۴:۱۱،۱۲)

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیش تر صورتوں میں عورت کا آدھا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن ہر صورت میں ایسا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر؛

دونوں کو ہی چھٹا حصہ ملتا ہے۔ اگر مرنے والے کی کوئی اولاد نہ ہو تو ماں اور باپ دونوں کو ہی چھٹا حصہ ملتا ہے۔ بعض اوقات، اگر مرنے والی خاتون ہو، اس کی اولاد بھی نہ ہو تو اس کے شوہر کو نصف، ماں کو تیسرا حصہ اور باپ کو چھٹا حصہ ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں عورت کا حصہ مرد سے دوگنا ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اس مثال میں ماں کا حصہ باپ کے مقابلے میں دگنا ہے۔

لیکن میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ بیش تر صورتوں میں عورتوں کا حصہ مردوں کے مقابلے میں آدھا ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے اسلام میں معاشی ذمہ داریاں مرد پر ڈالی گئی ہیں اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مرد کا حصہ زیادہ رکھا گیا ہے۔ خاندان کے تمام معاشی اخراجات پورے کرنے کی وجہ سے ضروری ہے کہ عورت کے مقابلے میں مرد کو زیادہ حصہ ملے۔ بصورتِ دیگر یہ ہوگا کہ ہمیں ''مرد کے حقوق'' پر بھی لیکچر دینے پڑیں گے۔

میں یہاں ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ فرض کیجیے ایک صاحب فوت ہوئے۔ ان کی جائداد میں سے باقی تمام حقوق ادا کرنے کے بعد بچوں کے حصہ میں ڈیڑھ لاکھ روپے آتے ہیں۔ اس شخص کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ اسلامی شریعت کی رو سے بیٹے کو ایک لاکھ اور بیٹی کو پچاس ہزار ملیں گے۔ لیکن بیٹے پر ایک پورے خاندان کی معاشی ذمہ داریاں ہیں۔ لہٰذا اسے اس میں ایک لاکھ کا بیشتر حصہ مثال کے طور پر ۸۰ ہزار یا شاید پورا ایک لاکھ ہی ان ذمہ داریوں کی وجہ سے خرچ کرنا پڑ جائے گا۔ دوسری طرف خاتون کو پچاس ہزار ملیں گے لیکن یہ ساری رقم اسی کے پاس رہے گی کیونکہ اس پر ایک پائی کی بھی ذمہ داری نہیں ہے۔ لہٰذا اسے خاندان پر کچھ بھی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔

سوال: آپ نے اپنی گفتگو کے دوران فرمایا کہ اگر کسی لڑکی کی شادی زبردستی کردی جائے تو ایسی شادی کو فسخ کیا جاسکتا ہے۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا کوئی ایسا ادارہ موجود ہے جو اس سلسلے میں بااختیار ہو اور کوئی لڑکی اپنے حقوق کے سلسلے میں اس سے رجوع کرسکے؟

جواب: بہن نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ ان کا سوال خواتین کے حقوق سے متعلق ہے۔ قرآن وحدیث سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ اگر کسی خاتون کی شادی زبردستی کردی جائے تو ایسی شادی کالعدم قرار دی جاسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دورِ حاضر میں کوئی ایسا ادارہ موجود ہے جو اس طرح کی شادی کو کالعدم قرار دے سکے۔ ایسے ادارے کئی ممالک میں موجود ہیں مثال کے طور پر ایران اور سعودی عرب میں۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوستانی حکومت مسلمانوں کو ایسی عدالتیں بنانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اگرچہ یہاں ''مسلم پرسنل لا'' موجود ہے لیکن اس میں تمام حقوق شامل نہیں ہیں۔

اگر ہندوستانی حکومت سے درخواست کی جائے اور وہ اجازت دے تو یہاں بھی ایسے ادارے قائم ہوسکتے ہیں۔ فی الحال تو محدود حقوق ہی حاصل ہیں۔ تمام حقوق نہیں دیے گئے۔

....

سوال: اسلام مردوں اور عورتوں کو مل جل کر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس رویے کو آپ جدید قرار دیں گے یا فرسودہ؟ اور سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا عورت ایئر ہوسٹس کی نوکری کرسکتی ہے؟ یہ ایک اچھی اور زیادہ تنخواہ والی نوکری ہے۔

جواب: جہاں تک سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے کہ اسلام عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کی اجازت نہیں دیتا۔ کیا یہ رویہ جدید ہے یا فرسودہ؟ تو عرض یہ ہے کہ اگر جدت سے آپ کی مراد یہ ہے کہ دونوں جنسوں کے اختلاط کی اجازت دے دی جائے، عورت کو خرید وفروخت کی شے بنا کر رکھ دیا جائے اور اسے ماڈلنگ جیسے پیشوں سے وابستہ کردیا جائے تو پھر میرا خیال ہے کہ اسلام فرسودہ ہی ہے۔

کیونکہ مغربی میڈیا ظاہر تو یہ کرتا ہے کہ مغربی کلچر میں عورت کو زیادہ حقوق دیے گئے ہیں لیکن حقیقتاً وہاں عورت کے مقام و مرتبے میں اضافہ کرنے کی بجائے اس کا استحصال ہو رہا ہے۔

اعداد و شمار ہمیں بتاتے ہیں کہ یونیورسٹیوں میں جانے والی اور کام کرنے والی خواتین میں سے پچاس فی صد کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ پچاس فی صد خواتین یعنی آدھی خواتین کے ساتھ۔ آپ جانتے ہیں کیوں؟

اس لیے کہ وہاں عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کی اجازت ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کی اجازت دینا جدت ہے تو پھر اسلام فرسودہ ہی ہے۔ اور اگر آپ ایسا نہیں سمجھتے تو پھر اسلام جدید ترین مذہب ہے۔

اب آتے ہیں سوال کے دوسرے حصے کی طرف۔ کیا اسلام عورت کو ایئر ہوسٹس کے طور پر نوکری کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ کیونکہ یہ ایک زیادہ تنخواہ والی اور مناسب نوکری ہے۔ میں پہلی بات سے تو اتفاق کرتا ہوں کہ واقعی یہ ایک زیادہ تنخواہ والی نوکری ہے لیکن جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے یعنی یہ کہ ''یہ ایک اچھی اور مناسب نوکری ہے'' تو اس کا ہمیں تجزیہ کرنا چاہیے۔

ایئر ہوسٹس کا انتخاب بنیادی طور پر ''حسن'' کے حوالے سے ہوتا ہے۔ آپ نے کبھی کوئی بدصورت ایئر ہوسٹس نہیں دیکھی ہوگی۔ انھیں اس لیے منتخب کیا جاتا ہے کہ وہ خوبصورت، اس لیے کہ وہ جوان ہیں، اس لیے کہ وہ جاذب نظر ہیں۔

انھیں ایسا لباس پہننے کا پابند کیا جاتا ہے جو اسلامی اخلاقیات کے مطابق نہیں ہوتا۔ انھیں آرائش و زیبائش کا بھی پابند کیا جاتا ہے تاکہ وہ مسافروں کو راغب کر سکیں۔ انھیں مسافروں کی بعض ضروریات پوری کرنی ہوتی ہیں اور یہ مسافر بالعموم مرد ہوتے ہیں۔ اس طرح عورت اور مرد ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور بعض اوقات یہ مسافر ایئر ہوسٹسوں کو تنگ بھی کرتے ہیں لیکن وہ انھیں کوئی سخت جواب نہیں دے سکتی کیونکہ یہ اس کی

تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر اگر مسافر کہے ''محترمہ ذرا میری سیٹ بیلٹ تو باندھ دیجیے'' تو ظاہر ہے کہ ایئر ہوسٹس کو باندھنا ہوگی۔

بیش تر فضائی کمپنیاں اپنی پروازوں کے دوران شراب بھی پیش کرتی ہیں اور اسلام میں نہ صرف شراب کا پینا حرام ہے بلکہ اس کا پیش کرنا بھی حرام ہے۔

تمام فضائی میزبان خواتین ہی ہوتی ہیں۔ مرد حضرات یعنی ''پرسز جہاز میں موجود ہوتے ہیں لیکن وہ کچن وغیرہ میں رہتے ہیں یعنی جہاز میں الٹا ہی نظام چلتا ہے۔ مرد باورچی خانے میں اور عورت مسافروں کی خدمت کر رہی ہے۔

آپ یقین کیجیے کہ اب خواتین کے بغیر کسی ایئر لائین کا گزارا ہی نہیں یہاں تک کہ سعودی ایئر لائن جسے سب سے زیادہ اسلامی ''فرض کیا جاتا ہے'' اس کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن چونکہ وہ سعودی لڑکیاں بھرتی نہیں کر سکتے لہٰذا یہ کرتے ہیں کہ لڑکیاں درآمد کرتے ہیں اور غیر ملکی لڑکیوں کو بھرتی کرتے ہیں۔

یہ دُہرا معیار ہے۔ اور یہ دُہرا معیار اس لیے اپنایا گیا ہے کہ فضائی سفر کے کاروبار میں اس کے بغیر گزارا نہیں۔ اس کاروبار میں مسافروں کو راغب کرنے کے لیے خوبصورت خواتین کو سامنے لانا پڑتا ہے۔

اور آپ کو شدید صدمہ پہنچے گا، اگر آپ کو فضائی کمپنیوں کے کچھ اصول وضوابط کا پتہ چل جائے۔ مثال کے طور پر انڈین ایئر لائن اور ایئر انڈیا دونوں کا اصول یہ ہے کہ منتخب ہونے کے بعد کوئی ایئر ہوسٹس چار برس تک شادی نہیں کر سکتی۔ بعض ایئر لائنز تو یہ بھی کہتی ہیں کہ حاملہ ہونے کی صورت میں نوکری ختم ہو جائے گی۔ اور ۳۵ سال کی عمر میں انھیں ریٹائر کر دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی جاذبیت کم ہو جاتی ہے۔

کیا آپ اسے ایک اچھی اور مناسب نوکری کہتے ہیں؟

سوال: کیا اسلام مخلوط تعلیم کی اجازت دیتا ہے؟

جواب: میرے بھائی نے پوچھا ہے کہ کیا اسلام میں مخلوط تعلیم کی اجازت ہے؟ یعنی کیا لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی سکول، کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں؟

پہلے ہم سکول کا معاملہ لیتے ہیں اور تجزیہ کرتے ہیں کہ کیا لڑکے لڑکیوں کا ایک ہی سکول میں پڑھنا مناسب ہے۔ پچھلے سال ہی ایک رپورٹ چھپی ہے۔ یہ رپورٹ ''The World This Week.'' نامی رسالے میں شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ میں مخلوط اور جداگانہ تعلیم والے سکولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ رپورٹ برطانیہ کے سکولوں کے بارے میں ہے۔

اس سروے میں بتایا گیا ہے کہ مجموعی طور پر جداگانہ تعلیم والے اداروں کے نتائج مخلوط تعلیم والے سکولوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھے۔ جب اس سلسلے میں اساتذہ سے بات چیت کی گئی تو انھوں نے بتایا کہ جداگانہ تعلیم والے اداروں میں طالب علم تعلیم پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ جب طالب علموں سے پوچھا گیا کہ تو انھوں نے مخلوط سکولوں میں پڑھنے کو ترجیح دی، جس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔

اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا کہ مخلوط اداروں میں پڑھنے والے بچے زیادہ وقت جنس مخالف کی توجہ حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ ان کی زیادہ توجہ جنس مخالف کے ساتھ تعلق بنانے پر ہوتی ہے نہ کہ تعلیم پر۔

یہ بھی بتایا گیا کہ برطانوی حکومت جداگانہ اداروں کی تعداد بڑھانے پر غور کر رہی ہے۔ امریکہ کے بارے میں ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ لڑکیاں حصول علم پر کم اور اپنے ہم جماعتوں سے جنسی معلومات حاصل کرنے پر زیادہ وقت صرف کر رہی ہیں۔

ہندوستان میں بھی صورتِ حال کم و بیش ایسی ہی ہے۔

جب آپ کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو جو نکات آپ کو سکولوں کے بارے میں بتائے گئے وہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

مارچ ۱۹۸۰ء میں نیوز دیک میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں یونیورسٹیوں میں

خواتین پر ہونے والے جنسی حملوں کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔ میں وقت کی کمی کی وجہ سے اس رپورٹ کی تمام تفاصیل آپ کے سامنے پیش نہیں کرسکوں گا لیکن اس رپورٹ کی بنیادی بات یہ تھی کہ اساتذہ نے، پروفیسروں اور لیکچراروں نے بہتر نمبروں کا لالچ دے کر طالبات کا جنسی استحصال کیا۔

یہ تو نیوز ویک کی رپورٹ تھی۔ ہندوستان میں بھی یہی کچھ ہورہا ہے۔ اور ظاہر ہے اس صورتِ حال میں اچھی تعلیم حاصل کرنے کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔ پچھلے سال ایسی ہی ایک خبر اخبارات میں نمایاں طور پر شایع ہوئی۔ مجھے کالج کا نام یاد نہیں۔ ایک طالبہ کے ساتھ چار پانچ طالب علموں نے دن دیہاڑے، کالج کی حدود میں زیادتی کی۔ اسی طرح پرسوں ایک رپورٹ ٹائمز آف انڈیا میں شایع ہوئی۔ یہ اصل میں نیویارک ٹائمز کی رپورٹ ہے جسے ٹائمز آف انڈیا میں نقل کیا گیا ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق امریکہ میں سکول اور یونیورسٹی جانے والی ۲۵ فیصد طالبات زنا بالجبر کا شکار ہوتی ہیں۔

میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ اپنے بچوں کو درسگاہوں میں علم حاصل کرنے کے لیے بھیجنا چاہتے ہیں یا اس لیے کہ وہ جنسی استحصال کا شکار ہوں؟ اگر آپ کا مقصد حصولِ علم ہے تو پھر میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ انھیں ایسے اداروں میں بھیجیں جہاں جداگانہ طرزِ تعلیم ہے مخلوط نہیں۔ اور ایسے ادارے بہت ہیں۔

....

سوال: آپ کی گفتگو سے پتہ چلا کہ قرونِ اُولیٰ میں بہت سے عالم خواتین موجود تھیں لیکن میرا سوال یہ ہے کہ آج کتنی خواتین علما ہیں جو قرآن و حدیث کی تفسیر کرسکتی ہیں اور مرد علما کے مقابلے میں ان کا تناسب کیا ہے؟ اگر ایسی خواتین ہوتیں تو تسلیمہ نسرین کے حق میں بولتیں؟

جواب: آپ کو میری اس بات سے تو اتفاق ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک

میں عالم خواتین موجود تھیں۔ جو نہ صرف قرآن و حدیث کی وضاحت کرتی تھیں بلکہ انھیں احادیث یاد بھی تھیں۔ صرف ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دو ہزار دو سو دس احادیث روایت کی گئی ہیں۔ لیکن آپ کا سوال یہ ہے کہ دورِ حاضر میں کتنی عالم خواتین موجود ہیں۔ آپ اُن کا تناسب بھی جاننا چاہتے ہیں۔

عالم خواتین اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اور متعدد ایسے ادارے ہیں جہاں خواتین دینی علوم حاصل کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ممبئی میں اور دار العلوم ندوۃ العلما میں، دار العلوم اصلاح البنات میں خواتین دینی علوم حاصل کر رہی ہیں اور عالم خواتین سامنے آ رہی ہیں۔ ان کے تناسب اور فی صد تعداد کا تو مجھے علم نہیں ہے لیکن بہر حال عالمہ خواتین کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔

جہاں تک سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا تسلیمہ نسرین کی حمایت کی جا سکتی ہے؟ تسلیمہ نسرین کے معاملے پر میں ایک مباحثے میں حصہ لے چکا ہوں جس میں میرے علاوہ ڈاکٹر ویاس فادر پریرا اور اشوک شاہانی شامل تھے جنہوں نے " لجا " کا مراٹھی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے مجھے اس مباحثے میں شریک ہونے سے منع کیا اور کہا کہ میری باتوں کو غلط معنی پہنائے جائیں گے۔ میں شش و پنج میں تھا لیکن پھر میرے والد نے مجھے کہا کہ '' اللہ کا نام لو اور جاؤ۔'' میں وہاں گیا اور الحمدللہ، محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ مباحثہ نہایت کامیاب رہا۔ یہ مباحثہ اس قدر کامیاب رہا کہ کسی ایک اخبار میں بھی اس کی خبر شایع نہیں ہوئی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ کسی ایک اخبار نے بھی اس مباحثے کی رپورٹ شایع نہیں کی۔ حالانکہ ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے وہاں موجود تھے، انڈین ایکسپریس کے نمائندے اور متعدد دیگر اخبارات اور اور خبر رساں اداروں کے نمائندے موجود تھے۔ لیکن کسی نے بھی رپورٹنگ نہیں کی کیوں؟ اس لیے کہ میں نے وہ سب کچھ نہیں کہا جو وہ سننا چاہتے تھے۔ اگر میں وہ سب کچھ کہتا تو اگلے دن بڑی بڑی سرخیاں لگتیں کہ مشہور اسلامی دانشور ڈاکٹر ذاکر نائیک نے یہ کہا اور وہ کہا

لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا لہٰذا کوئی خبر نہیں لگی۔

سوال: میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اسلام میں صرف شوہر ہی کو طلاق دینے کا حق کیوں دیا گیا ہے؟ عورت کو یہ حق کیوں حاصل نہیں؟

جواب: بہن نے سوال پوچھا ہے کہ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے سکے۔ لیکن کیا عورت کو بھی یہ حق ہے کہ وہ طلاق دے سکے؟ اس سوال کا جواب یہی ہے کہ عورت طلاق نہیں دے سکتی۔ طلاق عربی کا لفظ ہے اور یہ اسی موقع کے لیے خاص ہے جب شوہر اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرے۔ اسلام میں میاں بیوی کی علیحدگی کے پانچ طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ تو باہمی رضا مندی کا ہے۔ اگر دونوں فریق یہ فیصلہ کرلیں کہ بس ہم اور اکٹھے نہیں چل سکتے اور ہمیں علیحدہ ہو جانا چاہیے تو وہ اس رشتے کو ختم کر سکتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی مرضی سے بیوی کو چھوڑ دے۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ اس صورت میں اس مہر سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور اگر ابھی تک ادا نہیں کیا گیا تو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور جو کچھ وہ تحایف کی صورت میں دے چکا ہے وہ بھی بیوی ہی کی ملکیت رہتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ عورت اپنی مرضی سے نکاح کو ختم کرنے کا اعلان کردے۔ جی ہاں۔ بیوی بھی اس طرح کر سکتی ہے اگر یہ بات معاہدہ نکاح میں طے ہو جائے کہ بیوی کو بھی یہ حق ہوگا۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ اگر بیوی کو شوہر سے شکایات ہوں کہ وہ اس سے برا سلوک کرتا ہے یا اس کے حقوق ادا نہیں کرتا یا اس کے اخراجات کے لیے وسائل فراہم نہیں کرتا تو وہ عدالت میں جا سکتی ہے اور قاضی ان کا نکاح فسخ کر سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ شوہر کو مہر کی پوری، یا جزوی ادائیگی کا حکم بھی دے سکتا ہے۔

پانچویں اور آخری قسم خلع ہے۔ اگر بیوی محض ذاتی ناپسندیدگی کے باعث علیحدگی چاہتی ہے۔ شوہر میں کوئی خرابی نہیں مگر وہ پھر بھی علیحدہ ہونا چاہتی ہے تو وہ خود علیحدگی کی درخواست کرسکتی ہے۔ اسے خلع کہتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں بہت کم گفتگو کی جاتی ہے۔

بہرحال اسلام میں علیحدگی کی یہی اقسام ہیں۔ امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

....

سوال: خواتین کو مسجد میں جانے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

جواب: سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ خواتین کو مسجد میں جانے کی اجازت کیوں نہیں ہے اور یہ ایک مشکل سوال ہے کیونکہ پورے قرآن میں کسی بھی جگہ خواتین کو مساجد میں جانے سے منع نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی احادیث میں خواتین کو مسجد میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے۔ بعض لوگ ایک خاص حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ؛ عورت کے لیے مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے کہ وہ گھر میں نماز پڑھے اور گھر کے صحن میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے کہ کمرے میں پڑھے۔ لیکن یہ لوگ صرف ایک حدیث پر زور دے رہے ہیں اور باقی تمام احادیث کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کا ثواب ۲۷ گنا زیادہ ہے۔ ایک خاتون نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمارے شیرخوار بچے ہیں اور ہمیں گھر کا کام کاج کرنا ہوتا ہے ہم کس طرح مسجد میں آسکتی ہیں۔ تو جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عورت کے لیے مسجد کی بہ نسبت گھر میں اور گھر کے صحن کی بہ نسبت کمرے میں نماز پڑھنا بہتر ہے۔ اگر اس کے بچے چھوٹے ہیں یا کوئی اور مسئلہ ہے تو اسے وہی ثواب ملے گا جو مسجد میں نماز پڑھنے کا ہے۔

متعدد احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین کو مسجد میں آنے سے منع نہیں کیا گیا۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ''اللہ کی بندیوں کو مسجد میں آنے سے نہ روکو'' ایک اور حدیث کا مفہوم

ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے شوہروں کو کہا کہ اگر ان کی بیویاں مسجد میں جانا چاہیں تو انھیں روکا نہ جائے۔''

اس طرح کی متعدد احادیث ہیں۔ میں اس وقت تفصیل میں نہیں جانا چاہتا لیکن اصل بات یہ ہے کہ اسلام خواتین کو مسجد میں آنے سے نہیں روکتا۔ شرط یہ ہے کہ مسجد میں خواتین کے لیے انتظام اور سہولت موجود ہو کیونکہ مرد اور عورت کے اختلاط کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔

ہم جانتے ہیں کہ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں میں کیا ہوتا ہے۔ وہاں لوگ عبادت کے لیے کم اور نظر بازی کے لیے زیادہ آتے ہیں۔ لہٰذا اس کی اجازت تو اسلام نہیں دیتا۔ البتہ اگر مسجد میں خواتین کے لیے الگ انتظام ہو ان کے راستے الگ ہوں۔ وضو وغیرہ کا انتظام علیحدہ ہو، خواتین کے لیے الگ جگہ بنی ہوئی ہو جو مرد نمازیوں کے سامنے نہ ہو، تو وہ مسجد میں نماز پڑھ سکتی ہے۔

نماز میں ہم کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ خواتین کا جسمانی درجہ حرارت مردوں سے ایک زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر خواتین مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہوں گی تو لازماً ان کی توجہ بھٹکے گی۔ اسی لیے خواتین پیچھے کھڑی ہوتی ہیں۔

اگر آپ سعودی عرب جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ خواتین مساجد میں آتی ہیں اگر آپ امریکہ جائیں یا لندن جائیں تو وہاں بھی خواتین مسجد میں نماز پڑھتی ہیں۔ صرف ہندوستان اور کچھ اور ممالک ایسے ہیں جہاں خواتین مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتیں۔

یہاں تک کہ حرم شریف اور مسجد نبوی میں بھی خواتین کو آنے کی اجازت ہے۔ ہندوستان میں بھی اب بعض مساجد میں خواتین کے لیے اہتمام ہوتا ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ مزید مساجد میں بھی یہ اہتمام ہوگا۔

سوال: کیا دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے؟

جواب: سوال پوچھا گیا ہے کہ مرد کو دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضرری ہے۔ اسلام میں مرد کو دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینے کا پابند نہیں کیا گیا۔

قرآن میں ایک سے زیادہ شادیوں کے لیے ایک ہی شرط عاید کی گئی ہے اور وہ ہے عدل۔ اگر وہ اپنی بیویوں میں عدل کرسکتا ہے تو وہ ایک سے زیادہ شادیاں کرسکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر پہلی بیوی کی اجازت سے دوسری شادی کی جائے تو شوہر اور بیویوں کے تعلقات زیادہ خوشگوار رہیں گے۔

صرف ایک ہی صورت ہے جس میں مرد کو دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینی پڑتی ہے اور وہ یہ کہ اگر بیوی نے شادی کے وقت نکاح کے وقت یہ شرط رکھی ہو کہ شوہر دوسری شادی نہیں کرے گا تو پھر دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت لازمی ہو جاتی ہے۔ بصورتِ دیگر کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال: میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ فلموں، گانوں، ناولوں، رسالوں اور مخلوط تعلیم نے ہمارے دور کو جنسی انارکی کا دور بنا کر رکھ دیا ہے۔ کیا اس صورتِ حال میں یہ مناسب ہوگا کہ لڑکیوں کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کی اجازت دے دی جائے؟

جواب: بھائی نے سوال پوچھا ہے کہ اس جدید دور میں جب کہ جنسی فلموں وغیرہ کی اس قدر بہتات ہے، کیا یہ مناسب ہوگا کہ بیٹیوں کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کی اجازت دی جائے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، والدین اس سلسلے میں مشورہ دے سکتے ہیں رہنمائی کر سکتے ہیں لیکن زبردستی نہیں کر سکتے۔ والدین یقیناً اپنی بیٹیوں کو اس سلسلے میں اچھا مشورہ دے سکتے

ہیں لیکن اس بات کی بھی تو کوئی ضمانت نہیں کہ والدین ہمیشہ درست ہوں گے۔

بہرحال اسلامی حکم یہی ہے کہ والدین شادی کے سلسلے میں بیٹی کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔اس پر زبردستی نہیں کر سکتے کیونکہ بالآخر بیٹی نے ہی شوہر کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اس کے والدین نے نہیں۔

سوال: میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اسلامی قانون کے مطابق بچے کا ولی یا سرپرست صرف باپ ہی کیوں ہوسکتا ہے؟

جواب: بہن نے سوال پوچھا ہے کہ مسلم پرسنل لا کے مطابق صرف باپ ہی اولاد کا سرپرست بن سکتا ہے۔ایسا کیوں ہے؟

میری بہن، ایسا نہیں ہے۔اسلامی شریعت کے مطابق جب تک بچہ چھوٹا ہوتا ہے یعنی تقریباً ۷ سال کی عمر تک اس کی سرپرست ماں ہوتی ہے۔کیونکہ ابتدائی عمر میں باپ سے زیادہ ذمہ داری ماں کی ہوتی ہے۔

اس کے بعد یہ ذمہ داری باپ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔اور بالآخر جب بچہ بالغ ہوجاتا ہے تو یہ کلی طور پر اس کی اپنی مرضی ہوتی ہے کہ وہ ماں کے ساتھ رہنا چاہتا ہے یا باپ کے ساتھ۔

امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا قرآن کلامِ خداوندی ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

سید امتیاز احمد

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۱۴۲۸ھ ۲۰۰۷ء

کتاب : کیا قرآن کلام خداوندی ہے؟

مصنف : ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم : سید امتیاز احمد

اہتمام : دار النوادر، لاہور

مطبع : موٹر وے پریس، لاہور

قیمت : ۵۰ روپے

ترتیب

حصہ اوّل

حصہ دوم

☆......☆......☆

خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

محترم مہمانِ خصوصی جناب رفیق داد صاحب، دیگر مہمانانِ گرامی قدر، محترم بزرگو بھائیو اور بہنو! میں آپ سب کو اسلامی طریقہ سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے:

''کیا قرآن کلامِ الٰہی ہے؟''

بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حضرت محمد ﷺ مذہب اسلام کے بانی تھے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو اس وقت سے موجود ہے جب پہلے انسان نے کرۂ ارض پر قدم رکھا تھا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے زمین پر متعدد انبیائے کرام بھیجے اور ان کے ذریعے اپنا پیغام وحی کی صورت میں ہم تک پہنچایا۔ تمام گزشتہ انبیائے کرام کسی خاص قوم یا علاقے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے اور ان کا پیغام زمانی لحاظ سے بھی ایک خاص عرصے کے لیے تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان انبیائے کرام کو معجزات عطا کیے گئے، مثال کے طور پر سمندر میں راستہ بن جانا یا مردے کو زندہ کر دینا، ان معجزات کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ یہ اس دور کے لوگوں کے لیے تو دلیل بن سکتے ہیں لیکن آج یہ ممکن نہیں کہ ان معجزات کی جانچ پرکھ کر کے

انھیں ثابت کیا جا سکے۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے آخری پیغمبر تھے۔ جنھیں پوری بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا تھا۔ ان کی نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھی۔ قرآنِ مجید کی سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۱۰۷]

''اے نبیؐ! ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

چونکہ حضرت محمد ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری پیغام بر تھے اور چونکہ ان کا پیغام پوری انسانیت کے لیے اور ہر زمانے کے لیے تھا، لہٰذا انھیں معجزہ بھی وہ عطا کیا جانا چاہیے تھا جو ہمیشہ باقی رہنے والا اور ہر زمانے کے لیے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے معجزات پر زور نہیں دیا۔ حالانکہ ان سے بہت سے معجزات کا صدور ہوا جن کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔ ہم مسلمان ان معجزات پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ہم ایک ہی معجزے کو فخریہ بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قرآن کی صورت میں عطا فرمایا تھا۔ یہ ایک مستقل معجزہ ہے۔ چودہ سو سال سے اس کا اعجاز جاری و ساری ہے۔ آج بھی یہ معجزہ ہمارے سامنے ہے، آج بھی اسے پرکھا جا سکتا ہے، اور آئندہ بھی۔

ایک بات جس پر مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہی متفق ہیں وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کو ایک محمد بن عبداللہ ﷺ نامی شخص نے ساتویں صدی عیسوی میں پہلی بار مکہ نام کے شہر میں بیان کیا تھا۔

قرآنِ مجید کا ذریعہ اور منبع کیا ہے؟ اس بارے میں بنیادی طور پر تین نظریات پائے جاتے ہیں۔

- پہلا نظریہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ قرآن کے مصنف ہیں اور قرآن شعوری یا لاشعوری طور پر ان کی اپنی ہی تصنیف ہے۔
- دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے قرآن دوسرے انسانی ذرائع کی مدد

سے یا دیگر مذہبی متون کی مدد سے تحریر کیا ہے۔

- تیسرا ممکنہ نظریہ یہ ہے کہ قرآن انسانی تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ وحی کی صورت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

آیئے ہم ان تینوں نظریات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

پہلا ممکنہ مفروضہ یہ ہے کہ قرآن شعوری، لاشعوری یا تحت الشعوری طور پر خود نبی اکرمؐ کی تصنیف ہے اور انھوں نے خود یہ کتاب تحریر کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بڑے اور عظیم الشان کام کی تخلیق سے دستبردار ہوتا ہے تو اس کے اس دعوے کو جھٹلانا ویسے ہی ایک غیر منطقی بات بن جاتی ہے، لیکن مستشرقین بالعموم قرآن کے حوالے سے بات کرتے ہوئے یہی کرتے ہیں۔ وہ قرآن کی اصل پر شکوک کا اظہار کرتے ہوئے یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی قرآن کے مصنف ہیں۔

حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں فرمایا۔ انھوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ قرآن وحی خداوندی ہے، منزل من اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے برعکس دعویٰ کرنا ایک غیر منطقی بات ہے اور دراصل یہ کہنا ہے کہ (نعوذ باللہ من ذالک) رسول اللہ ﷺ سچ نہیں بول رہے تھے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ نبوت سے پہلے ان کی زندگی چالیس برس کے عرصے پر محیط ہے۔ اور اس پورے عرصے کے دوران انھیں ایک متقی، پرہیزگار، شریف اور باکردار شخصیت تسلیم کیا جاتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اہل مکہ انھیں صادق اور امین کے القاب سے پکارا کرتے تھے، دوست دشمن سب ان کی سچائی اور امانت داری پر متفق تھے۔

حتیٰ کہ وہ لوگ، جنھوں نے ان کے دعوائے نبوت کو تسلیم نہیں کیا تھا وہ بھی اپنی امانتیں انھی کے پاس رکھوایا کرتے تھے۔ نبوت کے اعلان کے بعد بھی آپ ﷺ کی امانت داری پر ان کا اعتماد اسی طرح برقرار تھا۔

اس صورت میں یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ اس قدر ایمان دار اور سچا شخص ایک جھوٹا دعویٰ کرے (نعوذ باللہ) اور کہے کہ وہ پیغمبر ہے، اس پر وحی نازل ہوتی ہے، حالانکہ دراصل ایسا نہ ہو۔ بھلا وہ ایسا کیوں کر کریں گے۔

کچھ مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے ایسا مادی فوائد کے حصول کے لیے کیا تھا۔ دنیاوی مفادات حاصل کرنے کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ (نعوذ باللہ) یقیناً کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دولت اور مفادات کے حصول کی خاطر نبوت یا ولایت کا جھوٹا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ ایسے لوگ نہایت پر تعیش زندگی گزارتے ہیں۔ ایسی مثالیں دنیا بھر میں موجود ہیں۔ خصوصاً ہمارے ملک انڈیا میں تو ایسی مثالیں بہت ہی زیادہ ہیں۔

لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اعلانِ نبوت سے قبل ایک نسبتاً بہتر معاشی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا نکاح ایک امیر کاروباری خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا۔ نکاح کے وقت آپ ﷺ کی عمر صرف ۲۵ برس تھی۔ یعنی اعلانِ نبوت سے پندرہ سال پہلے۔

اعلانِ نبوت کے بعد آپ ﷺ کے معاشی حالات کبھی قابل رشک نہیں رہے۔

امام النووی رحمہ اللہ کی کتاب ریاض الصالحین کی حدیث نمبر ۴۹۲ میں کہا گیا ہے:

''امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو دو ماہ تک ہمارے چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔''

یعنی دو دو ماہ تک حضرت نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اہل خانہ پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے اور صرف پانی اور کھجوروں پر گزارا فرمایا کرتے تھے یا بعض اوقات بکری کا دودھ جو اہل مدینہ پیش کردیا کرتے تھے، اس سے گزر اوقات ہوتی تھی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی محدود اور عارضی وقفے کے دوران ایسا ہوا ہو۔ بلکہ حضرتِ محمد ﷺ کا طرزِ زندگی ہی ایسا تھا۔ ریاض الصالحین کی ایک اور حدیث ہے:

''حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو تحائف

وصول ہوتے تو آپ فوراً انھیں غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے، کبھی اپنے لیے کچھ بچا کر نہیں رکھتے تھے۔''

اس صورتِ حال میں نبی کریم ﷺ کے حوالے سے یہ کس طرح سوچا جاسکتا ہے کہ ''نعوذ باللہ'' آپ ﷺ نے مادی فواید حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولا ہوگا۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾ [البقرۃ: ۷۹]

''پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں، پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کرلیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔''

یہ آیت انھی لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے ہاتھوں سے لکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دراصل یہ بات وحی الٰہی ہے۔ یا وہ وحی خداوندی میں کسی طرح کی تبدیلی کرتے ہیں۔

اگر اس بات کا ذرا سا بھی امکان ہوتا کہ قرآن نبی کریم ﷺ کی تحریر ہے، یا اس میں نبی کریم ﷺ نے کوئی بھی تبدیلی کی ہے (نعوذ باللہ) تو کیا یہ آیت قرآن میں موجود ہوتی؟ ہرگز نہیں، کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوتا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ خود اپنے آپ کو بُرا کہہ رہے ہوں۔

کچھ لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ، شان وشوکت اور جاہ وحکومت کے لیے کیا تھا۔

لیکن وہ لوگ جنھیں جاہ وحشمت، شان وشوکت اور قوت ودولت کی خواہش ہوتی ہے، ان کی زندگیاں کس طرح کی ہوتی ہیں؟ وہ لوگ عالیشان محلوں میں رہتے ہیں، زرق برق

لباس زیب تن کرتے ہیں۔ان کے اردگرد دربان ہوتے ہیں۔نوکر چاکر ہوتے ہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی بھی ہمارے سامنے ہے کہ وہ اپنی بکری کا دودھ بھی خود دوہتے تھے۔اپنے کپڑے خود سی لیا کرتے تھے۔اپنی جوتی کو خود پیوند لگالیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر کے دیگر کام بھی خود فرمالیا کرتے تھے۔ان کا طرزِ زیست سادگی اور انکسار کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھا۔

آپ ﷺ زمین پر تشریف فرما ہوتے تھے۔بغیر محافظوں کے رہتے۔تنہا بازار میں خریداری کے لیے چلے جاتے۔اگر کوئی غریب ترین شخص بھی آپؐ کو مدعو کرتا تو آپؐ اس کی دعوت ردّ نہ فرماتے اور جو کچھ بھی دعوت میں موجود ہوتا برضا و رغبت تناول فرماتے۔ یہاں تک کہ خود قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾ [التوبة : ٦١]

’’ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی ﷺ کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔کہو، وہ تمہاری بھلائی کے لیے ایسا ہے۔ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے ایمان دار ہیں۔اور جو لوگ اللہ کے رسولؐ کو دکھ دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک سزا ہے۔‘‘

ایک دفعہ کفار کی جانب سے عتبہ نامی ایک سردار نمائندہ بن کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ ’’اگر تم نے نبوت کا دعویٰ دولت کے لیے کیا ہے تو ہم تمہارے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، اگر حکومت کے لیے کیا ہے تو ہم تمھیں عربوں کا بادشاہ بنا لیتے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ تم پیغام توحید سے دستبردار ہو جاؤ۔‘‘ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات ماننے سے انکار فرما دیا۔

اسی طرح ایک دفعہ خود رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب نے بھی کوشش کی کہ آپؐ اپنا پیغام پھیلانے سے باز آ جائیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے جواب دیا:

"اے چچا، اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں، پھر بھی میں یہ جدوجہد نہیں چھوڑوں گا، یہاں تک کہ مجھے موت آ جائے۔"

ایک ایسے شخص کو اس قدر تکلیف اور قربانی والی زندگی گزارنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ چاہتے تو اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتے تھے۔

مزید برآں، آپؐ کی شخصیت میں اس قدر انکسار اور شرافت تھی کہ آپ ﷺ نے اپنی ہر کامیابی کے موقع پر یہی ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، میری ذاتی صلاحیت کی وجہ سے نہیں ہے۔

بعض مستشرقین نے ایک نیا مفروضہ پیش کر دیا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دراصل (نعوذ باللہ) ایک دماغی عارضے میں مبتلا تھے۔ اس عارضے کو (Mythomania) کہتے ہیں اور اس میں مبتلا شخص جھوٹ بولتا ہے، لیکن اسے خود اپنے جھوٹ پر پورا یقین ہوتا ہے۔ لہٰذا ان مستشرقین کا کہنا (نعوذ باللہ) یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جھوٹ بولتے تھے لیکن انہیں خود اس پر پورا یقین ہوتا تھا۔

اگر ایک ماہر نفسیات نے Mythomania میں مبتلا مریض کا علاج کرنا ہو تو وہ کیا کرے گا؟ اسے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ مریض کو حقایق کا سامنا کرنے پر مجبور کر دے۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ وہ شاہِ انگلستان ہے۔ معالج اسے یہ نہیں کہے گا کہ تم دیوانے ہو چکے ہو بلکہ وہ اس سے سوال کرے گا کہ اچھا اگر تم شاہِ انگلستان ہو تو بتاؤ تمھاری ملکہ کہاں ہے؟ تمہارے وزراء اور درباری کہاں ہیں؟ دربان اور محافظ کہاں ہیں؟ معالج جب حقایق اس کے سامنے لاتا جائے گا تو بالآخر Mythomania کا مریض خود ہی کہہ دے گا کہ "میرا خیال ہے کہ میں شاہِ انگلستان نہیں ہوں۔"

یہی کام قرآن کرتا ہے، قرآن لوگوں کے سامنے حقایق رکھتا ہے پھران سے سوالات کرتا ہے۔ یعنی درحقیقت پیغمبر اسلام ﷺ (نعوذ باللہ) Mythomaniac نہیں تھے بلکہ درحقیقت پیغمبر ﷺ کا انکار کرنے والے اس عارضے میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ پیغمبر ﷺ کی دعوت کا انکار کررہے ہیں اور اپنے اس غلط موقف پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ قرآن ان لوگوں کے سامنے سوالات رکھتا ہے کہ اگر تمھیں شک ہے، اگر تم اسے حق نہیں سمجھتے تو پھر ایسا کرو...... اور ایسا کرو، یا اگر قرآن اللہ کی جانب سے نہ ہوتا پھر یوں ہوتا۔ قرآن ایسے متعدد سوالات کرتا ہے، جن کے بارے میں ہم ان شاء اللہ آگے گفتگو کریں گے۔

کچھ لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن دراصل ایک مذہبی واہمہ ہے یا لاشعوری خیالات کا مجموعہ ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ، غیر شعوری طور پر اپنے خیالات قرآن کی صورت میں پیش کردیتے تھے۔ یہ لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ذہنی توازن ہی درست نہیں تھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

یہ لوگ ایک بنیادی حقیقت نظر انداز کردیتے ہیں اور وہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ایک ہی بار نازل نہیں ہوا تھا۔ قرآن کا عرصۂ نزول ۲۳ برس کے طویل عرصے پر مشتمل ہے۔ اگر قرآن رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی بار پیش کیا ہوتا تو ان معترضین کو یہ بات کرنے کا موقع مل بھی سکتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن کا نزول ۲۳ سال کے عرصے میں بہ تدریج ہوا تھا۔ اگر یہ لاشعوری خیالات کا مجموعہ ہوتا تو اس میں یکسانیت اور روانی کا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر ان لوگوں کے دعوے کے مطابق قرآنِ حکیم آنحضرتؐ کے تحت الشعوری خیالات اور آپؐ کے ابنارمل دماغ کا نتیجۂ فکر ہوتا (نعوذ باللہ) تو اس میں تضاد موجود ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ ۲۳ سال تک مسلسل ایک بات کرنا، ایک دعویٰ کرنا اور اس پر مسلسل قایم رہنا ممکن ہی نہیں ہے، اگر یہ دعویٰ محض لاشعوری خیالات کا نتیجہ ہوتا۔ قرآن خود ایسے کسی دعوے کی تردید کے لیے کافی ثبوت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن متعدد تاریخی واقعات کا حوالہ دیتا ہے جو اُس وقت کسی کے علم میں نہیں تھے لیکن درست ثابت ہوئے۔

اسی طرح قرآنِ مجید متعدد پیش گوئیاں بھی کرتا ہے اور یہ تمام پیش گوئیاں حرف بہ حرف پوری ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایسے متعدد سائنسی حقایق کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود ہے جو اُس وقت لوگوں کے علم میں ہی نہیں تھے لیکن آج ان کی تصدیق ہو چکی ہے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ لاشعوری خیالات کی مدد سے اس قسم کی پیش گوئیاں کی جا سکیں۔

خود قرآن اس بات کی گواہی سورۂ اعراف میں اس طرح دیتا ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ ﴾

[الاعراف: ١٨٤]

"اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو (بُرا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔"

اسی طرح سورۃ القلم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ○ ﴾ [القلم: ٢]

"تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔"

مزید فرمایا گیا:

﴿ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ○ ﴾ [التکویر: ٢٢]

"اور (اے اہلِ مکہ) تمھارا رفیق مجنون نہیں ہے۔"

لہٰذا کوئی شخص جھوٹ کس طرح بولے گا؟

یہاں تمام نظریات کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن وقفۂ سوالات کے دوران آپ سوالات کر سکتے ہیں اور ان شاء اللہ میں جواب دینے کی پوری کوشش کروں گا۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے قرآن دیگر مذہبی کتابوں کی مدد سے یا انسانی ذرائع کی مدد سے تحریر کیا۔ (نعوذ باللہ) اس نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لیے تو ایک تاریخی حقیقت پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے محبوب پیغمبر حضرت

محمد مصطفیٰ ﷺ پڑھنا لکھنا جانتے ہی نہیں تھے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ [العنکبوت: ٤٨]

''(اے نبی ﷺ!) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں تھا کہ لوگ قرآن کے بارے میں شک کریں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ربّ حکیم نے اپنی حکمت کاملہ سے کام لیتے ہوئے اپنے آخری پیغمبر ﷺ کو اُمّی یعنی رسمی تعلیم سے ناآشنا ہونے کی حیثیت سے مبعوث فرمایا۔

بصورتِ دیگر یہ بات ضرور کی جاتی، باطل پرست لوگ، غیر سنجیدہ لوگ ایسی باتیں ضرور کرتے یا انھیں ایسی باتیں کرنے کا موقع ضرور مل جاتا۔ اگر رسول اللہ ﷺ، تعلیم یافتہ ہوتے تو منفی ذہنیت رکھنے والے لوگ ضرور یہ دعویٰ کرنے کی کوشش کرتے کہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ نے کسی انسانی ذریعہ سے یہ معلومات حاصل کر کے قرآن کی صورت میں پیش کردی ہیں۔

لیکن الحمدللہ ان معترضین کے پاس ایسی کوئی گنجائش نہیں۔ اس مفروضے کی حیثیت پرکاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ [السجدہ: ۳۔۱]

''ا۔ل۔م۔ اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے

رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔''

قرآن کا اسلوب بیان دوسرے مذہبی صحیفوں کے متن سے بالکل مختلف ہے۔ دیگر مذہبی کتابیں بالعموم داستانی انداز لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ کسی انسان کی تحریر کردہ داستان کا طرزِ آغاز کیا ہوتا ہے؟ بالعموم یہ اس طرح شروع ہوتی ہیں۔

''ایک دفعہ کا ذکر ہے..................''

اسی طرح اگر آپ دیگر مذہبی متون کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا آغاز بھی کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔

''سب سے پہلے خدا تھا، اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا..................''

یا یہ کہ:

''سب سے پہلے لفظ تھا..................''

لیکن قرآن کا اسلوب اس انسانی اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ اسی طرح اگر آپ دیگر مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں ایک خاص ترتیب سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں، اگر کسی شخص کا ذکر ہے تو اس کے خاندان کا ذکر ہوگا، اس کی اولاد کا بیان ہوگا اور اسی طرح بالترتیب واقعات بیان ہوتے چلے جائیں گے۔ پہلا باب پھر دوسرا باب، اسی طرح آخر تک ترتیب ہوگی۔

قرآن بھی لوگوں کے بارے میں، ان کے خاندانوں کے بارے میں بات کرتا ہے لیکن قرآنی اسلوب، انسانی اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ کسی انسان کی لکھی ہوئی کہانیوں کی کتاب سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن اپنا ایک منفرد اسلوبِ بیان رکھتا ہے۔ یہ ایک منفرد کتاب ہے۔

جب لوگ قرآن کو انسانی تحریر ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر ایک نیا دعویٰ لے کر سامنے آجاتے ہیں کہ یہ دھوکہ ہے۔ انھیں اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کوئی ایک

معمولی سا ثبوت بھی نہیں ملتا۔ مگر یہ لوگ پھر بھی اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں اور خود کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں کی مثال کچھ اس طرح ہے کہ فرض کیجیے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ فلاں شخص میرا دشمن ہے۔ میرے پاس بات کے لیے کوئی ثبوت یا شہادت بھی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے اس بات پر پورا یقین ہے، لہٰذا جب بھی وہ شخص میرے سامنے آتا ہے میں اس کے ساتھ دشمنوں والا رویہ ہی اختیار کرتا ہوں۔ جوابی طور پر اس کا رویہ بھی میرے ساتھ خراب ہو جاتا ہے، بالآخر وہ بھی مجھ سے دشمنوں کی طرح پیش آنے لگتا ہے اور پھر میں کہتا ہوں:

"دیکھا! میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ شخص میرا دشمن ہے کیوں کہ وہ مجھ سے دشمنوں کی طرح پیش آرہا ہے۔"

سو ہوتا یہ ہے کہ لوگ ایک غلط بات مان لیتے ہیں اور پھر بیوقوفوں کی طرح اس پر اڑے رہتے ہیں۔ قرآن کا کہنا ہے کہ وحی عقل انسانی کے مطابق ہے لیکن بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ متونِ مقدسہ عقل انسانی سے ماورا ہیں۔ اگر یہ متونِ مقدسہ واقعی ہماری عقل و فہم سے ماورا ہیں تو پھر انھیں سمجھنا کیوں کر ممکن ہوگا؟ یہ کس طرح معلوم کیا جاسکے گا کہ کون سا مذہبی متن واقعی وحی خداوندی ہے اور کون سا نہیں؟

قرآن تو خود اپنے قاری کو تفکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن مکالمے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بہت سے مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ مذہبی مباحث سے بچنا چاہیے اور جہاں معاملہ مذہب کا ہو، کسی مباحثے سے پرہیز ہی بہتر ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا یہ رویّہ غلط ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۲۵]

"(اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔"

چناں چہ ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ عربی لفظ ﴿ قالوا ﴾ قرآنِ مجید میں ۳۳۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کا مطلب ہے "وہ کہتے ہیں" اور اسی طرح لفظ ﴿ قل ﴾ بھی اتنی ہی مرتبہ یعنی ۳۳۲ مرتبہ قرآن میں آیا ہے، اس لفظ کا مطلب ہے "کہو"۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مکالمے اور مباحثے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

ایک نظریہ ہے جسے "Exhausting the alternatives" کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی دعوے کے متبادل تمام دعوے ختم کر دینا، متبادل صورتیں رد کر دینا، اس طرح اصل دعویٰ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ کلامِ خداوندی ہے، اگر تم یہ بات تسلیم نہیں کرتے تو بتاؤ یہ کیا ہے؟ آپ متبادل دعویٰ کرتے ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں یہ رسول اللہ ﷺ کی تحریر ہے، قرآن اس بات کو غلط ثابت کر دیتا ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ نے مادی مفادات کے لیے قرآن پیش کیا تھا اور یہ دعویٰ بھی بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف متبادل صورتیں پیش ہوتی اور ردّ ہوتی چلی جاتی ہیں اور تمام متبادل دعوے ردّ ہونے کے بعد اس سوال کا ایک ہی جواب باقی رہ جاتا ہے کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے، کلامِ خداوندی ہے کیوں کہ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ کیا ہے؟

سورۂ جاثیہ میں فرمایا گیا:

﴿ حٰمٓ ○ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○ ﴾

[الجاثیہ : ۲۔۱]

"ح۔م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔"

یہ بات قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات پر کی گئی ہے کہ قرآن کلامِ خداوندی ہے۔

یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الانعام: ۱۹]

''اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمھیں اور جس کو یہ پہنچے، سب کو متنبہ کردوں۔''

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ﴾ [یوسف: ۱۰۲]

''اے نبیؐ! یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں۔''

﴿ طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ ﴾ [طٰہٰ: ۱۔۳]

''طٰہٰ۔ ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاددہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔''

﴿ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝ ﴾ [النمل: ٦]

''بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو۔''

سورۂ سجدہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ [السجدہ: ۱۔۳]

''ا۔ل۔م۔ اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔''

اسی طرح سورۂ یٰسین میں فرمایا گیا:

﴿ يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ

مُّسْتَقِيْمٍ ٥ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ٥ ﴾ [یٰسٓ : ۵۔۱]

''یٰسٓ۔ قسم ہے قرآنِ حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو (اور یہ قرآن) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے۔''

﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ٥ ﴾ [الزمر : ۱]

''اس کتاب کا نزول، اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔''

﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ٥ ﴾ [الجاثیہ : ۲]

''اس کتاب کا نزول، اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔''

﴿ اَلرَّحْمٰنُ ٥ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ٥ ﴾ [الرحمٰن : ۲۔۱]

''نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔''

﴿ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ٥ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ٥ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ٥ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ ﴾ [الواقعہ : ۸۰۔۷۷]

''یہ بلند پایہ قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔''

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ٥ ﴾ [الدھر : ۲۳]

''(اے نبیؐ!) ہم نے ہی یہ قرآن تم پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔''

اسی طرح متعدد دیگر مقامات پر بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن دراصل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بتاؤ یہ کیا ہے؟

سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سائنس کی دنیا کا ایک اپنا طریقۂ کار ہے۔ کسی نئے نظریے کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہوگا کہ اگر اس کا کوئی تردیدی امتحان نہیں ہو سکتا تو وہ اس نظریے پر توجہ ہی نہیں دیں گے۔

تفصیل میں جانے کا وقت میرے پاس نہیں ہے۔ مختصراً سمجھ لیجیے کہ یہ نظریہ تردیدیت (Falsification) کہلاتا ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ اگر آپ نئے نظریے کا Filsifi-

cation test- نہیں کر سکتے تو پھر ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔

یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں جب آئن سٹائن نے ایک نیا نظریہ پیش کیا تو ساتھ ہی اس نے تین Falsification Test بھی پیش کر دیے کہ اگر میرا نظریہ درست نہیں ہے تو ان تین طریقوں سے ان نظریے کو غلط ثابت کر دیا جائے، یعنی یہ تین امتحان ایسے ہیں جن سے نظریے کے درست یا غلط ہونے کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

اور سائنسدانوں نے چھ برس تک غور و فکر کرنے کے بعد تسلیم کیا کہ ہاں البرٹ آئن سٹائن کا نظریہ درست ہے۔ اس طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کوئی عظیم شخصیت ہے لیکن یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ نظریہ قابل غور اور قابل توجہ ہے۔

قرآن کے معاملے میں ایسے متعدد ''تردیدی امتحان'' (Falsification Test) موجود ہیں۔ اگر آئندہ آپ کی کسی سے مذہب کے بارے میں گفتگو ہو تو ایک سوال ضرور کریں کہ ''کیا اُس کے پاس کوئی ایسا امتحان ہے جس کی مدد سے اس کے مذہب کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہو؟''

یقین کیجیے میں نے متعدد لوگوں سے یہ سوال کیا ہے اور آج تک کسی نے یہ جواب نہیں دیا کہ ہاں میرے پاس اپنے مذہب کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی امتحان موجود ہے۔

لیکن قرآن کا معاملہ مختلف ہے۔ قرآن ایسے متعدد پیمانے، ایسے تردیدی امتحان پیش کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو صرف ماضی کے لیے تھے جب کہ کچھ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہیں۔

میں آپ کے سامنے چند مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

رسول اللہ ﷺ کے ایک چچا کا نام ابولہب تھا۔ اس کا شمار پیغمبر اسلام ﷺ کے شدید ترین مخالفین میں ہوتا تھا۔ اس کی عادت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا تعاقب کرتا، اور جب بھی رسول اللہ ﷺ کو کسی اجنبی سے بات کرتے دیکھتا تو ان کے جانے کے بعد فوراً اس سے پوچھتا کہ محمد بن عبداللہ ﷺ نے تم سے کیا بات کی ہے؟ اور اس کے الٹ باتیں

کرتا۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے کہا ہوتا کہ دن ہے تو یہ کہتا کہ رات ہے۔ یعنی ہر بات کی مخالفت کرتا۔

قرآنِ مجید میں سورۃ لہب نام کی ایک پوری سورۃ موجود ہے۔ اس سورۃ میں فرمایا گیا ہے کہ ابولہب اور اس کی بیوی کو ان کے اعمال کے سبب جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔ گویا بالواسطہ طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ وہ کبھی مسلمان نہیں ہوگا، کافر ہی رہے گا۔

یہ سورۃ ابولہب کی موت سے کوئی دس برس پہلے نازل ہوئی تھی۔ یعنی اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد دس سال تک ابولہب زندہ رہا۔ اس عرصے میں ابولہب کے دوستوں میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے، جو خود بھی اس کی طرح اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے مخالف تھے۔

چوں کہ ابولہب رسول اللہ ﷺ کی ہر بات کی مخالفت کرتا تھا، ہر بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا، لہٰذا اسے صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیتا۔ اسے اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی ضرورت نہ تھی، مسلمانوں والی عادات اپنانا لازم نہ تھا، صرف قبولِ اسلام کا اعلان کر کے وہ رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) غلط ثابت کر سکتا تھا۔ وہ دعویٰ کرتا کہ میں مسلمان ہوں اور قرآن کو غلط قرار دے دیتا۔ یہ کام اس کے لیے انتہائی آسان تھا۔ وہ پہلے بھی کذب بیانی سے کام لیتا تھا۔ ایک اضافی جھوٹ ہی تو بولنا تھا۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے رسول اللہ ﷺ اسے خود دعوت دے رہے ہوں کہ تم میرے دشمن ہو، مجھے غلط ثابت کرنا چاہتے ہو تو آؤ! اسلام قبول کرنے کا اعلان کرو اور مجھے غلط ثابت کر دو!

یہ کام انتہائی آسان تھا لیکن وہ نہیں کر پایا۔ یہ بات واضح ہے کہ کوئی انسان اپنی کتاب میں ایسا دعویٰ کرنے کی، ایسا بیان دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ یقیناً کلامِ خداوندی ہی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال سورۂ بقرہ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ [البقرة: ۹۵-۹٤]

"ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لیے ہی مخصوص ہے، تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو، یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے، اس لیے کہ اپنے ہاتھوں سے انھوں نے جو کچھ کما کر وہاں بھیجا ہے، اس کا اقتضا یہی ہے (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں) اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔"

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک گفتگو کے درمیان میں یہودیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آخرت کا گھر یعنی جنت صرف انھی کے لیے ہے، کسی اور کے لیے نہیں، اس کے بعد مذکورہ آیت نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ اگر واقعی جنت صرف یہودیوں کے لیے مخصوص ہے اور وہی جنت میں جائیں گے تو پھر تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو، مرنے کی خواہش کرو۔

اس موقع پر صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ یہودیوں میں سے ایک شخص سامنے آتا اور کہتا کہ ہاں میں مرنے کی تمنا رکھتا ہوں۔ صرف دعویٰ ہی تو کرنا تھا۔ واقعی مرنا ضروری نہیں تھا صرف زبانی کہنا تھا کہ میں مرنا چاہتا ہوں اور وہ قرآنی بیان کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ لیکن کوئی یہودی آگے نہیں بڑھا، کسی نے یہ بیان نہیں دیا کہ ہاں میں موت کی تمنا رکھتا ہوں۔

یہ بڑا واضح تردیدی امتحان Falsification Test تھا جو قرآن نے پیش کیا۔

لیکن ہوسکتا ہے آپ مجھ سے کہیں کہ یہ تمام باتیں ماضی کی ہیں، یہ امتحان لینا تو ماضی میں ہی ممکن تھا۔ کیا آج کے لیے بھی کوئی ایسا امتحان موجود ہے جس کی مدد سے قرآن کو (معاذ اللہ) غلط ثابت کیا جاسکے۔

یقیناً ایسے Falsification Test بھی ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہیں جو آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے کے لیے بھی تھے، آج کے لیے بھی کارآمد ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی رہیں گے۔ مثال کے طور پر، بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کلامِ خداوندی نہیں ہے۔ قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں کہتا ہے:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾

[بنی اسرائیل : ۸۸]

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے، چاہے وہ سب کے سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔"

اس آیت کریمہ میں ایک چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر پوری بنی نوع انسان اور سارے جنات مل کر قرآن جیسی ایک کتاب بنانا چاہیں تو وہ کامیاب نہیں ہوسکتے، خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن کا معاملہ یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن روئے زمین پر عربی زبان وادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

قرآنی عربی اس قدر واضح، قابل فہم، معجزاتی اور ناقابل تقلید ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اور اس کے باوجود قرآن کا ہر بیان حق اور سچائی کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ زبان وبیان کا اعلیٰ ترین اسلوب ہے جو اس کو وحی خداوندی ثابت کرتا ہے، قرآن کی ہر آیت بیک وقت ایک عام آدمی پر بھی اثر کرتی ہے اور ایک پڑھے لکھے عالم فاضل آدمی کو بھی متاثر کرتی ہے۔ حالاں کہ قرآن شاعری بھی نہیں۔ یہ وزن اور قافیہ ردیف سے

بھی کام نہیں لیتا۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک معجزاتی کتاب ہے۔

یہ چیلنج قرآن میں دوبارہ، ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

﴿ اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَل لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْیَاْتُوا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖ اِنْ كَانُوْا صَادِقِیْنَ ۝ ﴾ [الطور: ٣٣-٣٤]

''کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے، اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں۔''

اس آیت کریمہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس امتحان کو لوگوں کے لیے مزید آسان بنا دیا گیا ہے۔ بلکہ سورۂ ھود میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ ﴾ [ھود: ١٣]

''کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو، اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمھارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انھیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔''

لیکن ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی یہ چیلنج پورا نہ کر سکا اور قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر پیش نہیں کر سکا۔

سورۂ یونس میں یہ امتحان مزید آسان بنا کر پیش کیا گیا۔ وہاں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ ﴾ [یونس: ٣٨]

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے خود اسے تصنیف کر لیا ہے؟ کہو، اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر

جس جس کو بلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلالو۔''

لیکن یہ لوگ اتنا بھی نہیں کر پائے۔ کوئی ایک سورۃ بنا کر نہیں لا سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس Falsification Test کو آسان ترین صورت میں بھی پیش کر دیا۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ٥ ﴾ [البقرة: ٢٤-٢٣]

''اگر تمھیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورۃ بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلالو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر، جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔''

قرآن نے چیلنج دیا کہ اس جیسی کتاب بنا کر دکھاؤ، پھر آسان کر دیا کہ چلو دس سورتیں ایسی بنا کر لے آؤ، پھر اس چیلنج کو آسان تر بنا کر فرمایا کہ ایک سورۃ بنا کر دکھا دو۔ یہاں آسان ترین معاملہ کر دیا گیا ہے کہ چلو اس سے ملتی جلتی ایک سورۃ ہی بنا لاؤ۔ اس جیسی نہیں اس کے مانند ایک سورۃ ہی لے آؤ۔ دیگر جگہوں پر لفظ ﴿ مِثْلِهِ ﴾ استعمال ہوا تھا۔ یہاں فرمایا گیا: ﴿ مِنْ مِثْلِهِ ﴾ یعنی ''اس سے ملتی جلتی''۔ لیکن پھر بھی کفارِ عرب بری طرح ناکام ہوئے۔

عربی زبان وادب، اپنی فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے لحاظ سے نزولِ قرآن کے زمانے میں اپنے عروج پر تھے۔ متعدد کفارِ عرب نے کوشش کی اور بری طرح ناکام رہے۔

اس قسم کی بعض کوششیں تاریخ کی کتابوں میں محفوظ رہ گئیں اور آج بھی لوگ انھیں پڑھ پڑھ کر ہنستے ہیں۔

یہ چیلنج آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے دیا گیا تھا اور آج بھی موجود ہے۔ ایک کروڑ چالیس لاکھ قبطی عیسائی موجود ہیں۔ یہ لوگ نسلاً عرب ہیں۔ ان کی مادری زبان عربی ہے۔ یہ چیلنج ان کے سامنے بھی موجود ہے۔

اگر وہ بھی چاہتے ہیں کہ قرآن کو غلط ثابت کر دیں (معاذ اللہ) تو انھیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ قرآن جیسی ایک سورۃ بنا کر دکھا دیں۔ اور اگر آپ غور کریں تو صورت یہ ہے کہ قرآن کی بعض سورتیں انتہائی مختصر ہیں اور چند الفاظ پر ہی مشتمل ہیں، لیکن نہ تو آج تک کوئی یہ چیلنج قبول کر سکا ہے اور نہ ہی کبھی آئندہ قبول کر پائے گا۔ ان شاء اللہ۔

ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کوئی یہ کہے کہ عربی میری مادری زبان نہیں ہے، میں یہ زبان جانتا ہی نہیں۔ میں یہ امتحان کیسے دے سکتا ہوں۔

قرآن غیر عربوں کے لیے بھی ایک معیار پیش کر دیتا ہے، دنیا کا کوئی بھی شخص، خوہ وہ عربی نہ جانتا ہو، اس طرح قرآن کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۝ ﴾ [النساء: ۸۲]

"کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔"

گویا ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ اگر قرآن کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہو تو صرف اتنا کرو کہ قرآن میں تضاد یا اختلاف بیانی کی کوئی ایک ہی مثال پیش کر دو۔ قرآن کی کوئی ایک غلطی، تضاد یا اختلاف دکھا دو اور تم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے کہ قرآن کلامِ خداوندی نہیں ہے۔ انتہائی سیدھی سی بات ہے۔

میں جانتا ہوں کہ سینکڑوں لوگ یہ کوشش کر چکے ہیں۔ قرآن میں غلطیوں اور تضادات کی بزعم خویش نشان دہی کر چکے ہیں۔ لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ سو فی صد صورتوں میں یا تو غلط بیانی کی گئی ہے، سیاق و سباق سے ہٹ کر بات کی گئی ہے، غلط ترجمہ کیا گیا ہے یا دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج تک کوئی بھی شخص قرآن میں کوئی ایک غلطی یا تضاد بھی ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

فرض کیجیے ایک مولانا صاحب ہیں، جو تاریخ اسلام کے بارے میں اچھا علم رکھتے ہیں لیکن جدید سائنس کے بارے میں علم نہیں رکھتے۔ میں بہت سے ایسے علما کو جانتا ہوں جو دینی علوم میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور سائنس میں بھی، لیکن میں ایک ایسے عالم کی مثال دے رہا ہوں جو دینی علوم کا تو ماہر ہے لیکن سائنسی علوم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر ایسے کسی عالم کے سامنے یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ قرآن میں فلاں فلاں سائنسی اغلاط موجود ہیں اور یہ عالم جواب نہ دے پائے، وضاحت نہ کر سکے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن میں واقعی یہ غلطیاں موجود ہیں اور یہ کہ قرآن (نعوذ باللہ) کلامِ خداوندی نہیں ہے۔

کیوں کہ قرآن تو کہتا ہے کہ:

﴿ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝ ﴾ [الفرقان : ٥٩]

''جاننے والے سے پوچھو۔''

اگر آپ قرآن کے کسی سائنسی بیان کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی ایسے شخص سے پوچھنا پڑے گا جو سائنس کے بارے میں جانتا ہو۔ اسی صورت میں آپ کو پتہ چل سکے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

اسی طرح فرض کیجیے حاضرین میں سے کوئی قرآن میں (نعوذ باللہ) کسی گرامر کی غلطی کے بارے میں دعویٰ کر دیتا ہے۔ میں عربی زبان کا ماہر نہیں ہوں۔ میں محض ایک طالب علم ہوں۔ اب اگر میں سوال کا جواب دے سکتا ہوں تو الحمدللہ لیکن اگر میں اپنے محدود علم کی وجہ سے، عربی زبان میں مہارت نہ رکھنے کی وجہ سے جواب نہیں دے پاتا تو اس کا مطلب یہ

نہیں کہ واقعی غلطی موجود ہے۔ جو شخص اس شعبے کا ماہر ہوگا وہ جواب دے دے گا۔

آج تک کوئی شخص قرآن میں کوئی غلطی ثابت نہیں کرسکا اور نہ ہی آئندہ کوئی ثابت کر پائے گا۔

مندرجہ بالا گفتگو کے بعد کوئی ایسا شخص جو خدا پر ایمان رکھتا ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآنِ مجید کلامِ خداوندی نہیں ہے، منزل من اللہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو خدا پر یقین نہیں رکھتے، ان کا معاملہ ہی دوسرا ہے، لیکن جو لوگ خدا کی ہستی پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں وہ مذکورہ بالا دلائل دیکھنے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن وحی خداوندی نہیں ہے۔

لہٰذا اب ہمارے پاس تین بنیادی نظریات میں سے آخری نظریہ ہی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ کتاب منجانب اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی جانب سے نازل کردہ ہے۔

رہی بات دہریوں کی۔ جو کسی خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ خدا پر یقین نہ رکھنے والے جو حضرات آج یہاں تشریف فرما ہیں، میں انھیں مبارک باد دینا چاہوں گا۔ میں لا مذہب لوگوں کو یہ مبارکباد اس وجہ سے دے رہا ہوں کہ وہ اپنی عقل استعمال کر رہے ہیں۔ سوچنے سمجھنے کی طاقت سے کام لے رہے ہیں۔

خدا پر یقین رکھنے والے لوگوں کی اکثریت کا معاملہ اندھے ایمان کا ہوتا ہے، ایک شخص بالعموم اس لیے عیسائی ہوتا ہے کہ وہ پیدا ہی عیسائی کے گھر میں ہوا تھا۔ یا اس لیے ہندو ہوتا ہے کہ وہ ہندو کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ کچھ مسلمان بھی محض اس لیے مسلمان ہیں کہ وہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والدین مسلمان تھے۔ بیش تر لوگ ایک اندھا عقیدہ رکھتے ہیں۔

جب کہ ایک لا مذہب سوچتا ہے۔ اگر وہ ایک مذہبی گھرانے سے بھی تعلق رکھتا ہے تو پھر بھی وہ سوچتا ہے کہ ''یہ لوگ کیسے خدا پر ایمان رکھتے ہیں؟ ایک ایسے خدا پر جو انسانی خصوصیات رکھتا ہے، وہ خصوصیات جو مجھ میں بھی موجود ہیں، میں ایسے خدا پر کیوں ایمان لاؤں؟'' لہٰذا وہ اعلان کرتا ہے کہ خدا موجود ہی نہیں۔ یوں وہ خدا کی ہستی کا انکار کر دیتا ہے۔

کچھ مسلمان مجھ سے پوچھیں گے کہ ذاکر صاحب، آپ ایک لامذہب شخص کو ایک دہریے کو کس بات کی مبارک باد دے رہے ہیں؟

میں اسے اس لیے مبارک باد دے رہا ہوں کہ وہ کلمہ شہادت کے پہلے حصے کو قبول کر چکا ہے۔ وہ ''لا الہ'' کو تسلیم کر چکا ہے۔ اب اسے صرف ''الا اللہ'' کو تسلیم کرنا ہے، جس کے حوالے سے ہم ان شاء اللہ گفتگو کریں گے۔ وہ کلمے کے پہلے حصہ کے حوالے سے غور وفکر کر چکا ہے، وہ خدا کے کسی غلط تصور کو تسلیم نہیں کرتا لٰہذا اب یہ ہمارا فرض ہے کہ خدا کا صحیح تصور اس کے سامنے پیش کریں۔ اور خدائے واحد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا وجود اس پر ثابت کریں۔

جب بھی کوئی دہریہ میرے سامنے یہ کہتا ہے کہ میں خدا پر ایمان نہیں رکھتا تو میں اس سے ایک سوال کرتا ہوں۔

''یہ بتاؤ تمھارے نزدیک خدا کی تعریف کیا ہے؟''

اور اسے جواب دینا پڑتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کیوں؟

فرض کیجیے میں کہتا ہوں کہ ''یہ ایک قلم ہے'' اور آپ کہتے ہیں کہ ''یہ ایک قلم نہیں ہے'' تو پھر ضروری ہے کہ آپ جانتے ہوں کہ قلم کہتے کسے ہیں؟ آپ کو قلم کی تعریف معلوم ہونی چاہیے۔

اگر عام حالات میں آپ کو قلم کی تعریف معلوم نہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ''یہ قلم نہیں ہے'' تو پھر ضروری ہے کہ آپ جانتے ہوں کہ قلم کہتے کسے ہیں؟ قلم کی تعریف کیا ہے؟

اسی طرح اگر ایک دہریہ شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''خدا نہیں ہے'' تو اسے یہ علم ہونا چاہیے کہ خدا کہتے کسے ہیں؟ لفظ ''خدا'' کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اور جب میں اس دہریے سے یہ سوال کرتا ہوں تو وہ مجھے جواب دیتا ہے کہ ''ان لوگوں کو دیکھیں، یہ لوگ کس کو پوج رہے ہیں؟ ایک ایسی ہستی کو جو انسانی خصائص رکھتی ہے۔ میں ایسے خدا پر یقین نہیں رکھتا۔

کچھ خدا کا غلط تصور رکھتے ہیں۔ ایک دہریہ اس تصور کو رد کرتا ہے لیکن میں بحیثیت مسلمان بھی اس غلط تصور کی تائید نہیں کرتا، میں بھی اس غلط تصورِ خدا کو رد کرتا ہوں۔ یہ "لا الٰہ" کا مرحلہ ہے۔ لیکن جس وقت میں یہاں تک اس سے اتفاق کرتا ہوں، اس وقت میرا فرض بنتا ہے کہ میں خدا کا صحیح اور درست تصور بھی اس کے سامنے پیش کروں۔ اللہ کے حقیقی تصور سے اسے آگاہ کروں۔

اچھا اب فرض کیجیے کہ ایک شخص غیر مسلم ہے بلکہ اسلام کا مخالف ہے۔ اس سے پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں اسلام کا اس لیے مخالف ہوں کہ:

یہ ایک ظالمانہ مذہب ہے......

یہ ایک بے رحمانہ مذہب ہے......

یہ مذہب دہشت گردی کی ترویج کرتا ہے......

یہ مذہب خواتین کے حقوق تسلیم نہیں کرتا......

یہ مذہب غیر سائنسی ہے......

اگر وہ مجھے بتاتا ہے کہ مذکورہ اسباب کی وجہ سے وہ اسلام کا مخالف ہے تو میں اس سے کہوں گا کہ جس مذہب کی یہ خصوصیات ہوں میں خود اس کا مخالف ہوں، میں خود کسی ایسے مذہب کو تسلیم نہیں کرتا جو ظالمانہ ہو، جو خواتین کے حقوق غصب کرتا ہو لیکن میں اسے یہ بھی بتاؤں گا کہ یہ خصوصیات اسلام کی نہیں ہیں۔ میں اسلام کا صحیح تصور اس کے سامنے پیش کروں گا، اسے بتاؤں گا کہ اسلام تو رحم پر زور دینے والا مذہب ہے، دہشت گردی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مذہب خواتین کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ اسلام اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

اس کے بعد یقیناً وہ غیر مسلم، ان شاء اللہ، اسلام کو تسلیم کرے گا، یہ ہمارا فرض ہے کہ اسلام کا درست تصور لوگوں تک پہنچائیں۔ اسی طرح خدا کا، اللہ تعالیٰ کا درست تصور بھی لوگوں تک پہنچانا ضروری ہے۔

خدا کی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی، میرے خیال میں بہترین تعریف وہ ہے جو قرآنِ مجید میں بیان کردی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ٥ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ٥ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ٥ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ٥ ﴾ [الاخلاص : ٤-١]

"کہو، وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔"

مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی میں بتایا گیا ہے کہ؛

...... خدا واحد و یکتا ہے، اکیلا ہے۔

...... وہ بے نیاز ہے، ہر کسی کو اس کی ضرورت ہے۔ اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

...... وہ دنیاوی رشتوں سے پاک ہے، نہ اس کے والدین ہیں نہ اولاد۔ وہ ماں باپ اور بچوں جیسے رشتے نہیں رکھتا۔

...... اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے، اس کا تقابل کسی سے نہیں ہوسکتا، اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ اگر خدا کا کسی سے تقابل "Comparison" کیا جاسکے تو وہ خدا نہیں ہے۔

گویا یہاں اللہ تعالیٰ کی ایک چہار سطری تعریف بیان کردی گئی ہے۔ اگر کسی کا تصورِ خدا اس تعریف کے مطابق ہے تو ہم مسلمانوں کو اس تصور خدا پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔

اب جو جو خدائی کے امیدوار ہیں، انھیں سامنے آنا ہوگا، انھیں اس امتحان پر پورا اترنا ہوگا۔ خدائی کا امیدوار کون ہے؟ کون خدائی کا دعویٰ کرتا ہے؟

بعض لوگ گرو رجنیش کو، اوشو کو خدا سمجھتے ہیں۔ آیئے ہم اسے اس کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

خدا کی پہلی صفت، واحد یکتا ہونا ہے۔ کیا بھگوان رجنیش واحد و یکتا تھا؟ نہیں۔ اس جیسے ہزاروں لوگ موجود ہیں۔ ہمارے ملک میں ہی اس جیسے بہت سے لوگ پائے جاتے

ہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے رجنیش کا کوئی پیروکار اصرار کرے کہ نہیں گرو رجنیش منفرد تھا۔ وہ ایک ہی تھا۔ چلیں اسے ایک موقع دے دیتے ہیں اور دوسری صفت کی طرف بڑھتے ہیں۔ دوسری صفت بے نیاز ہونا ہے، اللہ صمد ہے، اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہر کسی کو اس کی ضرورت ہے۔

رجنیش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ دمے کا مریض تھا۔ اسے ذیابیطس بھی تھی۔ وہ اپنی بیماری تک دور نہ کرسکتا تھا۔ وہ آپ کی اور میری بیماری کیا دور کرے گا؟ جب وہ امریکہ گیا تو امریکی حکومت نے اسے گرفتار کرلیا تھا۔ ذرا اندازہ کیجیے' خدا قید میں ہے۔' کیا خدا کو قید کیا جاسکتا ہے؟ وہ جو خود کو آزاد نہیں کرواسکا، آپ کو اور مجھے کیا آزاد کروائے گا۔ ہمارے مسائل اور پریشانیاں کیا دور کرے گا؟

گرو رجنیش نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ تصور کیجیے! کیا خدا کو زہر دیا جاسکتا ہے؟

جب وہ یونان میں تھا تو یونان کے لاٹ پادری صاحب نے بیان دیا کہ اگر اس شخص کو یونان سے نہ نکالا گیا تو اس کے اور اس کے پیروکاروں کے مکانات تباہ کردیے جائیں گے۔ اور یونانی حکومت کو اسے جلاوطن کرنا پڑا۔ کیا یہ بے نیازی ہوتی ہے؟ کیا اسے صمدیت کہتے ہیں؟

تیسری صفت یہ ہے کہ خدا نہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے۔ یعنی نہ وہ ماں باپ رکھتا ہے اور نہ اولاد۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ گرو رجنیش کے کتنے بچے تھے لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس کی ماں بھی تھی اور باپ بھی۔ وہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جبل پور میں پیدا ہوا اور ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء کو مر گیا۔ لیکن جب آپ پونہ میں اس کے مرکز میں جائیں تو وہاں تحریر ہے:

بھگوان رجنیش

"جو نہ کبھی پیدا ہوا، نہ کبھی مرا، اس نے ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹ جنوری

۱۹۹۰ء تک اس دنیا کا دورہ کیا۔"

لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ دنیا کے اکیس ممالک میں اسے ویزا دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ وہ ان اکیس ممالک میں جانا چاہتا تھا لیکن نہیں جا سکا۔ اندازہ کیجیے خدا خود دنیا کے دورے پر آیا ہوا ہے اور اپنی دنیا کے اکیس ممالک میں جانا چاہتا ہے لیکن نہیں جا سکتا، کیا یہی خدا کا وہ تصور ہے جس پر آپ یقین رکھتے ہیں؟

اور اب آخری شرط کہ خدا کا ہم سر یعنی اس جیسا اور کوئی نہیں ہے۔ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی، اس کا کسی سے تقابل نہیں کیا جا سکتا، اگر آپ خدا کا تصور کرنے میں کامیاب ہو جائیں، اس کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خدا نہیں ہے۔ خدا کی تجسیم ممکن نہیں ہے۔

جبکہ گرو رجنیش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ گرو رجنیش کے لمبے بال تھے، ایک لمبی لہراتی ہوئی داڑھی تھی، جس کا رنگ سفید تھا، اس نے ایک چوغہ سا پہنا ہوا ہوتا تھا۔ یعنی آپ بڑی آسانی سے اس کا تصور کر سکتے ہیں اور وہ جو تصور میں آ جائے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

خدا کا کسی سے تقابل بھی ممکن نہیں ہے۔ فرض کیجیے کوئی شخص بطورِ مثال کہتا ہے کہ خدا آرنلڈ شوارزینیگر سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے۔ آرنلڈ مسٹر یونیورس، طاقتور ترین انسان تھا۔ اسی طرح دارا سنگھ ایک طاقت ور پہلوان تھا۔ لیکن جس وقت آپ تقابل کریں گے، جس وقت آپ کہیں گے کہ خدا آرنلڈ شوارزینیگر سے، دارا سنگھ سے، یا کنگ کانگ سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ کا تصورِ خدا ہی غلط ہے۔ خواہ آپ یہی کہہ رہے ہوں کہ خدا کسی سے ایک کروڑ گنا طاقتور ہے لیکن بہرحال آپ تقابل تو کر رہے ہوں گے اور خدا کی صفت یہ ہے کہ اس کا تقابل نہیں ہو سکتا۔

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ﴾

"اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔"

۱۹۹۰ء تک اس دنیا کا دورہ کیا۔''

لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ دنیا کے اکیس ممالک میں اسے ویزا دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ وہ ان اکیس ممالک میں جانا چاہتا تھا لیکن نہیں جا سکا۔ اندازہ کیجیے خدا خود دنیا کے دورے پر آیا ہوا ہے اور اپنی دنیا کے اکیس ممالک میں جانا چاہتا ہے لیکن نہیں جا سکتا، کیا یہی خدا کا وہ تصور ہے جس پر آپ یقین رکھتے ہیں؟

اور اب آخری شرط کہ خدا کا ہمسر یعنی اس جیسا اور کوئی نہیں ہے۔ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی، اس کا کسی سے تقابل نہیں کیا جا سکتا، اگر آپ خدا کا تصور کرنے میں کامیاب ہو جائیں، اس کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خدا نہیں ہے۔ خدا کی تجسیم ممکن نہیں ہے۔

جبکہ گرو رجنیش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ گرو رجنیش کے لمبے بال تھے، ایک لمبی لہراتی ہوئی داڑھی تھی، جس کا رنگ سفید تھا، اس نے ایک چوغہ سا پہنا ہوا ہوتا تھا۔ یعنی آپ بڑی آسانی سے اس کا تصور کر سکتے ہیں اور وہ جو تصور میں آ جائے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

خدا کا کسی سے تقابل بھی ممکن نہیں ہے۔ فرض کیجیے کوئی شخص بطورِ مثال کہتا ہے کہ خدا آرنلڈ شوارزینیگر سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے۔ آرنلڈ مسٹر یونیورس، طاقتور ترین انسان تھا۔ اسی طرح دارا سنگھ ایک طاقت ور پہلوان تھا۔ لیکن جس وقت آپ تقابل کریں گے، جس وقت آپ کہیں گے کہ خدا آرنلڈ شوارزینیگر سے، دارا سنگھ سے، یا کنگ کانگ سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ کا تصورِ خدا ہی غلط ہے۔ خواہ آپ یہی کہہ رہے ہوں کہ خدا کسی سے ایک کروڑ گنا طاقتور ہے لیکن بہر حال آپ تقابل تو کر رہے ہوں گے اور خدا کی صفت یہ ہے کہ اس کا تقابل نہیں ہو سکتا۔

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ﴾

''اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔''

لہٰذا اب یہ بات میں اپنے معزز، دانش مند، سامعین پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان کے ذہن میں خدا کا کیا تصور ہے؟ اور کیا ان کا تصور ان شرائط پر پورا اترتا ہے؟ کیا ان کے اس تصور میں یہ چاروں خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قرآن بیان کر رہا ہے، اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو ہم مسلمانوں کو آپ کے تصورِ خدا پر کوئی اعتراض نہیں اور ہم اسے اللہ تعالیٰ تسلیم کرتے ہیں، بصورتِ دیگر فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیکن یہ دلائل سننے کے بعد بھی بالعموم ایک دہریہ آپ کی بات قبول نہیں کرے گا۔ وہ کہے گا کہ میں ان دلائل کو نہیں مانتا۔ میں ایک ہی چیز کو حتمی مانتا ہوں اور وہ ہے سائنس۔

اتنا تو میں بھی مانتا ہوں کہ آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ لہٰذا آیئے ہم سائنسی علوم کی روشنی میں قرآن کا جائزہ لیتے ہیں۔ دہریے یہی کہتے ہیں کہ ہم صرف اسی دعوے کو درست مانتے ہیں جو سائنس کی روشنی میں درست ثابت ہو۔ بصورتِ دیگر ہم خدا کو نہیں مانتے۔

میں ان تمام تعلیم یافتہ حضرات سے ایک سوال کرنا چاہوں گا جو خدا پر یقین نہیں رکھتے لیکن سائنس پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے ایک مشین آئے جس کے بارے میں آپ نے نہ کچھ سنا ہو، نہ پڑھا ہو، نہ ہی اسے کبھی دیکھا ہو تو آپ کے خیال میں وہ پہلا شخص کون ہوگا جو آپ کو اس مشین کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کر سکے۔ یہ مشین ایک دہریے کے سامنے ہے جو صرف سائنس پر یقین رکھتا ہے تو اس کے خیال میں کون ہوگا جو اس مشین کے نظامِ عمل کے بارے میں علم رکھتا ہو؟

میں نے یہ سوال سینکڑوں دہریے لوگوں سے، مذہب کے منکر لوگوں سے کیا ہے، تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ان کا جواب عموماً یہی ہوتا ہے:

”شاید اس مشین کا بنانے والا ہی یہ معلومات دے سکتا ہے۔“

کچھ کہتے ہیں موجد، کچھ خالق کا لفظ استعمال کریں گے، کچھ تیار کنندہ کا۔ سینکڑوں لوگوں سے سوال کرنے کے بعد بھی مجھے ملتے جلتے جواب ہی ملے ہیں۔ بہرحال جواب کچھ

بھی ہو میں تسلیم کر لیتا ہوں۔ دوسرا شخص کون ہوگا؟ یہ وہ شخص بھی ہوسکتا ہے جسے خالق نے بتایا ہو اور کوئی ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو اپنی تحقیق سے درست نتائج تک پہنچ گیا ہو لیکن پہلا بہر صورت وہی ہوگا جو اس مشین کا خالق ہے، موجد ہے، تیار کنندہ ہے، بنانے والا ہے۔

اب میں اس دہریے سے، منکرِ خدا سے، جو صرف سائنس پر یقین رکھتا ہے ایک اور سوال کرتا ہوں کہ بتاؤ یہ کائنات کس طرح وجود میں آئی؟

وہ جواب دیتا ہے کہ دراصل پہلے صرف مادے کا ایک مجموعہ تھا جسے پرائمری نیبولا (Primary Nebula) کہتے ہیں۔ پوری کائنات یہی تھی۔ پھر ایک بہت بڑا دھماکہ (Big Bang) ہوا۔ جس کے نتیجے میں ثانوی تقسیم ہوئی اور کہکشائیں وجود میں آئیں۔ ستارے اور سیارے بنے۔ اور یہ زمین بھی وجود میں آئی جس پر ہم رہ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ جنوں پریوں کی کہانیاں تم نے کہاں سے سنی ہیں؟ وہ کہتا ہے ''نہیں، یہ جنوں پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ یہ تو سائنسی حقائق ہیں جو کل ہی ہمارے علم میں آئے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں ''کل'' سے مراد نصف صدی یا ایک صدی کا عرصہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے کہ دو سائنسدانوں کو ''عظیم دھماکے کا نظریہ Big Bang Theory دریافت کرنے پر نوبل انعام سے نوازا گیا۔''

میں کہتا ہوں بالکل ٹھیک۔ تمھاری ہر بات سے مجھے اتفاق ہے، لیکن اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ یہ بات قرآن میں آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے ہی بیان فرمادی گئی تھی۔ سورۂ انبیاء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟

میرا قرآن آج سے چودہ صدیاں پیش تر نازل ہوا تھا۔ اس بات کے کافی ثبوت

موجود ہیں کہ یہ وہی کتاب ہے جو ۱۴۰۰ سال پہلے موجود تھی۔ تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ اس میں عظیم دھماکے کے نظریے کی طرف اشارہ موجود ہے؟

اس آیت میں انتہائی اختصار کے ساتھ Big Bang Theory موجود ہے۔ تم کہتے ہو یہ نظریہ سو یا پچاس سال پہلے سامنے آیا ہے تو پھر قرآن میں اس کا ذکر کہاں سے آ گیا؟

لا مذہب اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ ''شاید کسی نے اندازہ لگایا ہوگا۔'' میں بحث نہیں کرتا، ان کی بات مان لیتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ زمین جس پر ہم رہ رہے ہیں، اس کی شکل کیسی ہے؟ جواب ملتا ہے کہ پہلے تو لوگ یہی سمجھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے اور اسی لیے وہ طویل سفر سے گھبراتے بھی تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ زمین کے کنارے پر پہنچ کر نیچے گر پڑیں۔ لیکن آج ہمارے پاس اس بات کے کافی سائنسی ثبوت موجود ہیں کہ زمین چپٹی نہیں ہے۔ زمین دراصل گول یعنی کرے کی شکل میں ہے۔ میں پوچھتا ہوں یہ بات آپ کو کب معلوم ہوئی؟

جواب ملتا ہے، ماضی قریب میں، سو سال پہلے، دو سو سال پہلے اور اگر جواب دینے والا صاحب علم ہو تو اس کا جواب ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ بات ثابت کی تھی وہ سر فرانسس ڈریک تھا، جس نے ۱۵۹۷ء میں یہ ثابت کیا کہ زمین کروی ہے۔

میں اسے کہتا ہوں کہ سورۂ لقمان کی اس آیت کا تجزیہ کرے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ ﴾ [لقمان : ۲۹]

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، سب ایک وقت مقرر تک چلے جا رہے ہیں اور (کیا تم نہیں جانتے کہ) جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

پروتے ہوئے لانے سے مراد ہے ایک سست رو اور بتدریج تبدیلی۔ یعنی رات آہستہ آہستہ، بتدریج دن میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے اور رات دن میں۔ یہ عمل اس طرح ہونا ممکن ہی نہیں اگر زمین چپٹی ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زمین کی شکل کروی ہو۔ اسی طرح کا ایک پیغام ہمیں قرآنِ مجید کی سورۃ الزمر میں بھی ملتا ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝ ﴾ [الزمر: ۵]

''اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک، ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو! وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے۔''

دن کو رات پر لپیٹنے اور رات کو دن پر لپیٹنے کا یہ عمل بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین گول یعنی کرہ نما ہو۔ زمین کے چپٹے ہونے کی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

آپ مجھے بتاتے ہیں کہ یہ بات ۱۵۹۷ء میں سامنے آئی تھی تو پھر قرآنِ عظیم میں یہ بات ایک ہزار چار سو سال پہلے کس طرح موجود تھی؟

ہوسکتا ہے وہ کہیں کہ یہ بھی اتفاق تھا، محض ایک اتفاق، ایک اندازہ جو درست ثابت ہوا۔ میں یہاں بھی بحث نہیں کرتا اور آگے بڑھتا ہوں۔

میرا اگلا سوال یہ ہوگا کہ چاند سے جو روشنی ہم تک پہنچتی ہے یہ کس چیز کی روشنی ہوتی ہے؟ وہ مجھے بتائے گا کہ پہلے ہم یہی سمجھتے تھے کہ یہ چاند کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن آج جب کہ سائنس ترقی کرچکی ہے، آج ہم جانتے ہیں کہ دراصل یہ سورج کی روشنی ہوتی ہے جو چاند سے منعکس ہوکر زمین تک آتی ہے۔ چاند خود سے روشن نہیں ہے۔

اس کے بعد میں اس سے ایک اور سوال کروں گا۔ اور وہ یہ کہ قرآنِ مجید کی سورۃ

فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ ﴾ [الفرقان: ٦١]

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک قمرِ منیر روشن کیا۔''

عربی میں چاند کے لیے لفظ ''قمر'' استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کی روشنی کے لیے لفظ ''منیرا'' استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد منعکس یا منعطف روشنی ہوتی ہے ''نور'' کا لفظ ایسی ہی روشنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

تم کہتے ہو کہ یہ حقیقت تم نے آج دریافت کی ہے، تو پھر بتاؤ، قرآن میں یہ بات ۱۴۰۰ سال پہلے کس طرح موجود تھی؟ وہ فوری جواب نہیں دے سکے گا، اسے کچھ دیر سوچنا پڑے گا اور شاید بالآخر اس کا جواب یہی ہوگا کہ غالباً یہ بھی محض اتفاق ہے، اندازہ ہے یا ''تکا لگ گیا ہے۔''

میں اس سے پھر بھی بحث نہیں کروں گا۔ گفتگو آگے چلانے کے لیے میں بحث سے گریز کروں گا۔ میں کہوں گا کہ اگر تمھارا جواب یہی ہے تو میں تم سے بحث نہیں کرتا۔ اور بات آگے بڑھاتا ہوں۔

میں اسے کہتا ہوں کہ میں نے ۱۹۸۲ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس وقت ہمیں بتایا گیا تھا کہ سورج ساکن ہے یعنی اپنے مرکز کے گرد تو مسلسل حرکت کر رہا ہے، گھوم رہا ہے، لیکن اپنے مقام کے لحاظ سے ساکن ہے۔ ہوسکتا ہے وہ پوچھے کہ کیا قرآن بھی یہی کہتا ہے؟ میرا جواب ہوگا کہ نہیں۔ یہ بات تو ہمیں سکول میں بتائی گئی تھی، میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا واقعی اسی طرح ہے؟

وہ کہے گا کہ نہیں۔ آج سائنس ترقی کر چکی ہے۔ اب ہمیں پتہ چلا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد گھومنے کے علاوہ مداری حرکت بھی کر رہا ہے۔ سورج کی مرکز کے گرد حرکت کا

آپ مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں، اگر آپ کے پاس ضروری آلات موجود ہوں۔ سورج کی سطح پر سیاہ دھبے موجود ہیں اور ان دھبوں کی حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد ایک چکر تقریباً پچیس دن میں پورا کر لیتا ہے۔ لیکن اس حرکت کے علاوہ سورج ایک مدار میں بھی حرکت کر رہا ہے۔

کیا قرآن کہتا ہے کہ سورج ساکن ہے؟ ہوسکتا ہے وہ دہریہ جس سے میں گفتگو کر رہا ہوں اس موقع پر ہنسنے لگے۔

لیکن پھر میں بتاتا ہوں کہ نہیں۔ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیآء: ۳۳]

”اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔“

قرآن بتا رہا ہے کہ سب ایک فلک میں، ایک مدار میں حرکت کر رہے ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ اگر یہ بات جدید سائنس نے حال ہی میں دریافت کی ہے تو پھر قرآن میں یہ بات چودہ سو سال پہلے ہی کس طرح بیان کر دی گئی تھی؟

وہ تھوڑی دیر تک خاموش ہی رہتا ہے اور کچھ دیر کے بعد کہتا ہے کہ عرب علم فلکیات کے ماہر تھے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے عربوں میں سے کسی نے یہ بات تمہارے پیغمبر ﷺ سے کی ہو اور انھوں نے اسے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہو!

میں مانتا ہوں، تسلیم کرتا ہوں کہ عرب علم فلکیات میں انتہائی ترقی یافتہ تھے لیکن ساتھ ہی میں اسے یاد دلاتا ہوں کہ وہ تاریخ کو گڈمڈ کر رہا ہے۔ کیوں کہ عربوں کا فلکیات میں ترقی کرنا بہت بعد کی بات ہے اور قرآن اس سے صدیوں پہلے نازل ہو چکا تھا۔ بلکہ دراصل عربوں کے فلکیات میں ترقی کرنے کا سبب ہی قرآن تھا۔ علم فلکیات عربوں سے قرآن میں نہیں آیا، قرآن سے عربوں نے سیکھا تھا۔ قرآن بہت سے سائنسی حقایق کا ذکر کرتا ہے۔

جغرافیے کے حوالے سے اور پھر ''آبی چکر'' (Water Cycle) کے حوالے سے دیکھیے تو قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ [الزمر: ۲۱]

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔''

قرآن آبی چکر کا ذکر متعدد آیات میں کرتا ہے اور پوری تفصیل کے ساتھ کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ پانی سمندروں کی سطح سے بخارات بن کر اٹھتا ہے۔ بادلوں میں تبدیل ہوتا ہے۔ بادل بالآخر کثیف ہو جاتے ہیں، ان میں بجلیاں چمکتی ہیں اور ان سے بارش ہوتی ہے۔ اس مظہر کا ذکر قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے۔

سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ [المومنون: ۱۸]

''اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔''

سورۂ روم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ [الروم: ۴۸]

''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے،

پھر تُو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو وہ یکا یک خوش وخرم ہو جاتے ہیں۔''

سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ﴾ [النور: ٤٣]

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں۔''

سورۂ روم میں فرمایا گیا:

﴿ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴾

[الروم: ٢٤]

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمھیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے، خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یعنی قرآن متعدد مقامات پر آبی چکر کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ جب کہ یہ آبی چکر (Water Cycle) ایک سائنسدان نے جس کا نام Bernard Palacy تھا، ۱۵۸۰ء میں بیان کیا تھا۔ جو آبی چکر سائنس ۱۵۸۰ء میں دریافت کر رہی ہے وہ قرآن میں اس سے ہزار سال پہلے ہی موجود تھا؟ کیسے؟

اب ہم ''ارضیات'' کی جانب آتے ہیں۔ علم ارضیات میں ایک تصور بیان کیا جاتا

ہے جسے Folding کہتے ہیں۔ جس زمین پر ہم رہتے ہیں اس کی بیرونی پرت یا سطح خاصی باریک ہے۔ اس سطح میں بل پڑنے کے سبب پہاڑی سلسلے وجود میں آتے ہیں جو سطح زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ اب میں اس دہریے کو بتاتا ہوں کہ قرآنِ مجید کی سورۂ نبا میں بتایا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ٥ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا ٥ ﴾ [النبأ: ٦۔٧]

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔"

قرآن کہتا ہے کہ پہاڑوں کو میخیں بنایا گیا ہے۔ "اوتاد" عربی میں اس میخ کو کہا جاتا ہے جو خیمہ کھڑا کرنے کے لیے گاڑی جاتی ہے۔ اور جدید سائنس بھی پہاڑوں کا اسی طرح کا کردار بیان کرتی ہے۔

یعنی پہاڑوں کی مثال خیموں کی میخوں کی سی ہے۔ قرآن مزید کہتا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ٥ ﴾ [الانبیآء: ٣١]

"اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔"

گویا قرآن یہ کہتا ہے کہ زمین میں پہاڑ اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ زمین ڈھلکنے سے محفوظ رہے۔

مزید برآں میرے پوچھنے پر وہ دہریہ کہے گا کہ اس کے علم میں ہے کہ سمندر میں میٹھا اور کھارا پانی بعض جگہوں پر الگ الگ رہتے ہیں۔ ان کے درمیان ایک روک موجود ہوتی ہے۔ ایک آڑ موجود ہوتی ہے جو دونوں طرح کے پانی کو ملنے نہیں دیتی اور الگ الگ رکھتی ہے۔ مَیں اُسے سورۂ فرقان کی یہ آیت سناتا ہوں:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ

﴿ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾ [الفرقان: ۵۳]

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

اسی طرح کی بات سورۂ رحمان میں بھی کی گئی ہے:

﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ۝ ﴾

[الرحمٰن: ۲۰-۱۹]

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

آج جدید سائنس بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ بعض مقامات پر سمندر میں میٹھا اور کھاری پانی ایک دوسرے میں حل نہیں ہوتے، ان کے درمیان ایک روک موجود رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ دہریہ جس سے میں گفتگو کر رہا ہوں وہ اس موقع پر کہے کہ ''شاید کسی عرب نے سمندر میں غوطہ لگا کر اس روک کو دیکھ لیا ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا ہوگا، یوں یہ بات قرآن میں آ گئی ہوگی۔''

لیکن بات یہ ہے کہ جس روک یا آڑ کا یہاں ذکر یہاں ہو رہا ہے، وہ نظر تو آتی ہی نہیں۔ یہ تو ایک نادیدہ رکاوٹ ہے۔ اسی لیے قرآن اس کے لیے ''برزخ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

یہ مظہر انتہائی واضح طور پر ''کیپ ٹاؤن'' کے قریب دیکھا جاسکتا ہے۔ یعنی افریقہ کے انتہائی جنوب میں۔ مصر میں بھی جہاں دریائے نیل سمندر سے ملتا ہے، یہی صورتِ حال ہوتی ہے۔ اسی طرح خلیج عرب میں جہاں ہزاروں کلومیٹر تک دونوں طرح کا پانی موجود ہے، لیکن الگ الگ رہتا ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ انبیاء میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

"کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کردیا ہے، غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟"

آپ ذرا تصور کیجیے کہ عرب کے صحراؤں میں جہاں پانی کی شدید قلت ہوتی ہے، وہاں یہ بات کہی جارہی ہے۔ وہاں کس کو یہ خیال آسکتا تھا کہ ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ اگر انھیں اندازہ لگانا ہی ہوتا تو وہ ہر چیز کا اندازہ لگا سکتے تھے، انھیں کسی بھی چیز کا خیال آسکتا تھا، سوائے پانی کے۔ آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ ہر زندہ چیز خلیوں سے بنی ہے۔ ان خلیات کا بنیادی جزو سائٹو پلازم Cytoplasm ہوتا ہے جو کہ اسی فی صد پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر زندہ چیز پچاس سے نوے فی صد پانی پر مشتمل ہوتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آج سے چودہ صدیاں پیش تر، یہ بات قرآنِ حکیم میں کیوں کر بیان کردی گئی تھی؟ اب وہ دہریہ بھی چپ ہو چکا ہوگا۔ وہ کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہوگا۔

شماریات کا ایک نظریہ ہے جسے Theory of Probability کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے دو ممکنہ جوابات ہوسکتے ہیں۔ ایک صحیح اور ایک غلط۔ اگر آپ محض اندازے سے جواب دیں تو پچاس فی صد امکان ہے کہ آپ کا جواب درست ہوگا۔ مثال کے طور پر جب آپ ٹاس کرتے ہیں تو دونوں طرف پچاس پچاس فی صد امکان ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ دو دفعہ ٹاس کریں تو اس بات کا کتنا امکان ہے کہ دونوں مرتبہ ہی آپ کا جواب درست ہوگا۔ پہلی مرتبہ پچاس فی صد یعنی دو میں سے ایک اور دوسری مرتبہ پچاس فی صد کا پچاس فی صد یعنی چار میں سے ایک امکان یا

یوں کہیے کہ پچیس فی صد امکان ہے کہ آپ دونوں مرتبہ درست جواب دیں گے۔

فرض کیجیے میں ایک پانسہ (Dice) پھینکتا ہوں جس کے چھ رخ ہے۔ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، اور ۶۔ اب اگر میں اندازہ لگاؤں تو اس اندازے کے درست ہونے کا امکان چھ میں سے ایک ہوگا۔ اب اگر میں دو دفعہ ٹاس کروں اور ایک دفعہ پانسہ پھینکوں تو یہ امکان کتنا ہے کہ ہر دفعہ میں جواب درست ہوگا؟

یہ امکان ہوگا، ۲/۱ ضرب ۲/۱ ضرب ۶/۱ یعنی ۲۴/۱ یا دوسرے لفظوں میں چوبیس میں ایک امکان یہ ہے کہ میرا جواب ہر بار درست ہوگا۔

آیئے یہ نظریہ (Theory of Probability) قرآن پر لاگو کر کے دیکھتے ہیں۔ محض گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ قرآن میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ محض اندازے ہیں جو درست ثابت ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان اندازوں کے درست ہونے کا امکان کتنا تھا؟

قرآن کہتا ہے کہ زمین گول یعنی کرہ نما ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ زمین کی شکل کے بارے میں کیا اندازے لگائے جاسکتے ہیں؟ کسی شخص کے ذہن میں زمین کی کون سی ممکنہ شکلیں آسکتی ہیں؟

کہا جاسکتا ہے کہ زمین چپٹی ہے یا تکون ہے یا چوکور ہے یا شش پہلو ہے یا ہشت پہلو ہے، اسی طرح بہت سی ممکنہ شکلیں سوچی جاسکتی ہیں، ذہن میں آسکتی ہیں۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ صرف تیس ممکنہ شکلیں ہوسکتی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص محض اندازہ لگاتا ہے تو اس اندازے کے درست ثابت ہونے کا امکان ۳۰ میں سے ایک ہوگا۔

چاند کی روشنی یا تو اس کی اپنی ہوگی یا منعکس ہوگی لہٰذا دو ہی صورتیں ہیں اور یہاں اندازہ درست ثابت ہونے کا امکان دو میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ امکان کہ ایک شخص کے دونوں اندازے درست ثابت ہوں گے، ساٹھ میں ایک ہے۔

اچھا، اب یہ بتایئے کہ صحرائے عرب میں رہنے والا شخص کیا اندازہ لگائے گا کہ انسان

بلکہ تمام جاندار کس شے سے بنے ہوئے ہیں؟ اور اندازہ بھی صحرا کے رہنے والے شخص نے ہی لگانا ہے تو اس کا جواب کیا ہوسکتا ہے؟ ہوسکتا ہے اس کا جواب ریت ہو، یا لکڑی یا لوہا یا کوئی اور دھات یا کوئی گیس یا تیل۔ وہ شخص دس ہزار اندازے لگا سکتا ہے اور اس کا آخری اندازہ پانی ہوگا۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر زندہ مخلوق پانی سے بنائی گئی ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔''

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا گیا:

﴿ وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ﴾ [النور: ۴۵]

''اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا۔''

یہ بات اگر محض اندازے سے کی جائے تو اندازہ درست ہونے کا امکان دس ہزار میں ایک ہوگا۔ اب یہ امکان کہ ایک شخص مذکورہ بالا تینوں معاملات میں اندازے سے جواب دے اور ہر بار اس کا اندازہ درست ثابت ہو، چھ لاکھ میں سے ایک ہے۔ یعنی ۱۷ ۰۰۰۰ء۰ فی صد۔ اب میں یہ آپ حاضرین پر چھوڑتا ہوں کہ اس کے بعد آپ Theory of Probability کا اطلاق قرآن پر کرنا چاہیں گے یا نہیں۔

قرآن ایسے سینکڑوں حقائق کا ذکر کرتا ہے جو اس وقت یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں لوگوں کے علم میں نہیں تھے۔ اگر ان تمام بیانات کو اندازے فرض کیا جائے تو ان اندازوں کے بیک وقت درست ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ اور Probability کے نظریے کی رو سے تو یہ امکان صفر ہی رہ جاتا ہے۔

یہاں کچھ لوگ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ''ذاکر صاحب کیا آپ قرآن کو سائنس کی مدد سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' لہٰذا میں یہ یاددہانی ضروری سمجھتا ہوں کہ ''قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ یہ سائنز کی کتاب ہے۔ یعنی؛

Quran is not a book of Science

It is a Book of SIGNS.

یعنی یہ نشانیوں کی، آیات کی کتاب ہے، اس کتاب میں چھ ہزار آیات موجود ہیں۔ جن میں سے ایک ہزار سے زاید آیات ایسی ہیں جن کا تعلق سائنسی علوم سے ہے۔ میں سائنس کو قرآن کے اثبات کے لیے استعمال نہیں کر رہا کیوں کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے آپ کو کسی پیمانے کی، کسی معیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہم مسلمانوں کے لیے آخری پیمانہ اور حتمی معیار خود قرآن ہے۔ قرآن ہی ہمارے لیے فرقان یعنی حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ اسی پیمانے پر ہم یعنی مسلمان صحیح اور غلط بیان کا فیصلہ کرتے ہیں۔

لیکن ایک دہریے کے لیے، ایک پڑھے لکھے شخص کے لیے جو خدا پر ایمان ہی نہیں رکھتا، اس کے لیے معیار کیا ہے؟ اس کے لیے تو آخری پیمانہ سائنس ہی ہے۔ لہٰذا میں اپنی بات اس کے سامنے اسی کے پیمانے سے درست ثابت کر رہا ہوں۔ البتہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سائنسی نظریات بسا اوقات تبدیل بھی ہو جایا کرتے ہیں، لہٰذا ہم نے صرف ثابت شدہ سائنسی حقائق ہی کو سامنے رکھا ہے۔ میں نے محض نظریات اور مفروضوں کی بنیاد پر بات نہیں کی۔ یعنی ایسے نظریات کو دلیل نہیں بنایا جن کی بنیاد مفروضوں پر ہے۔ میں نے اس کو یہ بتایا ہے کہ جو چیز تمھارے معیار اور پیمانے نے آج سے سو یا پچاس برس پہلے ثابت کی ہے قرآن اسے چودہ سو سال پہلے ہی بیان کر رہا تھا۔ لہٰذا بالآخر ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن ہی برتر ہے۔ سائنس اور قرآن میں سے برتری قرآن ہی کو حاصل ہے۔ قرآن متعدد سائنسی حقائق ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴾ [طٰہٰ: ۵۳]

”وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بنایا اور اس میں تمھارے چلنے کو

راستے بنائے اور اوپر سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے نباتات کے جوڑے نکالے۔''

آپ یہ بات ماضی قریب میں دریافت کر رہے ہیں کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ ﴾

[الانعام: ۳۸]

'' زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

سائنس اس بات کا اثبات کچھ ہی عرصہ قبل کر رہی ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں بتایا گیا ہے کہ شہد کی مکھی شہد بنانے کے لیے رس جمع کرتی ہے۔ یہاں اس کے لیے مونث کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ کام نر مکھی نہیں کرتی بلکہ مادہ مکھی کرتی ہے۔ سائنس نے یہ حقیقت بھی حال ہی میں دریافت کی ہے، ورنہ پہلے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ یہ کام نر مکھی کرتی ہے۔ یہ مکھیاں صرف نو دریافت شدہ پودوں اور پھولوں کی اطلاع دیگر مکھیوں کو دیتی ہیں۔

سورۂ عنکبوت میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

[العنکبوت: ٤١]

'' اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر، مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔''

یہاں بات محض مکڑی کے گھر یعنی جالے کی ظاہری کمزوری کے حوالے سے نہیں کی

جا رہی۔ یہ آیت مکڑی کی گھریلو زندگی کی خصوصیت بھی بیان کر رہی ہے کہ تعلقات کے لحاظ سے بھی سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات مادہ مکڑی اپنے نر کو ہلاک کر دیتی ہے۔

اسی طرح سورۂ نمل کی آیت نمبر ۱۷ اور ۱۸ میں چیونٹیوں کے باتیں کرنے کا ذکر ہے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ تو جنوں پریوں کی کہانیوں والی بات ہے۔ کیا چیونٹیاں بھی آپس میں بات کر سکتی ہیں؟

لیکن آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ حیوانات میں سے چیونٹیوں کا طرزِ زندگی انسانی طرزِ زندگی کے قریب ترین ہے۔ یعنی انسانی طرزِ حیات سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ چیونٹیوں میں مردہ چیونٹیوں کو دفنانے کی عادت بھی موجود ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے درمیان رابطے کا ایک مکمل نظام موجود ہوتا ہے۔ ان کے درمیان پیغامات کی ترسیل کا ایک باقاعدہ نظام پایا جاتا ہے۔

اسی طرح سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ﴾

[النحل: ٦٩]

''اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے، جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔''

اس آیت قرآنی میں فرمایا گیا کہ شہد میں انسانوں کے لیے شفا رکھی گئی ہے اور آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ شہد میں جراثیم کش خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسی فوجی دورانِ جنگ اپنے زخموں پر شہد لگاتے رہے۔ اور نہ صرف ان کے زخم مندمل ہو جاتے تھے بلکہ زخم کا نشان بھی بہت کم باقی رہتا تھا۔ بعض اقسام کی الرجی کے علاج کے لیے شہد آج بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

اسی طرح قرآن دورانِ خون اور دودھ کی افزائش کے حوالے سے بھی بات کرتا ہے۔

سورۂ نحل کی آیت نمبر ۶۶ اور سورۂ مومنون کی آیت نمبر ۲۱ میں یہ ذکر موجود ہے اور نزول قرآن کے چھ سو سال بعد ابن نفیس نے دورانِ خون کا عمل دریافت کیا۔ مغربی دنیا کے حوالے سے دیکھا جائے تو نزول قرآن کے ایک ہزار سال بعد Harvey نامی سائنس دان نے یہ نظریہ عام کیا۔

قرآن علم الجنین کے بارے میں بھی بات کرتا ہے۔ قرآنِ مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات، سورۂ علق کی درجِ ذیل آیات تھیں۔

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ ﴾

[العلق : ۲ ۔ ۱]

”پڑھو (اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔“

”علقۃ“ کا ترجمہ خون کا لوتھڑا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس لفظ کا مطلب ”چپکنے والی چیز“ اور ”جونک نما چیز“ بھی ہوتا ہے۔ یہ آیت اور قرآن میں موجود علم الجنین کے حوالے سے موجود دیگر بیانات پروفیسر کیتھ مور کو دکھائے گئے تھے۔ پروفیسر صاحب کا تعلق ٹورنٹو، کینیڈا سے ہے اور وہ اس شعبے کے اعلیٰ ترین ماہرین میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔

کچھ عرب حضرات نے اس قرآنی ہدایت پر عمل کیا کہ ”اگر تم نہیں جانتے تو ان سے پوچھ لو جو جانتے ہیں“ اور وہ پروفیسر کیتھ مور کے پاس چلے گئے۔ یہ سارا لوازمہ ان کے سامنے رکھا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ تمام باتیں ٹھیک ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ قرآنی بیانات میں سے بیش تر تو جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں سو فی صد درست ہیں لیکن بعض بیانات ایسے ہیں، جن کے بارے میں وہ کوئی رائے نہیں دے سکتے کیوں کہ انھیں خود اس بارے میں مکمل علم حاصل نہیں ہے۔

ان آیات میں سے ایک آیت وہ تھی جس میں فرمایا گیا ہے کہ ”ہم نے انسان کو ایک جونک نما شے سے تخلیق کیا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب اپنی تجربہ گاہ میں گئے۔ انھوں نے جونک کی

تصاویر کا تقابل جنین کے بالکل ابتدائی مراحل کے ساتھ کیا۔ طاقتور خوردبین سے تفصیلی جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بالکل ابتدائی مراحل کے جنین اور جونک میں واقعی مشابہت پائی جاتی ہے۔

لہٰذا انھوں نے یہ بیان دیا کہ جو کچھ قرآن میں فرمایا گیا ہے، وہ صحیح اور درست ہے۔ یہی نہیں، پروفیسر مور نے آیاتِ قرآنی سے اخذ کردہ یہ معلومات اپنی کتاب ''The Developing Human.'' کے تیسرے ایڈیشن میں شامل کیں۔ اس کتاب کو اس سال کسی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا ایوارڈ بھی ملا۔ ڈاکٹر مور نے یہ بھی تسلیم کیا کہ علم الجنین کے حوالے سے قرآن جو معلومات فراہم کرتا ہے، جدید سائنس نے وہ باتیں حال ہی میں دریافت کی ہیں۔ کیوں کہ علم الجنین تو علم طب کی جدید ترین شاخوں میں سے ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ باتیں کسی انسان کے علم میں آج سے چودہ سو برس پہلے موجود ہوں۔ لہٰذا قرآن لازماً ایک الہامی کتاب ہے۔

قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ٥ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ٥ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ٥ ﴾ [الطارق: ۷-۵]

''پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

اور آج جدید علم الجنین ہمیں بتاتا ہے کہ ابتدائی مراحل میں جنسی اعضاء یعنی فوطے اور رحم وغیرہ اس مقام سے بنتے ہیں جہاں گردے ہوتے ہیں یعنی ریڑھ کی ہڈی اور گیارھویں بارھویں پسلی کے درمیان۔

سورۂ نجم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ٥ مِنْ نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنٰى ٥ ﴾

[النجم: ۴۶-۴۵]

''اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے، جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔''

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ ﴾ [القیمۃ: ۳۹-۳۷]

''کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔''

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی جنس کا تعین نطفہ کرتا ہے۔ یعنی مرد بچے کی جنس کا ذمہ دار ہوتا۔ جدید سائنس نے یہ حقیقت بھی حال ہی میں دریافت کی ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جنین تین اندھیروں یا تین تہوں کے اندر ہوتا ہے۔ اور جدید تحقیقات بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں۔

جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کا ذکر بھی قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے:

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ﴾ [المومنون: ۱۴-۱۲]

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی۔ پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاری گروں سے اچھا کاری گر۔''

سورۂ حج میں بھی یہ مراحل بیان فرمائے گئے ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ [الحج: ۵]

''لوگو، اگر تمھیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں، ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں۔ (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ ﴾ [السجدہ: ۹]

''پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں۔''

الدھر میں دوبارہ ارشاد ہوا:

﴿ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ [الدھر: ۲]

''ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔''

مذکورہ بالا دونوں آیاتِ قرآنی میں سننے کی صلاحیت کا ذکر'' دیکھنے کی صلاحیت'' یعنی بصارت سے پہلے آیا ہے۔ آج کا جدید علم طب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ سماعت کی قوت پہلے آتی ہے اور بصارت کی بعد میں، سماعت کا نظام پانچویں مہینے میں بن چکا ہوتا ہے جبکہ بصارت ساتویں ماہ میں مکمل ہوتی ہے۔

لوگوں نے سوال کیا کہ مرنے کے بعد تو انسان کی ہڈیاں بھی مٹی میں مل کر مٹی ہو چکی ہوں گی تو پھر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انسان کو دوبارہ کس طرح زندہ کرے گا؟

جواب میں فرمایا گیا:

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ٥ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ٥ ﴾ [القيمة : ٣ـ٤]

'' کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔''

مندرجہ بالا آیت میں ہڈیوں کے ساتھ انگلیوں کی پوروں کا ذکر کیوں فرمایا گیا ہے؟ قرآن کا بیان ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انگلیوں کی پوریں بھی ٹھیک بنا دینے پر قادر ہے۔ یہ ذکر کیوں کیا جا رہا ہے؟

۱۸۸۰ء میں انگلیوں کے نشانات Finger Prints کی مدد سے لوگوں کی شناخت کا طریقہ دریافت ہوا۔ یہ طریقہ کار آج بھی لوگوں کی شناخت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ کیوں کہ لاکھوں کروڑوں لوگوں میں کوئی دو انسان بھی ایسے نہیں ہوتے جن کی انگلیوں کے نشانات یکساں ہوں۔

اور قرآن آج سے چودہ سو سال پہلے ہی اس طرف اشارہ دے رہا ہے۔

ایسی بہت سی مثالیں مزید پیش کی جا سکتی ہیں۔ اگر آپ قرآن اور سائنس کے حوالے سے مزید تفصیلات جاننا چاہیں تو میری کتاب'' Quran & Modern Science ''[1] سے

[1] اس کتاب کا اُردو ترجمہ'' قرآن اور سائنس'' کے نام سے دارالنوادر کی جانب سے شائع کیا جا چکا ہے۔

رجوع کر سکتے ہیں۔

میں صرف ایک مثال مزید پیش کرنا چاہوں گا۔ تھائی لینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک سائنس دان تھے، جن کا نام تھا Prof-Thagada Shaun انھوں نے درد اور درد محسوس کرنے والے اعضا کے حوالے سے کافی تحقیقات کی ہیں۔ قبل ازیں خیال یہی تھا کہ درد محسوس کرنے کا عمل ایک دماغی عمل ہے۔ یعنی دماغ اعصاب کی مدد سے درد محسوس کرتا ہے۔ لیکن حال ہی میں دریافت ہوا ہے کہ درد محسوس کرنے کے عمل میں جلد بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ جلد میں Pain Receptors ہوتے ہیں جن کی مدد سے انسان درد محسوس کرتا ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نسا میں فرمایا گیا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ ﴾ [النساء: ٥٦]

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کردیا ہے، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے۔ اور جب ان کے بدن کی کھال جل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کردیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔''

قرآن کی یہ آیت واضح طور پر بتارہی ہے کہ جلد کا درد محسوس کرنے کے عمل سے براہِ راست تعلق ہے۔ یعنی یہاں Pain Receptors کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

ڈاکٹر تھاگاڈا کو جب اندازہ ہوا کہ یہ کتاب آج سے ۱۴۰۰ سال قبل ہی یہ معلومات فراہم کررہی تھی تو انھوں نے صرف اس ایک دلیل کی بنیاد پر قاہرہ میں ایک طبی کانفرنس کے دوران اسلام قبول کرنے کا اعلان کردیا۔ اور برسرِ عام کہہ دیا:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ))

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

اب اگر ایک دہریے سے پوچھا جائے کہ یہ تمام معلومات قرآن میں کہاں سے آگئی ہیں تو اس کا جواب کیا ہونا چاہیے؟ اس کے پاس ایک ہی جواب ہوگا۔ وہی جواب جو

ہمارے پہلے سوال کا تھا۔ پہلا سوال یہ تھا کہ ایک نامعلوم مشین کے بارے میں معلومات کس سے مل سکتی ہیں؟ جواب تھا۔ بنانے والے سے، خالق سے۔

قرآن میں یہ سارے حقائق بیان کرنے والا بھی اس کائنات کا خالق، اس کا بنانے والا اس کا ایجاد کرنے والا ہی ہے۔ جس کے لیے انگریزی میں GOD کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور عربی میں بہتر طور پر اللہ کا لفظ مستعمل ہے۔

Francis Beacon نے بجا طور کہا تھا:

''سائنس کا نامکمل علم آپ کو ملحد بنا دیتا ہے لیکن سائنس کا وسیع اور عمیق مطالعہ آپ کو خدا پر ایمان رکھنے والا بنا دیتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ آج کا سائنسدان جھوٹے خداؤں کو تو ردّ کر چکا ہے یعنی لا الٰہ کے مقام پر تو پہنچ چکا ہے لیکن ''الا اللہ'' کی منزل تک نہیں پہنچ پایا۔

میں اپنی گفتگو کا اختتام قرآنِ مجید کی اس آیت پر کرنا چاہوں گا:

﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ [حٰمٓ السجدہ: ۵۳]

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی۔ یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ط

حصہ دوم

سوال:...... مسلمان، خدا کو اللہ کہہ کر کیوں پکارتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... میری بہن نے سوال پوچھا ہے کہ مسلمان خدا کے لیے لفظ ''اللہ'' کیوں استعمال کرتے ہیں؟ اپنی گفتگو کے دوران میں نے قرآنِ مجید کی سورۂ اخلاص سے اللہ کی تعریف آپ کے سامنے پیش کی تھی۔ ان آیات میں فرمایا گیا ہے:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ [الاخلاص: ٤۔١]

''کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے۔ اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔''

لیکن قرآنِ مجید میں یہ بھی فرمادیا گیا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾ [بنی اسرائیل: ١١٠]

''اے نبیؐ! ان سے کہو'' اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔''

یعنی ہر اچھا نام اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ یہ بات قرآنِ مجید میں دیگر متعدد مقامات پر بھی فرمائی گئی ہے۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۚ﴾ [الاعراف: ١٨٠]

''اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اسے اچھے ناموں ہی سے پکارو۔''

﴿ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾

[الحشر: ٢٤]

''وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔''

﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝ ﴾ [طٰہٰ: ٨]

''وہ اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔''

گویا تمام بہترین نام اللہ ہی کے لیے ہیں لیکن ایک تو یہ نام خوبصورت ہونے چاہئیں اور دوسرے ان ناموں کو سن کر آپ کے ذہن میں کوئی تصویر نہیں بننی چاہیے۔ یعنی ان ناموں میں تجسیم کا کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔

رہی یہ بات کہ مسلمان لفظ اللہ کو انگریزی لفظ GOD کے مقابلے میں ترجیح کیوں دیتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے عربی لفظ ''اللہ'' ایک خالص اور منفرد لفظ ہے۔ جب کہ انگریزی لفظ ''گاڈ'' کی یہ صورت نہیں۔ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ممکن ہے۔ اگر آپ اس لفظ کے آخر میں حرف ''S'' لگا دیں تو یہ GODS بن جاتا ہے یعنی جمع کا صیغہ لیکن عربی لفظ ''اللہ'' کی کوئی جمع نہیں ہے۔ لہٰذا بہت سے خداؤں کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اللہ ایک ہی ہے۔

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ ﴾ [الاخلاص : ۱]

''کہو وہ اللہ ہے، یکتا۔''

اسی طرح اگر آپ انگریزی لفظ GOD کے آخر میں ''ESS'' کا اضافہ کر دیں تو یہ ایک اور لفظ GODESS بن جائے گا۔ یعنی ''مونث خدا''۔ جب کہ عربی لفظ اللہ کے ساتھ تذکیر و تانیث کا کوئی تصور وابستہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جنس کے تصور سے پاک ہے۔ انگریزی لفظ کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر آپ اسے بڑے ''G'' سے لکھیں گے تو اس کا مطلب خدا ہوگا لیکن اگر آپ اسے چھوٹے ''g'' سے لکھیں گے تو پھر اس کا مطلب ''دیوتا'' یا ''جھوٹے خدا'' ہوگا۔

اسلام میں صرف ایک ہی معبودِ حقیقی یعنی اللہ کا تصور موجود ہے۔ ہم کسی دیوتا وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے۔

اگر آپ لفظ God کے بعد Father کا اضافہ کر دیں تو یہ Godfather بن جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''فلاں میرا گاڈ فادر ہے'' یعنی فلاں میرا سرپرست ہے۔ لیکن لفظ اللہ

کے ساتھ اس نوع کا کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ ''اللہ ابا'' یا ''اللہ باپ'' جیسا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ God کے بعد Mother کا اضافہ کریں تو لفظ Godmother بن جائے گا۔ اس قسم کا کوئی لفظ بھی اسلام میں نہیں پایا جاتا۔

لفظ God سے قبل Tin لگا دیا جائے تو یہ Tingod بن جاتا ہے جس کے معنی ہیں جھوٹے خدا یا جعلی خدا۔ لیکن لفظ اللہ کے ساتھ اس قسم کا کوئی سابقہ یا لاحقہ لگانا ممکن ہی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ واحد و یکتا ہے۔ آپ اسے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں لیکن یہ نام خوبصورت ہونا چاہیے۔

میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... اردن شوری نے لکھا ہے کہ قرآنِ مجید کی چوتھی سورۃ کی گیارھویں بارھویں آیت میں ورثا کے حصے بیان کرتے ہوئے جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اگر آپ ان تمام حصوں کو جمع کریں تو حاصل جمع ایک سے زیادہ آتا ہے۔ بقول اردن شوری اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے مصنف کو ریاضی نہیں آتی تھی۔ آپ سے گزارش ہے کہ وضاحت فرمائیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... میرے بھائی نے سوال یہ پوچھا ہے کہ اردن شوری کا دعویٰ ہے کہ'' قرآنِ پاک کی سورۂ نسا کی آیت گیارہ اور بارہ میں بیان کردہ ورثا کے حصوں کو اگر جمع کیا جائے تو جواب ایک سے زیادہ آتا ہے'' اور یہ کہ'' اس طرح پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے مصنف کو ریاضی نہیں آتی تھی۔'' (نعوذ باللہ)

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اپنی گفتگو کے دوران میں واضح کیا تھا، بات یہ ہے کہ یوں تو سینکڑوں لوگ ہیں جو قرآن میں غلطیاں تلاش کرنے کے دعوے کرتے ہیں لیکن اگر آپ تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام دعوے غلط اور جھوٹے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک دعویٰ بھی ایسا نہیں جسے ثابت کیا جا سکے۔

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے، قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس حوالے سے بات کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیات میں وراثت کا بیان موجود ہے۔

سورۂ بقرہ...... آیت ۱۸۰

سورۂ بقرہ...... آیت ۲۴۰

سورۂ نسا...... آیت ۱۹

لیکن جہاں تک ان حصوں کی پوری تفصیل کا تعلق ہے تو یہ سورۂ نساء کی آیات ۱۱، ۱۲ اور پھر ۱۷۶ میں بیان کی گئی ہے۔ ارون شوری نے جس بیان کا ذکر کیا ہے وہ سورۂ نساء کی گیارھویں اور بارھویں آیت میں موجود ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَآ أَوْ دَيْنٍ آبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ○ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِن كَانُوٓا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ○ ﴾ [النساء: ۱۱۔۱۲]

''تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر (میت کی وارث) دو سے زاید لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی۔ (یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے) جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کردی جائے قرض جو اس پر ہو ادا کردیا جائے۔ اور تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کردیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اس کا آدھا حصہ تمھیں ملے گا، اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمھارا ہے۔ جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے اور وہ تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی، اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا۔ بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کردی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کردیا جائے۔

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے جب کہ وصیت

جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا بینا اور نرم خو ہے۔''

گویا مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان آیات میں پہلے اولاد پھر والدین اور پھر دیگر حصے دار بیان کر دیے گئے ہیں۔ اسلام وراثت کے بارے میں بڑی تفصیلی اور مکمل رہنمائی دیتا ہے۔ ان آیات میں بنیادی اصول بیان کر دیے گئے ہیں۔ مکمل تفاصیل کے لیے ہمیں حدیث کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے کہ جس کی تحقیق میں پوری زندگی صرف کی جاسکتی ہے۔ جب کہ ارون شوری صرف دو آیات پڑھ کر خود کو قانونِ وراثت پر رائے دینے کا اہل سمجھتا ہے۔

اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ریاضی کی ایک پیچیدہ مساوات حل کرنا چاہتا ہے لیکن علم ریاضی کے بنیادی اصول بھی نہیں جانتا۔ مثال کے طور پر وہ اصول جسے BODMAS کہا جاتا ہے، یعنی:

BO: Brackets off

D: Division

M: Multiplication

A: Addition

S: Subtraction

یہ ترتیب BODMAS کا اصول کہلاتی ہے۔ اگر اس ترتیب کو نظر انداز کر دیا جائے، آپ پہلے تفریق کریں پھر ضرب دیں پھر جمع کر دیں تو یقیناً آپ کا جواب غلط ہوگا، اسی طرح کا معاملہ ارون شوری کا ہے۔

ایک سیدھا سا اصول ہے کہ آپ والدین اور میاں یا بیوی کا حصہ ادا کرنے کے بعد اولاد میں ترکہ تقسیم کریں گے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس طرح حصوں کا کل میزان ایک

سے زیادہ آ جائے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... میں ایک نومسلم ہوں۔ میں نے ۱۹۸۰ء میں عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا، میں اپنے والدین کو یہ یقین کس طرح دلا سکتی ہوں کہ قرآن، انجیل کی نقل نہیں ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... میری بہن نے ایک سوال پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ پہلے مسیحی تھیں اور پھر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ میں انھیں مبارک باد دینا چاہوں گا اور ایک بار نہیں بلکہ تین بار مبارک باد دینا چاہوں گا۔ میں نے پہلے کہا تھا کہ میں دہریے کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس نے ''لا الٰہ'' تو کہہ دیا ہے۔ بہن کو میں تین دفعہ مبارک باد اس لیے دے رہا ہوں کہ اس نے ''لا الٰہ'' کہنے کے بعد ''الا اللہ'' بھی کہہ دیا ہے اور ''محمد رسول اللہ'' بھی کہہ دیا ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ ط

''کوئی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور محمدؐ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ پیغمبر ہیں۔''

لہٰذا میں اپنی بہن کو مبارک باد دیتا ہوں اور اب آتا ہوں ان کے سوال کی جانب۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنے والدین کے سامنے یہ بات کس طرح ثابت کریں گی کہ قرآن بائبل کی نقل نہیں ہے۔ یا بائبل سے استفادہ نہیں کرتا۔

جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو بتایا کہ ایک تاریخی حقیقت ہی ایسی ہے جو اس قسم کی کسی بات کا امکان ہی ختم کر دیتی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اُمّی تھے۔ یعنی پڑھے لکھے نہیں تھے۔

قرآن کہتا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ط﴾ [الاعراف: ۱۵۷]

''(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی اُمّیؐ کی پیروی

اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔''

اور بائبل میں کہا گیا ہے:

''اور پھر وہ کتاب کسی ناخواندہ کو دیں اور کہیں اس کو پڑھ اور وہ کہے میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔'' [یسعیاہ۔ باب ۲۹۔۱۲]

قرآن نے کہا کہ اس بات کا ذکر انجیل میں موجود ہے اور اگر آپ انجیل کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ واقعی موجود ہے۔ وہ مستشرقین جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے انجیل سے استفادہ کیا تھا (نعوذ باللہ)، وہ یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اس وقت تک انجیل کا عربی زبان میں کوئی ترجمہ ہوا ہی نہیں تھا۔

عہد نامہ عتیق کا قدیم ترین عربی ترجمہ بھی پیغمبر اسلامؐ کے دو سو سال بعد کا ہے جب کہ عہد نامہ جدید کا عربی ترجمہ تو کہیں ۱۶۱۶ء میں جا کر ہوا تھا۔ یعنی ایک ہزار سال بعد۔ یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ دونوں کتابوں میں کہیں کہیں جزوی مماثلتیں موجود ہیں لیکن اس کا سبب استفادہ نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ دراصل ایک تیسرا ذریعہ ہے جو دونوں کتابوں کی اصل ہے۔

تمام الہامی کتابوں کا بنیادی پیغام یعنی توحید تو ایک ہی ہے۔ گویا تمام الہامی کتابوں کا پیغام مشترک ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ سابقہ کتب سماویہ ایک خاص عرصے کے لیے تھیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ وحی کی سابقہ صورتیں کسی خاص مدت یا خاص قوم کے لیے تھیں۔ لہٰذا وہ اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہ سکیں اور ان میں تحریف راہ پا گئی۔ اب ان کتب میں بہت سی انسانی تحریفات موجود ہیں۔ لیکن ان تحریفات کے باوجود چوں کہ ان کی اصل ایک ہی تھی، لہٰذا مشترک نکات کا پایا جانا عین قرینِ قیاس ہے۔

محض ان مشابہتوں کی بنا پر یہ دعویٰ کر دینا بالکل غلط ہوگا کہ قرآنِ مجید میں انجیل یا دیگر صحائف سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ حضرتِ محمد مصطفیٰ ﷺ نے بائبل سے نقل کر کے قرآن تحریر کر دیا تھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

اور اس طرح تو یہ کہنا بھی لازم آتا ہے کہ عہد نامہ جدید میں عہد نامہ عتیق کی نقل کی گئی ہے کیوں کہ ان دونوں میں بھی بہت سی باتیں مشترک ہیں، لہٰذا حضرتِ عیسیٰ نے بھی پرانے عہد نامے سے استفادہ کیا ہوگا۔ (نعوذ باللہ) لیکن بات یہی ہے کہ ان دونوں صحائف کا بھی اصل ماخذ ایک ہی ہے۔

فرض کیجیے کوئی شخص نقل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی امتحان کے دوران میں کوئی شخص کسی سے نقل کرتا ہے، کیا وہ اپنے جواب میں کبھی اس شخص کا ذکر کرے گا جس سے نقل کی جارہی ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے واضح طور پر حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر فرمایا ہے۔ قرآن ان انبیا کا ذکر مکمل عزت و احترام کے ساتھ کرتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ اگر قرآن نعوذ باللہ ان کی نقل ہوتی تو کبھی ان کا ذکر نہ کیا جاتا۔ لہٰذا اس سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن انجیل کی نقل نہیں ہے۔

محض تاریخی حقائق سے ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کے لیے یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل ہو کہ قرآن اور انجیل میں سے کون سی کتاب درست ہے۔ لہٰذا ہم اپنے سائنسی علم سے مدد لیتے ہیں۔

سرسری جائزہ لینے پر قرآن اور بائبل کی بہت سی باتیں، قصص اور نکات یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر آپ تجزیہ کریں تو فرق آپ کے سامنے آجائے گا۔ مثال کے طور پر انجیل کی کتاب پیدائش میں کہا گیا ہے کہ دنیا چھ دن میں تخلیق کی گئی تھی، لیکن یہاں ''دن'' سے مراد ''۲۴ گھنٹے والا دن'' ہے۔ دوسری طرف قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے کہ کائنات چھ ایام میں تخلیق کی گئی تھی۔

﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ﴾

[الاعراف : ٥٤]

''درحقیقت تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں

پیدا کیا۔‘‘

یہی بات سورۂ یونس کی تیسری آیت میں اور بعض دیگر مقامات پر بھی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چھ ’’ایام‘‘ میں پیدا فرمایا۔ عربی لفظ ایام اصل میں ’’یوم‘‘ کی جمع ہے۔ یوم سے مراد ’’دن‘‘ بھی ہوتا ہے اور ایک طویل زمانہ بھی۔ لہٰذا جب ’’چھ ایام‘‘ سے مراد چھ طویل ادوار یا زمانے لیے جائیں تو جدید سائنس بھی اس بیان کو تسلیم کرتی ہے، لیکن جب بائبل یہ دعویٰ کرتی ہے کہ کائنات ۲۴ گھنٹے والے چھ دنوں میں بنی تھی تو کوئی بھی سائنسدان اس بیان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

اسی طرح بائبل کہتی ہے کہ دن اور رات پہلے دن بنا دیے گئے تھے جب کہ سورج کی تخلیق چوتھے دن ہوئی تھی۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ نتیجہ پہلے برآمد ہو اور سبب بعد میں تخلیق کیا جائے۔ روشنی کا ذریعہ ہی سورج ہے۔ بغیر سورج کے دن اور رات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بائبل کتاب پیدائش کی ابتدائی آیات میں یہی بتاتی ہے کہ روشنی، سورج کی تخلیق سے ۳ دن پہلے ہی تخلیق ہو گئی تھی۔ اور یہ قطعی غیر منطقی بات ہے۔

یہ بھی ایک غیر سائنسی اور غیر منطقی بیان ہے کہ دن اور رات تو پہلے تخلیق ہو جائیں اور زمین بعد میں وجود میں آئے۔ حالانکہ دن اور رات تو دراصل زمین ہی کی حرکت کا نتیجہ ہیں۔ لیکن بائبل یہی کہتی ہے۔

دوسری طرف قرآن بھی روشنی اور سورج کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے لیکن قرآن یہ غیر سائنسی بلکہ غیر ممکن ترتیب پیش نہیں کرتا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا آپ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بائبل سے یہ باتیں لیں لیکن ان کی اصلاح کر دی؟ ایسا نہیں ہو سکتا کیوں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے یہ باتیں کسی کے علم میں ہی نہیں تھیں۔

بائبل میں بتایا گیا ہے:

’’خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو سمندر اور خدا

نے دیکھا کہ اچھا ہے۔...........سو تیسرا دن ہوا۔

......سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے اور ایک نیر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا......سو چوتھا دن ہوا۔" [پیدائش ۱: ۲۰۔ ۹]

لیکن آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ چاند اور زمین دراصل ایک ہی بڑے ستارے کے حصے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ زمین سورج سے پہلے وجود میں آ جائے۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباسات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بائبل یہی بتا رہی ہے کہ زمین تیسرے دن تخلیق ہوئی جب کہ سورج چوتھے دن وجود میں آیا۔

بائبل یہ بھی کہتی ہے کہ تمام نباتات تیسرے دن وجود میں آئیں:

"اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں کو اور پھل دار درختوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلیں اور جو زمین پر اپنے آپ ہی بیج رکھیں اُگائے اور ایسا ہی ہوا۔" [پیدائش ۱: ۱۲۔ ۱۱]

جب سورج چوتھے دن وجود میں آیا۔ سورج کی روشنی کے بغیر نباتات کی افزائش ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی طرح سورج اور چاند کے بارے میں بتایا گیا کہ ایک نیر اصغر ہے اور ایک نیر اکبر۔ ایک بڑی روشنی ہے ایک چھوٹی روشنی۔ یعنی بائبل چاند کو بھی ایک از خود روشن جسم قرار دیتی ہے۔

جب کہ قرآن کا بیان میں نے پہلے آپ کے سامنے پیش کیا۔ سورۂ فرقان کی آیت کے پیش نظر پتہ چلتا ہے کہ چاند کی روشنی مستعار ہے۔

تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارے پیغمبرؐ نے بائبل سے یہ باتیں نقل کیں (نعوذ باللہ) لیکن بائبل کی تمام سائنسی غلطیاں درست کر دیں۔ یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔

اگر آپ اُن قصص اور واقعات کا جائزہ لیں جو بائبل اور قرآن میں مشترک ہیں تو ان کے درمیان بھی آپ کو فرق نظر آ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بائبل ہمیں حضرت آدم علیہ السلام

کے بارے میں بتاتی ہے کہ زمین پر پہلے انسان حضرتِ آدم علیہ السلام تھے۔ لیکن بائبل ان کی زمین پر آمد کا وقت بھی معین کر دیتی ہے جو کہ تقریباً ۵۸۰۰ سال قبل بنتا ہے۔ جب کہ آج سائنس آثارِ قدیمہ کی مدد سے یہ ثابت کر چکی ہے کہ زمین پر انسان اس سے ہزار ہا سال پہلے بھی موجود تھا۔

اسی طرح بائبل حضرتِ نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی تفصیل سے بتاتی ہے۔ اور طوفان نوح علیہ السلام کا بھی ذکر کرتی ہے۔ بائبل کا کہنا ہے کہ یہ طوفان عالم گیر تھا، یعنی پوری زمین پر آیا تھا۔ اور روئے زمین پر موجود تمام حیات اس طوفان کے نتیجے میں فنا ہو گئی تھی۔ سوائے ان کے جو حضرتِ نوح علیہ السلام کی کشتی میں موجود تھے۔ بائبل اس طوفان کا وقت اندازاً اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح کا بتاتی ہے۔ آج ماہرین آثار قدیمہ ہمیں بتاتے ہیں کہ مصر کا گیارھواں حکمران خاندان اور بابل میں تیسرا حکمران خاندان اس وقت حکومت کر رہے تھے۔ لیکن ان علاقوں میں اس طوفان کے کسی قسم کے اثرات کا سراغ نہیں ملتا۔

قرآن بھی طوفانِ نوحؑ کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن ایک تو قرآن اس طوفان کا وقت معین نہیں کرتا اور دوسرے قرآنی بیان کے مطابق یہ ایک مقامی طوفان تھا۔ قرآن اس طوفان کے عالم گیر ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ قرآن کے مطابق یہ سیلاب صرف قومِ نوحؑ کے لیے آیا تھا۔ اور یہ ایک ایسا بیان ہے جس پر آج کے سائنسدان بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکتے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں آپ خود یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں بائبل سے استفادہ موجود ہے یا نہیں؟

سوال:...... پہلی بات تو میں یہ کرنا چاہوں گا کہ تمام ہندو گرو رجنیش کو بھگوان نہیں سمجھتے۔ دوسرے میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھنا چاہوں گا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ہر قوم کی طرف ہدایت بھیجی گئی تھی۔ تو کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وید مقدس بھی الہامی کتابیں ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بھائی نے سوال پوچھنے سے پہلے ایک بات یہ کی کہ تمام ہندو گرو رجنیش کو بھگوان نہیں سمجھتے۔ میں نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تمام ہندو گرو رجنیش کو بھگوان مانتے ہیں، میری تمام گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔ آپ اسی گفتگو کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھ سکتے ہیں لہٰذا یہاں تو یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ''بعض ہندو گرو رجنیش کو بھگوان سمجھتے ہیں۔ میں نے تمام ہندوؤں کے بارے میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا تھا۔ میں ہندومت کے بارے میں، ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں ان متون کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں۔

جہاں تک بھائی کے اس سوال کا تعلق ہے کہ چوں کہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد انبیاء بھیجے ہیں اور متعدد صحائف نازل فرمائے ہیں تو کیا میں وید، شاستروں اور دیگر متون پر بھی یقین رکھتا ہوں؟ دیگر پیغمبروں پر بھی یقین رکھتا ہوں؟ ان کا بنیادی سوال یہی ہے۔ میں ان کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ قرآن ہمیں واقعی یہی بتاتا ہے۔

﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ ﴾ [فاطر: ٢٤]

''ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو۔''

﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ ﴾ [الرعد: ٧]

''اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔''

آپ کا سوال یہ ہے کہ کیا ان آیات کی روشنی میں، میں ویدوں پر یا ویدوں کے الہامی ہونے پر یقین رکھتا ہوں؟ کیا میں دیگر پیغمبروں پر یقین رکھتا ہوں؟ بات یہ ہے کہ قرآن ۲۵ انبیائے کرام کا ذکر نام لے کر کرتا ہے۔ حضرتِ آدم، حضرتِ ابراہیم، حضرتِ اسماعیل، حضرتِ موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد ﷺ سمیت ۲۵ انبیائے کرام کے اسمائے گرامی قرآن میں موجود ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے

کرام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان میں سے ۲۵ کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ دیگر کے بارے میں امکان ہی ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی کسی شخص کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاید وہ نبی تھے، شاید نہیں تھے۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔

تو کیا میں ویدوں کے الہامی ہونے پر یقین رکھتا ہوں؟ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ویدوں کی تعلیمات اور قرآنی تعلیمات میں کوئی مطابقت پائی جاتی ہے؟ جی ہاں! ایسی مطابقت موجود ہے۔

مثال کے طور پر ویدوں میں خدا کا ذکر موجود ہے۔ یجروید کے تیسرے باب کی آیت نمبر ۳۲ میں کہا گیا ہے:

''تم خدا کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے۔''

یجروید، باب ۳۲، آیت ۳ میں تحریر ہے:

''خدا جسم اور شکل سے پاک ہے۔''

یجر وید کے باب نمبر ۴۰، آیت نمبر ۸ میں بھی یہی کہا گیا ہے:

''خدا نہ جسم رکھتا ہے اور نہ صورت۔''

آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

''خدا ایک ہی ہے، دوسرا کوئی خدا نہیں ہے، ہرگز نہیں۔''

اسی طرح رگ وید، جلد ۸، باب ۱، آیت ۱ میں کہا گیا:

''تمام تعریفیں صرف اسی کے لیے ہیں۔''

رگ وید، جلد ۶، باب ۴۵، آیت ۱۶ میں کہا گیا:

''صرف ایک ہی خدا ہے، اسی کی عبادت کرو۔''

ہمیں ویدوں کے اس طرح کے بیانات قبول کرنے میں ہرگز تامل نہیں ہوگا۔ یہ بیانات الہامی بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے لیے صحیح اور غلط معلوم کرنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ معیار قرآنِ مجید ہے۔ کیوں کہ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری اور حتمی ہدایت کا

ذریعہ ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کو مذکورہ بالا بیانات کو تسلیم کرنے یعنی منجانب اللہ تسلیم کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن کچھ دوسری باتیں بھی ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ان کتابوں میں تحریف و تدلیس ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا ان کتابوں کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو کہ انسانی ہے، جو تحریف کے نتیجہ میں ان کا حصہ بنا ہے۔ اور اس حصے کو منزل من اللہ تسلیم کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ غیر سائنسی اور غیر منطقی بیانات جس طرح بائبل میں موجود ہیں اسی طرح ویدوں میں بھی موجود ہیں۔ اس وقت میں ان کے حوالے سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔

سو بات یہ ہے کہ ہمیں یہ امکان تسلیم کرنے پر تو کوئی اعتراض نہیں کہ اپنی اصل صورت میں یہ کتابیں الہامی ہو سکتی ہیں۔ انجیل کے بارے میں ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اپنی اصل صورت میں یہ وحی خداوندی تھی۔ کیوں کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ وہ وحی ہے جو حضرتِ عیسیٰ مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

اسی طرح پیغمبروں کا معاملہ ہے۔ یقیناً بہت سے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ اور جہاں تک رام اور کرشن وغیرہ جیسی شخصیات کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ کیا وہ بھی نبی تھے؟ تو ہمارا جواب ہوگا کہ ''وہ نبی ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی''، یعنی ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مجھے ان لوگوں سے بالکل اتفاق نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ رام علیہ السلام یا کرشن علیہ السلام۔ یہ غلط ہے۔

میں یہی کہتا ہوں کہ ان کا نبی ہونا ممکن ضرور ہے لیکن فرض کیجیے کہ رام واقعی اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے۔ اور فرض کیجیے کہ وید واقعی الہامی کتابیں تھیں۔ پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ یہ ایک خاص زمانے کے لیے تھے۔ اور اسی زمانے تک محدود تھے۔ ان کا پیغام صرف ایک خاص زمانے کے لوگوں کے لیے ہی تھا۔ ہمیشہ کے لیے نہیں تھا۔ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کا آخری اور حتمی پیغام ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے، ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے ہے۔

انجیل اور وید وغیرہ کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اپنی اصل صورت میں یہ منزل من اللہ تھے تو اپنے زمانے ہی کے لیے تھے۔ آج کے لیے نہیں۔ قرآن آخری وحی ہے اور حضرتِ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں۔ لہٰذا آج ہمیں ہدایت کے لیے قرآن اور صاحب قرآن ﷺ ہی کی پیروی کرنا پڑے گی۔

سوال:...... میرا سوال یہ ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... میری بہن نے سوال پوچھا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو بالعموم ملاحدہ کی جانب سے پوچھا جاتا ہے۔ دہریے اور عقل پسند عموماً یہ سوال پوچھا کرتے ہیں۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ میرے ایک قریبی دوست کا بمبئی کے ایک عقلیت پرست گروپ کے ساتھ مباحثہ ہوگیا۔ اس نے انھیں وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں قائل کرنے کے لیے ان سے سوالات کرنا شروع کیے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ کپڑا کہاں سے آیا ہے؟ کتاب کہاں سے آئی ہے؟ قلم کہاں سے آیا ہے؟ ہر چیز کے بارے میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اس کا کوئی نہ کوئی خالق موجود ہے، اس نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ سورج کہاں سے آیا ہے؟ چاند کو کس نے بنایا ہے؟ اس نے ان سے کہا کہ آپ یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ہر چیز کا کوئی خالق موجود ہے۔ یہ کوئی ایک شخص بھی ہوسکتا ہے اور ایک کارخانہ بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اب میرے ان سوالوں کا جواب دو کہ سورج اور چاند کا خالق کون ہے؟

ان عقلیت پسندوں نے کچھ توقف کے بعد کہا کہ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ ہر چیز کا کوئی خالق موجود ہے، لیکن ہماری شرط یہ ہے کہ آپ اپنا بیان تبدیل نہیں کریں گے یعنی اس بیان پر قائم رہیں گے کہ ہر چیز کا کوئی خالق بھی ہوتا ہے۔ اپنے اس بیان سے پھریں گے نہیں۔

میرا وہ دوست بہت خوش ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کامیاب ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنا سوالات کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ سورج کو کس نے بنایا ہے؟ چاند کو کس نے بنایا ہے؟ مجھے میری ماں نے جنم دیا، انھیں اُن کی والدہ نے جنم دیا لیکن سوال یہ ہے کہ پہلا

خالق کون تھا؟

پہلا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے ہر چیز کو تخلیق کیا ہے۔ میرے دوست کا خیال تھا کہ وہ اس مباحثے میں غالب آچکا ہے۔

لیکن پھر دہریے نے ایک سوال کیا۔ اس نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتے ہیں لیکن شرط وہی ہے کہ آپ اپنی دلیل سے پھریں گے نہیں۔ اپنا بیان تبدیل نہیں کریں گے اور سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟

میرے دوست کو شدید ذہنی دھچکا پہنچا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ساری رات سو نہیں سکا۔ اگلے دن وہ میرے پاس آیا اور اس نے یہ پورا واقعہ مجھے سنایا۔ اس کی بات سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ وجود باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے وہی دلائل استعمال کر رہا تھا جو پہلے بھی بعض فلاسفہ استعمال کر چکے ہیں۔ اور یہ فلاسفہ منطق کا ایک اہم اصول نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنی بات کا خود تجزیہ نہیں کرتے۔

اگر آپ میری گفتگو کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ میں نے کہیں بھی یہ دلیل استعمال نہیں کی کہ ہر چیز کا کوئی خالق ضرور ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر میں ایسا کہتا تو میں خود ہی پھنس جاتا۔ اسی لیے میں نے یہ دلیل پیش نہیں کی۔

میں نے تو خود دہریے سے یہ سوال کیا تھا کہ کسی بھی چیز کے بارے میں معلومات کس کے پاس ہوں گی؟ اور اس کا جواب تھا کہ اس شے کے خالق کے پاس، موجد کے پاس، یہ جواب میں نے نہیں بلکہ ایک دہریے نے دیا تھا۔

فرض کیجیے یہ سوال مجھ سے کیا جاتا کہ:

”ذاکر بھائی، وہ پہلا شخص کون ہوگا جو کسی بھی نامعلوم مشین کے بارے میں ہمیں مکمل معلومات فراہم کر سکے؟“

میرا جواب یہ ہوگا کہ کوئی بھی شے جو بنائی گئی ہے، جو ایک ابتدا رکھتی ہے اس کے بارے میں، اس کے افعال کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والا پہلا شخص اس کا موجد

یا خالق ہی ہوگا۔ میں یہاں اپنی منطق استعمال کر رہا ہوں کیوں کہ میں پھنسنا نہیں چاہتا۔

چناں چہ جب میں یہ جواب دیتا ہوں کہ ہر اس چیز کے بارے میں، جو ایک ابتدا رکھتی ہے، جو کسی وقت تخلیق ہوتی ہے، اس کے بارے میں علم رکھنے والی پہلی شخصیت اس کے خالق کی ہوگی تو اس دلیل کو استعمال کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے۔

سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ اس کائنات کی ایک ابتدا ہے۔ یہ کسی وقت عدم سے وجود میں آئی تھی۔ اسی طرح سورج کا بھی ایک آغاز ہے۔ چاند کا بھی ایک آغاز ہے۔ لہٰذا یہاں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی نوعیت وافعال کے بارے میں ہمیں علم کون فراہم کرسکتا ہے اور جواب ہوگا ''کائنات کا خالق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ۔''

آپ نے سوال پوچھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی آپ سے یہ سوال کرے:

''میرے بھائی ٹام نے ایک بچے کو جنم دیا ہے، بتائیں یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟

میں ایک ڈاکٹر ہوں اور جانتا ہوں کہ ایک مرد بچے کو جنم نہیں دے سکتا لہٰذا بچے کی جنس کے بارے میں سوال لایعنی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ سوال پوچھنا ہی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے بنایا ہے۔ یہ سوال ہی لایعنی ہے۔ خدا ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ سے ہے۔

امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

سوال :......بعض مستشرقین یہ دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ الزام لگاتے ہیں کہ دراصل نبی کریم ﷺ نے عربوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے قرآن تحریر کیا تھا اور اسے الہامی اس لیے قرار دیا تاکہ اس کی قبولیت میں اضافہ ہوسکے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :......میرے بھائی نے ایک سوال پیش کیا ہے اور ان کی

اس بات سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں کہ بعض مستشرقین واقعی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے محبوب پیغمبر حضرتِ محمد مصطفےٰ ﷺ نے غلط بیانی کی تھی۔ (نعوذ باللہ) اور یہ کہ قرآن کو کلامِ الٰہی قرار دینے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عربوں کی اصلاح کی جا سکے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور قرآنِ مجید کا مقصد صرف عربوں کی اصلاح نہیں تھا بلکہ پوری انسانیت کی اصلاح تھا۔ ان کا پیغام محض عربوں کے لیے نہیں بلکہ پوری بنی نوع انسان کے لیے تھا۔

لیکن اگر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے تو اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربوں کی اخلاقی طور پر اصلاح کرنا چاہتے تھے تو وہ اس کے لیے غیر اخلاقی ذرائع کیوں کر استعمال کر سکتے تھے۔ ایک اخلاقی معاشرے کی تشکیل غیر اخلاقی طریقوں سے کس طرح کی جا سکتی ہے۔

آپ خود تصور کیجیے۔ اگر آپ معاشرے کی اخلاقی اصلاح کرنا چاہتے ہوں تو کیا آپ اپنے کام کا آغاز دروغ گوئی سے کریں گے؟

دروغ گوئی اور غلط بیانی سے کام صرف وہی لوگ لیتے ہیں جو درحقیقت اپنا فائدہ چاہتے ہیں۔ جو غلط لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زبانی طور پر لاکھ کہتے رہیں کہ وہ دنیا کی اصلاح کرنا چاہتے لیکن درحقیقت وہ مال و دولت کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ میں پہلے ہی ثابت کر چکا ہوں کہ انھیں مال و دولت دنیا کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ سو اگر آپ کا مقصد سچائی ہے تو اس مقصد کے حصول کے لیے ذرائع بھی سچائی پر مبنی ہی ہونے چاہئیں۔

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ [الانعام: ۹۳]

''اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑے، یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے درآں حالے کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو، یا جو اللہ کی

نازل کردہ چیز کے مقابلے میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھادوں گا۔‘‘

اگر نبی کریم ﷺ (نعوذ باللہ) غلط بیانی کر رہے ہوتے تو یقیناً وہ خود اپنی کتاب میں ایسا کرنے والے کو برا بھلا نہ کہتے۔ کوئی بھی ایسا نہ کرے گا کیوں کہ اگر آگے چل کر کوئی جھوٹ سامنے آجائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود کو ہی برا بھلا کہہ رہا تھا۔

اسی طرح آگے چل کر قرآنِ مجید میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ۝ ﴾ [الحاقة: ٤٣-٤٧]

’’یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔‘‘

اگر نبی کریم ﷺ نے کبھی کوئی غلط بیانی کی ہوتی (نعوذ باللہ) تو وہ کبھی یہ باتیں اپنی کتاب میں درج نہ کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر یہ غلط بیانی لازماً پکڑی جاتی اور اس وقت ان آیات کا کیا مطلب ہوتا؟

اسی قسم کی بات قرآنِ مجید کی درج ذیل آیات میں بھی کی گئی ہے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ ﴾ [الشورىٰ: ٢٤]

’’کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے؟ اگر اللہ چاہے تو تمھارے دل پر مہر کردے۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے

فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے۔ وہ سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔''

﴿ اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۰۵]

'' (جھوٹی باتیں نبیؐ نہیں گھڑتا بلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے، وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔''

اسی طرح قرآنِ مجید میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں خود پیغمبر ﷺ کی بات کی اصلاح فرمائی گئی ہے۔ اگر قرآن (نعوذ باللہ) خود رسول اللہ ﷺ کی تصنیف ہوتی جیسا کہ بعض مستشرقین کہتے ہیں تو وہ خود ان باتوں کا ذکر کیوں کرتے؟

اس کی ایک واضح مثال سورۂ عبس میں ملتی ہے:

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ ﴾ [عبس: ۱-۱۰]

'' ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمھیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔ حالاں کہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمھارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔''

یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کچھ کفار کے سرداروں سے بات کر رہے تھے اور اس دوران ایک نابینا صحابی جن کا نام عبداللہ ابن مکتوم تھا، وہ اس گفتگو کے دوران الجھن پیدا کر رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ کفار کے سرداروں سے اہم بات چیت فرما رہے تھے۔ نابینا صحابیؓ کو اس دوران میں بات ٹوکنی نہیں چاہیے تھی۔ لہٰذا نبی کریمؐ

نے انھیں سرزنش فرمائی۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا، کیسا ہی شخص ہوتا، یہ بات ایسی نہیں تھی جس پر اعتراض کیا جاسکتا۔ لیکن یہاں معاملہ رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ آپؐ کا کردار اس قدر بلند تھا، اس قدر عظیم تھا، آپؐ غریب اور بے سہارا لوگوں کے اس قدر ہمدرد تھے کہ اس بات پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور آپؐ جب بھی اس صحابیؓ سے ملتے تو اس بات پر ان کا شکریہ ادا کرتے کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اصلاح فرمائی۔

اس قسم کی متعدد مثالیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ تحریم، سورۂ نحل اور سورۂ انفال۔

اگر رسول اللہ ﷺ نے عربوں کی اصلاح کے لیے قرآن خود تحریر کیا ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ یہ مقامات قرآن میں موجود نہ ہوتے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... آپ نے اپنی گفتگو کے دوران میں ایسے بہت سے سائنسی حقائق کا ذکر کیا جو کہ قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا قرآنِ مجید میں علم ریاضی سے متعلق بھی حقائق موجود ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن نے سوال کیا ہے کہ میں نے ایسے بہت سے سائنسی حقائق کے بارے میں بات کی ہے جن کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ تو کیا ایسے ریاضیاتی حقائق بھی ہیں؟ کیا قرآنِ مجید میں ریاضی کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے؟

جی ہاں، قرآن نے ایسی بہت سی باتیں ہمارے سامنے پیش کی ہیں جن کا تعلق ریاضی سے ہے۔ سب سے پہلے تو ہم ارسطو کے پیش کردہ اس اصول کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ ہر بیان یا تو درست ہوگا یا غلط۔ یعنی ہر بیان درست بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ صدیاں گزر گئیں اور ہر کوئی اس اصول کو درست تسلیم کرتا رہا۔ سو سال پہلے تک اس اصول کو بالکل درست سمجھا جاتا رہے۔ محض سو سال پہلے ہی ایک شخص نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر ہر بیان کے درست یا غلط ہونے کا امکان موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود یہ بیان بھی یا

درست ہوگا یا غلط۔ اگر یہ درست ہے تو ٹھیک، لیکن اگر یہ غلط ہے تو پھر؟ اس صورت میں ریاضی کا پورا نظام ہی منہدم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ریاضی دانوں نے ایک نیا موقف اپنایا۔ انھوں نے کہا کہ جب بھی آپ کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے دو ممکنہ معانی ہو سکتے ہیں۔ یعنی ایک تو اصطلاحی معانی اور ایک لغوی معانی۔ بعض اوقات آپ اُس لفظ ہی کے بارے میں بات کر رہے ہوتے ہیں اس کے معانی کے بارے میں نہیں۔ میں آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

فرض کیجیے ایک بچہ جس کا نام اکبر ہے۔ میں اس کے بارے میں کہتا ہوں:

''اکبر چھوٹا ہے۔''

اب معانی کے لحاظ سے میں بالکل ٹھیک کر رہا ہوں۔ اکبر ایک چھوٹا لڑکا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اکبر چھوٹا ہے۔ لیکن ایک عربی جاننے والا شخص میری بات پر اعتراض کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اکبر چھوٹا نہیں ہے۔ ''اکبر بڑا ہے۔'' اکبر کا مطلب ہی ''بڑا'' ہوتا ہے۔ اب ہوا یہ ہے کہ میں ایک لفظ کا ذکر کر رہا تھا۔ اس لفظ کو استعمال نہیں کر رہا تھا۔

ایک اور مثال پر غور کیجیے۔ فرض کیجیے میں کہتا ہوں:

''۳ ہمیشہ ۴ سے پہلے آتا ہے۔''

کوئی میری اس بات سے اختلاف نہیں کرے گا۔ ہر کوئی یہی کہے گا کہ میں درست کہہ رہا ہوں۔ واقعی ۳ ہمیشہ ۴ سے پہلے آتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے ایک متشکک اس بات پر اعتراض کر دے۔ وہ مجھے بتائے گا کہ انگریزی لغت میں Three ہمیشہ Four کے بعد آئے گا۔ کیوں کہ حرف ''T'' ہمیشہ حرف ''F'' کے بعد ہی آتا ہے۔ یہاں معاملہ الٹ ہو گیا۔ میں بات استعمال کے لحاظ سے کر رہا ہوں لیکن وہ متشکک ایک ایسی مثال دے رہا ہے جہاں محض ذکر ہوا ہے۔ استعمال نہیں ہوا۔

یعنی جب آپ ایک لفظ سے کام لیتے ہیں تو اس کی دو ممکنہ صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو

آپ اس لفظ کا ذکر کر رہے ہوں گے اور یا اس لفظ کو استعمال کر رہے ہوں گے۔

اپنی گفتگو کے دوران میں نے سورۂ نساء کی یہ آیت آپ کے سامنے پیش کی تھی:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ ﴾ [النساء: ۸۲]

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔''

اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ اور آج تک کوئی قرآن میں سے اختلاف کی کوئی مثال پیش بھی نہیں کر سکا۔ یعنی قرآن کلام خداوندی ہے۔ لیکن فرض کیجیے یہاں بھی ایک متشکک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں قرآن میں اختلاف دکھا سکتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کہاں؟ وہ کہتا ہے کہ ''سورۂ نسآ، آیت ۸۲ میں ''اختلاف'' کا لفظ اس آیت میں موجود ہے۔ لہٰذا قرآن کا بیان غلط ثابت ہو جاتا ہے۔''

اب اختلاف کا لفظ تو واقعی قرآن میں موجود ہے تو کیا یہ واقعی ایک غلطی ہے؟ (نعوذ باللہ)۔ میں کہتا ہوں ٹھہرو، اس آیت کو غور سے پڑھو۔ یہاں کہا جا رہا ہے کہ ''بہت سے اختلافات ہوتے'' جب کہ تم صرف ایک جگہ اختلاف کا لفظ دکھا رہے ہو۔ یعنی قرآن کا بیان ہی درست ہے۔ کیوں کہ قرآن بہت سے اختلافات کے بارے میں کہہ رہا ہے اور اختلاف کا لفظ قرآن میں ایک ہی بار استعمال ہوا ہے، کثیر تعداد میں استعمال نہیں ہوا۔

لیکن اس طرح میں اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ کیوں کہ ایک اور متشکک اٹھے گا اور کہے گا کہ دیکھو قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ کسی اور کی جانب سے ہوتا تو تم اس میں ''اختلافاً کثیرا'' پاتے۔ اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ''اختلافاً کثیرا'' کے الفاظ اس آیت میں موجود ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ (نعوذ باللہ)

مجھے اندازہ ہے کہ بات ذرا زیادہ پیچیدہ ہوگئی ہے۔ تفہیم ذرا مشکل ہوگئی ہے لیکن میں ایک آسان مثال بھی پیش کروں گا۔

بہر حال بات مذکورہ آیت کی ہو رہی تھی۔ اس آیت کریمہ میں یہ نہیں کہا گیا کہ:

”اگر قرآن میں کثیر اختلاف ہوں تو یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔“

بلکہ فرمایا جا رہا ہے:

”اگر یہ غیر اللہ کی جانب سے ہوتا تو اس میں کثیر اختلاف ہوتے۔“

اور اسی لیے متشککین کی منطق درست نہیں۔ پہلی صورت میں ان کی منطق درست ہوسکتی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے بات اس انداز میں بیان ہی نہیں فرمائی۔ اور مذکورہ بالا دونوں باتیں الگ ہیں۔ ایک ہی بات نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے اس مثال پر غور کریں۔

”بمبئی میں رہنے والے تمام لوگ ہندوستانی ہیں۔“

یہ ایک درست بیان ہے۔ لیکن اس بیان سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ:

”تمام ہندوستانی بمبئی میں رہتے ہیں۔“

تو یہ نتیجہ بالکل غلط ہوگا۔ کسی بیان کی معکوس صورت ہمیشہ درست نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ صورت بھی درست ہوتی ہے اور بعض اوقات نہیں بھی۔

اب میں ایک سادہ اور آسان سی مثال سے اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ٥ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ٥ ﴾

[المومنون: ۲۔۱]

”یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔“

یہ آیت پڑھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ”ٹھہریں جناب! میں ایک ایسے مسلمان کو جانتا ہوں جو بڑے خشوع وخضوع سے پانچ وقت نماز پڑھتا ہے لیکن وہ دھوکہ باز ہے، لوگوں کو لوٹتا ہے۔ ہر معاشرے میں کالی بھیڑیں ہوتی ہیں لیکن دیکھیں یہاں قرآن کی بات غلط ثابت ہو رہی ہے۔ (نعوذ باللہ) کیوں کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ حقیقی مومن اپنی نمازوں میں

خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

میں اسے کہوں گا کہ ٹھہرو اور قرآن کے الفاظ غور سے پڑھو۔ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ حقیقی ایمان والے نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہہ رہا کہ نماز میں خشوع اختیار کرنے والا ہر شخص فلاح یافتہ مومن ہے۔ اگر قرآن نے یہ کہا ہوتا کہ نماز میں خشوع اختیار کرنے والے تمام لوگ فلاح یافتہ مومن ہیں تو یہ بات غلط ثابت ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ریاضی کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسے متشککین بھی ہیں جو قرآن میں غلطیاں ہی تلاش کریں گے، لہٰذا وہ منتخب الفاظ استعمال کرتا ہے۔

میں ایک مثال اور پیش کرنا چاہوں گا، قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ﴾ [آل عمران : ۵۹]

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔''

آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ عیسیٰؑ اور آدمؑ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا فرمایا، معانی بالکل صاف ہیں لیکن اگر آپ غور کریں تو ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآنِ مجید میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ۲۵ مرتبہ آیا ہے اور حضرتِ آدم علیہ السلام کا ذکر بھی ۲۵ بار ہوا ہے، یعنی معانی کے لحاظ سے اگر دونوں یکساں ہیں تو دونوں کا ذکر بھی یکساں تعداد میں ہوا ہے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا گیا:

﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ ﴾ [الاعراف : ۱۷۶]

''اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو

زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو پھر بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔''

''آیات کو جھٹلانے'' کے الفاظ قرآنِ مجید میں پانچ مرتبہ آئے ہیں اور کتے کے لیے عربی لفظ کلب بھی پانچ مرتبہ آیا ہے۔ یعنی مشبہ اور مشبہ بہ معنوی لحاظ سے تو یکساں ہیں ہی، ان کا ذکر بھی یکساں مرتبہ کیا گیا ہے۔

﴿ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۝ ﴾ [فاطر: ۲۰]

''اور نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔''

عربوں میں اندھیرے کے لیے لفظ ''ظلمت'' استعمال ہوتا ہے جب کہ روشنی کے لیے نور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ظلمت کا لفظ قرآن مجید میں ۲۴ مرتبہ استعمال ہوا ہے جب کہ ''نور'' کا لفظ قرآن میں ۲۳ مرتبہ آیا ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ معنوی لحاظ سے دونوں یکساں نہیں ہیں بلکہ دونوں کا ذکر بھی یکساں تعداد میں نہیں ہوا ہے۔ دونوں برابر نہیں ہیں کیوں کہ ۲۳ اور ۲۴ برابر نہیں ہیں۔

گویا قرآن نے جنھیں یکساں قرار دیا ان کا ذکر بھی یکساں تعداد میں کیا اور جنھیں مختلف قرار دیا ان کا ذکر بھی مختلف ہے۔

اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ لیکن آج ہم سب جانتے ہیں کہ سوچنے کا کام دل نہیں بلکہ دماغ کرتا ہے۔ کیا آپ اس بات کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بہن نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ بہن نے سوال پوچھنے سے پہلے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نومسلمہ ہیں۔ میں پہلے تو انھیں بھی تین بار مبارک باد

پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے پوچھا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید کے بعض مقامات پر فرماتا ہے کہ بعض لوگوں کے ''دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے'' اور یوں ان لوگوں کی اصلاح کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ میں ان کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ واقعی قرآنِ مجید میں ایسے ارشادات موجود ہیں۔

ان کا سوال یہ ہے کہ آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سوچنے کا کام دل نہیں بلکہ دماغ کرتا ہے تو پھر قرآن یہاں دل کا ذکر کیوں کر رہا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کا یہی خیال تھا کہ سوچنے کا کام دل کرتا ہے۔ تو کیا یہاں (نعوذ باللہ) قرآن کا بیان غلط ہے؟

قرآنِ مجید کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ ﴾ [طٰهٰ : ۲۸-۲۵]

''موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''پروردگار، میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔''

یہاں بھی یہی دعا کی جا رہی ہے کہ میرا سینہ یعنی دل کھول دے۔ بات یہ ہے کہ عربی لفظ سے ایک مراد تو سینہ یا دل ہوتا ہے اور دوسرے ''مرکز''۔ لفظ صدر کا ایک مطلب مرکز بھی ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کراچی جانے کا اتفاق ہو تو وہاں ایک علاقہ ہے کراچی صدر۔ صدر کراچی سے مراد ہوتی ہے کراچی کا مرکز۔ یعنی لفظ صدر سے مراد مرکز ہے۔ سو قرآن بھی یہاں یہی بتا رہا ہے کہ سوچنے سمجھنے کے مرکز پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ اور اس مرکز سے مراد دماغ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ میرے فہم و ادراک کے مرکز کو کھول دے۔ (آمین)

اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... ذاکر صاحب کیا یہ تضاد نہیں ہے کہ قرآن بعض مقامات پر ابلیس کو جن

قرار دیتا ہے اور بعض جگہ فرشتہ؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے سوال پوچھا ہے کہ متعدد مقامات پر ابلیس کو فرشتہ کہا گیا ہے اور پھر ایک مقام پر قرآن اسے جن قرار دیتا ہے تو کیا یہ تضاد نہیں ہے؟ بات یہ ہے کہ قرآن متعدد مقامات پر ابلیس و آدمؑ کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ یہ واقعہ قرآنِ مجید میں کئی سورتوں میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف، سورۂ حجر، سورۂ اسراء، سورۂ طٰہٰ، سورۂ صٓ، وغیرہ۔ ان تمام سورتوں میں یہی بات کی گئی ہے کہ جب فرشتوں کو حکم ملا کہ آدمؑ کے سامنے جھک جائیں تو سب سجدے میں جھک گئے سوائے ابلیس کے، جس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ مذکورہ بالا تمام سورتوں میں یہی بات کی گئی ہے لیکن ایک مقام پر ابلیس کو جن قرار دیا گیا ہے۔ جس کے حوالے سے بھائی نے سوال کیا ہے۔ انھوں نے حوالہ نہیں دیا لیکن یہ سورۂ کہف کی یہ آیت ہے:

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ﴾ [الکھف: ۵۰]

"یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔"

اس آیت میں ابلیس کو جن قرار دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوا کہ سات مقامات پر ابلیس کا ذکر فرشتوں کے ضمن میں ہو رہا ہے اور پھر ایک مقام پر اسے جن قرار دیا جا رہا ہے تو کیا یہ تضاد اور اختلاف نہیں ہے؟

بات یہ ہے کہ ہم انگریزی تراجم پڑھتے ہیں اور ان کی مدد سے قرآن کو سمجھتے ہیں لیکن قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔ اور عربی زبان کا ایک قاعدہ ہے جسے "تغلیب" کہتے ہیں۔ تغلیب سے مراد ہوتی ہے کہ جب آپ اکثریت کا ذکر کرتے ہیں تو اقلیت بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ یعنی جب آپ لوگوں کی اکثریت سے خطاب کریں گے تو اقلیت کو شامل

سمجھا جائے گا۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے ایک جماعت میں سو طالب علم ہیں۔ جن میں سے ننانوے لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔ اب اگر میں عربی میں انھیں کہوں:

''لڑکو، کھڑے ہو جاؤ۔''

تو وہ لڑکی بھی کھڑی ہو جائے گی کیوں کہ وہ تغلیب کے اصول کو سمجھتی ہوگی۔ لیکن اگر میں انگریزی میں کہوں کہ:

" All boys, Stand up."

تو صرف لڑکے کھڑے ہوں گے، لڑکی بیٹھی رہے گی۔ کیوں کہ انگریزی زبان میں تغلیب کا اصول موجود نہیں ہے۔

لہٰذا بات یہ ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔ اور عربی زبان میں جب فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکثریت فرشتوں کی تھی۔ ابلیس جن تھا یا فرشتہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ حکم سب کے لیے تھا۔

ان تمام آیات میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی جائے گی کہ وہ جن تھا یا فرشتہ؟ کیوں کہ تغلیب کے قاعدے کی رو سے حکم سب کو ملا تھا۔ اور سب کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔ لیکن سورۂ کہف کی بیسویں آیت میں بتا دیا گیا کہ وہ ایک جن تھا۔

دوسری بات یہ کہ فرشتے اپنی مرضی کے مالک نہیں ہوتے۔ انھیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ہر حکم پر بلا چون و چرا عمل پیرا ہونا ہوتا ہے۔

جب کہ جن ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے۔ لہٰذا اس سے بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ ایک جن ہی تھا۔ مجھے اُمید ہے، آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... اگر ہم یہ یقین رکھتے ہیں خدا مافوق الفطرت ہے اور سب کچھ کرنے پر قادر ہے تو پھر وہ انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کرسکتا؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن نے سوال پوچھا ہے کہ خدا مافوق الطفرت ہے اور سب کچھ کرنے پر قادر ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی صورت کیوں نہیں اختیار

کرسکتا؟ وہ لوگ جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ خدا مافوق الفطرت ہے۔ عموماً جتنے بھی لوگ خدا کو مانتے ہیں سب ہی یہ بات کرتے ہیں کہ خدا مافوق الفطرت ہے۔ سب سے پہلے تو میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا واقعی خدا مافوق الفطرت ہے۔ خدا کو مافوق الفطرت Super Natural کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ خدا ایک چیز ہے اور فطرت ایک دوسری چیز جس پر خدا فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ قرآن کے بیان کردہ تصور خدا کے مطابق خدا کو مافوق الفطرت نہیں کہنا چاہیے۔ کیوں کہ فطرت تو خدا کی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے جس نے فطرت کو خلق فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ فطرت کچھ کہے اور خدا کچھ اور کہے۔

آپ کی فطرت یعنی فطرتِ انسانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کی تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی میں سے ایک ''فاطر'' بھی ہے۔ یہ قرآنِ مجید کی پینتیسویں سورۃ کا نام بھی ہے۔ فاطر کا لفظ فطرت ہی سے نکلا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے تخلیق کرنے والا، بنانے والا، فطرت عطا کرنے والا، مخلوقات کی اصل فطرت وضع کرنے والا۔

اسی طرح رمضان المبارک میں ہم مغرب کے وقت روزہ افطار کرتے ہیں یعنی روزہ توڑتے ہیں۔ افطار کا مطلب ہے روزہ توڑنا۔ فاطر کا مطلب ہے خالق۔ اشیا کو بنانے والا، صورت عطا کرنے والا، فطرت عطا کرنے والا۔

قرآن لوگوں سے کہتا ہے کہ مظاہر فطرت پر غور کرو، سورج اور چاند کی گردش پر غور کرو یہ سب قوانین فطرت کی پابندی کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی اپنے مدار سے باہر نہیں جاتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا تصور بھی عین فطری ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ ﴾ [الاحزاب: ٦٢]

''اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

اسی طرح کا پیغام قرآنِ مجید میں ایک اور مقام پر بھی دیا گیا ہے۔ سورۂ روم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشادِ پاک ہے:

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط﴾

[الروم: ۳۰]

''قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں کی جا سکتی۔''

آج کوانٹم فزکس اور جدید ترین سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ کسی دیکھنے والے کے بغیر کسی شے کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ کائنات بھی لایعنی ہے اگر اس پر نظر رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ایک نام الشہید بھی ہے یعنی گواہ۔ یعنی خدا مافوق الفطرت نہیں ہے بلکہ فطری ہے۔ جہاں تک سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے، کہ خدا اگر سب کچھ کرنے پر قادر ہے تو وہ انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کر سکتا؟

اس بات کو سمجھانے کے لیے میں خدا پر ایمان رکھنے والوں سے ایک سوال کیا کرتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کا تصور ان کے لیے واضح تر ہو سکے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا خدا ہر شے کو پیدا کر سکتا ہے؟

اور ان کا جواب ہوتا ہے کہ ہاں اللہ تعالیٰ ہر چیز پیدا فرما سکتا ہے۔

پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کرنے پر قادر ہے؟

ان کا جواب ہوتا ہے:

ہاں، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کر سکتا ہے۔

میرا تیسرا سوال ہوتا ہے:

کیا اللہ تعالیٰ کوئی ایسی چیز بنا سکتا ہے جسے وہ فنا نہ کر سکے؟

اور یہاں وہ پھنس جاتے ہیں۔ اگر وہ جواب ہاں میں دیتے ہیں کہ خدا کوئی ایسی چیز بنا سکتا ہے جسے وہ فنا نہ کر سکے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے دوسرے بیان کی نفی کر رہے ہیں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ جواب نفی میں دیتے ہیں، اگر وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی شے نہیں بنا سکتا جسے وہ فنا نہ کر سکے تو وہ اپنے پہلے بیان کی تردید کرتے

ہیں یعنی یہ کہ اللہ ہر چیز بنا سکتا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ منطقی انداز میں نہیں سوچ رہے ہوتے۔ بہت سے کام ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ ایک طویل القامت پست قد آدمی نہیں بنا سکتا۔ آدمی یا تو طویل قامت ہوگا یا پست قد اللہ تعالیٰ پست قامت کو طویل کرسکتا ہے لیکن پھر وہ پست قد نہیں رہے گا۔ وہ طویل قامت کو پست قد کرسکتا ہے لیکن پھر وہ طویل نہیں رہے گا یا وہ اس کا قد درمیانہ کرسکتا ہے جو پست ہوگا نہ طویل لیکن وہ ایک انسان کو طویل القامت بونا نہیں بنا سکتا۔

میں ایسے ہزار ہا کاموں کی فہرست بنا سکتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ نا انصافی نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ یہ تمام کام نہیں کرسکتا کیوں کہ خدا ہونے کا مطلب یہی ہے کہ وہ یہ سب کام نہیں کرسکتا۔ وہ بھول نہیں سکتا، وہ ظلم نہیں کرسکتا۔

پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے مار سکتا ہے، فنا کرسکتا ہے، ختم کرسکتا ہے لیکن کسی ایسی جگہ نہیں بھیج سکتا جہاں اس کا حکم نہ چلتا ہو۔ وہ مجھے فنا کرسکتا ہے لیکن اپنی خدائی سے باہر نہیں نکال سکتا۔ کیوں کہ سب کچھ اسی کا ہے سب کچھ اس کی خدائی میں ہے۔

قرآن کہیں یہ نہیں کہتا کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔''

قرآن بتاتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، کوئی شے ایسی نہیں جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔ یہ بات قرآن میں متعدد مقامات پر کہی گئی ہے، بار بار دہرائی گئی ہے، سورۂ بقرہ میں، سورۂ آل عمران میں، سورۂ فاطر میں اور متعدد دیگر آیات میں فرمایا گیا ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ ﴾

کہیں بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ اللہ ہر کام کرسکتا ہے اور ان دونوں باتوں میں کہ ''اللہ ہر کام کرسکتا ہے'' اور

''اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''

زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بلکہ قرآنِ مجید میں تو ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴾ [البروج: ١٦]

''وہ جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے۔''

یعنی وہ جو کچھ چاہتا ہے، جس بات کا ارادہ کرتا ہے، وہی کرتا ہے۔ وہ ارادہ کس کام کا کرتا ہے اللہ، صرف افعال الٰہیہ ہی کا ارادہ فرماتا ہے۔ خدائی کام ہی کرتا ہے۔ ایسے کام نہیں کرتا جو اس کے مرتبہ سے فروتر ہوں۔

جہاں تک آپ کے بنیادی سوال کا تعلق ہے، تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کرسکتا؟

خدا کے انسانی صورت اختیار کرنے کا فلسفہ ''حلول'' کہلاتا ہے اور اس فلسفے کے ماننے والوں نے اپنی ایک بظاہر خوبصورت منطق وضع کر رکھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے، ان کے دکھ درد اور مسائل کو سمجھنے کے لیے انسانی صورت اختیار کرتا ہے تاکہ وہ جان سکے کہ جب آپ دکھی ہوتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں، جب آپ خوش ہوتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ اور اس طرح وہ انسانیت کے لیے اوامر و نواہی وضع فرماتا ہے۔ یہ عقیدۂ حلول ہے۔

لیکن اگر آپ تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ منطق بالکل کمزور ہے۔ فرض کیجیے میں کسی شے کا خالق ہوں۔ فرض کیجیے میں ایک ٹیپ ریکارڈر یا ٹیلی ویژن ایجاد کرتا ہوں۔ اب یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس ٹیپ ریکارڈر یا ٹی وی کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا، مجھے خود ٹیپ ریکارڈر یا ٹی وی بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے صرف یہ کرنا ہوگا کہ ایک ہدایتی کتابچہ لکھ دوں کہ اس ٹیپ ریکارڈر کو استعمال کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ اس میں کیسٹ کس طرح ڈالی جائے گی اور کون سا بٹن دبانے

سے یہ چل پڑے گا؟ کون سا بٹن دبانے سے رک جائے گا۔ یہ بٹن دبائیں تو فارورڈ ہوگا، فلاں بٹن دبائیں تو ریوائنڈ ہوگا۔

اسی طرح انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا کو خود انسان بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسانوں کو ان کا بھلا برا بتانے کے لیے وہ صرف یہ کرتا ہے کہ انھی میں سے ایک شخص کو منتخب کرتا ہے اور اس کے ذریعے انھیں ہدایتی کتابچہ فراہم کر دیتا ہے۔

یہ کتابچہ کیا ہے؟ قرآنِ مجید ہی وہ ہدایت نامہ ہے جس کے ذریعے انسانیت کو اوامر و نواہی کا علم دیا گیا ہے۔ انھیں بتا دیا گیا ہے کہ ان کے حق میں کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ قرآن کے ذریعے انھیں مکمل ہدایت فراہم کر دی گئی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو انسانی صورت اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آپ پوچھتے ہیں:

''کیا خدا انسانی صورت اختیار کر سکتا ہے؟''

میں کہتا ہوں، ہاں، کر سکتا ہے لیکن جس وقت وہ انسانی صورت میں آئے گا وہ خدا نہیں رہے گا۔ کیوں کہ انسان فانی ہے اور خدا لافانی۔ کوئی بیک وقت فانی اور لافانی کس طرح ہو سکتا ہے؟

اسی طرح انسانوں کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انھیں کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے اور قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ [الانعام: ١٤]

''کہو، اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا مالک ہے جو روزی دیتا ہے، روزی لیتا نہیں ہے۔''

روزی اور خوراک کی ضرورت تمام انسانوں کو ہوتی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت ہے؟ ہرگز نہیں۔

اسی طرح انسان کو نیند کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ﴾

[البقرہ: ۲۵۵]

اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔''

انسان کو سونے کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور آرام کی بھی۔ اسے کھانے کی بھی حاجت ہوتی ہے اور پینے کی بھی۔ جس وقت آپ خدا کے انسانی صورت میں آنے کی یا مافوق الفطرت ہونے کی بات کرتے ہیں تو گویا آپ ملحد اور دہریے کے ہاتھ میں وہ چھڑی دے دیتے ہیں جس سے وہ آپ کو پیٹ سکتا ہے۔

لہٰذا خدا مافوق الفطرت نہیں، عین فطری ہے اور وہ انسانی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔

اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... میں ایک عیسائی ہوں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اسلام حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ تسلیم کرتا ہے کہ انھیں آسمان پر اٹھالیا گیا تھا۔ جب کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح مسلمان یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام معجزانہ طور پر بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اگر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں ہیں تو پھر بھی وہ حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ضرور ہیں۔ تو آپ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کیوں پیش نہیں کرتے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے ایک بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ لیکن اس قسم کے سوال عموماً مشنریوں کی جانب سے، مسیحی مبلغین کی جانب سے پوچھے جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بھائی ایک مبلغ ہیں یا نہیں لیکن اس قسم کے سوالات عموماً وہی کرتے ہیں۔ انھوں نے دو تین مثالیں دیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تھا یا یہ کہ ان کی پیدائش ایک معجزے کے طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی۔ جب کہ

حضرتِ محمد مصطفےٰ ﷺ کو آسمان پر بھی نہیں اٹھایا گیا۔ ان کے والد بھی تھے اور والدہ بھی۔

اس قسم کے سوالات کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ افضل کون ہے؟ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام۔ اسی طرح پوچھا جاتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نام لے کر قرآنِ مجید میں ۲۵ مرتبہ کیا گیا ہے۔ جب کہ حضرتِ محمد ﷺ کا صرف پانچ مرتبہ۔ تو افضل کون ہے؟ اور ہمارے ذہن میں خیال آتا ہے کہ اس طرح تو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام ہی افضل ہیں۔

تو بھائی! آپ چاہتے ہیں کہ میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بات کروں۔ تو بات یہ ہے کہ اسلام وہ واحد غیر عیسائی مذہب ہے، جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایمان کی شرط ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو تسلیم کیا جائے۔ ہم ان کی بغیر باپ کے پیدائش پر بھی یقین رکھتے ہیں حالاں کہ دورِ حاضر کے بہت سے عیسائی بھی اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔

ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے، اللہ کے حکم سے اندھوں کو بینا کر دیا کرتے تھے۔

لیکن یہاں ہماری راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔ ہم حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ہرگز نہیں سمجھتے۔ اور نہ ہی ہم انھیں خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ ہم انھیں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر مانتے ہیں۔

اب ہم آپ کے سوال کی طرف آتے ہیں کہ اگر قرآن یہ بتاتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا جب کہ حضرتِ محمد ﷺ کو آسمان پر نہیں اٹھایا گیا تو پھر دونوں میں سے افضل کون ہے؟............

قرآن میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے فرمایا گیا ہے:

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ط ﴾

[النسآء: ۱۷۱]

’’اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی

بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا۔''

اس آیت مبارکہ میں اہل کتاب کو غلو سے منع کیا گیا ہے۔ کون سے غلو سے؟ ایک طرف یہود تھے جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت ہی کا انکار کر رہے تھے اور انھیں جھوٹا کہہ رہے تھے۔ جب کہ عیسائی انھیں خدا قرار دے رہے تھے۔ دونوں طرف انتہا پسندی تھی۔

خدا صرف ایک ہی ہے۔ رفع مسیح کا سبب غلط فہمی رفع کرنا تھا۔ ان کی آمد ثانی بطورِ رسول کے نہیں ہوگی۔ وہ ہمیں نئی تعلیمات دینے کے لیے نہیں آئیں گے۔

سورۂ مائدہ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ ﴾ [المائدہ: ۳]

''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے۔ اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے۔ اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

ہم مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ دوبارہ تشریف لائیں گے۔ لیکن وہ کوئی نئی تعلیم نئی شریعت دینے کے نہیں آئیں گے۔ بلکہ وہ خود فرمائیں گے:

''یا باری تعالیٰ، تو گواہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کو کبھی اپنی پرستش کرنے کا حکم نہیں دیا۔ میں نے انھیں کبھی نہیں کہا کہ مجھے خدا کا بیٹا سمجھیں۔''

درحقیقت وہ عیسائیوں ہی کے لیے تشریف لائیں گے مسلمانوں کے لیے نہیں۔

دوسری بات آپ کرتے ہیں ان کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کے حوالے سے۔ اگر آپ اس وجہ سے انھیں خدا قرار دیتے ہیں کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو اس بات کا جواب قرآن اِن الفاظ میں دیتا ہے:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ

كُنْ فَيَكُوْنُ ○ ﴾ [آل عمران : ۵۹]

"اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔ کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہوجا اور وہ ہوگیا۔"

کیا حضرتِ آدم علیہ السلام کا کوئی باپ تھا؟

نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا۔ بلکہ ان کی ماں بھی نہیں تھی۔ اگر اس بنیاد پر آپ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا قرار دیتے ہیں تو پھر حضرتِ آدم علیہ السلام کو ان سے بڑا خدا قرار دینا چاہیے۔ (نعوذ باللہ)

انجیل تو ایک اور غیر معمولی انسان King Malchisedec کا بھی ذکر کرتی ہے، جس کا نہ کوئی آغاز تھا اور نہ اختتام۔

جہاں تک سوال ہے قرآنِ مجید میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر پچیس مرتبہ ہونے کا اور حضرتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر صرف پانچ مرتبہ ہونے کا تو اس کی وجوہات بھی بالکل واضح ہیں۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام پر (یہودیوں کی طرف سے) الزامات تھے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی الزام نہیں تھا جس کا جواب دیا جانا ضروری ہوتا۔ جب قرآن نازل ہو رہا تھا تو حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود وہاں موجود تھے۔ جو شخص آپ کے سامنے موجود ہو اس کو بار بار مخاطب کرنے یا اس کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جو دوست موجود نہ ہو اس کا ذکر آپ ہر بار نام لے کر کریں گے۔

لہٰذا حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام چوں کہ اس وقت موجود نہیں تھے، جب قرآن نازل ہو رہا تھا، لہٰذا ان کا ذکر ہر بار نام لے کر کیا گیا۔ اور اگر یہی معیار ہے تو پھر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر تو ۱۳۲ مرتبہ کیا گیا ہے تو کیا وہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اور حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سے افضل ہیں؟ نہیں۔ بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ چوں کہ وہ موجود نہیں تھے، لہٰذا ان کا ذکر ہر بار نام لے کر کیا جانا ضروری تھا۔

اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... میرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی؟ حالاں کہ آج ایسے جدید طریقہ ہائے کار دریافت ہو چکے ہیں جن کی مدد سے بآسانی بچے کی جنس معلوم ہو سکتی ہے۔ اس صورتِ حال کی آپ کیا وضاحت فرمائیں گے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بہن نے سوال پوچھا ہے کہ قرآن کے مطابق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ رحم میں پلنے والے بچے کی جنس کیا ہے؟ میں ان کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ آج ایسے کئی جدید ٹیسٹ دریافت ہو چکے ہیں جن کی مدد سے بچے کی جنس معلوم کی جا سکتی ہے۔ تو کیا یہ ایک غلطی ہے؟

بہن قرآنِ مجید کی جس آیت کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ سورۂ لقمان کی ایک آیت ہے۔ اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ ﴾ [لقمٰن : ٣٤]

’’اُس گھڑی کا (قیامت) علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے۔ کوئی متنفس یہ نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔‘‘

اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا ہے ان پانچ باتوں کا علم سوائے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے کسی کو نہیں ہے۔ جہاں تک بچے کی جنس کے حوالے سے آپ کے سوال کا تعلق ہے تو بات یہ ہے یہ محض غلط فہمی ہے جس کی وجہ تراجم خصوصاً بعض اُردو تراجم ہیں۔ جن میں اس آیت کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی بچے کی جنس کے بارے میں نہیں جانتا۔ آیت میں جنس کا ذکر ہی نہیں ہے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا کہ رحم

میں کیا ہے؟ قرآن بچے کی جنس کے حوالے سے بات نہیں کر رہا بلکہ اس بچے کے کردار اور شخصیت کے حوالے سے بات کر رہا ہے۔ کیا وہ بچہ نیک ہوگا، ایمان دار ہوگا یا بے ایمان؟ وہ معاشرے کے لیے کیا کردار ادا کرے گا؟ وہ انجینئر بنے گا؟ ڈاکٹر بنے گا؟ اور یقین کیجیے اپنے تمام تر علم طب اور سائنسی معلومات کے باوصف یہ باتیں آج بھی وقت سے پہلے کوئی نہیں بتا سکتا۔ لہٰذا یہ محض غلط تراجم سے پیدا ہونے والی غلط فہمی ہے۔ آپ لغات دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی لغات بھی ہیں جو غیر مسلموں کی مرتبہ ہیں۔ ان میں سے Lane Lexicon سب سے زیادہ مشہور ہے۔ آپ ان کی مدد سے خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان آیاتِ مبارکہ میں جنس کا ذکر موجود ہی نہیں ہے۔

اس آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ بھی سوائے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے کسی کے علم میں نہیں ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے قیامت آنے کی پیش گوئیاں کیں۔ مثال کے طور پر نومبر ۱۹۹۲ء میں ٹائمز آف انڈیا اخبار میں یہ خبر آئی کہ کوریا کے کسی چرچ نے یہ اعلان کیا کہ دنیا نومبر ۱۹۹۲ء میں ہی ختم ہو جائے گی۔

اس چرچ سے وابستہ تمام لوگ مذکورہ تاریخ کو اس چرچ میں جمع ہوئے لیکن ہوا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ دنیا آج بھی قائم ہے اور قیامت کی پیش گوئی کرنے والے لوگوں کے پیسے لے کر فرار ہو گئے۔

اسی طرح بارش کا معاملہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آج محکمہ موسمیات وقت سے پہلے ہی بارش کی پیش گوئی کر سکتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ پیش گوئیاں کس حد تک درست ہوتی ہیں خصوصاً انڈیا میں۔

لیکن ہو سکتا ہے بعض لوگ کہیں کہ ترقی یافتہ ممالک مثلاً امریکہ میں یہ پیش گوئیاں درست ہوتی ہیں۔ چلیے ہم ان کی بات مان لیتے ہیں۔ فرض کر لیتے ہیں کہ وہاں واقعی اطلاعات درست ہوتی ہیں لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ محکمہ موسمیات بارش کی پیش گوئی کس طرح کرتا ہے؟ اس کے لیے بادلوں کی موجودگی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پھر ہوا کا رخ دیکھا

جاتا ہے۔ اور یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں بارش تو بادلوں میں موجود ہوتی ہے۔ صرف برسنے کا اندازہ لگانا ہوتا ہے۔

یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی طالب علم امتحان دے، جس کا نتیجہ ایک ماہ بعد آنا ہو۔ تین ہفتے بعد وہ استاد جس نے پرچے چیک کیے ہیں وہ پیش گوئی کرے کہ فلاں طالب علم اوّل آئے گا۔ اس میں کوئی خوبی نہیں کیوں کہ پرچے چیک کرنے کی وجہ سے اسے وہ معلومات پہلے ہی حاصل ہوگئی ہیں جو دوسرے لوگوں کو ایک ہفتے بعد حاصل ہوں گی۔

بات تو جب ہے کہ محکمۂ موسمیات کسی خاص علاقے کے بارے میں بغیر بادلوں کو دیکھے یہ بتائے کہ ۲۰۰ سال بعد وہاں بارش ہوگی یا نہیں؟ میں چیلنج کرتا ہوں کوئی بھی محکمہ موسمیات دوسو سال کی پیش گوئی کرے کہ دنیا میں کہاں کتنی بارش ہوگی اور وہ کبھی ایسا نہیں کرسکیں گے۔

اس کے بعد موت کا معاملہ آتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک خودکشی کرنے والا یہ بتاسکتا ہے کہ وہ کہاں اور کس وقت مرے گا لیکن ہم جانتے ہیں کہ خودکشی کی کوشش کرنے والوں کی اکثریت ناکام ہوجاتی ہے۔ دنیا میں کتنے فی صد لوگ خودکشی کی کوشش کرتے ہیں؟ ایک انتہائی معمولی اور ناقابل ذکر تعداد۔ اور ان کی اکثریت بھی اپنی کوشش میں ناکام ہوجاتی ہے۔ کچھ لوگ زہر کھاتے ہیں اور پھر کسی کو بتادیتے ہیں۔ انھیں ہسپتال پہنچایا جاتا ہے اور ان کی جان بچالی جاتی ہے۔

اگر آپ کہیں سے چھلانگ مارتے ہیں تو پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ آپ مرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں۔ اگر اللہ آپ کو بچانا چاہے تو پھر بھی بچاسکتا ہے۔ اور اگر آپ مرجاتے ہیں تو پھر بھی آپ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ کی مرضی سے ہی مرتے ہیں۔

اور جہاں تک آخری بات کا تعلق ہے کہ کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کیا کمائے گا تو اس کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ بھائی ذاکر مجھے تو پتہ ہے کہ میں دو ہزار روپے کماؤں گا۔ میری ماہانہ آمدن دو ہزار روپے ہے۔ تو کیا قرآن کا بیان غلط ہے؟

نہیں، کیوں کہ قرآن آپ کی معاشی آمدن کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ دنیاوی کمائی کا ذکر نہیں کر رہا۔ یہاں لفظ "تکسب" استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد اچھے برے اعمال بھی ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک نیک اعمال کا تعلق ہے وہ اگر آپ کرتے بھی ہیں تو آپ کو یہ علم تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کتنا ثواب کما رہے ہیں؟

اسی طرح اگر آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو پھر بھی آپ یہ نہیں جانتے کہ اس کی آپ کو کتنی سزا ملے گی۔ ان تمام باتوں کا حساب اللہ ہی کے پاس ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... ارون شوری نے اسلام کے خلاف متعدد مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ آپ انھیں چیلنج یعنی عوامی مناظرے کا چیلنج کیوں نہیں دیتے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... سوال پوچھا گیا ہے کہ میں ارون شوری کو مناظرے کا چیلنج کیوں نہیں دیتا، جس نے اسلام کے خلاف کتابیں لکھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں یہ تحریر پڑھ چکا ہوں۔ اس کے بیش تر مقالات کا تعلق دو نکات سے ہوتا ہے۔ ایک تو وہ خواتین کے حوالے سے بات کرتا ہے کہ اسلام خواتین کو مساوی حقوق نہیں دیتا اور دوسرے وہ یہ کہتا ہے کہ اسلام ایک دہشت گرد مذہب ہے۔ یہ ایک بے رحم اور ظالم مذہب ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ ادھر ادھر کی باتیں جیسا کہ ایک بھائی نے سوال پوچھا تھا کہ کیا (نعوذ باللہ) خدا ریاضی نہیں جانتا؟ ہم ان باتوں کا تجزیہ کر سکتے ہیں اور یقین کیجیے اس کی تمام باتیں سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے، غلط حوالوں اور غلط ترجموں کو بنیاد بنا کر کے کی گئی ہیں۔ میں ان تمام باتوں کی وضاحت کر سکتا ہوں اور کر رہا ہوں۔

اگر آپ اس کی تازہ ترین کتاب (World of Fatwas, Shariah in Action.) کا جائزہ لیں جو کچھ ہی دن پہلے بمبئی سے شایع ہوئی ہے۔ اس کے سرورق پر قرآن مجید کی آیت درج کی گئی ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ

بَيْنَهُمْ ﴾ [الفتح : ۲۹]

’’محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔‘‘

یہاں بھی اس نے وہی کام کیا ہے کہ سیاق وسباق سے الگ کر کے ایک بات پیش کر دی ہے اور تاثر یہ پیش کرنا چاہا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کے حق میں بے رحم ہیں۔ اگر آپ اس آیت کو درست سیاق وسباق میں پڑھنا چاہیں تو یہ بات آیت نمبر ۲۵ سے شروع ہو رہی ہے۔ اور فرمایا جا رہا ہے کہ وہ لوگ، کفار جنھوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور قربانی کرنے سے روکا، ان کے حق میں مسلمان سخت ہیں۔ یہاں ذکر ان کفار کا ہو رہا ہے جنھوں نے مسلمانوں کو حج کا فریضہ ادا کرنے سے روکا تھا، آپ خود بتائیے کہ اگر آج کوئی عیسائیوں کو ویٹیکن سٹی میں داخل ہونے سے روکے تو عیسائی اسے اچھا سمجھیں گے یا برا؟

یا فرض کیجیے کوئی ایک ہندو کو بنارس میں داخل ہونے سے روک دے تو کیا وہ ہندو اس روکنے والے کو پسند کرے گا؟

قدرتی بات ہے کہ وہ اسے ناپسند کرے گا۔ یہاں بھی اگر آپ سیاق وسباق کو ملحوظ رکھ کر مطالعہ کریں تو یہی بات کی جا رہی ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے اور حج کا فریضہ ادا کرنے سے روکا ہے مسلمانوں کو ان کے حق میں سخت اور آپس میں نرم خو ہونا چاہیے۔

اس کتاب کے صفحہ ۱۵۷ اور ۲۷۵ پر وہ اپنی پسندیدہ آیت کا حوالہ دیتا ہے۔ یہ سورۂ توبہ کی پانچویں آیت ہے، جس کا حوالہ وہ بار بار دیتا ہے:

﴿ فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ﴾

[التوبہ : ۵]

''پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو، جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

یہاں بھی وہی معاملہ ہے کہ بات سیاق وسباق سے الگ کر کے کی جا رہی ہے۔ یہاں بات سورۂ توبہ کی پہلی آیت سے شروع ہو رہی ہے۔ اور ان مشرکینِ مکہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھوں نے مسلمانوں سے ایک امن معاہدہ کیا تھا اور پھر یک طرفہ طور پر معاہدہ توڑ دیا۔ معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں واضح انتباہ کر دیا گیا کہ یا تو چار ماہ کے دوران معاملات سیدھے کرلو اور یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور مسلمانوں کو کہا گیا کہ جنگ کے دوران انھیں جہاں پاؤ قتل کر دو۔

فرض کیجیے امریکہ اور ویت نام کی لڑائی کے دوران امریکہ کا صدر اپنے فوجیوں کو کہتا ہے کہ دورانِ جنگ دشمنوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور میں آج یہ بات آپ کے سامنے اس طرح کرتا ہوں کہ:

''امریکی صدر کہتا ہے کہ ویت نامیوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔''

تو یقیناً امریکہ کا صدر آپ کو قصائی ہی لگے گا۔ لیکن جنگ کے تناظر میں کوئی بھی جرنیل یا سربراہ حکومت یہی کہے گا کہ ڈرومت اور اپنے دشمنوں کو قتل کرو۔ وہ اسی طرح ان کا حوصلہ بلند رکھ سکتا ہے۔ پھر پانچویں آیت کے بعد وہ سیدھا ساتویں اور آٹھویں آیت پر پہنچ جاتا ہے۔ چھٹی آیت کو نظر انداز کر دیتا ہے، کیوں؟

اس لیے کہ اس آیت میں اس کے اعتراض کا جواب موجود ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو۔ اور پھر اسے محفوظ جگہ تک پہنچا دو۔ اگر وہ اسلام قبول نہ بھی کریں، پھر بھی جس مشرک نے پناہ مانگی ہے، اسے امن کی جگہ تک پہنچاؤ۔

آج کون سا جرنیل اپنے فوجیوں کو یہ ہدایت دے سکتا ہے کہ اگر دشمن پناہ مانگے تو اسے محفوظ مقام پر پہنچا کر بھی آؤ۔ محض معاف کرنے یا چھوڑ دینے کی بات بھی نہیں ہو رہی بلکہ بحفاظت مقامِ امن تک پہنچانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج کون سی فوج، کون سا جرنیل یہ حکم دے سکتا ہے؟

لیکن قرآن یہی حکم دے رہا ہے۔

لیکن اپنے محبوب موضوع یعنی مسلمانوں کو ظالم ثابت کرنے کے لیے ارون شوری اسی طرح سیاق وسباق سے ہٹ کر حوالے پیش کرتا ہے۔

اس کا دوسرا پسندیدہ موضوع ''خواتین کے حقوق'' ہے اور یہاں بھی آیات کے حوالے دیتا ہے۔ اور یہ وہی آیات ہیں جن کا حوالہ تسلیمہ نسرین جیسے لوگ دیتے ہیں۔

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں ارون شوری سے مباحثہ کیوں نہیں کرتا؟

میں نے ایک دفعہ تسلیمہ نسرین کے حوالے سے ہونے والے ایک مباحثے میں شرکت کی تھی جس کا اہتمام ''بمبئی یونین آف جرنلسٹس'' نے کیا تھا۔ جب میں نے اس مباحثے کی وڈیو ریکارڈنگ کی اجازت مانگی تو مجھے اجازت نہیں دی گئی۔ حالاں کہ اس مباحثے کا عنوان تھا:

''کیا مذہبی انتہا پسندی آزادیٔ اظہار کی راہ میں رکاوٹ ہے؟''

یعنی عنوان تو آزادیٔ اظہار ہے لیکن مجھے وہ گفتگو ریکارڈ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، کیا یہ منافقت نہیں ہے؟ میں نے انھیں کہا کہ وہ بھی اس ریکارڈنگ کی کاپی رکھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اجازت نہیں دینا چاہتے تھے۔ بالآخر خاصی بحث وتمحیص کے بعد مجھے اس مباحثے کو ریکارڈ کرنے کی اجازت ملی اور آپ جانتے ہیں کیا ہوا؟

ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میں انتہائی کامیاب رہا۔ وہ لوگ اسلام کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے، ذاکر نائیک کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مباحثہ انتہائی کامیاب رہا۔ اس میں میری ذاتی قابلیت کا کوئی دخل نہیں تھا محض اللہ کا کرم تھا کہ میں کامیاب رہا اور اتنا کامیاب رہا کہ کسی ایک اخبار نے بھی اس مباحثے کی خبر نہیں

لگائی۔

عیسائیوں کی طرف سے اس مباحثے پر فادر پریرا موجود تھے۔ ہندوؤں کی نمائندگی ڈاکٹر ویدویاس کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے میں تھا اور تسلیمہ نسرین کی کتاب کا مراٹھی ترجمہ کرنے والے اشوک صاحب بھی مباحثے میں شریک تھے۔ اگر اس مباحثے کی ریکارڈنگ نہ کی جاتی تو بھلا کس کو اس کے بارے میں پتہ چلتا؟ لیکن آج صرف بمبئی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں لاکھوں لوگ یہ ریکارڈنگ دیکھ چکے ہیں۔

اور ارون شوری کے اس حوالے سے تمام اعتراضات کے جوابات بھی ایک کیسٹ میں موجود ہیں۔ اس کیسٹ کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں میری گفتگو ہے اور دوسرے حصے میں سوالات کے جوابات ہیں۔ [1] اور ان میں وہ سوالات بھی شامل ہیں جو ارون شوری اٹھاتا ہے۔

رہا سوال ارون شوری کے ساتھ مناظرے کا۔ تو کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ مباحثہ کیا جائے؟ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے۔ لیکن میں اس کے ساتھ کسی بھی وقت مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ آئے .... اھلاً وسھلاً

شرط یہی ہوگی کہ یہ مناظرہ سرعام ہوگا، لوگوں کے سامنے ہوگا، بند کمرے میں نہیں۔ اور اس کی براہِ راست ریکارڈنگ بھی ہوگی۔

بہت بہت شکریہ

تمت بالخیر

☆......☆......☆

---

(۱) اُردو ترجمہ ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' کے نام سے دارالنوادر کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکا ہے۔

مذاہب عالم میں تصورِ خدا
اور
اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کے ۲۰ سوال

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

سید امتیاز احمد

الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

۲۰۰۶ء

کتاب: مذاہب عالم میں تصور خدا
اور اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کے ۲۰ سوال

مصنف: ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم: سید امتیاز احمد

اہتمام: دارالنوادر

مطبع: موٹروے پریس، لاہور

قیمت: غیر مجلد ۷۰ روپے
مجلد ۹۰ روپے

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724
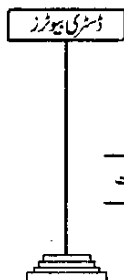
ڈسٹری بیوٹرز

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ترتیب

حصہ اوّل

اہم مذاہب میں خدا کا تصور

حصہ دوم

اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کے بیس سوال

تعارف

مذاہب اور نظام ہائے اخلاقیات کی ایک بڑی تعداد ہماری تہذیب کی اہم خصوصیت ہے۔ بنی نوعِ انسان کی ازل سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنی تخلیق کی وجہ کو سمجھے اور اس کائنات میں اپنے مقام کا عرفان حاصل کرے۔ وہ اس نظامِ قدرت میں اپنی شناخت اور مقام کو جاننے کے لیے ہمیشہ سے سرگرداں رہا ہے۔

ممتاز تاریخ داں، آرنلڈ ٹوائن بی نے قرنوں پر محیط انسانی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس نے دس جلدوں پر پھیلا ہوا اپنا معرکہ آرا کام پیش کیا۔ اس کی کتابوں کا خلاصہ یہی ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ۲۴/ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں وہ ''دی آبزرور'' میں شائع شدہ مضمون میں رقمطراز ہے:

''میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ تخلیق کے معمے کی چابی مذہب ہی کے پاس ہے۔''

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق مذہب کی تعریف کچھ یوں بنتی ہے:

''ایک ایسی فوق البشر قوت پر اعتقاد رکھنا، بالخصوص ذاتی خدا یا خداؤں پر یقین رکھنا جو اطاعت اور عبادت کے لائق ہوں۔''

تمام اہم مذاہب عالم میں ہمیں عالم الغیب اور قادرِ مطلق خدا یا مقتدرِ اعلیٰ کا تصور ملتا ہے۔ پھر تمام اہم مذاہب کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ وہ جس خدا پر یقین رکھتے اور جس کی اطاعت کرتے ہیں وہی تمام دوسرے لوگوں کا خدا بھی ہے۔

کئی ایک ''غیر مذہبی'' اعتقادات مثلاً مارکسزم، فرائیڈ ازم وغیرہ نے منظم مذاہب کی بنیاد پر حملے کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ غیر مذہبی اعتقادات بھی کسی مذہبی اعتقاد کی سی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر جب کئی ممالک میں کمیونزم یعنی اشتراکی نظام رائج

تھا، اس کی تشہیر و تبلیغ اسی پیمانے، انداز اور دلجمعی کے ساتھ کی جاتی تھی جس طرح کہ مذاہب کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ پس مذہب انسانی وجود کا اہم ترین جزو ہے۔

قرآن مجید فرقانِ حمید کی درج ذیل آیت میں اللہ فرماتا ہے:

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾ (۳:۶۴)

''اے نبیؐ! کہو ''اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے، اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔''

مذاہب عالم کا مطالعہ اور موازنہ میرے لیے بہت سودمند ثابت ہوا ہے۔ اور میرا یہ یقین ازسرِنو مستحکم ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنے وجود کی سمجھ بوجھ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ انسان کی نفسیاتی ترکیب کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ باآسانی خالقِ عظیم کا تصور قبول کرتا ہے بصورتِ دیگر خدا کے عدم تصور کے لیے اسے دلائل دینا پڑتے ہیں۔ بالفاظ دیگر خدا پر یقین کے لیے کوئی شرط نہیں ہے مگر خدا کے تصور کو ردّ کرنے کے لیے شرط یا دلائل کی ضرورت پڑتی ہے۔

دنیا کے بڑے مذاہب کی درجہ بندی

اگر ہم وسیع پیمانے پر دیکھیں تو مذاہب عالم کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی سامی مذاہب اور غیر سامی مذاہب۔ جبکہ غیر سامی مذاہب کو مزید دو زمروں یعنی آریائی اور غیر آریائی مذاہب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

سامی مذاہب

سامی مذاہب وہ مذاہب ہیں جو سامیوں میں ظہور پذیر ہوئے۔ انجیل کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام سام تھا اور ان کی نسلیں سامی کہلائیں۔ چنانچہ سامی مذاہب وہ مذاہب ہیں جو یہودیوں، عربوں اور آشوریوں وغیرہ میں پروان چڑھے تھے۔ یہودیت، مسیحیت اور اسلام اہم اور بڑے سامی مذاہب ہیں۔ یہ تمام مذاہب پیغمبری مذاہب ہیں اور ان آسمانی ہدایات پر اعتقاد رکھتے ہیں جو خدا نے پیغمبروں کے ذریعے زمین پر اُتاریں۔

غیر سامی مذاہب

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ غیر سامی مذاہب کو مزید دو ذیلی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو آریائی اور غیر آریائی مذاہب ہیں۔

آریائی مذاہب

آریائی ادیان وہ مذاہب ہیں جن کی ابتدا آریائی قوم میں ہوئی۔ آریائی ان اقوام کو کہا جاتا ہے جو بہت طاقتور تھے اور ہند یورپی زبانیں بولتے تھے۔ یہ دوسرے ہزاریے کے پہلے نصف (۲۰۰۰ تا ۱۵۰۰ قبل مسیح) تک ایران سے لے کر شمالی ہندوستان تک پھیل گئے تھے۔

اب آریائی مذاہب کو مزید دو اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے: اوّل ویدک اور دوم غیر ویدک۔

ویدک مذہب کو عام طور پر ہندومت اور برہمنیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جبکہ غیر ویدک مذاہب میں سکھ مت ، بدھ مت اور جین ازم وغیرہ شامل ہیں۔ تقریباً تمام آریائی مذاہب میں پیغمبروں کا تصور موجود نہیں۔

زرتشتی مذہب ایک آریائی مگر غیر ویدک مذہب ہے جس کا ہندومت سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ پیغمبرانہ مذہب ہے۔

غیر آریائی مذاہب

غیر آریائی ادیان کی ابتدا مختلف جگہوں پر ہوئی ہے۔ کنفیوشنزم اور تاؤ ازم کی سرزمین چین ہے جبکہ شنتو مذہب جاپان میں پروان چڑھا۔ ایسے کئی ایک غیر آریائی مذاہب میں خدا کا تصور موجود نہیں ہے۔ انہیں باقاعدہ مذاہب کی بجائے اخلاقیاتی تعلیمات کے نظام کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

مذہب میں خدا کی درست ترین توجیہہ

کسی بھی مذہب میں اپنائے گئے خدا کے تصور کو صرف اس کے پیروکاروں کے عمل سے نہیں جانچا جا سکتا۔ لوگوں میں خود ان کی مذہبی کتابوں سے عدم واقفیت ، تمام مذاہب میں ایک عام سی بات ہے۔ اس تناظر میں یہ بہتر ہوگا کہ کسی بھی مذہب میں خدا کے تصور کو اس کی مقدس تحریروں کی روشنی میں دیکھا جائے۔

اب ہم دنیا کے اہم ادیان کا تجزیہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کی مقدس تحریریں خدا کے تصور کے متعلق کیا کہتی ہیں۔

ہندومت میں خدا کا تصور

ہندومت تمام آریائی مذاہب میں مشہور ہے۔ ہندو درحقیقت ایک فارسی لفظ ہے اس کے معنی ان لوگوں کے ہیں جو وادی سندھ سے آگے کے علاقوں کے رہائشی ہیں۔ تاہم عام بول چال میں ہندومت کی اصطلاح ایک لبادے کی طرح ہے جو مجموعۂ عقاید کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر عقاید وید، اپنشد اور بھگود گیتا سے اخذ کیے گئے ہیں۔

ہندومت میں خدا کے لیے رائج عمومی تصورات

عموماً ہندومت کو ایسے دین کے طور پر لیا جاتا ہے جس میں کثرتِ خدا کا تصور ہے۔ درحقیقت بہت سے ہندو اس کی تصدیق کرتے ہیں اور وہ کئی ایک خداؤں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ کچھ ہندو تین خداؤں جبکہ بعض ہندو تو ۳۳۰ کروڑ خداؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ تاہم پڑھے لکھے ہندو جو اپنی کتابوں سے واقفیت رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ ایک ہندو کو صرف اور صرف ایک خدا کی ہی پوجا کرنی چاہیے۔

خدا کے تصور کے بارے میں ہندو اور مسلمانوں میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ ہندوؤں کا عام عقیدہ ہے کہ وہ ہمہ اوست (Pantheism) کے قائل ہیں۔ ہمہ اوست یا کائنات پرستی کا یہ نظریہ کہتا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان مقدس اور الہامی ہے۔ اسی لیے ہندو، درختوں، سورج، چاند، جانوروں اور حتیٰ کہ انسانوں کو بھی خدا کا پَرتو جانتے ہیں۔ یعنی عام ہندو کے لیے ہر شے خدا ہے۔

اس کے برعکس اسلام انسان سے کہتا ہے کہ وہ خود کو اور اپنی اطراف کی اشیا کو خدا کی تخلیق سمجھے کہ خدائی صفات والا سمجھے۔ لہٰذا مسلمان ہر شے کو خدا کی ملکیت سمجھتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہر شے کا تعلق اللہ سے ہے۔ درخت، سورج، چاند اور تمام اشیا خدا کی ہی ہیں۔ یہ

کائنات بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے۔

پس ہندو اور مسلمانوں کے عقاید میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ہندوؤں کے نزدیک ہر شے خدا ہی ہے جبکہ مسلمانوں کے نزدیک ہر شے خدا کی ہے۔قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں درج ہے:

''تو سب سے پہلی مشترک بات یہ ہے کہ ہم کسی کی عبادت نہیں کرتے سوائے اللہ کے۔''

اب ہم اسلام اور ہندومت کی مقدس تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان دونوں کے درمیان مشترکہ باتیں تلاش کریں گے۔

بھگود گیتا

ہندومت کی تمام کتابوں میں بھگود گیتا بہت مشہور ہے۔گیتا کے اس شعر کو پڑھیے:

''جن کی فہم مادی خواہشات نے سلب کر لی ہے ، انہوں نے دیوتاؤں (اوتاروں) کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں اور پھر اپنی مرضی کے مطابق پوجا کے اُصول بنا لیے ہیں۔'' [بھگود گیتا؛باب:۷،شعر:۲۰]

یہاں گیتا کہہ رہی ہے کہ مادہ پرست لوگ اصل خدا کو چھوڑ کر نیم دیوتاؤں کی عبادت شروع کر دیتے ہیں۔

اُپنشد: ......اپنشد کو بھی ہندوؤں کی مقدس کتاب کا درجہ حاصل ہے۔اپنشد کا یہ شعر پڑھیے:

(i) ''وہ صرف ایک ہے کسی دوسرے کے بغیر۔'' [چندوگیا اُپنشد ۶:۲:۱]

اُپنشد کا ایک مصرعہ یہ ہے:

(ii) ''نہ ہی اس کے ماں باپ ہیں اور نہ ہی کوئی خدا''

[سویت سواترا اُپنشد ۶،۹][حصہ دوم،صفحہ:۲۶۳]

اُپنشد ہی کا ایک اور شعر دیکھیے:

(iii) ''اس جیسا کوئی نہیں ہے'' [سویت سواترا اُپنشد، باب ۴:۱۹]

''کوئی اس جیسا نہیں، جس کا نام عظمت والا ہے۔''(۱)

اب درج بالا اشعار کا ان آیاتِ قرآنی سے موازنہ کیجئے:

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ﴾ [۴:۱۱۲]

''اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔''

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ [۴۲:۱۱]

''کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں، وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔''

(iv) اُپنشد کے درج ذیل اشعار خدا کو مجسم تصور کرنے سے انسان کے عاجز ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

''اس کا پیکر نظر نہیں آتا، کوئی اسے آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ جو اسے دل اور دماغ سے دیکھتے ہیں وہ ان کے دل میں رہ کر انہیں لافانی بنا دیتا ہے۔''

[سویت سواترا، اُپنشد ۴:۲۰]

قرآنِ عظیم اسی مظہر کو اس آیت میں بیان کرتا ہے:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝ ﴾

''نگاہیں اس کو پا نہیں سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے، وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔'' [۶:۱۰۳]

وید

ہندومت کی کتابوں میں وید سب سے اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ وید کی چار کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔ یعنی رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھروا وید۔

۱ ...... یجر وید

i) یجر وید کا ایک جملہ یہ ہے:

---

(1) [The Principal Upanishad by S.Radhakrishnan. page736,737]
[Sacred books of the East, volume15, the Upanishad part II Page No 253.]

''اس کا کوئی عکس نہیں'' [یجروید ۳۲:۳]

آگے چل کر لکھا ہے:

''وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا، وہی ہماری عبادت کا مستحق ہے۔ اس کا کوئی عکس نہیں اور یقیناً اس کی شان سب سے بلند ہے۔ وہ خود کو سورج وغیرہ میں قائم رکھ سکتا ہے، شاید وہ مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ یہی میری دعا ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا اور ہماری عبادت کے لائق ہے۔''(۱)

ii) ''وہ بے جسم اور خالص ہے۔'' یہ یجروید میں درج ہے: ۴۰:۸

''وہ روشن، بے جسم، بے زخم، بے پیوند اور خالص ہے جس میں بُرائی چھید نہیں کر سکتی۔ وہ وسیع النظر، عقل مند، احاطہ کرنے والا، خود وجود رکھنے والا ہے، وہ لا متناہی برسوں کے لیے مالک ہے۔''(۲)

iii) یجروید میں یہ بھی درج ہے:

''جو قدرتی مظاہر کی پوجا کریں گے، اندھیرے میں داخل ہوں گے۔'' مثلاً ہوا، پانی اور آگ وغیرہ۔ ''جو سنبھوتی کی عبادت کریں گے، اندھیروں کی مزید گہرائی میں غرق ہو جائیں گے۔'' سنبھوتی کا مطلب اشیا کی تخلیق ہے مثلاً کرسی، میز اور بت وغیرہ بنانا'' [یجروید ۴۰:۹]

iv) ایک اور دعا میں یہ بھی آیا ہے:

''ہمیں اچھا رستہ دکھا اور ان گناہوں کو ہٹا دے جو ہمیں بے راہ اور گمراہ بنا دیتے ہیں۔'' [یجروید ۴۰:۱۶]

۴ ...... اتھروا وید

اتھروا وید کے یہ اشعار دیکھیے:

---

(۱) یجروید، دیوی چند ایم اے فلسفہ، صفحہ: ۳۷۷

(۲) [Yajurveda Samhita by Ralph I.H.Griffith pg 538]

i) ''بے شک خدا عظیم ہے۔'' [اتھروا وید ۳:۵۸ ۲۰]

''سوریا، تو یقیناً عظیم ہے، ادیتیا تو عظیم ہے، چونکہ تو عظیم ہے تیری عظمت کی تعظیم کی جاتی ہے۔ بے شک تو عظیم ہے، اے خدا'' (۱)

﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ﴾ [القرآن: ۱۳:۹]

''وہ پوشیدہ اور ظاہر ہر چیز کا عالم ہے۔ وہ بزرگ ہے اور ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے۔''

۳...... رگ وید

i) تمام ویدوں میں رگ وید سب سے قدیم ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ بھی ایک مقدس ترین کتاب ہے۔ رگ وید میں تحریر ہے کہ:

''مذہبی بزرگ خدا کو کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔''

[رگ وید ۱:۱۶۴:۴۶]

ii) رگ وید میں خدائے بزرگ و برتر کی جو مختلف صفات بتائی گئی ہیں وہ کسی بھی طرح ۳۳ سے کم نہیں ہیں۔ ان میں سے کئی رگ وید کی کتاب دوم کی مناجات اوّل میں درج ہیں۔

رگ وید میں خدا کی جو متعدد صفات بتائی گئی ہیں ان میں سے سب سے خوبصورت صفت، رگ وید کی دوسری شبدھ کے تیسرے شعر میں موجود ہے جہاں خدا کے لیے ''براہما'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ براہما کو عربی میں ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنی خالق کے ہوں گے۔ خدا کو ''خالق''، ''تخلیق کار'' یا ''براہما'' کہنے پر مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تاہم مسلمان یقیناً اس تصور کو قبول نہیں کریں گے کہ خدا بزرگ و برتر کے چار ہاتھ ہوں (نعوذ باللہ) مسلمان اسے سختی سے ردّ کر دیں گے۔

خدا کو تجسیمی (Anthropomorphic) یا مادی شکل میں پیش کرنے کے عمل کی نفی یجر وید کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے:

---

(۱)[Atharveda Samhiti VoL 2 William Dmight Whitney pg 910]

''اس کا کوئی عکس نہیں ہے۔'' [یجر وید ۳:۳۲]

رگ وید کی کتاب دوم، مناجات اوّل کے تیسرے شعر میں خدا کی ایک اور عمدہ صفت بیان کی گئی ہے۔ یہاں خدا کو ''وشنو'' کہا گیا ہے۔

وشنو کا مطب ہے ''پرورش کرنے والا'' اگر اسے عربی میں ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنی ''رب'' کے ہوں گے۔ ایک بار پھر یہاں مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا جب خدائے بزرگ و برتر کو ''رب''، ''پالنے والا'' یا ''وشنو'' کہا جائے مگر ہندوؤں میں وشنو کا عام تصور یہ ہے کہ وہ چار ہاتھوں والا خدا ہے۔ اس کے ایک دائیں ہاتھ میں تھالی ہے جسے ''چکرا'' کہتے ہیں۔ ایک بائیں ہاتھ میں سنکھ یا ناقوس ہے، ایک پرندہ بھی ہے جو سانپ کے بل کی طرف جا رہا ہے۔ خدا کی کوئی بھی تصویر مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ یہ بات خود یجر وید کے باب ۴۰ کے انیسویں شعر کے خلاف ہے۔

iii) رگ وید کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

''اے دوستو! اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، صرف وہی ایک خدا ہے۔''(۱)

[رگ وید کتاب ۸:۱:۱]

iv) ''عقلمند جوگی اپنے ذہن اور اپنی سوچ کی توجہ حقیقتِ اعلیٰ پر مرکوز رکھتے ہیں جو قادر مطلق، عظیم اور حاکم اعلیٰ ہے۔ وہ تنہا، ان کے اعمال اور حیاتی اعضا کو تفویض کیے جانے والے اُمور سے آگاہ ہے۔ بے شک وہی عظیم ہے اور آسمانی خالق ہے۔''(۲)

[رگ وید ۵:۸۱]

---

(1) [Rigveda Samhiti Vol ix, Page1 and 2 by Swami Satyaprakash Sarasvati and Satyakam vidhya Lankar]

(2) [Rigveda Samhiti Volume 6 Page 1802 and 1803 by Swami Satya Prakash Saraswati and Satya Kam Vidhya Lauka]

ہندو ویدانت کی براہما سُترا

ہندو ویدانت کی براہما سترا میں درج ہے:

''خدا صرف ایک ہی ہے، کوئی دوسرا نہیں، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، معمولی حد تک بھی نہیں۔''

پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندو مت کی کتب کے غیر متعصبانہ مطالعے سے ہی کوئی ہندو مت میں خدا کے تصور کو سمجھ سکتا ہے۔

سکھ مذہب میں خدا کا تصور

سکھ مذہب ایک غیر سامی، آریائی مگر غیر ویدک مذہب ہے۔ اگرچہ یہ دنیا کے بڑے مذاہب میں تو شامل نہیں مگر یہ ہندومت سے پھوٹنے والی ایک شاخ ہی ہے جس کی بنیاد بابا گرونانک نے پندرھویں صدی کے آخر میں رکھی تھی۔ اس کا مسکن پاکستان اور شمالی مغربی بھارت کا وہ علاقہ ہے جسے پنجاب بھی کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے پانچ دریاؤں کی سرزمین۔ گرونانک نے ایک ہندو خاندان کی کھتری یا (جنگجو ذات) میں آنکھ کھولی مگر وہ اسلام اور مسلمانوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

سکھ اور سکھ مذہب کی تعریف

لفظ ''سکھ'' دراصل ''سیسیا'' نامی لفظ سے نکلا ہے۔ اس کے معنی مرید یا پیروکار کے ہیں۔ اس مذہب میں دس گرو ہیں۔ گرونانک سب سے پہلے گرو جب کہ گرو گوبند سنگھ دسویں اور آخری گرو گزرے ہیں۔ سکھ مذہب کی مقدس کتاب کا نام سری گرو گرنتھ ہے جو ادی گرنتھ صاحب کے نام سے بھی مشہور ہے۔

پانچ ''ککے''

سکھ مذہب میں ہر سکھ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی شناخت کے لیے پانچ چیزوں کو اپنائے یا اپنے پاس رکھے:

i) کیش:...... بال نہ کاٹے جائیں کیونکہ تمام گرو بھی بال نہیں کاٹتے تھے۔

ii) کنگھا:...... سر کے بالوں کو ہموار اور صاف رکھنے کے لیے۔

iii) کڑا:...... اسٹیل یا دھات کی موٹی چوڑی جو قوت کے لیے پہنی جاتی ہے۔

iv) کرپان:......خنجر جو اپنے دفاع کے لیے رکھا جاتا ہے۔

v) کچھا:...... پھرتی اور چستی کے لیے پہنا جانے والا زیر جامہ جس کی لمبائی گھٹنوں تک ہوتی ہے۔

مل منترا......سکھوں کے بنیادی عقاید

خدا کے تصور کے حوالے سے کسی بھی سکھ کے تصورات کو بہتر انداز میں مل منترا میں بیان کیا جاتا ہے۔''مل منترا'' سکھوں کے بنیادی عقاید کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ اسے گرو گرنتھ صاحب کے شروع میں بیان کیا گیا ہے۔سری گرنتھ صاحب کی جلد اوّل، جپو جی کا پہلا شعر ہے:

''صرف ایک خدا کا وجود ہے جو حقیقتاً تخلیق کرنے والا ہے، وہ خوف اور نفرت سے عاری ہے، وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا مگر لافانی ہے، وہ خود سے وجود رکھنے والا، عظیم اور رحیم ہے۔''

سکھ مذہب اپنے ماننے والوں کو وحدانیت کی سختی سے تلقین کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک ہی رب اعلیٰ ہے۔ وہ ایک غیر واضح اور مبہم صورت میں موجود ہے جسے ''ایک اومکارا'' کہا جاتا ہے۔

جب خدا کی واضح صفات بیان کی جائیں تو اسے اومکارا کہا جاتا ہے۔سکھ مذہب میں خدا کی کئی ایک صفات بیان کی جاتی ہیں۔

کرتار.........خالق

صاحب.........بادشاہ

اکال.........ابدی

ستنا نام.........مقدس نام

پروردگار.........محبت سے پرورش کرنے والا

رحیم.........رحم کرنے والا

کریم..........خیر خواہ اور کرم کرنے والا

سکھ مذہب میں خدا کے لیے ''واہے گرو'' یعنی ''ایک سچا خدا'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

چونکہ سکھ مذہب وحدانیت کی سختی سے تلقین کرتا ہے۔ اس لیے اس میں اوتار وید اپر اعتقاد بالکل نہیں ہے جسے تجسیم اور حلول کا عقیدہ کہا جا سکتا ہے۔ سکھ مذہب میں خدا اپنی تجسیم کرکے دوسری شکلوں میں نہیں ڈھلتا اور یوں اوتار کا تصور بالکل نہیں ہے۔ سکھ مذہب، بت پرستی کی بھی شدید مخالفت کرتا ہے۔

گرونانک پر کبیر کا اثر

گرونانک سنت کبیر کے فرمودات سے بہت متاثر تھے۔ لہٰذا شری گرونانک صاحب کے متعدد ابواب میں سنت کبیر کے اشعار جابجا ملتے ہیں۔ ان میں سے چند مشہور اشعار یہ ہیں:

''ہر کوئی مشکل میں تو خدا کو یاد رکھتا ہے مگر امن اور خوشی میں اسے کوئی یاد نہیں کرتا۔

جو آسودگی اور خوشحالی میں بھی خدا کو یاد رکھے گا اس پر مصیبت کیوں آئے گی؟''

اب ان اشعار کا درج ذیل آیاتِ قرآنی سے موازنہ کیجئے:

﴿ وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَندَادًا لِّيُضِلَّ عَن سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ﴾

[القرآن ۳۹:۸]

''انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرکے اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا۔ اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھیراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کردے (اے نبیؐ) اس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اُٹھالے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔''

پارسی مذہب میں خدا کا تصور

پارسی مذہب ایک قدیم آریائی مذہب ہے جس کا ظہور ۲۵۰۰ سال قبل فارس میں ہوا تھا۔ اگرچہ اس کے ماننے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہے یعنی پوری دنیا میں ایک لاکھ تیس ہزار سے بھی کم پارسی ہیں۔ مگر یہ دنیا کے قدیم مذاہب میں سے ایک ہے۔ ایک ایرانی پیغمبر زرتشت نے پارسی مذہب کی بنیاد رکھی تھی۔ (اسے زرتشی مذہب بھی کہتے ہیں) پارسیوں کی مقدس کتابوں میں دساتیر اور آوستا شامل ہیں۔

پارسی مذہب میں خدا کے لیے ''اہورمزدا'' کا نام آیا ہے۔ ''اہور'' کا مطلب ہے ''آقا'' اور ''مزدا'' کے معنی ''عقل مند'' کے ہیں۔ یعنی اہورمزدا کا مطلب ہے ''عقل مند آقا'' یا ''عقل مند مالک'' اہورمزدا کے تصور میں بھی ایک خدا کے تصور کا بہت دخل ہے۔

دساتیر کے مطابق خدا کی صفات

دساتیر میں خدا کے لیے درج ذیل صفات بیان کی گئی ہیں:

(i) وہ ایک ہے۔

(ii) اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

(iii) نہ اس کی ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا۔

(iv) نہ اس کا کوئی باپ ہے نہ ہی کوئی بیٹا، نہ کوئی بیوی ہے اور نہ ہی اولاد ہے۔

(v) وہ بے جسم اور بے شکل ہے۔

(vi) نہ آنکھ اس کا احاطہ کر سکتی ہے۔ نہ ہی فکری قوت سے اسے تصور میں لایا جا سکتا ہے۔

(vii) وہ ان سب سے بڑھ کر ہے جن کے متعلق ہم سوچ سکتے ہیں۔

(viii) وہ ہم سے زیادہ ہمارے نزدیک ہے۔

خدا کی صفات، آوستا کے مطابق

آوستا، گتھا اور ینسا کے مطابق اہور مزدا کی کئی ایک صفات ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

(i) خالق

(سینا ۷:۳۱ اور ۱۱) (سینا ۷:۴۴) (سینا ۱۱:۵۰) (سینا ۷:۵۱)

(ii) بہت قوت، بہت عظمت والا

(سینا ۱۱:۳۳) (سینا ۶:۴۵)

(iii) داتا......''ہدائی''

(سینا ۱۱:۳۳) (سینا ۳:۴۸)

(iv) سخی......''اسپینٹا''

(سینا ۱۵، ۱۳، ۱۱، ۹، ۷، ۵، ۳۴:۴) (سینا ۲:۴۴) (سینا ۵:۴۵) (سینا ۹:۴۶) (سینا ۳:۴۸)

یہودیت میں خدا کا تصور

یہودیت سامی مذاہب میں ایک اہم مذہب ہے۔ اس کے ماننے والے یہودی کہلاتے ہیں اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغمبرانہ مشن پر یقین رکھتے ہیں۔

(i) درج ذیل آیات عہد نامہ عتیق کی پانچویں کتاب ثنائیہ میں درج ہیں۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: عبرانی آیت کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''سنو! اے بنی اسرائیل! ہمارا مالک خدا ہے، وہ ایک مالک ہے۔''

[کتاب مقدس۔ ثنائیہ ۶:۴]

(ii) کتاب عیسائیہ کی ایک اور آیت ملاحظہ کیجئے:

''میں، اور میں ہی مالک ہوں، میرے سوا بچانے والا کوئی نہیں ہے۔''

[کتاب مقدس۔ عیسائیہ ۴۳:۱۱]

(iii) ''میں ہی خدا ہوں اور کوئی نہیں، میرے سوا کوئی خدا نہیں۔''

[کتاب مقدس۔ عیسائیہ ۴۶:۹]

یہودیت میں بت پرستی کی مخالفت درج ذیل آیت سے عیاں ہے:

''میرے علاوہ کوئی خدا نہیں، تمہیں چاہیے کہ میری کوئی تصویر کشی نہ کرو۔ مجھ سے کسی کی مشابہت نہیں ہے، نہ آسمان پر، نہ زمین پر اور نہ ہی پانی کے نیچے۔ لہٰذا تم کسی اور کے سامنے نہ جھکو، ان کی طرف نہ دیکھو، میں ہی تمہارا خدا ہوں۔''

[کتاب مقدس۔ خروج ۵۔۲۰:۳]

(iv) کتاب ثنائیہ میں بھی اسی طرح کا پیغام ملا ہے:

''میرے علاوہ کوئی اور خدا نہیں، لہٰذا تم میری تجسیم نہ کرو۔ آسمانوں میں، زمین

کے اوپر اور پانی کی گہرائیوں میں کوئی بھی میرا ہمسر نہیں ہے۔ پس تمہیں چاہیے کہ تم ان کو سجدہ نہ کرو اور نہ ہی ان کی خدمت کرو۔ میں ہی خدا اور مالک ہوں۔"

[کتاب مقدس۔ ثنائیہ ۹۔۷:۵]

عیسائیت میں خدا کا تصور

عیسائیت ایک سامی مذہب ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پوری دنیا میں اس کے لگ بھگ دو ارب پیروکار ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اسلام میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ اسلام وہ واحد غیر مسیحی مذہب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان کی تلقین کرتا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم عیسائیت میں خدا کے تصور پر بات کریں ہم پہلے اسلام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام پر بات کرتے ہیں۔

(i) اسلام واحد غیر مسیحی مذہب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتقاد کا حکم دیتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ رکھے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔

(ii) ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عظیم اور برگزیدہ پیغمبر ہیں۔

(iii) ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ بغیر باپ کے معجزانہ طور پر پیدا ہوئے جبکہ آج کے کئی عیسائی اس پر یقین نہیں رکھتے۔

(iv) ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ خدا کے حکم سے مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔

(v) ہم یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ وہ خدا کی عطا سے پیدائشی نابیناؤں اور کوڑھ کے مریضوں کو اچھا کیا کرتے تھے۔

اب یہاں ایک سوال یہ اُبھرتا ہے کہ جب مسلمان اور عیسائی دونوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا احترام اور ان سے محبت رکھتے ہیں تو کس جگہ سے ان دونوں مذاہب کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔ اسلام اور عیسائیت میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت پر اصرار کرتے ہیں۔ عیسائی مقدس کتابوں کے مطالعے سے عیاں ہے کہ حضرت یسوع مسیح علیہ السلام نے

کبھی بھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ درحقیقت پوری انجیل مقدس میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بیان دیا ہو کہ ''میں خدا ہوں'' یا ''میری عبادت کرو'' دراصل انجیل مقدس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب جو باتیں ہیں وہ اس کے عین مخالف ہیں۔ انجیل مقدس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب یہ بیانات ملاحظہ کیجئے۔

''میرے والد مجھ سے عظیم ہیں۔'' [یوحنا ۱۴:۲۸]

''میرے والد سب سے بلند اور عظیم ہیں۔'' [یوحنا ۱۰:۲۹]

''میں خدا کے حکم سے شیطانوں کو پٹختا ہوں۔'' [متی ۲۱:۲۸]

''............خدا کی اُنگلی سے شیطانوں کو نکال باہر کرتا ہوں......'' [لوقا ۱۱:۲۰]

''میں خود اپنے آپ سے کچھ نہیں کر سکتا: میں سنتا ہوں، موازنہ کرتا ہوں اور میری رائے درست ہوتی ہے، کیونکہ اس میں میری کوشش نہیں بلکہ میرے خدا کی چاہ ہوتی ہے، جس نے مجھے بھیجا ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقصد......قانون کی تکمیل

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی بھی رب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے مشن کے متعلق صاف فرمایا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائے بزرگ و برتر نے یہودیت کی تکمیل وتصدیق کے لیے بھیجا تھا۔ درج ذیل بیان متی کی انجیل میں درج ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

''یہ نہ سوچنا کہ میں قانون یا پیغمبروں کو ختم کرنے آیا ہوں، میں انہیں تباہ کرنے کے بجائے ان کی تکمیل کرنے آیا ہوں۔ جب تک زمین و آسمان ہیں۔ قانون کا ایک ذرہ بھی تعمیل سے گزرے بغیر نہیں رہے گا۔ یہاں تک کہ سب پر عمل ہو جائے گا۔

جو کوئی بھی معمولی حکم الٰہی کو توڑے گا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دے گا۔ جنت میں اس کا نام آخر میں پکارا جائے گا مگر جو بھی عین اس کے مطابق عمل کرے اور تعلیم دے گا، اسی کو جنت میں عظیم نام سے پکارا جائے گا۔'' [انجیل۔ متی ۲۰۔ ۵:۱۷]

خدا نے یسوع مسیح علیہ السلام کو زمین پر بھیجا

انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغمبرانہ مشن کی طرف درج ذیل آیات میں اشارہ ملتا ہے۔

"..........اور جو الفاظ تم سنتے ہو، وہ میرے نہیں ہیں، بلکہ اس باپ کے ہیں جس نے مجھے بھیجا۔" [انجیل۔ یوحنا ۱۴:۲۴]

"اور یہ زندگی لا فانی ہے، شاید وہ ایک سچے خدا کو جان جائیں گے۔ مجھے بھی جسے اس نے بھیجا ہے۔" [انجیل۔ یوحنا ۱۷:۳]

یوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے خدا ہونے کے معمولی سے اشارے کو بھی رد کیا ہے۔

انجیل کا ایک اور جملہ ملاحظہ فرمایئے:

"ایک شخص آتا ہے اور اس سے کہتا ہے "اچھے مالک" میں کون سے اچھے کام کروں کہ ابدی زندگی پانے میں کامیاب ہوسکوں؟"

پھر وہ اس سے کہتا ہے "تم نے مجھے اچھا کیوں کہا؟" کوئی خدا نہیں سوائے ایک خدا کے۔ لیکن اگر تم زندگی میں داخل ہونا چاہتے ہو حکمِ ربی کا پاس رکھو۔"

اوپر تحریر کردہ بیانات اس مسیحی طرزِ فکر کی نفی کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ربانی خواص رکھتے تھے اور ان کے مصلوب ہونے سے نجات حاصل ہو چکی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہی نصیحت کی ہے کہ نجات صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب احکامات الٰہی پر عمل کیا جائے۔

یسوع ناصریؑ خدا کا منظور کردہ بندہ

انجیل کا درج ذیل بیان، اسلامی عقاید کی تائید کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے پیغمبر تھے:

"اے بنی اسرائیل! یہ الفاظ سنو، خدا نے تم لوگوں میں سے ایک شخص یسوع ناصری کو منظور کر لیا ہے کہ وہ معجزات، کرشمے اور نشانیاں بتائے جو خدا نے کی ہیں اور تمہارے درمیان دکھائی ہیں اور تم خود بھی جان لو گے۔"

پہلا حکم کہ خدا ایک ہے

انجیل مسیحیت کے نظریہ تثلیث کی تائید نہیں کرتی۔ مقدس کتاب کا مسودہ لکھنے والے ایک شخص نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ سب سے بڑھ کر پہلا حکمِ الٰہی کون سا ہے تو انہوں نے صرف وہی بات دہرا دی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہی تھی۔ یہ ایک عبرانی جملہ تھا جس کا ترجمہ یہ ہے:

''خداوند، ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔'' [مرقس ۱۲:۲۹]

اسلام میں خدا کا تصور

اسلام ایک سامی مذہب ہے۔ دنیا بھر میں اس کے ماننے والوں کی تعداد ایک ارب بیس کروڑ سے زاید ہے۔ اسلام کا مطلب ہے "اللہ کی مکمل اطاعت کرنا.........مسلمان قرآن کو خدائے عزوجل کے الفاظ مانتے ہیں جو حضرت محمد ﷺ پر وحی کے ذریعے نازل ہو کر ہم تک پہنچے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمام ادوار میں اللہ نے پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعے اپنی وحدانیت کا پیغام اور آخرت میں احتساب کا پیغام بھیجا ہے۔ اسی لیے اسلام مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ پہلے کے تمام پیغمبروں پر یقین رکھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بقیہ تمام پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

خدا کی نہایت جامع تعریف

اسلام میں خدا کی نہایت جامع اور مختصر تعریف سورۃ اخلاص کی چار آیات میں موجود ہے۔ یہ قرآن مجید کی ۱۱۲ ویں سورۃ ہے۔

۱ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝

۲ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝

۳ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝

۴ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

[القرآن ۱۱۲: ۴-۱]

"کہو وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

لفظ ''الصمد'' کا ترجمہ قدرے مشکل ہے۔ اس کا مطلب ہے ''ہمیشہ رہنے والا'' اور یہ صفت صرف اللہ ہی کی ہوسکتی ہے۔ بقیہ تمام اشیا و جاندار عارضی اور وقتی ہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ تمام مخلوق اور اشیا اللہ کی محتاج ہیں۔

سورۃ اخلاص......الٰہیات کی کسوٹی

قرآن مجید کی سورۃ اخلاص (۱۱۲ویں سورۃ) دین یا الٰہیات کی بہترین کسوٹی ہے۔ چار آیات پر مشتمل یہ سورۃ خدا کے مطالعے کے لیے ایک کسوٹی اور ایک پیمانے کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر کوئی خدائی کا اُمیدوار ہے تو یہ ضروری ہے کہ اسے بھی اس کسوٹی پر پرکھا جائے۔ چونکہ اس سورۃ میں اللہ رب العزت کی یکتا صفات کا احاطہ کیا گیا لہٰذا اس سورۃ کی روشنی میں جھوٹے خداؤں اور الٰہیاتی اُمیدواروں کو باآسانی رد کیا جاسکتا ہے۔

اسلام دیوتاؤں کے متعلق کیا کہتا ہے؟

بھارت کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ دیوتاؤں کی سرزمین ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھارت میں روحانی اساتذہ کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ان میں سے کئی ایک بابا اور پیروں کے ماننے والے دنیا بھر میں موجود ہیں۔ اسلام کسی بھی انسان کی معبود سازی کی شدید ممانعت کرتا ہے۔

خدائی کے دعوے داروں یا الٰہیاتی صفات سے متصف کیے جانے والے ایسے لوگوں کے لیے ہم اسلام کی روشنی میں ایسے ایک ''خدائی بندے'' اوشو رجنیش'' کا جائزہ لیتے ہیں۔ رجنیش بھارت میں پیدا ہونے والے ان گنت روحانی اساتذہ میں سے ایک ہیں۔ مئی 1981ء میں وہ امریکہ گئے اور وہاں ''رجنیش پورم'' نامی ایک علاقہ قائم کیا۔ بعد ازاں انہوں نے مغرب میں ایک فراڈ کیا، آخر کار گرفتار ہوئے اور انہیں ملک چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ وہ بھارت واپس آگئے اور پونا میں ایک فرقے کی بنیاد رکھی جسے ''اوشو'' فرقہ کہا جاتا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ رجنیش کے ماننے والے اسے خدا کہتے ہیں۔ پونا میں اوشو کے مرکز پر اگر کوئی جائے تو

وہاں اس کے سنگِ مزار پر یہ درج ہے:

"اوشو...... نہ پیدا ہوا اور نہ مرا ہے، اس نے ۱۱ دسمبر ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء تک صرف اس سیارے یعنی زمین کا دورہ کیا تھا۔"

یہاں اس کے پیروکار یہ بھول جاتے ہیں کہ اسے ۲۱ مختلف ممالک کا ویزا نہیں دیا گیا تھا۔ رجنیش کے پیروکار اپنے "خدا" کے زمین کا دورہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں دیکھتے مگر ان کے خدا کو کسی ملک میں داخل ہونے کے لیے ویزا کی ضرورت رہتی تھی!

اب ہم خدائی کے اس دعویدار، بھگوان رجنیش کو سورہ اخلاص کی روشنی میں پرکھتے ہیں کیونکہ یہی الٰہیات کی کسوٹی ہے۔

i) سورۃ اخلاص میں خدا کے لیے درج پہلی شرط یا کسوٹی ہے "کہو کہ وہ اللہ ایک ہے۔" کیا رجنیش ایک اور واحد ہے؟ نہیں! رجنیش جیسے بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ تاہم اس کے کچھ ماننے والے رجنیش کو اب بھی یکتا مانتے ہیں۔

ii) دوسری کسوٹی یہ ہے کہ وہ "معبود برحق بے نیاز ہے" یقیناً رجنیش بے نیاز اور لافانی نہ تھا اور وہ ۱۹۹۰ء میں مر گیا تھا۔ اس کی سوانح حیات سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ ذیابیطس، دمے اور کمر کے شدید درد میں مبتلا تھا۔ اس نے الزام لگایا تھا کہ امریکی جیل میں حکومت نے اسے آہستگی سے اثر کرنے والا زہر دیا تھا۔ تصور کیجیے کہ کیا خدائے عزوجل کو زہر دیا جا سکتا ہے! (نعوذ باللہ) تو رجنیش بے نیاز اور لافانی نہ تھا۔

iii) تیسری کسوٹی ہے کہ "نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا" ہم جانتے ہیں کہ رجنیش جبل پور، بھارت میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ تھے جو بعد میں اس کے پیروکار بنے۔

iv) چوتھی کسوٹی بہت سخت ہے۔ وہ ہے کہ "کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے" اس موقع پر آپ "خدا" کو تصور کر کے کسی دوسرے "خدائی کے اُمیدوار" سے اس کا موازنہ کیجیے اور سوچیے کہ ایسا ناممکن ہے۔ ایک سچے خدا کی ذہنی تصویر بنا لینا بھی ناممکن ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ رجنیش ایک سفید بھری ہوئی ڈاڑھی والا انسان ہی تھا۔ اس کے دو کان، دو

آنکھیں، ایک ناک اور ایک منہ تھا جو بڑی تعداد میں دستیاب اس کی تصاویر اور پوسٹر میں نمایاں ہیں۔ آپ تصور کیجئے کہ خدا کیا ہوتا ہے، یقیناً وہ (رجنیش) خدا نہیں ہے۔
اب خدا کے تصور کا موازنہ ''مسٹر یونیورس'' سے کیجئے۔ جو جسمانی لحاظ سے دنیا کا طاقتور ترین انسان ہوتا ہے۔ اب اس جانچ پرکھ کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔ یہی نا! کہ اس کسوٹی پر کوئی پورا نہیں اُتر سکتا سوائے ''سچے خدا کے۔''

ہم خدا کو کس نام سے پکاریں؟

مسلمان انگریزی لفظ ''God'' کے بجائے لفظ اللہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ عربی میں یہ نام ''اللہ'' خالص اور یکتا ہے۔ جب کہ انگریزی لفظ ''God'' اس کی جگہ نہیں لے سکتا کیونکہ انگریزی لفظ میں تاویل کی گنجائش زیادہ ہے۔
اگر آپ لفظ ''God'' کے آخر میں S کا اضافہ کر دیں تو یہ ''Gods'' بن جائے گا، یعنی خدا کی جمع۔ اس کے مقابلے میں لفظ اللہ ایک اور واحد ہے اور اسے جمع کے صیغے کے لیے بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اب اگر آپ God کے لفظ کے آگے ''Dess'' کا اضافہ کر دیں تو یہ ''Goddess'' ہو جائے گا جس کا مطلب ہے خدا کی مؤنث یا مادہ۔ جبکہ مذکر اللہ (Male Allah) اور مؤنث اللہ (Female Allah) جیسی کوئی شے نہیں ہے۔ اسی طرح انگریزی لفظ God میں Tin کا سابقہ لگا دیا جائے تو یہ Tin-God بن جائے گا جس کے معنی ''جعلی خدا'' کے ہیں۔ تو لفظ ''اللہ'' نہایت منفرد اور یکتا لفظ ہے جسے بولتے وقت کوئی تصویر ذہن میں نہیں آتی اور اس لفظ کو ادل بدل کر اس سے کھیلا بھی نہیں جا سکتا۔ اسی طرح مسلمان لفظ اللہ کہنے کو ہی ترجیح دیتے، تاہم کبھی کبھار وہ غیر مسلموں سے بات کرتے ہوئے God کا لفظ کہہ دیتے ہیں جو کہ بہت موزوں لفظ نہیں ہے۔ چونکہ اس کتاب میں میرے مخاطب مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی ہیں، اسی لیے میں نے مضمون میں کئی جگہ اللہ کے بجائے خدا (God) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

خدا، انسان نہیں ہوسکتا!

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب خدا سب کچھ کرسکتا ہے تو وہ انسانی شکل میں کیوں نہیں آ سکتا؟ اگر خدا چاہے تو وہ انسانی صورت میں آ سکتا ہے۔ تاہم اس کے بعد وہ خدا نہیں رہے گا کیونکہ خدا اور انسان کی خصوصیات کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

اگلے پیراگراف میں آپ پڑھیں گے کہ خدا کے انسان بننے میں منطقی لحاظ سے کتنا تضاد موجود ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا لافانی یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا جب کہ انسان فانی ہے اور اسے موت آتی ہے۔ کوئی شخص بھی خدائی انسان (God-Man) نہیں ہوسکتا یعنی ایسا انسان جو کبھی نہ مرتا ہو یعنی بہ یک وقت انسان بھی ہو اور ساتھ ہی لافانی بھی ہو۔ یہ تو بے معنی بات ہوئی۔ خدا کی کوئی ابتدا ہی نہیں ہے جبکہ انسان کی ابتدا ہوتی ہے۔ کوئی انسان ایسا موجود نہیں جس کی ابتدا نہیں ہوئی ہو اور ہوئی بھی ہو۔ پھر انسانوں کا آخری وقت بھی آتا ہے۔ ایسا کوئی شخص موجود نہیں بہ یک وقت جس کا کوئی اختتام نہ ہو اور اختتام بھی ہو، اسی لیے یہ بات بھی بے معنی ہی ہے۔

خدائے بزرگ و برتر کو غذا کی ضرورت نہیں جب کہ انسان کو زندہ رہنے اور نشوونما کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔

﴿ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ﴾ [۶: ۱۴]

”کہو اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنا لوں؟ اس خدا کو چھوڑ کو جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے روزی لیتا نہیں ہے۔“

خدا کو آرام و نیند کی ضرورت نہیں ہوتی جب کہ کوئی انسان ایسا نہیں جو بنا آرام کیے مسلسل زندہ رہ سکتا ہو۔

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ﴾

[۲۵۵:۲]

ترجمہ: ’’اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔‘‘

کسی دوسرے انسان کی عبادت فضول ہے

جس طرح خدا کے انسان بننے کا خیال ناقابل قبول ہے اسی طرح ہمیں اس پر بھی اتفاق کرنا چاہیے کہ کسی دوسرے انسان کی پوجا اور عبادت بھی بے کار ہے۔ اگر خدا انسان کا روپ اختیار کر لے تو وہ خدا نہیں رہے گا بلکہ اس کی تمام خصوصیات انسانوں جیسی ہی ہوں گی۔ مثال کے طور پر ایک ذہین پروفیسر کسی حادثے سے دوچار ہو کر اپنی یادداشت کھو بیٹھتا ہے تو اس سے سبق پڑھنے اور علم حاصل کرنے والے طالب علم بے وقوف ہی کہلائیں گے۔

مزید برآں اگر خدا کا انسانی صفات اختیار کر لینا تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس کا دوبارہ خدائی صفات اختیار کرنا ناممکن ہی رہے گا کیونکہ ’’انسان‘‘ کی تعریف میں یہ بات شامل ہے کہ وہ خدا نہیں بن سکتا لہٰذا کسی انسان میں اُلوہیت فرض کر کے اس کی پرستش کرنا محض ایک منطقی مغالطہ ہے جو اپنی تمام صورتوں میں قابلِ نفرت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن عظیم عقیدہ بشری پیکر یعنی خدا کے انسانی روپ میں آنے کے ہر تصور کو رد کرتا ہے۔ قرآن عظیم درج ذیل آیت میں کہتا ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○ ﴾ [۱۱:۴۲]

ترجمہ: ’’کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں، وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔‘‘

خدا غیر خدائی کام نہیں کر سکتا

خدائے بزرگ و برتر سے کسی غلط کام کی توقع رکھنا بھی محال ہے کیونکہ وہ انصاف، رحم

۱۹۹۰ء تک اس دنیا کا دورہ کیا۔''

لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ دنیا کے اکیس ممالک میں اسے ویزا دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ وہ ان اکیس ممالک میں جانا چاہتا تھا لیکن نہیں جا سکا۔ اندازہ کیجیے خدا خود دنیا کے دورے پر آیا ہوا ہے اور اپنی دنیا کے اکیس ممالک میں جانا چاہتا ہے لیکن نہیں جا سکتا، کیا یہی خدا کا وہ تصور ہے جس پر آپ یقین رکھتے ہیں؟

اور اب آخری شرط کہ خدا کا ہم سر یعنی اس جیسا اور کوئی نہیں ہے۔ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی، اس کا کسی سے تقابل نہیں کیا جا سکتا، اگر آپ خدا کا تصور کرنے میں کامیاب ہو جائیں، اس کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خدا نہیں ہے۔ خدا کی تجسیم ممکن نہیں ہے۔

جبکہ گرو رجنیش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ گرو رجنیش کے لمبے بال تھے، ایک لمبی لہراتی ہوئی داڑھی تھی، جس کا رنگ سفید تھا، اس نے ایک چوغہ سا پہنا ہوا ہوتا تھا۔ یعنی آپ بڑی آسانی سے اس کا تصور کر سکتے ہیں اور وہ جو تصور میں آ جائے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

خدا کا کسی سے تقابل بھی ممکن نہیں ہے۔ فرض کیجیے کوئی شخص بطورِ مثال کہتا ہے کہ خدا آرنلڈ شوارزنیگر سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے۔ آرنلڈ مسٹر یونیورس، طاقتور ترین انسان تھا۔ اسی طرح دارا سنگھ ایک طاقت ور پہلوان تھا۔ لیکن جس وقت آپ تقابل کریں گے، جس وقت آپ کہیں گے کہ خدا آرنلڈ شوارزنیگر سے، دارا سنگھ سے، یا کنگ کانگ سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ کا تصورِ خدا ہی غلط ہے۔ خواہ آپ یہی کہہ رہے ہوں کہ خدا کسی سے ایک کروڑ گنا طاقتور ہے لیکن بہر حال آپ تقابل تو کر رہے ہوں گے اور خدا کی صفت یہ ہے کہ اس کا تقابل نہیں ہو سکتا۔

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ﴾

''اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔''

لہٰذا اب یہ بات میں اپنے معزز، دانش مند، سامعین پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان کے ذہن میں خدا کا کیا تصور ہے؟ اور کیا ان کا تصور ان شرائط پر پورا اترتا ہے؟ کیا ان کے اس تصور میں یہ چاروں خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قرآن بیان کر رہا ہے، اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو ہم مسلمانوں کو آپ کے تصورِ خدا پر کوئی اعتراض نہیں اور ہم اسے اللہ تعالیٰ تسلیم کرتے ہیں، بصورتِ دیگر فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیکن یہ دلائل سننے کے بعد بھی بالعموم ایک دہریہ آپ کی بات قبول نہیں کرے گا۔ وہ کہے گا کہ میں ان دلائل کو نہیں مانتا۔ میں ایک ہی چیز کو حتمی مانتا ہوں اور وہ ہے سائنس۔

اتنا تو میں بھی مانتا ہوں کہ آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ لہٰذا آیئے ہم سائنسی علوم کی روشنی میں قرآن کا جائزہ لیتے ہیں۔ دہریے یہی کہتے ہیں کہ ہم صرف اسی دعوے کو درست مانتے ہیں جو سائنس کی روشنی میں درست ثابت ہو۔ بصورتِ دیگر ہم خدا کو نہیں مانتے۔

میں ان تمام تعلیم یافتہ حضرات سے ایک سوال کرنا چاہوں گا جو خدا پر یقین نہیں رکھتے لیکن سائنس پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے ایک مشین آئے جس کے بارے میں آپ نے نہ کچھ سنا ہو، نہ پڑھا ہو، نہ ہی اسے کبھی دیکھا ہو تو آپ کے خیال میں وہ پہلا شخص کون ہوگا جو آپ کو اس مشین کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کر سکے۔ یہ مشین ایک دہریے کے سامنے ہے جو صرف سائنس پر یقین رکھتا ہے تو اس کے خیال میں کون ہوگا جو اس مشین کے نظامِ عمل کے بارے میں علم رکھتا ہو؟

میں نے یہ سوال سینکڑوں دہریے لوگوں سے، مذہب کے منکر لوگوں سے کیا ہے، تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ان کا جواب عموماً یہی ہوتا ہے:

''شاید اس مشین کا بنانے والا ہی یہ معلومات دے سکتا ہے۔''

کچھ کہتے ہیں موجد، کچھ خالق کا لفظ استعمال کریں گے، کچھ تیار کنندہ کا۔ سینکڑوں لوگوں سے سوال کرنے کے بعد بھی مجھے ملتے جلتے جواب ہی ملے ہیں۔ بہر حال جواب کچھ

بھی ہو میں تسلیم کر لیتا ہوں۔ دوسرا شخص کون ہوگا؟ یہ وہ شخص بھی ہوسکتا ہے جسے خالق نے بتایا ہو اور کوئی ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو اپنی تحقیق سے درست نتائج تک پہنچ گیا ہو لیکن پہلا بہرصورت وہی ہوگا جو اس مشین کا خالق ہے، موجد ہے، تیار کنندہ ہے، بنانے والا ہے۔

اب میں اس دہریے سے، منکرِ خدا سے، جو صرف سائنس پر یقین رکھتا ہے ایک اور سوال کرتا ہوں کہ بتاؤ یہ کائنات کس طرح وجود میں آئی؟

وہ جواب دیتا ہے کہ دراصل پہلے صرف مادے کا ایک مجموعہ تھا جسے پرائمری نیبولا (Primary Nebula) کہتے ہیں۔ پوری کائنات یہی تھی۔ پھر ایک بہت بڑا دھماکہ (Big Bang) ہوا۔ جس کے نتیجے میں ثانوی تقسیم ہوئی اور کہکشائیں وجود میں آئیں۔ ستارے اور سیارے بنے۔ اور یہ زمین بھی وجود میں آئی جس پر ہم رہ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ جنوں پریوں کی کہانیاں تم نے کہاں سے سنی ہیں؟ وہ کہتا ہے ''نہیں، یہ جنوں پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ یہ تو سائنسی حقائق ہیں جو کل ہی ہمارے علم میں آئے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں ''کل'' سے مراد نصف صدی یا ایک صدی کا عرصہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے کہ دو سائنسدانوں کو ''عظیم دھماکے کا نظریہ Big Bang Theory دریافت کرنے پر نوبل انعام سے نوازا گیا۔''

میں کہتا ہوں بالکل ٹھیک۔ تمہاری ہر بات سے مجھے اتفاق ہے، لیکن اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ یہ بات قرآن میں آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے ہی بیان فرمادی گئی تھی۔ سورۂ انبیاء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟

میرا قرآن آج سے چودہ صدیاں پیش تر نازل ہوا تھا۔ اس بات کے کافی ثبوت

موجود ہیں کہ یہ وہی کتاب ہے جو ۱۴۰۰ سال پہلے موجود تھی۔ تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ اس میں عظیم دھماکے کے نظریے کی طرف اشارہ موجود ہے؟

اس آیت میں انتہائی اختصار کے ساتھ Big Bang Theory موجود ہے۔ تم کہتے ہو یہ نظریہ سو یا پچاس سال پہلے سامنے آیا ہے تو پھر قرآن میں اس کا ذکر کہاں سے آ گیا؟

لامذہب اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ ''شاید کسی نے اندازہ لگایا ہوگا۔'' میں بحث نہیں کرتا، ان کی بات مان لیتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ زمین جس پر ہم رہ رہے ہیں، اس کی شکل کیسی ہے؟ جواب ملتا ہے کہ پہلے تو لوگ یہی سمجھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے اور اسی لیے وہ طویل سفر سے گھبراتے بھی تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ زمین کے کنارے پر پہنچ کر نیچے گر پڑیں۔ لیکن آج ہمارے پاس اس بات کے کافی سائنسی ثبوت موجود ہیں کہ زمین چپٹی نہیں ہے۔ زمین دراصل گول یعنی کرے کی شکل میں ہے۔ میں پوچھتا ہوں یہ بات آپ کو کب معلوم ہوئی؟

جواب ملتا ہے، ماضی قریب میں، سو سال پہلے، دو سو سال پہلے اور اگر جواب دینے والا صاحب علم ہو تو اس کا جواب ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ بات ثابت کی تھی وہ سر فرانسس ڈریک تھا، جس نے ۱۵۹۷ء میں یہ ثابت کیا کہ زمین کروی ہے۔

میں اسے کہتا ہوں کہ سورۂ لقمان کی اس آیت کا تجزیہ کرے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ [لقمان: ۲۹]

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، سب ایک وقت مقرر تک چلے جا رہے ہیں اور (کیا تم نہیں جانتے کہ) جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

پروتے ہوئے لانے سے مراد ہے ایک سست رو اور بتدریج تبدیلی۔ یعنی رات آہستہ آہستہ، بتدریج دن میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے اور رات دن میں۔ یہ عمل اس طرح ہونا ممکن ہی نہیں اگر زمین چپٹی ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زمین کی شکل کروی ہو۔ اسی طرح کا ایک پیغام ہمیں قرآنِ مجید کی سورۃ الزمر میں بھی ملتا ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝ ﴾ [الزمر: ۵]

’’اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک، ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو! وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے۔‘‘

دن کو رات پر لپیٹنے اور رات کو دن پر لپیٹنے کا یہ عمل بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین گول یعنی کرہ نما ہو۔ زمین کے چپٹے ہونے کی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ مجھے بتاتے ہیں کہ یہ بات ۱۵۹۷ء میں سامنے آئی تھی تو پھر قرآنِ عظیم میں یہ بات ایک ہزار چار سو سال پہلے کس طرح موجود تھی؟

ہوسکتا ہے وہ کہیں کہ یہ بھی اتفاق تھا، محض ایک اتفاق، ایک اندازہ جو درست ثابت ہوا۔ میں یہاں بھی بحث نہیں کرتا اور آگے بڑھتا ہوں۔

میرا اگلا سوال یہ ہوگا کہ چاند سے جو روشنی ہم تک پہنچتی ہے یہ کس چیز کی روشنی ہوتی ہے؟ وہ مجھے بتائے گا کہ پہلے ہم یہی سمجھتے تھے کہ یہ چاند کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن آج جب کہ سائنس ترقی کرچکی ہے، آج ہم جانتے ہیں کہ دراصل یہ سورج کی روشنی ہوتی ہے جو چاند سے منعکس ہوکر زمین تک آتی ہے۔ چاند خود سے روشن نہیں ہے۔

اس کے بعد میں اس سے ایک اور سوال کروں گا۔ اور وہ یہ کہ قرآنِ مجید کی سورۃ

فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ ﴾ [الفرقان : ٦١]

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک قمرِ منیر روشن کیا۔''

عربی میں چاند کے لیے لفظ ''قمر'' استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کی روشنی کے لیے لفظ ''منیرا'' استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد منعکس یا منعطف روشنی ہوتی ہے ''نور'' کا لفظ ایسی ہی روشنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

تم کہتے ہو کہ یہ حقیقت تم نے آج دریافت کی ہے، تو پھر بتاؤ، قرآن میں یہ بات ۱۴۰۰ سال پہلے کس طرح موجود تھی؟ وہ فوری جواب نہیں دے سکے گا، اسے کچھ دیر سوچنا پڑے گا اور شاید بالآخر اس کا جواب یہی ہوگا کہ غالباً یہ بھی محض اتفاق ہے، اندازہ ہے یا ''تکا لگ گیا ہے۔''

میں اس سے پھر بھی بحث نہیں کروں گا۔ گفتگو آگے چلانے کے لیے میں بحث سے گریز کروں گا۔ میں کہوں گا کہ اگر تمھارا جواب یہی ہے تو میں تم سے بحث نہیں کرتا۔ اور بات آگے بڑھاتا ہوں۔

میں اسے کہتا ہوں کہ میں نے ۱۹۸۲ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس وقت ہمیں بتایا گیا تھا کہ سورج ساکن ہے یعنی اپنے مرکز کے گرد تو مسلسل حرکت کر رہا ہے، گھوم رہا ہے، لیکن اپنے مقام کے لحاظ سے ساکن ہے۔ ہوسکتا ہے وہ پوچھے کہ کیا قرآن بھی یہی کہتا ہے؟ میرا جواب ہوگا کہ نہیں۔ یہ بات تو ہمیں سکول میں بتائی گئی تھی، میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا واقعی اسی طرح ہے؟

وہ کہے گا کہ نہیں۔ آج سائنس ترقی کر چکی ہے۔ اب ہمیں پتہ چلا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد گھومنے کے علاوہ مداری حرکت بھی کر رہا ہے۔ سورج کی مرکز کے گرد حرکت کا

آپ مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں، اگر آپ کے پاس ضروری آلات موجود ہوں۔ سورج کی سطح پر سیاہ دھبے موجود ہیں اور ان دھبوں کی حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد ایک چکر تقریباً پچیس دن میں پورا کر لیتا ہے۔ لیکن اس حرکت کے علاوہ سورج ایک مدار میں بھی حرکت کر رہا ہے۔

کیا قرآن کہتا ہے کہ سورج ساکن ہے؟ ہوسکتا ہے وہ دہریہ جس سے میں گفتگو کر رہا ہوں اس موقع پر ہنسنے لگے۔

لیکن پھر میں بتاتا ہوں کہ نہیں۔ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ ﴾ [الانبیآء: ۳۳]

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

قرآن بتا رہا ہے کہ سب ایک فلک میں، ایک مدار میں حرکت کر رہے ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ اگر یہ بات جدید سائنس نے حال ہی میں دریافت کی ہے تو پھر قرآن میں یہ بات چودہ سو سال پہلے ہی کس طرح بیان کر دی گئی تھی؟

وہ تھوڑی دیر تک خاموش ہی رہتا ہے اور کچھ دیر کے بعد کہتا ہے کہ عرب علم فلکیات کے ماہر تھے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے عربوں میں سے کسی نے یہ بات تمہارے پیغمبر ﷺ سے کی ہو اور انھوں نے اسے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہو!

میں مانتا ہوں، تسلیم کرتا ہوں کہ عرب علم فلکیات میں انتہائی ترقی یافتہ تھے لیکن ساتھ ہی میں اسے یاد دلاتا ہوں کہ وہ تاریخ کو گڈمڈ کر رہا ہے۔ کیوں کہ عربوں کا فلکیات میں ترقی کرنا بہت بعد کی بات ہے اور قرآن اس سے صدیوں پہلے نازل ہو چکا تھا۔ بلکہ دراصل عربوں کے فلکیات میں ترقی کرنے کا سبب ہی قرآن تھا۔ علم فلکیات عربوں سے قرآن میں نہیں آیا، قرآن سے عربوں نے سیکھا تھا۔ قرآن بہت سے سائنسی حقایق کا ذکر کرتا ہے۔

جغرافیے کے حوالے سے اور پھر ''آبی چکر'' (Water Cycle) کے حوالے سے دیکھیے تو قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ [الزمر: ۲۱]

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔''

قرآن آبی چکر کا ذکر متعدد آیات میں کرتا ہے اور پوری تفصیل کے ساتھ کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ پانی سمندروں کی سطح سے بخارات بن کر اٹھتا ہے۔ بادلوں میں تبدیل ہوتا ہے۔ بادل بالآخر کثیف ہو جاتے ہیں، ان میں بجلیاں چمکتی ہیں اور ان سے بارش ہوتی ہے۔ اس مظہر کا ذکر قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے۔

سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ۱۸]

''اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔''

سورۂ روم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ ﴾ [الروم: ۴۸]

''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے،

پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو وہ یکایک خوش وخرم ہو جاتے ہیں۔''

سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ [النور: ٤٣]

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں۔''

سورۂ روم میں فرمایا گیا:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

[الروم: ٢٤]

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمھیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے، خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یعنی قرآن متعدد مقامات پر آبی چکر کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ جب کہ یہ آبی چکر (Water Cycle) ایک سائنسدان نے جس کا نام Bernard Palacy تھا، ۱۵۸۰ء میں بیان کیا تھا۔ جو آبی چکر سائنس ۱۵۸۰ء میں دریافت کر رہی ہے وہ قرآن میں اس سے ہزار سال پہلے ہی موجود تھا؟ کیسے؟

اب ہم ''ارضیات'' کی جانب آتے ہیں۔ علم ارضیات میں ایک تصور بیان کیا جاتا

ہے جسے Folding کہتے ہیں۔ جس زمین پر ہم رہتے ہیں اس کی بیرونی پرت یا سطح خاصی باریک ہے۔ اس سطح میں بل پڑنے کے سبب پہاڑی سلسلے وجود میں آتے ہیں جو سطح زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ اب میں اس دہریے کو بتاتا ہوں کہ قرآنِ مجید کی سورۂ نبا میں بتایا گیا ہے:

﴿ اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۝ وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۝ ﴾ [النباء: ٦-٧]

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔''

قرآن کہتا ہے کہ پہاڑوں کو میخیں بنایا گیا ہے۔ ''اوتاد'' عربی میں اس میخ کو کہا جاتا ہے جو خیمہ کھڑا کرنے کے لیے گاڑی جاتی ہے۔ اور جدید سائنس بھی پہاڑوں کا اسی طرح کا کردار بیان کرتی ہے۔

یعنی پہاڑوں کی مثال خیموں کی میخوں کی سی ہے۔ قرآن مزید کہتا ہے:

﴿ وَجَعَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِهِمۡ وَجَعَلۡنَا فِیۡهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمۡ یَهۡتَدُوۡنَ ۝ ﴾ [الانبیآء: ٣١]

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔''

گویا قرآن یہ کہتا ہے کہ زمین میں پہاڑ اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ زمین ڈھلکنے سے محفوظ رہے۔

مزید برآں میرے پوچھنے پر وہ دہریہ کہے گا کہ اس کے علم میں ہے کہ سمندر میں میٹھا اور کھارا پانی بعض جگہوں پر الگ الگ رہتے ہیں۔ ان کے درمیان ایک روک موجود ہوتی ہے۔ ایک آڑ موجود ہوتی ہے جو دونوں طرح کے پانی کو ملنے نہیں دیتی اور الگ الگ رکھتی ہے۔ مَیں اُسے سورۂ فرقان کی یہ آیت سناتا ہوں:

﴿ وَهُوَ الَّذِیۡ مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ هٰذَا عَذۡبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلۡحٌ اُجَاجٌ

﴿ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○ ﴾ [الفرقان : ۵۳]

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈ مڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

اسی طرح کی بات سورۂ رحمان میں بھی کی گئی ہے:

﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ○ ﴾

[الرحمٰن: ۲۰۔۱۹]

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

آج جدید سائنس بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ بعض مقامات پر سمندر میں میٹھا اور کھاری پانی ایک دوسرے میں حل نہیں ہوتے، ان کے درمیان ایک روک موجود رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ دہریہ جس سے میں گفتگو کر رہا ہوں وہ اس موقع پر کہے کہ ''شاید کسی عرب نے سمندر میں غوطہ لگا کر اس روک کو دیکھ لیا ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا ہوگا، یوں یہ بات قرآن میں آگئی ہوگی۔''

لیکن بات یہ ہے کہ جس روک یا آڑ کا یہاں ذکر یہاں ہو رہا ہے، وہ نظر تو آتی ہی نہیں۔ یہ تو ایک نادیدہ رکاوٹ ہے۔ اسی لیے قرآن اس کے لیے ''برزخ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

یہ مظہر انتہائی واضح طور پر ''کیپ ٹاؤن'' کے قریب دیکھا جاسکتا ہے۔ یعنی افریقہ کے انتہائی جنوب میں۔ مصر میں بھی جہاں دریائے نیل سمندر سے ملتا ہے، یہی صورتِ حال ہوتی ہے۔ اسی طرح خلیج عرب میں جہاں ہزاروں کلومیٹر تک دونوں طرح کا پانی موجود ہے، لیکن الگ الگ رہتا ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ انبیاء میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے، غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟''

آپ ذرا تصور کیجیے کہ عرب کے صحراؤں میں جہاں پانی کی شدید قلت ہوتی ہے، وہاں یہ بات کہی جا رہی ہے۔ وہاں کس کو یہ خیال آسکتا تھا کہ ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ اگر انھیں اندازہ لگانا ہی ہوتا تو وہ ہر چیز کا اندازہ لگا سکتے تھے، انھیں کسی بھی چیز کا خیال آسکتا تھا، سوائے پانی کے۔ آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ ہر زندہ چیز خلیوں سے بنی ہے۔ ان خلیات کا بنیادی جزو سائٹو پلازم Cytoplasm ہوتا ہے جو کہ اسی فی صد پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر زندہ چیز پچاس سے نوے فی صد پانی پر مشتمل ہوتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آج سے چودہ صدیاں پیش تر، یہ بات قرآنِ حکیم میں کیوں کر بیان کر دی گئی تھی؟ اب وہ دہریہ بھی چپ ہو چکا ہوگا۔ وہ کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہوگا۔

شماریات کا ایک نظریہ ہے جسے Theory of Probability کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے دو ممکنہ جوابات ہو سکتے ہیں۔ ایک صحیح اور ایک غلط۔ اگر آپ محض اندازے سے جواب دیں تو پچاس فی صد امکان ہے کہ آپ کا جواب درست ہوگا۔ مثال کے طور پر جب آپ ٹاس کرتے ہیں تو دونوں طرف پچاس پچاس فی صد امکان ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ دو دفعہ ٹاس کریں تو اس بات کا کتنا امکان ہے کہ دونوں مرتبہ ہی آپ کا جواب درست ہوگا۔ پہلی مرتبہ پچاس فی صد یعنی دو میں سے ایک اور دوسری مرتبہ پچاس فی صد کا پچاس فی صد یعنی چار میں سے ایک امکان یا

یوں کہیے کہ پچیس فی صد امکان ہے کہ آپ دونوں مرتبہ درست جواب دیں گے۔

فرض کیجیے میں ایک پانسہ (Dice) پھینکتا ہوں جس کے چھ رخ ہے۔ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، اور ۶۔ اب اگر میں اندازہ لگاؤں تو اس اندازے کے درست ہونے کا امکان چھ میں سے ایک ہوگا۔ اب اگر میں دو دفعہ ٹاس کروں اور ایک دفعہ پانسہ پھینکوں تو یہ امکان کتنا ہے کہ ہر دفعہ میں جواب درست ہوگا؟

یہ امکان ہوگا، ۲/۱ ضرب ۲/۱ ضرب ۶/۱ یعنی ۲۴/۱ یا دوسرے لفظوں میں چوبیس میں ایک امکان یہ ہے کہ میرا جواب ہر بار درست ہوگا۔

آیئے یہ نظریہ (Theory of Probability) قرآن پر لاگو کر کے دیکھتے ہیں۔ محض گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ قرآن میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ محض اندازے ہیں جو درست ثابت ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان اندازوں کے درست ہونے کا امکان کتنا تھا؟

قرآن کہتا ہے کہ زمین گول یعنی کرہ نما ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ زمین کی شکل کے بارے میں کیا اندازے لگائے جاسکتے ہیں؟ کسی شخص کے ذہن میں زمین کی کون سی ممکنہ شکلیں آسکتی ہیں؟

کہا جاسکتا ہے کہ زمین چپٹی ہے یا تکون ہے یا چوکور ہے یا شش پہلو ہے یا ہشت پہلو ہے، اسی طرح بہت سی ممکنہ شکلیں سوچی جاسکتی ہیں، ذہن میں آسکتی ہیں۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ صرف تیس ممکنہ شکلیں ہوسکتی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص محض اندازہ لگاتا ہے تو اس اندازے کے درست ثابت ہونے کا امکان ۳۰ میں سے ایک ہوگا۔

چاند کی روشنی یا تو اس کی اپنی ہوگی یا منعکس ہوگی لہٰذا دو ہی صورتیں ہیں اور یہاں اندازہ درست ثابت ہونے کا امکان دو میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ امکان کہ ایک شخص کے دونوں اندازے درست ثابت ہوں گے، ساٹھ میں ایک ہے۔

اچھا، اب یہ بتایئے کہ صحرائے عرب میں رہنے والا شخص کیا اندازہ لگائے گا کہ انسان

بلکہ تمام جاندار کس شے سے بنے ہوئے ہیں؟ اور اندازہ بھی صحرا کے رہنے والے شخص نے ہی لگانا ہے تو اس کا جواب کیا ہوسکتا ہے؟ ہوسکتا ہے اس کا جواب ریت ہو، یا لکڑی یا لوہا یا کوئی اور دھات یا کوئی گیس یا تیل۔ وہ شخص دس ہزار اندازے لگا سکتا ہے اور اس کا آخری اندازہ پانی ہوگا۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر زندہ مخلوق پانی سے بنائی گئی ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔''

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا گیا:

﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ﴾ [النور: ٤٥]

''اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا۔''

یہ بات اگر محض اندازے سے کی جائے تو اندازہ درست ہونے کا امکان دس ہزار میں ایک ہوگا۔ اب یہ امکان کہ ایک شخص مذکورہ بالا تینوں معاملات میں اندازے سے جواب دے اور ہر بار اس کا اندازہ درست ثابت ہو، چھ لاکھ میں سے ایک ہے۔ یعنی ۰،۰۰۰۱۷ فی صد۔ اب میں یہ آپ حاضرین پر چھوڑتا ہوں کہ اس کے بعد آپ Theory of Probability کا اطلاق قرآن پر کرنا چاہیں گے یا نہیں۔

قرآن ایسے سینکڑوں حقائق کا ذکر کرتا ہے جو اس وقت یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں لوگوں کے علم میں نہیں تھے۔ اگر ان تمام بیانات کو اندازے فرض کیا جائے تو ان اندازوں کے بیک وقت درست ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ اور Probability کے نظریے کی رو سے تو یہ امکان صفر ہی رہ جاتا ہے۔

یہاں کچھ لوگ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ'' ذاکر صاحب کیا آپ قرآن کو سائنس کی مدد سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' لہٰذا میں یہ یاد دہانی ضروری سمجھتا ہوں کہ'' قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ یہ سائنز کی کتاب ہے۔ یعنی؛

Quran is not a book of Science

It is a Book of SIGNS.

یعنی یہ نشانیوں کی، آیات کی کتاب ہے، اس کتاب میں چھ ہزار آیات موجود ہیں جن میں سے ایک ہزار سے زاید آیات ایسی ہیں جن کا تعلق سائنسی علوم سے ہے۔ میں سائنس کو قرآن کے اثبات کے لیے استعمال نہیں کر رہا کیوں کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے آپ کو کسی پیمانے کی، کسی معیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہم مسلمانوں کے لیے آخری پیمانہ اور حتمی معیار خود قرآن ہے۔ قرآن ہی ہمارے لیے فرقان یعنی حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ اسی پیمانے پر ہم یعنی مسلمان صحیح اور غلط بیان کا فیصلہ کرتے ہیں۔

لیکن ایک دہریے کے لیے، ایک پڑھے لکھے شخص کے لیے جو خدا پر ایمان ہی نہیں رکھتا، اس کے لیے معیار کیا ہے؟ اس کے لیے تو آخری پیمانہ سائنس ہی ہے۔ لہٰذا میں اپنی بات اس کے سامنے اسی کے پیمانے سے درست ثابت کر رہا ہوں۔ البتہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سائنسی نظریات بسا اوقات تبدیل بھی ہو جایا کرتے ہیں، لہٰذا ہم نے صرف ثابت شدہ سائنسی حقائق ہی کو سامنے رکھا ہے۔ میں نے محض نظریات اور مفروضوں کی بنیاد پر بات نہیں کی۔ یعنی ایسے نظریات کو دلیل نہیں بنایا جن کی بنیاد مفروضوں پر ہے۔ میں نے اس کو یہ بتایا ہے کہ جو چیز تمھارے معیار اور پیمانے نے آج سے سو یا پچاس برس پہلے ثابت کی ہے قرآن اسے چودہ سو سال پہلے ہی بیان کر رہا تھا۔ لہٰذا بالآخر ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن ہی برتر ہے۔ سائنس اور قرآن میں سے برتری قرآن ہی کو حاصل ہے۔ قرآن متعدد سائنسی حقائق ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴾ [طٰہٰ: ۵۳]

''وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بنایا اور اس میں تمھارے چلنے کو

راستے بنائے اور اوپر سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے نباتات کے جوڑے نکالے۔“

آپ یہ بات ماضی قریب میں دریافت کر رہے ہیں کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ○ ﴾

[الانعام: ۳۸]

”زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔“

سائنس اس بات کا اثبات کچھ ہی عرصہ قبل کر رہی ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں بتایا گیا ہے کہ شہد کی مکھی شہد بنانے کے لیے رس جمع کرتی ہے۔ یہاں اس کے لیے مونث کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ کام نر مکھی نہیں کرتی بلکہ مادہ مکھی کرتی ہے۔ سائنس نے یہ حقیقت بھی حال ہی میں دریافت کی ہے، ورنہ پہلے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ یہ کام نر مکھی کرتی ہے۔ یہ مکھیاں صرف نو دریافت شدہ پودوں اور پھولوں کی اطلاع دیگر مکھیوں کو دیتی ہیں۔

سورۂ عنکبوت میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ○ ﴾

[العنکبوت: ۴۱]

”اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر، مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔“

یہاں بات محض مکڑی کے گھر یعنی جالے کی ظاہری کمزوری کے حوالے سے نہیں کی

اختتام اور خلاصہ

قرآن عظیم کہتا ہے:

﴿ وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ٥ ﴾[٦:١٠٨]

''(اور اے مسلمانو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں، ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو خوش نما بنا دیا ہے پھر انھیں اپنے رب کی طرف پلٹ کر آنا ہے اس وقت وہ انھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔''

﴿ وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ٥ ﴾

[۳۱:۲۷]

''زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائیں) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی۔ بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔''

﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ٥ ﴾

[۲۲:۷۳]

''لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔''

اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو خالق، مالک، آقا اور دنیاؤں کو پالنے والا ہے۔

حصہ دوم
اسلام کے بارے میں
غیر مسلموں کے بیس سوال

تعارف

دعوۃ (دعوتِ دین) ایک فرض ہے

اکثر مسلمان جانتے ہیں کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے، جو ساری کی ساری بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا خالق و مالک ہے اور مسلمانوں کو ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ اللہ رب العزت کا پیغام ساری انسانیت تک پہنچائیں۔ افسوس کہ آج کے بیشتر مسلمان اپنے اس فرض سے غافل ہو گئے ہیں۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام ہی ہمارے لیے زندگی گزارنے کا بہترین راستہ ہے، مگر ہم مسلمانوں کی اکثریت یہ خواہش نہیں رکھتی کہ اسلام کا یہ پیغام ان لوگوں تک بھی پہنچایا جائے جو اس نعمت سے محروم ہیں۔

دین کی دعوت اور تبلیغ کے لیے عربی میں لفظ ''دعوۃ'' استعمال ہوتا ہے، جس کا مطلب (کسی کو) پکارنا یا (کسی بات کے لیے) دعوت دینا، بلاوا دینا ہے۔ اسلامی سیاق وسباق میں اس کا مفہوم ''اللہ کے دین (اسلام) کو پھیلانے کی کوشش کرنا'' ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ [سورۃ:۲، آیت:۱۴۰]

''اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے؟ تمہاری حرکات سے، اللہ غافل تو نہیں ہے۔''

بیس عمومی سوالات

اسلام کا پیغام (دوسروں تک) پہنچانے کے لیے مکالمہ اور تبادلۂ خیال ناگزیر ہیں۔

قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ

بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ۝ ﴾ [سورۃ:۱۶، آیت:۱۲۵]

"اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔"

اسلام کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچانے میں عام طور پر یہ کافی نہیں ہوتا کہ اسلام کی مثبت فطرت پر روشنی ڈال کر ہی بس کر دیا جائے۔ بہت سے غیر مسلم، اسلام کی سچائی اور حقانیت کے قائل نہیں ہوتے کیونکہ ان کے ذہن کے گوشوں میں اسلام کے بارے میں کچھ ایسے سوالات بھی موجود ہوتے ہیں جو (اسلام سے ابتدائی تعارف ہو جانے کے باوجود) جواب طلب ہی رہتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ وہ اسلام کی مثبت فطرت سے متعلق آپ کی باتوں سے متفق ہو جائیں۔ لیکن، عین اسی موقع پر، وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں "ہاں! لیکن آپ لوگ تو وہی مسلمان ہیں ناں، جو ایک وقت میں کئی عورتوں سے شادی کرتے ہیں۔ آپ وہی لوگ تو ہیں جو عورتوں کو پردے میں رکھ کر ان کی حق تلفی کرتے ہیں۔ آپ لوگ بنیاد پرست بھی تو ہیں" وغیرہ۔

ذاتی طور پر میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ غیر مسلموں سے یہ پوچھا جائے کہ اُن کے اپنے محدود علم کے مطابق (خواہ وہ صحیح ہو یا غلط اور چاہے اس کا ذریعہ کچھ بھی ہو) اسلام میں ایسا کیا ہے جو انہیں غلط محسوس ہوتا ہے۔ میں ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں کہ وہ نہایت دوستانہ اور آزادانہ انداز اختیار کریں، اور (میں) پہلے انہیں اس بات پر قائل کرتا ہوں کہ اسلام کے بارے میں تنقید برداشت کر سکتا ہوں۔

گزشتہ چند سال کے دوران دعوت و تبلیغ کے ضمن میں میرا جو تجربہ رہا ہے، اس کی روشنی میں مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ ایک عام غیر مسلم کے ذہن میں اسلام کے متعلق بمشکل تمام بیس سوالات سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جب کبھی آپ کسی غیر مسلم سے پوچھیں "آپ کے

نزدیک اسلام میں کیا خرابی یا برائی ہے؟'' تو وہ آپ کے سامنے پانچ سے چھ سوالات پیش کر دیتا ہے اور یہ تمام سوالات بھی انہی بیس سوالوں میں شامل ہیں جو غیر مسلم عموماً اسلام کے بارے میں کرتے ہیں۔

اکثریت کو عقلی جوابات سے قائل کیا جا سکتا ہے

اسلام کے بارے میں پوچھے جانے والے بیس عام ترین سوالات کے جوابات عقلی دلیل اور منطق کے ذریعے دیے جا سکتے ہیں۔ غیر مسلموں کی اکثریت کو ان جوابات سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان ان جوابات کو صرف ذہن نشین بھی کر لے تو ان شاء اللہ وہ اس معاملے میں کامیاب رہے گا۔ اور اگر وہ غیر مسلموں کو اسلام کی مکمل اور آفاقی سچائی پر قائل نہیں بھی کر پایا، تب بھی وہ کم از کم ان غلط فہمیوں کا ازالہ تو ضرور ہی کر دے گا جو اسلام کے حوالے سے غیر مسلموں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی اسلام کے بارے میں ان کی منفی سوچ کو معتدل کر سکے گا۔ بہت ہی کم غیر مسلم ایسے ہیں جو ان جوابات کا رڈ کرنے کے لیے مزید دلائل لاتے ہیں، جن کے لیے مزید معلومات کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

ذرائع ابلاغ (میڈیا) کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں

بیشتر غیر مسلموں کے ذہنوں میں اسلام کے حوالے سے موجود غلط فہمیوں کی وجہ یہ ہے کہ ان پر ذرائع ابلاغ کی جانب سے اسلام کے بارے میں غلط معلومات کی بمباری مسلسل جاری رہتی ہے۔ بین الاقوامی میڈیا کے بڑے حصے پر مغربی دنیا کی اجارہ داری ہے۔ چاہے وہ عالمی سیٹلائٹ چینل ہوں، ریڈیو اسٹیشن ہوں، اخبارات و رسائل ہوں یا کتابیں ہوں۔ حال ہی میں انٹرنیٹ بھی اطلاعات کا ایک طاقتور ذریعہ بن چکا ہے۔ اگرچہ اس پر کسی کا کنٹرول نہیں ہے لیکن پھر بھی انٹرنیٹ پر اسلام کے بارے میں منفی اور زہر آلود پروپیگنڈے کی بھر مار ہے۔ بے شک، مسلمان بھی انٹرنیٹ کو اسلام اور مسلمانوں کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لیکن اسلام دشمن پروپیگنڈا کرنے والوں کے مقابلے میں وہ بہت پیچھے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ مسلمانوں کی کوششیں جاری رہیں گی اور ان میں اضافہ ہوگا، ان شاء اللہ۔

وقت کے ساتھ بدلتی غلط فہمیاں

اسلام کے حوالے سے اُٹھائے جانے والے عمومی سوالات مختلف ادوار میں مختلف رہے ہیں۔ بیس عمومی سوالات کا زیر نظر مجموعہ موجودہ دور کے لحاظ سے ہے۔ عشروں پہلے عمومی سوالات کا مجموعہ کچھ اور تھا۔ یہ مجموعہ آنے والے وقت میں تبدیل ہوسکتا ہے، جس کا انحصار اس بات پر ہے کہ عالمی ذرائع ابلاغ اسلام کی کیسی تصویر عوام الناس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ساری دنیا میں ایک جیسی غلط فہمیاں

دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف لوگوں سے ملنے کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ اسلام کے بارے میں یہ بیس عمومی سوالات ہر جگہ بالکل یکساں ہیں۔ کسی مخصوص علاقے، ماحول یا تمدن کے پیش نظر ان میں چند ایک سوالات کا اضافہ ہوسکتا ہے مثلاً، امریکہ میں عام پوچھا گیا اضافی سوال یہ تھا: ''اسلام میں سود لینے اور دینے کی ممانعت کیوں ہے؟''

میں نے ان بیس عمومی سوالات میں چند ایسے مخصوص سوالات بھی شامل کر دیے ہیں جو (اسلام کے حوالے سے) ہندوستانی غیر مسلموں کے ذہنوں میں سر اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان غیر سبزیاتی (نان ویجی ٹیرین) غذا کیوں کھاتے ہیں؟ یہ سوالات شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی نژاد لوگ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ دنیا کی آبادی کا ۲۰ فیصد، یعنی پانچواں حصہ بناتے ہیں۔ لہٰذا، ان کے سوالات بھی دنیا بھر کے غیر مسلموں کی جانب سے کیے جانے والے عمومی سوالات میں شامل ہوجاتے ہیں۔

ان غیر مسلموں کی غلط فہمیاں جنھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے

کئی غیر مسلم ایسے بھی ہیں جنھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے اسلام پر لکھی گئی ایسی کتابیں پڑھی ہیں جن میں اسلام پر جانب دارانہ اور متعصبانہ تنقید کی گئی ہے۔ ایسے غیر مسلموں میں اسلام کے حوالے سے بیس اضافی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً وہ قرآن پاک میں تضادات کا دعویٰ کرتے ہیں، ان میں یہ تاثر ہے کہ قرآن پاک غیر سائنسی ہے وغیرہ۔ ایسے اعتراضات کے لیے بیس جوابات کا ایک اضافی مجموعہ ہے، جس کا مقصد ان

غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے .... کیونکہ ان غیر مسلموں نے اسلام کا مطالعہ مسخ شدہ ذرائع سے کیا ہے۔ ان سب کے علاوہ میں نے اپنی تقریروں اور ایک کتاب میں بھی ایسے بیس سوالوں کے جواب دیے ہیں جو زیادہ عام نہیں ہیں اور اُن غیر مسلموں کی جانب سے کیے جاتے ہیں جنہوں نے اسلام کا تھوڑا بہت مطالعہ کر رکھا ہے۔

ا۔ کثرتِ ازدواج

سوال: اسلام میں مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت کیوں ہے؟ یعنی اسلام میں کثرتِ ازدواج کی اجازت کیوں ہے؟

جواب:

کثرتِ ازدواج کی تعریف:

کثرتِ ازدواج (پولی گیمی) سے مراد شادی کا ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت ایک فرد ایک سے زیادہ شریکِ حیات رکھ سکتا ہو۔ کثرتِ ازدواج دو طرح کی ہوسکتی ہے۔ اس کی ایک شکل ''پولی گائنی'' (Polygyny) ہے جس کے تحت ایک مرد ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کر سکتا ہو، جبکہ اس کی دوسری صورت ''پولی اینڈری'' (Polyandry) ہے جس میں ایک عورت کئی مردوں سے بیک وقت شادی رچا سکتی ہے۔ اسلام میں محدود ''پولی گینی'' کی اجازت تو ہے، لیکن پولی اینڈری کی مکمل ممانعت ہے۔

اب میں اصل سوال کی طرف آتا ہوں، یعنی یہ کہ اسلام میں مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت کیوں ہے؟

قرآن پاک دنیا کی وہ واحد مذہبی کتاب ہے جو ''صرف ایک سے شادی کرو'' کا حکم دیتی ہے:

اس پوری دنیا میں صرف اور صرف قرآنِ پاک ہی وہ واحد مذہبی (الہامی) کتاب ہے، جس میں یہ جملہ موجود ہے: ''صرف ایک سے شادی کرو'' دوسری کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں ہے جو مرد کو صرف ایک بیوی رکھنے کا حکم دیتی ہو۔ کسی دوسری مذہبی کتاب میں، چاہے وہ ویدوں میں سے کوئی ہو، رامائن ہو، مہا بھارت ہو، گیتا ہو، زبور ہو یا انجیل، کسی میں بھی مرد کے

لیے بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے۔ان تمام کتابوں کے مطابق ،کوئی مرد ایک وقت میں جتنی عورتوں سے چاہے، شادی کر سکتا ہے۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے جب ہندو پنڈتوں اور عیسائی کلیسا (چرچ) نے بیویوں کی تعداد کو محدود کر کے صرف ایک کر دیا۔

ہندوؤں کی اپنی مذہبی شخصیات ،خود ان کی اپنے کتابوں کے مطابق ایک وقت میں کئی بیویاں رکھتی تھیں۔ مثلاً رام کے باپ ،یعنی راجہ دسرتھ کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔خود کرشنا کی کئی بیویاں تھیں۔

ابتدائی زمانے میں عیسائی مردوں کو اتنی بیویاں رکھنے کی اجازت تھی کہ جتنی وہ چاہیں کیونکہ انجیل میں بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی ہے۔ یہ تو صرف آج سے چند صدیوں پہلے کا واقعہ ہے کہ جب کلیسا نے بیویوں کی تعداد کو ایک تک محدود کر دیا۔

یہودیت میں بھی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ زبور میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں ، جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام (بیک وقت) سیکڑوں بیویوں کے شوہر تھے۔کثرتِ ازدواج کا یہ عمل (یہودیوں میں) ربّی گرشم بن یہودا (۹۶۰ء تا ۱۰۳۰ء) تک جاری رہا۔گرشم نے اس عمل کے خلاف مذہبی حکم نامہ جاری کیا تھا۔مسلم ممالک میں آباد یہودی جو بالعموم سپین اور شمالی افریقہ کے یہودیوں کی اولاد تھے، انہوں نے عشرہ ۱۹۵۰ء کے اختتام تک یہ سلسلہ جاری رکھا، یہاں تک کہ اسرائیل کے سب سے بڑے ربّی نے ایک مذہبی قانون کے ذریعے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر (یہودیوں کے لیے) عالمگیر پابندی عاید کر دی۔

دلچسپ نکتہ

ہندوستان میں ۱۹۷۵ء کی مردم شماری کے مطابق ،مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں میں کثرتِ ازدواج کی شرح زیادہ تھی۔ ۱۹۷۵ء میں ''کمیٹی آف دی اسٹیٹس آف ومن اِن اسلام'' کی شائع کردہ رپورٹ میں صفحہ ۶۶ اور ۶۷ پر یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیانی برسوں میں ۵ء۶ فیصد ہندو کثیر الازدواج تھے، جبکہ اسی عرصے میں مسلمانوں کی صرف

۴ء۳۱ فیصد تعداد کی ایک سے زاید بیویاں تھیں۔ ہندوستانی قانون کے مطابق، صرف مسلمان مردوں ہی کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ غیر مسلموں کے لیے کثرتِ ازدواج غیر قانونی ہونے کے باوجود، مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں میں کثرتِ ازدواج کی شرح زیادہ تھی۔ اس سے پہلے ہندو مردوں پر بھی بیویوں کی تعداد کے معاملے میں کوئی پابندی نہیں تھی۔ ۱۹۵۴ء میں ''ہندو میرج ایکٹ'' منظور ہونے کے بعد سے ہندوؤں کے لیے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر پابندی عاید ہوئی۔ اس وقت بھی، ہندوستانی قانون کی رُو سے کسی ہندو کے لیے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا غیر قانونی ہے، لیکن ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے مطابق آج بھی ان پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔

چلیے، اب ہم یہ تجزیہ کرتے ہیں کہ آخر اسلام میں مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت کیوں دی گئی ہے؟

قرآن پاک، کثرتِ ازدواج کو محدود کرتا ہے

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، قرآن پاک وہ واحد مذہبی کتاب ہے جو کہتی ہے: ''صرف ایک سے شادی کرو'' اس نکتے کا سیاق وسباق، قرآن پاک کی درج ذیل آیت میں موجود ہے، جو سورۃ النساء کی ہے:

﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ ﴾ [سورۃ:۴، آیت:۳]

''اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کرلو۔ لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا اُن عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضے میں آتی ہیں۔ یہ بے انصافی سے بچنے کے لیے زیادہ قرین صواب ہے۔''

قرآنِ پاک کے نزول سے پہلے کثرتِ ازدواج کی کوئی انتہائی حد متعین نہیں تھی، لہٰذا مردوں کی بیک وقت کئی بیویاں ہوتی تھیں اور یہ تعداد بسا اوقات سیکڑوں تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ اسلام نے چار بیویوں کی انتہائی حد مقرر کر دی۔ اسلام کسی مرد کو دو، تین یا چار شادیوں کی اجازت تو دیتا ہے، لیکن صرف اور صرف اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان سب کے ساتھ انصاف کر سکے۔

اسی سورۂ مبارکہ، یعنی سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۲۹ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾ [سورۃ:۴، آیت:۱۲۹]

''بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانونِ الٰہی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو اُدھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

لہٰذا کثرتِ ازدواج کوئی قانون نہیں بلکہ ایک استثناء، ایک رعایت ہے۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ مسلمانوں کے لیے کثرتِ ازدواج ایک لازمی چیز ہے۔

وسیع تر تناظر میں اوامر (Do's) اور نواہی (Dont's) کے پانچ زمرے ہیں:

الف: فرض...... یعنی لازم

ب: مستحب...... یعنی ایسا کام جسے کرنے کی ترغیب دی گئی ہو، اسے کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہو، لیکن وہ کام فرض نہ ہو۔

ج: مباح...... جائز، یعنی جسے کرنے کی اجازت ہو۔

د: مکروہ...... یعنی ایسا کام جسے کرنا اچھا تصور نہ کیا جاتا ہو اور جس کے کرنے کی حوصلہ

شکنی کی گئی ہو۔

٥: حرام......یعنی ایسا کام جس کی اجازت نہ ہو، جس کا کرنا بالکل منع ہو۔

کثرتِ ازدواج مذکورہ بالا پانچوں زمروں کے درمیانی زمرے یعنی ''مباح'' کے تحت آتا ہے۔ یعنی ایک ایسا کام جس کی اجازت ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مسلمان جس کی دو، تین یا چار بیویاں ہوں، ایک بیوی رکھنے والے کسی دوسرے مسلمان کے مقابلے میں بہتر ہے۔

خواتین کی اوسط عمر، مردوں سے زیادہ ہوتی ہے

قدرتی طور پر عورتیں اور مرد تقریباً یکساں تناسب سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک لڑکی میں (پیدائش کے وقت سے ہی) لڑکوں کی بہ نسبت زیادہ امنیت (Immunity) ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ ایک لڑکی، لڑکے کے مقابلے میں جراثیم اور بیماریوں سے زیادہ بہتر انداز میں اپنا دفاع کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹی عمر کے بچوں میں لڑکوں کی اموات کا تناسب، لڑکیوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

اسی طرح جنگوں وغیرہ میں بھی عورتوں سے زیادہ مردوں کی ہلاکتیں ہوتی ہیں۔ بیماریوں اور حادثوں کی وجہ سے بھی مردوں کی اموات، عورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ خواتین کی اوسط عمر، مردوں کی اوسط عمر سے زیادہ ہوتی ہے اور کسی بھی موقع پر ہمیں دنیا بھر میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہی ملتی ہے۔

لڑکیوں کے اسقاطِ حمل اور بچیوں کی ہلاکت کے باعث ہندوستان میں مردوں کی آبادی، خواتین سے زیادہ ہے

اپنے کچھ پڑوسی ممالک سمیت، ہندوستان کا شمار دنیا کے ان چند ملکوں میں ہوتا ہے جہاں خواتین کی آبادی، مردوں کی آبادی سے کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بیشتر لڑکیوں کو شیر خوارگی ہی کے موقع پر ہلاک کر دیا جاتا ہے، جبکہ دوسری طرف اس ملک میں ہر سال دس لاکھ سے زاید بچیوں کو اسقاطِ حمل کے ذریعے، آنکھ کھولنے سے بھی پہلے، ہلاک کر دیا جاتا ہے.........یعنی جیسے ہی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ فلاں حمل کے نتیجے میں لڑکی پیدا ہوگی تو

اسقاطِ حمل کے ذریعے وہ حمل ضائع کروا دیا جاتا ہے۔ اگر ہندوستان میں یہ ظالمانہ عمل روک دیا جائے تو یہاں بھی عورتوں کی تعداد، مردوں سے زیادہ ہو جائے گی۔

عورتوں کی عالمگیر آبادی، مردوں سے زیادہ ہے

امریکہ میں عورتوں کی تعداد، مردوں کے مقابلے میں ۷۸ لاکھ زیادہ ہے۔ صرف نیویارک ہی میں عورتوں کی آبادی مردوں سے لگ بھگ دس لاکھ زیادہ ہے، جبکہ نیویارک کی مرد آبادی کا بھی ایک تہائی حصہ ہم جنس پرستوں پر مشتمل ہے۔ پورے امریکہ میں، مجموعی طور پر ڈھائی کروڑ سے زیادہ ہم جنس پرست مرد (Gays) موجود ہیں۔ یعنی یہ مرد، عورتوں سے شادی کرنا نہیں چاہتے۔ برطانیہ میں خواتین کی آبادی، مردوں کے مقابلے میں بقدر چالیس لاکھ زیادہ ہے۔ اسی طرح جرمنی میں خواتین کی تعداد مردوں سے پچاس لاکھ زیادہ ہے۔ روس کی طرف دیکھیں تو وہاں خواتین کی آبادی مردوں کی بہ نسبت ۹۰ لاکھ زیادہ ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ساری دنیا میں عورتوں کی مجموعی آبادی، مردوں کے مقابلے میں حقیقتاً کتنی زیادہ ہے۔

ہر ایک مرد کو صرف ایک بیوی تک محدود رکھنا عملاً ممکن نہیں

اگر ہر مرد کو صرف اور صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت ہو تو صرف امریکہ ہی میں تقریباً تین کروڑ خواتین کنواری رہ جائیں گی (کیونکہ وہاں کی مرد آبادی کے ڈھائی کروڑ افراد ہم جنس پرست ہیں) برطانیہ میں چالیس لاکھ، جرمنی میں پچاس لاکھ اور روس میں ۹۰ لاکھ عورتیں شوہر سے محروم رہیں گی۔

فرض کیجئے کہ آپ کی یا میری بہن غیر شادی شدہ ہے اور امریکہ کی شہری ہے۔ اب اس کے سامنے صرف دو ہی راستے ہوں گے: یا تو وہ کسی شادی شدہ مرد سے شادی کرے، یا پھر غیر شادی شدہ رہ کر ''عوامی ملکیت'' (پبلک پراپرٹی) بن جائے۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ سمجھ دار اور عقل مند لوگ، اس صورتحال میں پہلے راستے ہی کو ترجیح دیں گے۔

بیشتر عورتیں یہ نہیں چاہیں گی کہ ان کے شوہر کی کوئی دوسری شریکِ حیات بھی ہو۔ لیکن،

جب اسلام کا معاملہ سامنے آئے اور مرد کے لیے دوسری شادی کرنا (اسلام کو بچانے کی غرض سے) لازمی ہو جائے تو صاحبِ ایمان، شادی شدہ عورت یہ ذاتی نقصان برداشت کر کے اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دے سکتی ہے تاکہ اپنی مسلمان بہنوں کو ''عوامی ملکیت'' بننے سے، ایک عظیم تر نقصان سے بچایا جا سکے۔

''عوامی ملکیت'' بننے سے بہتر ہے کہ شادی شدہ مرد سے شادی کر لی جائے

مغربی معاشرے میں یہ بات عام ہے کہ مرد ایک شادی کرنے کے باوجود (اپنی بیوی کے علاوہ) دوسری عورتوں مثلاً ملازماؤں (سیکریٹریوں اور رفقائے کار) اور کئی اور طرح کی عورتوں کے ساتھ زن وشوہر والے تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو عورت کی زندگی کو شرمناک اور غیر محفوظ بنا دیتی ہے۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ وہی معاشرہ مرد کو صرف اور صرف ایک شادی کا پابند بناتا ہے اور دوسری بیوی کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتا.......... حالانکہ بیوی ہونے کی صورت میں عورتوں کو معاشرے میں باعزت مقام ملتا ہے، ان کا احترام کیا جاتا ہے اور وہ ایک محفوظ زندگی گزار سکتی ہیں۔

لہٰذا وہ عورتیں، جنہیں کسی وجہ سے شوہر نہیں مل پاتا، وہ صرف دو راستے اختیار کرنے پر ہی مجبور ہوتی ہیں: شادی شدہ مرد سے شادی کر لیں یا پھر ''عوامی ملکیت'' بن جائیں۔ اسلام ترجیحی بنیادوں پر عورت کو ایک محترم مقام دینے کے لیے پہلے راستے کی اجازت دیتا ہے، جبکہ دوسرے راستے پر پابندی عاید کرتا ہے۔

اسلام میں محدود پیمانے پر کثرتِ ازدواج کی اجازت کیوں ہے؟ اس کے جواب میں دوسرے کئی دلائل بھی موجود ہیں، تاہم اس کا بنیادی مقصد عورت کے تقدس اور احترام کی حفاظت کرنا ہے۔

۲۔ ایک وقت میں ایک سے زیادہ شوہر (پولی اینڈری)

سوال: اگر مرد کو کثرتِ ازدواج کی اجازت ہے تو پھر اسلام میں عورت کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

جواب: بہت سے افراد جن میں کچھ مسلمان بھی شامل ہیں، یہ پوچھتے ہیں کہ آخر اسلام میں مرد کے لیے کثرتِ ازدواج کی اجازت ہونے، اور عورت کے لیے یہ فعل ممنوع ہونے کی کیا عقلی دلیل ہے.......... کیونکہ ان کے خیال میں یہ عورت کا ایک ''حق'' ہے جس سے عورت کو محروم کیا گیا ہے۔

پہلے تو میں نہایت ادب و احترام سے یہ کہوں گا کہ اسلام کی بنیاد عدل اور مساوات پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو مساوی تخلیق کیا ہے، مگر مختلف صلاحیتوں کے ساتھ اور مختلف ذمہ داریاں نبھانے کے لیے۔ عورت اور مرد نہ صرف جسمانی، بلکہ نفسیاتی اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح ان کے کردار اور ان کی ذمہ داریاں بھی مختلف ہیں۔ یاد رکھیے! اسلام میں عورت اور مرد (ایک دوسرے کے) برابر ہیں، مگر باہم مماثل (Identical) نہیں ہیں۔

قرآنِ پاک کی چوتھی سورۂ مبارکہ، سورۃ النساء کی ۲۲ ویں تا ۲۴ ویں آیات میں ان عورتوں کی فہرست دی گئی ہے، جن سے مسلمان مرد شادی نہیں کر سکتے۔ سورۃ النساء کی ۲۴ ویں آیت میں مزید یہ بھی بتا دیا گیا ہے ''ان عورتوں سے بھی (شادی کرنے کی ممانعت ہے) جو شادی شدہ ہوں۔''

درج ذیل نکات میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام میں عورت کے لیے بیک وقت ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی ممانعت کیوں ہے:

۱ اگر کسی شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو اِن شادیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں کے والدین کی شناخت باآسانی ممکن ہے۔ یعنی ایسے کسی بچے کے باپ اور ماں، دونوں کے بارے میں آسانی سے بتایا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر کوئی عورت ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ شادی کرلے تو ایسی شادیوں سے پیدا ہونے والی اولاد کی ماں کے بارے میں تو پتا چل جائے گا، مگر باپ کا تعین نہیں ہو سکے گا۔ اسلام میں والدین، یعنی ماں اور باپ کی شناخت کو زبردست اہمیت دی گئی ہے۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ وہ بچے جنہیں اپنے والدین کا علم نہ ہو، خصوصاً جن کا باپ نامعلوم ہو، وہ متعدد ذہنی صدمات اور نفسیاتی مسائل کا شکار رہتے ہیں۔ عام طور پر ان کا بچپن ناخوش گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسم فروشی کرنے والی عورتوں کے بچوں کا بچپن نہایت کرب و الم میں گزرتا ہے۔ ایسی کسی شادی سے پیدا ہونے والے بچے کو جب اسکول میں داخل کرایا جاتا ہے، اور داخلے کے وقت اس کی ماں سے (بچے کے) باپ کا نام پوچھا جائے تو اسے دو یا دو سے زاید نام بتانے پڑیں گے۔

مجھے جدید سائنسی ترقی کا علم ہے جس کی بدولت یہ ممکن ہوگیا ہے کہ جینیاتی ٹیسٹنگ کر کے بچے کی ماں اور باپ، دونوں کی شناخت کرلی جائے۔ لہٰذا یہ نکتہ جو ماضی میں قابلِ اطلاق تھا، شاید آج کے دور میں اطلاق کے قابل نہ رہا ہو۔

۲ عورت کے مقابلے میں مرد کی فطرت میں کثرتِ ازدواج کا رجحان زیادہ ہے۔

۳ حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ایک مرد کے لیے کئی بیویاں ہوتے ہوئے بھی، ایک شوہر کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اگر ایسی کسی کیفیت کا سامنا عورت کو کرنا پڑے یعنی اس کے ایک سے زیادہ شوہر ہوں، تو اس کے لیے بیوی کی ذمہ داریاں بحسن وخوبی نبھانا ہرگز ممکن نہیں ہوگا۔ اپنے ماہواری کے چکر کے مختلف مراحل کے دوران ایک عورت کے طرزِ عمل اور نفسیات میں متعدد تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔

☆ کسی عورت کے ایک سے زیادہ شوہر ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے جنسی شریک (سیکسوئل پارٹنرز) بھی کئی ہوں گے۔ لہٰذا اس کے کسی جنسی بیماری میں مبتلا ہونے کا، اور اس بیماری کو اپنے دیگر شوہروں تک منتقل کرنے کا امکان بھی بہت قوی ہوگا، چاہے وہ تمام کے تمام مرد صرف اسی ایک عورت تک ہی کیوں نہ محدود ہوں۔ اس کے برعکس، اگر کسی مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں، اور وہ اپنی بیویوں ہی تک محدود رہے تو ایسا خدشہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

مذکورہ بالا دلائل صرف وہ ہیں جن کا مشاہدہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً جب اللہ تعالیٰ نے، جو حکمت کا سرچشمہ ہے، عورت کے لیے کثرتِ ازدواج کی ممانعت کی ہے تو اس میں بھی لاتعداد حکمتیں پوشیدہ ہوں گی۔

۳۔عورتوں کے لیے حجاب (پردہ)

سوال: اسلام عورتوں کو پردے میں رکھ کر ان کی تذلیل کیوں کرتا ہے؟

جواب: لادین میڈیا بطورِ خاص اسلام میں عورتوں کے مقام کو تاک تاک کر اپنی تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ ''حجاب'' یا (عورتوں کے) اسلامی لباس کو بیشتر لوگ اسلامی قانون کے تحت عورت کی حق تلفی یا تذلیل قرار دیتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اسلام میں عورت کے لیے ''حجاب'' کے پسِ پشت دلائل کا تجزیہ کریں، بہتر ہوگا کہ آمدِ اسلام سے قبل دیگر معاشروں میں عورت کے مقام پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

ماضی میں عورتوں کو تکمیل ہوس کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی توہین کی جاتی تھی

درج ذیل تاریخی مثالوں سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ آمدِ اسلام سے پہلے کی تہذیبوں اور معاشروں میں عورت کا مقام اس قدر پست تھا کہ انہیں ایک عام انسان کی حیثیت سے بھی حقوق حاصل نہیں تھے۔

الف...... بابل کی تہذیب میں:

بابل کے قانون میں عورتوں کی نہایت توہین و تذلیل کی گئی تھی اور انہیں تمام حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ مثال کے طور پر اگر وہاں کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر دیتا تو اسے سزا دینے کی بجائے اس کی بیوی کو سزائے موت دی جاتی تھی۔

ب...... یونانی تہذیب میں:

قدیم زمانے کی تہذیبوں میں یونانی تہذیب کو سب سے عظیم اور بلند پایہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی ''عظیم المرتبت'' نظام کے تحت عورتوں کو ہر طرح کے حقوق سے محروم رکھا گیا تھا اور انہیں نہایت حقارت کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ یونانی دیو مالا میں ''پنڈورا'' کے نام سے ایک

''خیالی عورت'' کا تذکرہ ملتا ہے، جو اس دنیا میں نوعِ انسانی کے تمام تر مسائل اور پریشانیوں کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ یونانیوں کے نزدیک عورت ''انسانوں سے کم تر'' تھی، جبکہ مردوں کے مقابلے میں بھی اس کا مقام کم تر تھا۔ اگرچہ عورت کی عصمت، یونانی تہذیب میں قیمتی تصور کی جاتی تھی، اور عورتوں کو احترام کے ساتھ رکھا بھی جاتا تھا، لیکن بعدازاں یونانیوں نے اپنی انا اور جنسی ہوس کے ہاتھوں مغلوب ہوکر عورت کو تذلیل و توہین کا خوب نشانہ بنایا۔ یونانی معاشرے کے سارے طبقات میں عصمت فروشی ایک عام سی چیز بن کر رہ گئی۔

ج...... رومی تہذیب میں:

جب روم کی تہذیب اپنی رفعت وعظمت کے ''عروج'' پر تھی تو وہاں پر مردوں کو یہ تک آزادی تھی کہ وہ اپنی بیویوں کو قتل کر دیں۔ علاوہ ازیں عصمت فروشی اور برہنگی بھی رومیوں میں بہت عام تھی۔

د...... مصری تہذیب میں:

مصریوں کے نزدیک عورت کو برائی سمجھا جاتا تھا اور عورتوں کو شیطان کی نشانی قرار دیا جاتا تھا۔

ھ...... قبل از اسلام عرب میں:

عرب میں اسلام پھیلنے سے قبل، عربوں میں بھی عورتوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور عموماً جب کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی تو اس بچی کو زندہ دفنا دیا کرتے تھے۔

اسلام نے عورتوں کا مرتبہ بلند کیا، انہیں مساوات دی، اوران سے اس مقام کی پاسداری کا تقاضا کرتا ہے

اسلام نے معاشرے میں عورتوں کا مقام بلند کیا اور آج سے چودہ سو سال پہلے انہیں ان کے جائز حقوق دیے۔ اسلام، عورتوں سے یہ توقع بھی کرتا ہے کہ وہ اپنے اس مقام کی پاسداری کریں گی۔

مَردوں کے لیے حجاب:

لوگ عام طور پر صرف عورتوں کے حوالے سے حجاب کی بات کرتے ہیں۔ تاہم، قرآنِ پاک میں عورتوں کے حجاب سے پہلے مردوں کے لیے حجاب کا تذکرہ آیا ہے۔ سورۃ النور میں آتا ہے:

﴿ قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ ﴾ [سورۃ:۲۴۔آیت:۳۰]

''اے نبیؐ! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔''

جب کوئی مرد کسی عورت کو دیکھے، تو بہت ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں بے شرمی یا بے حیائی کی کوئی بات آ جائے، لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ فوراً اپنی نگاہیں نیچی کر لے۔

عورتوں کے لیے حجاب:

سورۃ النساء کی اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ اَوْ آبَائِهِنَّ اَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَائِهِنَّ اَوْ اَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ ط...... ﴾ [سورۃ:۲۴، آیت:۳۱]

''اور اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں، مگر ان لوگوں کے سامنے، شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، بیٹے۔......''

حجاب کی چھ کسوٹیاں

قرآن وسنت کی رُو سے حجاب کے لیے چھ بنیادی کسوٹیاں یا شرائط عاید کی گئی ہیں:

۱۔ حدود (Extent)

پہلی کسوٹی تو یہ ہے کہ جسم کا کس قدر حصہ (لازماً) ڈھکا ہونا چاہیے۔ مردوں اور عورتوں کے لیے یہ کیفیت مختلف ہے۔ مردوں کو حکم ہے کہ وہ اپنی ناف سے لے گھٹنوں تک سارا بدن لازماً ڈھانپ کر رکھیں۔ جبکہ عورتوں کے لیے چہرے کے سوا باقی تمام جسم کو اور ہاتھوں کو کلائیوں تک ڈھانپنے کا حکم ہے۔ اگر وہ چاہیں تو چہرے اور ہاتھوں کو بھی ڈھانپ سکتی ہیں۔ بعض علما کا کہنا ہے کہ ہاتھ اور چہرہ بھی ان اعضائے جسمانی میں شامل ہیں جن کا ڈھانپنا عورتوں کے لیے لازم ہے، یعنی خواتین کے حجاب کا حصہ ہے، اور یہی قول افضل ہے۔

باقی کی پانچوں شرائط عورتوں اور مردوں کے لیے ایک جیسی ہیں۔

۲۔ پہنا گیا لباس ڈھیلا ڈھالا ہو، یعنی ایسا نہ ہو کہ جس سے جسمانی خدوخال نمایاں ہوتے ہوں (مطلب یہ کہ تنگ، کسا ہوا، یا ''فٹنگ'' والا لباس نہ ہو)

۳۔ پہنا گیا لباس شفاف نہ ہو، یعنی ایسا نہ ہو کہ جس کے آر پار دیکھا جا سکے۔

۴۔ پہنا گیا لباس شوخ و چنچل اور بھڑک دار نہ ہو، یعنی لباس ایسا نہ ہو جو جنسِ مخالف کو راغب کرتا ہو۔

۵۔ پہنا گیا لباس ایسا نہ ہو کہ صنفِ مخالف کے لباس سے مماثلت رکھتا ہو، یعنی اگر کسی مرد نے لباس پہنا ہے تو وہ مردانہ ہی دکھائی دے، جبکہ اگر کسی عورت کا لباس ہے تو وہ عورتوں کے لباس جیسا ہو اور اس پر مردانہ لباس کی چھاپ نہ ہو۔

۶۔ پہنا گیا لباس ایسا ہو کہ جس میں کفار کی مشابہت نہ ہو، یعنی ایسا لباس نہ پہنا جائے جس سے (کفار کے کسی گروہ کی) کوئی شناخت بطورِ خاص وابستہ ہو، یا اس پر کچھ ایسی علامات بنی ہوں جو کفار کے مذاہب کی ترجمان ہوں۔

حجاب میں دوسری چیزوں کے علاوہ عمل اور طرزِ عمل بھی شامل ہیں

لباس کی مذکورہ بالا چھ شرائط کے علاوہ، مکمل ''حجاب'' میں عملی اخلاقیات، طرزِ عمل، رویہ اور (حجاب کرنے والے) فرد کی نیت بھی شامل ہے۔ اگر کوئی فرد صرف لباس کی حد تک حجاب کی شرائط پوری کرتا ہے تو وہ حجاب کے حکم پر محدود انداز ہی میں عمل کر رہا ہوگا۔ لباس کے حجاب کے ساتھ آنکھوں کا حجاب، دل کا حجاب، سوچ کا حجاب، نیت اور عمل کا حجاب بھی یکساں طور پر ضروری ہے۔ اس (حجاب) میں کسی شخص کا چلنا، بولنا اور طرزِ عمل وغیرہ تک سب باتیں شامل ہیں۔

حجاب دست درازی سے بچاتا ہے

عورتوں کے لیے حجاب کیوں ضروری قرار دیا گیا ہے؟ اس کی ایک وجہ سورۂ احزاب کی درج ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے:

﴿ يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ ﴾ [سورۃ:۳۳، آیت:۵۹]

''اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے، تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔''

قرآنِ پاک کی اس آیت مبارکہ سے واضح ہے کہ عورتوں کے لیے حجاب اس وجہ سے ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ باوقار حیثیت سے شناخت کی جاسکیں، اور دست درازی سے بھی محفوظ رہ سکیں۔

جڑواں بہنوں کی مثال

فرض کیجیے جڑواں بہنیں ہیں، جو یکساں طور پر خوبصورت بھی ہیں۔ کسی دن وہ ایک ساتھ گھر سے نکلتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے مکمل طور پر اسلامی حجاب کیا ہوا ہے، تمام جسم ڈھکا ہوا

ہو۔ دوسری جڑواں بہن نے مغربی لباس پہن رکھا ہے، یعنی منی اسکرٹ یا شارٹس پر مبنی لباس جو مغرب میں عام ہے۔ اب فرض کیجئے کہ گلی کے کونے پر کوئی اوباش، لفنگا یا بدمعاش بیٹھا ہے جو آتے جاتے لوگوں کو چھیڑتا ہے، خصوصاً لڑکیوں کو۔ یہ بتایئے کہ وہ پہلے کسے تنگ کرے گا؟ اسلامی حجاب والی لڑکی کو، یا مغربی لباس میں ملبوس لڑکی کو؟ ظاہری سی بات ہے کہ اس کا پہلا ہدف وہی لڑکی ہوگی جو مغربی لباس میں گھر سے نکلی ہے۔ اس نوعیت کے لباس، جنس مخالف کے لیے ایک طرح کی بالواسطہ ''دعوت'' ہوتے ہیں کہ وہ چھیڑیں یا دست درازی کریں۔ پس! یہ ثابت ہوا کہ قرآنِ پاک نے یہ بالکل صحیح فرمایا ہے کہ حجاب، عورتوں کو دست درازی سے بچاتا ہے۔

زناکاروں کے لیے سزائے موت

اسلامی شریعت کے مطابق، اگر کسی آدمی پر کسی (شادی شدہ) عورت سے زنا کرنے کا جرم ثابت ہو جائے تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ بہت سوں کو اس ''ظالمانہ'' سزا پر حیرت ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اسلام ایک بے رحمانہ اور سفاکانہ مذہب ہے! (نعوذ باللہ) میں نے سیکڑوں غیر مسلم مردوں سے ایک سادہ سوال کیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ فرض کیجئے! خدانخواستہ، آپ کی اپنی بہن، بیٹی، بیوی یا ماں کے ساتھ کوئی مرد زنا کرے اور اس مرد کو سزا دینے کے لیے آپ کے سامنے لایا جائے تو آپ کیا کریں گے؟ ان سب کا جواب تھا کہ وہ ایسے آدمی کو مار ڈالیں گے۔ بعض لوگوں نے تو اس حد تک کہا کہ وہ ایسے آدمی کو اذیتیں دیتے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جائے۔ تب میں نے ان سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص آپ کی بہن، بیٹی، ماں یا بیوی کی عزت لوٹ لے تو آپ اسے قتل کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن اگر یہی سانحہ کسی دوسرے کی بہن، بیٹی، بیوی یا ماں کے ساتھ ہوا ہو تو اس کے لیے سزائے موت تجویز کرنا سفاک اور بے رحمانہ عمل کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ دہرا معیار کیوں ہے؟

عورت کا مقام بلند کرنے کا مغربی دعویٰ جھوٹ ہے

آزادیٔ نسواں کے بارے میں مغرب کا دعویٰ ایک ایسا بہروپ ہے جو عورت کے جسمانی استعمال، روح کی پامالی اور عورت کو تقدس و احترام سے محروم کرنے کے لیے بھرا گیا ہے۔ مغربی معاشرے کا دعویٰ ہے کہ اس نے عورت کا مقام ''بلند'' کیا ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ مغرب میں عورت کی تذلیل کی گئی ہے۔ وہاں عورت کو ''آزادی'' کے نام پر داشتہ بنا دیا گیا ہے، اسے مسٹریس (ہر طرح کی ''خدمت'' کرنے والی خادمہ) اور ''سوسائٹی بٹر فلائی'' بنا کر ہوس پرستوں اور جنسی تجارت کرنے والوں کے ہاتھ میں کھلونا بنا دیا گیا...... یہی وہ سب لوگ ہیں جو ''آرٹ'' اور ''کلچر'' جیسے رنگین پردوں میں چھپ کر اپنا کاروبار چمکا رہے ہیں۔

امریکہ میں عصمت دری کی شرح سب سے زیادہ ہے

ریاستہائے متحدہ امریکہ (یو ایس اے) کو دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ تاہم یہی وہ ملک بھی ہے کہ جہاں عصمت دری کے واقعات بھی دنیا میں سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ایف بی آئی کی رپورٹ کے مطابق، سال ۱۹۹۰ء کے دوران صرف امریکہ میں ہر روز عصمت دری کی اوسطاً ۱۷۵۶ وارداتیں رپورٹ ہوئیں۔ بعد کی ایک اور رپورٹ میں، جس پر سال نہیں لکھا، امریکہ میں ہر روز عصمت دری کی اوسطاً ۱۹۰۰ وارداتیں بتائی گئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سال ۱۹۹۲ء یا ۱۹۹۳ء کے بارے میں ہو۔ ہوسکتا ہے کہ بعد کے برسوں میں امریکی اور زیادہ ''بہادر'' ہو گئے ہوں۔

عرضِ مترجم: ......امریکی معاشرے میں عصمت فروشی کو قانونی حیثیت حاصل ہے اور وہاں کی فاحشائیں حکومت کو باقاعدہ ٹیکس بھی ادا کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہاں کے قانون میں عصمت دری ایک ایسے فعل کو کہا جاتا ہے جب جنسی عمل میں کسی ایک فریق کی مرضی شامل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں غیر شادی شدہ جوڑوں کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے، جبکہ ''زنا بالرضا'' کو عصمت دری میں شامل نہیں کیا جاتا۔ یعنی اگر ان بدفعلیوں کو بھی عصمت دری کے زمرے میں لایا جائے تو صرف امریکہ ہی میں ہر روز لاکھوں مرد و زن ''زنا'' جیسے حرام ترین فعل میں مشغول ہیں)

اب ذرا تصور کیجئے کہ! امریکہ میں اسلامی حجاب کی پابندی کی جاتی ہے۔ اس حجاب کی رُو سے اگر ایک مرد کی نظر کسی غیر عورت پر پڑے تو وہ فوراً اپنی نظر جھکا لے۔ ہر عورت پوری طرح سے اسلامی حجاب کر کے گھر سے نکلے، یعنی وہ اپنا پورا جسم ڈھانپ کر نکلے۔ پھر یہ بھی ہو کہ اگر کوئی مرد زنا کا مرتکب پایا جائے تو اسے سزائے موت دی جائے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ایسے حالات میں امریکہ میں عصمت دری کی شرح بڑھے گی، یکساں رہے گی یا کم ہوگی؟

اسلامی شریعت کا نفاذ، عصمت دری میں کمی لائے گا

یہ بالکل فطری سی بات ہے کہ جب اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا تو اس کے مثبت نتائج بھی جلد ہی ملنے لگیں گے۔ اگر اسلامی شریعت دنیا کے کسی بھی حصے میں نافذ ہوگئی، خواہ وہ امریکہ ہو یا یورپ، تو معاشرے کو سکھ کا سانس ملے گا۔ حجاب عورت کے مقام میں کمی نہیں کرتا، بلکہ وہ تو عورت کا مرتبہ بلند کرتا ہے اور اس کی عزت و عصمت کی حفاظت کرتا ہے۔

۴۔ کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟

سوال: یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام کو امن کا مذہب قرار دیا جائے، کیونکہ یہ تو تلوار (جنگ وجدل) کے زور سے پھیلا ہے؟

جواب: بیشتر غیر مسلموں کی ایک عام شکایت یہ ہے کہ اگر اسلام طاقت کے استعمال سے پھیلا نہ ہوتا، تو اس وقت دنیا میں اس کے ماننے والوں کی تعداد اتنی زیادہ (اربوں میں) ہرگز نہ ہوتی۔ درج ذیل نکات یہ واضح کریں گے کہ اسلام کے تیز رفتار عالمگیر پھیلاؤ میں تلوار کی طاقت کے بجائے سچائی، عقل اور دلیل کی بے مثل طاقت کارفرما رہی ہے۔

اسلام کا مطلب ''امن'' ہے

لفظ ''اسلام'' کا ماخذ ''سلام'' ہے۔ جس کا مطلب امن ہے۔ اس کا ایک اور مفہوم یہ بھی ہے کہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ تعالیٰ کے حکم کا تابع کر دیا جائے۔ یعنی اسلام امن کا مذہب ہے، اور یہ امن وسکون اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب انسان اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع بنا دے۔

کبھی کبھار امن برقرار رکھنے کے لیے طاقت استعمال کرنا پڑتی ہے

اس دنیا کا ہر فرد امن اور ہم آہنگی قائم رکھنے کے حق میں نہیں۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنے ظاہری یا پوشیدہ مفادات کے لیے امن وامان میں خلل ڈالتے رہتے ہیں۔ لہٰذا، بعض مواقع پر امن قائم رکھنے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں پولیس کا محکمہ ہوتا ہے جو مجرموں اور معاشرے کے شر پسند عناصر کے خلاف طاقت استعمال کرتا ہے، تاکہ ملک میں امن وامان برقرار رکھا جا سکے۔ اسلام امن کی ترغیب دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسلام ہمیں یہ ترغیب بھی دیتا ہے کہ ناانصافی کے خلاف لڑیں۔ لہٰذا، بعض مواقع پر

ناانصافی اور شر پسندی کے خلاف لڑائی میں طاقت کا استعمال بھی کرنا پڑتا ہے۔ یاد رہے کہ اسلام میں طاقت کا استعمال صرف اور صرف امن اور انصاف کو فروغ دینے کے لیے ہی کیا جا سکتا ہے۔

مؤرخ ڈی لیسی اولیری کی رائے

اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، اس عام غلط فہمی کا بہترین جواب ایک نامور مؤرخ، ڈی لیسی اولیری نے اپنی مشہور کتاب ''اسلام ایٹ دی کراس روڈ'' میں صفحہ ۸ پر کچھ اس طرح سے دیا ہے:

''تاہم، تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگجو مسلمانوں کے دنیا بھر میں پھیلنے اور مفتوح اقوام کو تلوار کے زور پر دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کی من گھڑت داستان ان زبردست خیالی اور دیومالائی کہانیوں میں سے ایک ہے جنہیں مؤرخین ہمیشہ سے دہراتے آرہے ہیں۔''

مسلمانوں نے اسپین پر ۸۰۰ سال حکومت کی

مسلمانوں نے اسپین پر تقریباً ۸۰۰ سال حکومت کی۔ اسپین میں مسلمانوں نے لوگوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے (مسلمان بنانے) کے لیے کبھی تلوار کا استعمال نہیں کیا۔ بعد ازاں صلیبی عیسائیوں نے اسپین پر قبضہ کرلیا اور مسلمانوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ حد تو یہ ہے کہ پورے اسپین میں کسی ایک مسلمان کو بھی یہ اجازت نہ تھی کہ وہ آزادی سے اذان ہی دے سکتا۔

ایک کروڑ چالیس لاکھ عرب، آج بھی کپتی عیسائی ہیں

مسلمان پچھلے چودہ سو سال سے عرب کے حکمران رہے ہیں۔ درمیان کے صرف چند سال ایسے ہیں جب وہاں برطانوی اور فرانسیسی حکمرانی رہی۔ تاہم مجموعی طور پر مسلمان سرزمینِ عرب پر چودہ سو سال سے حکمران ہیں۔ اس کے باوجود، آج بھی وہاں ایک کروڑ چالیس لاکھ عرب ایسے ہیں جو کپتی عیسائی (کوپٹک کرسچنز) ہیں، یعنی وہ عیسائی جو وہاں نسل در نسل آباد چلے آرہے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے تلوار استعمال کی ہوتی تو اس خطے میں کوئی ایک عرب بھی

ایسا نہ ہوتا جو عیسائی رہ پاتا۔

ہندوستان میں ۸۰ فیصد سے زیادہ غیر مسلم ہیں

ہندوستان پر بھی مسلمانوں نے لگ بھگ ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اگر وہ چاہتے تو ان کے پاس اتنی طاقت تھی کہ وہ ہندوستان میں بسنے والے ایک ایک غیر مسلم کو (تلوار کے زور پر) اسلام قبول کرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ آج ہندوستان کی آبادی کا ۸۰ فیصد سے زاید حصہ غیر مسلموں پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں غیر مسلموں کی اتنی بڑی اکثریت خود اپنی زبان سے یہ گواہی دے رہی ہے کہ برصغیر میں بھی اسلام طاقت کے زور سے ہرگز نہیں پھیلا۔

انڈونیشیا اور ملائشیا

آبادی کے لحاظ سے انڈونیشا، دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ ملائشیا میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ کیا یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ ''کون سی فوج تھی جو (مسلح ہو کر) انڈونیشیا اور ملائشیا پر حملہ آور ہوئی تھی؟'' (یعنی وہاں پر اسلام کے پھیلاؤ میں مسلمانوں کی کون سی جنگی طاقت کو دخل ہے؟)

افریقہ کا مشرقی ساحل

اسی طرح براعظم افریقہ کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ بھی اسلام بہت تیزی سے پھیلا ہے۔ ایک بار پھر، یہی سوال سامنے آتا ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو کون سے مسلمان ملک کی فوج ان علاقوں کو فتح کرنے اور لوگوں کو مسلمان کرنے وہاں گئی تھی؟

تھامس کارلائل

مشہور مؤرخ، تھامس کارلائل اپنی تصنیف ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں اسلام پھیلنے کے بارے میں اس غلط فہمی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''تلوار تو ہے، لیکن آپ اپنی تلوار لے کر کہاں جائیں گے؟ ہر نئی رائے ابتدا میں اقلیت ہی کے درمیان ہوتی ہے۔ (ابتدا میں) صرف کسی ایک فرد کے ذہن میں ہوتی ہے۔ یہ سوچ وہیں سے پروان چڑھتی ہے۔ اس ساری دنیا کا صرف ایک

آدمی جو اس (بات) پر یقین رکھتا ہے، صرف ایک آدمی جو باقی سارے آدمیوں کے مدِ مقابل ہوتا ہے۔ پھر (اگر) وہ تلوار اُٹھا لے اور (اپنی بات کو) پھیلانے کی کوشش کرنے لگے، تو اس سے معمولی سی کامیابی ہی حاصل کر پائے گا۔ آپ کے پاس آپ کی اپنی تلوار لازماً ہونی چاہیے! (تاہم) مجموعی طور پر کوئی چیز اتنی ہی پھیلے گی کہ جتنی وہ خود، اپنے طور پر، پھیل سکتی ہے۔"

دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے

اسلام کون سی تلوار سے پھیلا؟ اگر مسلمانوں کے پاس یہ (تلوار) ہوتی اور انہوں نے اسلام پھیلانے کے لیے اس کا استعمال کیا بھی ہوتا، تب بھی وہ اسلام پھیلانے میں ان کے کسی کام نہ آتی، کیونکہ قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ ط ﴾ [سورۃ:۲،آیت:۲۵۶]

"دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔"

علم، عقل اور دلیل کی تلوار

جس تلوار نے اسلام کو دنیا بھر میں پھیلایا، وہ علم کی، عقل کی اور دلیل کی تلوار ہے۔ یہی وہ تلوار ہے جو انسان کے ذہن اور قلب کو فتح کرتی ہے۔ سورۃ النحل کی ۱۲۵ ویں آیتِ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ٥ ﴾ [سورۃ:۱۶،آیت:۱۲۵]

"اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ

بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔''

۱۹۳۴ء سے ۱۹۸۴ء کے درمیان دنیا کے سب سے زیادہ پھیلنے والے مذہب

ریڈرز ڈائجسٹ الماتک، برائے ۱۹۸۴ء میں شائع شدہ ایک مضمون میں دنیا کے بڑے مذاہب میں پھیلاؤ کے اعداد وشمار دیے گئے ہیں جو ۱۹۳۴ء سے ۱۹۸۴ء تک نصف صدی کا احاطہ کرتے ہیں۔ بعد ازاں یہی مضمون ''دی پلین ٹرتھ'' نامی جریدے میں بھی شائع ہوا۔ اس مضمون میں سرِ فہرست اسلام تھا، جو پچاس سال کے عرصے میں ۲۳۵ فیصد بڑھا تھا، جبکہ اسی دوران عیسائیت کا پھیلاؤ صرف ۴۷ فیصد تک رہا تھا۔ کیا یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس صدی میں ایسی کون سی جنگ ہوئی تھی جس نے کروڑوں لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا؟

اسلام، یورپ اور امریکہ میں سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے

اس وقت امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلنے والا مذہب اسلام ہے۔ اسی طرح یورپ میں بھی تیز رفتار ترین انداز سے پھیلنے والا مذہب اسلام ہی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سی تلوار ہے جو مغرب کے لوگوں کو اتنی تیزی سے اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر رہی ہے؟

ڈاکٹر جوزف ایڈم پیٹرسن کی رائے

ڈاکٹر جوزف ایڈم پیٹرسن نے بالکل درست کہا ہے:

''وہ لوگ جو اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ نیوکلیائی ہتھیار ایک نہ ایک دن عربوں کے ہاتھوں میں چلے جائیں گے، وہ یہ محسوس کرنے سے قاصر ہیں کہ اسلامی بم تو پہلے ہی گرایا جا چکا ہے۔ یہ بم تو اسی دن گرا دیا گیا تھا، جس دن محمد (ﷺ) پیدا ہوئے تھے۔''

۵۔ مسلمان بنیاد پرست اور دہشت گرد ہیں

سوال: بیشتر مسلمان بنیاد پرست اور دہشت گرد کیوں ہیں؟

جواب: یہ وہ سوال ہے جو مسلمانوں سے اکثر و بیشتر، براہِ راست یا بالواسطہ، عالمی امور پر گفتگو یا مذاہب پر بحث کے دوران کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں ایسے تصورات ہر طرح کے ذرائع ابلاغ میں مسلسل پیش کیے جاتے ہیں، جبکہ ان کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں نہایت غلط معلومات بھی نتھی کر دی جاتی ہیں۔

درحقیقت یہی وہ غلط سلط معلومات اور جھوٹے پروپیگنڈے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک یا ان کے خلاف پرتشدد کارروائیوں کے پس پشت کارفرما ہوتے ہیں۔ اس موقع پر میں امریکی میڈیا میں مسلمانوں کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔

اوکلاہوما بم دھماکے کے فوراً بعد امریکی میڈیا نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ اس حملے کے پیچھے ''مشرق وسطیٰ کی سازش'' ہے۔ کچھ عرصے بعد اس واقعے کا اصل مجرم پکڑا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ امریکہ کی مسلح افواج سے تعلق رکھنے والا ایک فوجی تھا۔

اب ہم بنیاد پرستی اور دہشت گردی جیسے الزامات کا تجزیہ کریں گے۔

لفظ ''بنیاد پرست'' کی وضاحت

بنیاد پرست ایسا کوئی بھی فرد ہوتا ہے جو کسی مخصوص نظریے یا رہنما اصولوں کے مجموعے (ڈاکٹرائین) سے وابستہ رہتے ہوئے، اس کی مطابقت میں عمل کرتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کے اچھا ڈاکٹر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ طب (میڈیسن) کی بنیادی باتوں سے واقف ہو، ان کا پابند ہو اور ان پر عمل بھی کرتا ہو۔ بہ الفاظ دیگر، اسے طب کے میدان کا ''بنیاد پرست'' ہونا چاہیے۔ ایک اچھا ریاضی دان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس شخص کو ریاضی کی مبادیات کا علم ہو، وہ ان

کا پابند ہو، اور ان کی مطابقت میں کام کرتا ہو۔ یعنی اسے ریاضی کے میدان کا بنیاد پرست ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک اچھا سائنس دان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو سائنس کی بنیادی باتوں کا علم ہو۔ آپ ان کے پابند ہوں اور ان کی مطابقت میں عمل بھی کریں۔ یعنی اچھا سائنس دان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سائنس کا ''بنیاد پرست'' بنا جائے۔

تمام بنیاد پرست یکساں نہیں ہوتے

تمام اقسام کے بنیاد پرستوں کی تصویر کشی ایک ہی قلم سے نہیں کی جاسکتی۔ یعنی تمام کے تمام بنیاد پرستوں کو (یکساں طور پر) اچھا یا برا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ درجہ بندی کے لیے ضروری ہے کہ اس شعبے یا سرگرمی کو دیکھا جائے کہ جس سے کسی بنیاد پرست کا تعلق ہے۔ مثلاً ایک بنیاد پرست چور یا ڈاکو کسی معاشرے کے لیے ضرر رساں ہے لہٰذا وہ ناپسندیدہ ہوگا۔ اس کے برعکس، ایک بنیاد پرست ڈاکٹر یا سرجن کی ذات سے معاشرے کو فائدہ پہنچتا ہے، لہٰذا اسے معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مجھے فخر ہے کہ میں مسلم بنیاد پرست ہوں

میں ایک بنیاد پرست مسلمان ہوں، الحمدللہ اسلام کی مبادیات سے واقف ہوں، ان کی پاسداری کرتا ہوں اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک سچے مسلمان کو اپنے بنیاد پرست ہونے پر شرمانا نہیں چاہیے۔ مجھے اپنے بنیاد پرست مسلمان ہونے پر فخر ہے، میں جانتا ہوں کہ اسلام کی مبادیات ہی انسانیت اور ساری دنیا کے لیے فائدہ مند ہیں۔ اسلام کی بنیادی باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو مجموعی طور پر نوعِ انسانی کے مفاد کے خلاف ہو۔ بہت سے لوگ اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی کئی تعلیمات غیر منصفانہ اور غیر معقول ہیں۔ اس کی وجہ اسلام کے بارے میں ان کی ناکافی اور غلط معلومات ہیں۔ اگر اسلامی تعلیمات کا کھلے ذہن سے تنقیدی تجزیہ کیا جائے تو اس حقیقت سے فرار ممکن ہی نہیں رہتا کہ اسلام درحقیقت اجتماعی وانفرادی، دونوں اعتبار سے نوعِ انسانی کے لیے فائدوں سے بھرپور ہے۔

لفظ ''بنیاد پرست'' کا لغوی ترجمہ

ویبسٹرز ڈکشنری کے مطابق ''بنیاد پرستی'' (فنڈامنٹل ازم) ایک تحریک تھی جو امریکہ کے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں شروع کی تھی۔ یہ تحریک (اصل میں) جدیدیت پرستی کا ردِعمل تھی، جس میں انجیل کی سچائی کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ عیسائی بنیاد پرستی کی اس تحریک میں یہ زور دیا گیا تھا کہ انجیل کے احکامات صرف عقیدے اور اخلاقیات سے وابستہ معاملات ہی میں نہیں، بلکہ تاریخی ریکارڈ کے ضمن میں بھی بالکل صحیح تسلیم کیے جائیں۔ اس عقیدے پر شدومد سے اصرار کیا جاتا تھا کہ صرف اور صرف انجیل ہی کو خدا کا ''صحیح کلام'' تسلیم کیا جائے۔ تو ثابت ہوا کہ بنیاد پرست کا لفظ پہلے پہل عیسائیوں کے اس گروہ نے استعمال کیا، جس کا عقیدہ تھا کہ انجیل ہی خدا کا وہ واحد کلام ہے جو کسی بھی قسم کی غلطیوں (اور تحریف) سے پاک ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق ''بنیاد پرستی'' سے مراد ''کسی بھی مذہب، خصوصاً اسلام کی بنیادی یا قدیمی تعلیمات (عقائد) پر سختی سے کاربند رہنا ہے۔''

آج اگر کسی شخص کے سامنے ''بنیاد پرست'' کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہ فوری طور پر ایسے کسی مسلمان کا تصور ذہن میں لاتا ہے جو دہشت گرد ہو۔

ہر مسلمان کو ''دہشت گرد'' ہونا چاہیے

ہر مسلمان کو دہشت گرد ہونا چاہیے۔ دہشت گرد کوئی ایسا شخص ہوتا ہے جو خوف و دہشت کی وجہ بنتا ہے۔ جس لمحے کوئی ڈاکو کسی پولیس والے کو دیکھتا ہے تو وہ بھی دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ یعنی پولیس والا کسی ڈاکو کے لیے دہشت گرد ہے۔ اسی طرح ہر مسلمان کو بھی معاشرے کے برے عناصر کے لیے ایک دہشت گرد ہونا چاہیے۔ خواہ وہ چور ہوں، ڈاکو ہوں یا بدکار۔ جب بھی ایسا کوئی برا شخص کسی مسلمان کو دیکھے تو اسے دہشت زدہ ہو جانا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ لفظ ''دہشت گرد'' سے مراد وہ شخص لیا جاتا ہے جو عام لوگوں میں خوف، ہراس اور دہشت پھیلانے کا باعث ہو۔ لیکن ایک سچے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف مخصوص لوگوں کے لیے ہی دہشت گرد ہو، یعنی ان لوگوں کے لیے جو معاشرے کے برے عناصر ہیں، جبکہ وہ

عام لوگوں کے لیے دہشت کی وجہ نہ بنے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایک سچے مسلمان کو عام اور معصوم لوگوں کے لیے امن وآشتی کا ذریعہ ہونا چاہیے۔

''دہشت گرد'' اور ''وطن پرست'' ایک ہی کام کرنے والوں کے دونام

برطانوی تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنے سے پہلے، آزادیٔ ہند کی جدوجہد کرنے والے وہ لوگ جو عدم تشدد پر متفق نہیں تھے، انہیں برطانوی حکومت نے ''دہشت گرد'' قرار دے دیا۔ انہی لوگوں کو آج ہندوستان میں ''آزادی کے متوالوں'' اور ''وطن پرستوں'' کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ لوگ وہی ہیں، کام بھی ایک ہی ہے، لیکن ان پر دو جداگانہ طبقات کی جانب سے دو مختلف ''لیبل'' لگا دیے گئے ہیں۔ ایک کے نزدیک وہ دہشت گرد تھے۔ اس کے برعکس، جن لوگوں کا یہ نقطۂ نظر تھا کہ برطانیہ کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں، وہ انہیں وطن پرست اور آزادی کے متوالوں جیسے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

لہٰذا، یہ ضروری ہے کہ کسی شخص کا فیصلہ سنانے سے پہلے اس کا موقف بھی ایمان داری سے سن لیا جائے۔ فریقین کے دلائل سنے جائیں، صورتحال کا جائزہ لیا جائے، ملزم کے عزائم اور ان کے پس پشت نیت کو بھی سامنے رکھا جائے اور پھر اسی کے مطابق اس شخص کے لیے فیصلہ صادر کیا جائے۔

اسلام کا مطلب ''امن'' ہے

اسلام کو ''سلام'' سے اخذ کیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے امن۔ یہ امن کا مذہب ہے جس کی مبادیات، اس کے پیروکاروں کو یہ تعلیم دیتی ہیں کہ وہ امن قائم کریں اور ساری دنیا میں امن پھیلائیں۔

لہٰذا ہر مسلمان کو بنیاد پرست ہونا چاہیے۔ یعنی اسے امن کے مذہب کی، اسلام کی بنیادی باتوں پر لازماً عمل کرنا چاہیے۔ اسے صرف ان لوگوں کے لیے دہشت گرد ہونا چاہیے جو معاشرے میں امن اور سکون کے دشمن ہیں۔ تاکہ معاشرے میں امن، سکون اور عدل وانصاف قائم کیا، اور قائم رکھا جاسکے۔

۸۔ غیر سبزیاتی غذا

سوال: جانوروں کو ہلاک کرنا ایک بے رحمانہ فعل ہے۔ تو پھر مسلمان غیر سبزیاتی غذا (نان ویجی ٹیرین فوڈ) کیوں استعمال کرتے ہیں؟

جواب: ''سبزی خوری'' آج ایک عالمی تحریک بن چکی ہے۔ بلکہ اب تو اس سے جانوروں کے حقوق بھی وابستہ کر دیے گئے ہیں۔ نوبت تو یہاں تک آن پہنچی ہے کہ بہت سے لوگ گوشت یا دوسری غیر سبزیاتی مصنوعات استعمال کرنے کو بھی جانوروں کے حقوق کی خلاف ورزی تصور کرنے لگے ہیں۔

اسلام صرف انسانوں ہی پر نہیں، بلکہ دوسری تمام جاندار مخلوقات پر بھی رحم کی تلقین کرتا ہے۔ تاہم، اسی کے ساتھ ساتھ، اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ زمین اور اس پر موجود خوبصورت پودے اور جانور، نوعِ انسانی کے فائدے ہی کے لیے تخلیق فرمائے ہیں۔ یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان تمام ذرائع کو، جو اس کے لیے اللہ کی نعمت اور امانت ہیں، عدل وانصاف کے ساتھ استعمال بھی کرے۔

اب ہم اس دلیل کے مختلف پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔

مسلمان ''پکا سبزی خور'' بھی ہو سکتا ہے

ایک مسلمان پوری طرح سے سبزی خور ہونے کے باوجود بھی ایک اچھا مسلمان ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ غیر سبزیاتی غذا ہی کھائیں۔

قرآن پاک، مسلمانوں کو غیر سبزیاتی غذا کی اجازت دیتا ہے

تاہم، قرآن پاک میں مسلمانوں کو غیر سبزیاتی غذا کھانے کی اجازت بھی دی گئی ہے اس کا ثبوت درج ذیل آیات مبارکہ ہیں:

﴿ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ ﴾ (سورۃ:۵، آیت:۱)

''تمہارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے ہیں۔''

﴿ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ ﴾

(سورۃ:۱۶، آیت:۵)

''اس نے جانور پیدا کیے جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور طرح طرح کے دوسرے فایدے بھی۔''

﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ ﴾ [سورۃ:۲۳، آیت:۲۱]

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فایدے بھی ہیں، ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔''

گوشت غذائیت سے بھرپور، اور مکمل پروٹین سے لبریز ہوتا ہے

غیر سبزیاتی غذا، بہترین پروٹین حاصل کرنے کا اچھا ذریعہ ہوتی ہے۔ حیاتیاتی اعتبار سے اس میں مکمل پروٹین ہوتے ہیں، یعنی ایسے پروٹین جن میں آٹھوں بنیادی امائنو ترشے (امائنوایسڈ) موجود ہوں۔ یہ ضروری امائنوایسڈز انسانی جسم میں نہیں بنتے، لہٰذا ان کا بیرونی غذا سے حصول ضروری ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں گوشت میں فولاد (آئرن)، وٹامن بی ون (B_1) اور نیاسین جیسے اہم اجزا بھی پائے جاتے ہیں۔

انسانی دانت ہمہ خور (اومنی وورس) نوعیت کے ہیں

اگر آپ سبزی خور جانوروں مثلاً گائے، بکری یا بھیڑ وغیرہ کے دانتوں کا مشاہدہ کریں تو آپ پر ان سب میں ایک حیرت انگیز یکسانیت کا انکشاف ہوگا۔ ان تمام جانوروں کے دانت سیدھے یا مستوی (فلیٹ) ہیں، یعنی ایسے دانت جو نباتاتی غذا چبانے کے لیے موزوں ترین

ہیں، اسی طرح اگر آپ شیر، چیتے یا تیندوے وغیرہ جیسے کسی گوشت خور جانور کے دانتوں کا مشاہدہ کریں تو وہاں بھی آپ کو ایک خاص طرح کی مماثلت نظر آئے گی۔ یعنی ان تمام، گوشت خور جانوروں کے دانت نوک دار ہیں جو گوشت پر مبنی غذا چبانے کے لیے موزوں ترین ہیں۔ اب، اگر آپ انسانی دانتوں کا مشاہدہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کچھ تو سپاٹ (فلیٹ) ہیں، جبکہ کچھ انسانی دانت نوک دار بھی ہیں۔ مطلب یہ کہ انسانی دانت نباتات (سبزیوں وغیرہ) کے علاوہ گوشت کھانے کے لیے بھی بہت موزوں ہیں۔ گویا انسان ''ہمہ خور'' (اومنی وورس) ہوا، جو سبزی اور گوشت کو یکساں سہولت کے ساتھ چبا سکتا ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ انسان صرف سبزیاں ہی کھائے تو اس نے ہمیں یہ اضافی، نوک دار دانت کیوں دیے؟ اس سوال کا منطقی جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ہمہ خور مخلوق کی حیثیت سے تخلیق فرمایا ہے، اور وہ ذاتِ پاک ہم سے توقع رکھتی ہے کہ ہم سبزیوں کے علاوہ غیر سبزیاتی غذا (یعنی گوشت وغیرہ) سے بھی اپنی جسمانی ضروریات پوری کر سکیں۔

انسانی نظام ہاضمہ، سبزیاتی اور غیر سبزیاتی، دونوں طرح کی غذاؤں کو ہضم کر سکتا ہے

سبزی خور جانوروں کا نظامِ ہاضمہ صرف نباتات ہی کو ہضم کر سکتا ہے۔ اسی طرح گوشت خور جانوروں کے نظام ہاضمہ میں صرف گوشت ہضم کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن انسانی نظام ہاضمہ کی خاصیت ہے کہ یہ سبزیاتی اور غیر سبزیاتی، دونوں طرح کی غذا ہضم کر سکتا ہے۔ اگر اللہ رب العزت یہ چاہتا کہ ہم (انسان) صرف سبزیوں ہی پر گزارا کریں تو وہ ہمارے نظام ہاضمہ کو اس قابل کیوں بناتا کہ وہ سبزیوں کے ساتھ ساتھ غیر سبزیاتی غذا کو بھی ہضم کر سکے۔

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں بھی غیر سبزیاتی غذا کی اجازت دی گئی ہے

الف: بہت سے ہندو ایسے بھی ہیں جو بڑی سختی سے سبزی خوری کی پابندی کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ''ماس مچھی'' کھانا، ان کے دھرم کے خلاف ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کی اپنی قدیم کتابوں میں لوگوں کے گوشت کھانے پر کوئی پابندی نہیں۔ انہی

ہیں، اسی طرح اگر آپ شیر، چیتے یا تیندوے وغیرہ جیسے کسی گوشت خور جانور کے دانتوں کا مشاہدہ کریں تو وہاں بھی آپ کو ایک خاص طرح کی مماثلت نظر آئے گی۔ یعنی ان تمام، گوشت خور جانوروں کے دانت نوک دار ہیں جو گوشت پرمبنی غذا چبانے کے لیے موزوں ترین ہیں۔ اب، اگر آپ انسانی دانتوں کا مشاہدہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کچھ تو سپاٹ (فلیٹ) ہیں، جبکہ کچھ انسانی دانت نوک دار بھی ہیں۔ مطلب یہ کہ انسانی دانت نباتات (سبزیوں وغیرہ) کے علاوہ گوشت کھانے کے لیے بھی بہت موزوں ہیں۔ گویا انسان "ہمہ خور" (اومنی وورس) ہوا، جو سبزی اور گوشت کو یکساں سہولت کے ساتھ چبا سکتا ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ انسان صرف سبزیاں ہی کھائے تو اس نے ہمیں یہ اضافی، نوک دار دانت کیوں دیے؟ اس سوال کا منطقی جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ہمہ خور مخلوق کی حیثیت سے تخلیق فرمایا ہے، اور وہ ذاتِ پاک ہم سے توقع رکھتی ہے کہ ہم سبزیوں کے علاوہ غیر سبزیاتی غذا (یعنی گوشت وغیرہ) سے بھی اپنی جسمانی ضروریات پوری کرسکیں۔

انسانی نظام ہاضمہ، سبزیاتی اور غیر سبزیاتی، دونوں طرح کی غذاؤں کو ہضم کرسکتا ہے

سبزی خور جانوروں کا نظامِ ہاضمہ صرف نباتات ہی کو ہضم کرسکتا ہے۔ اسی طرح گوشت خور جانوروں کے نظام ہاضمہ میں صرف گوشت ہضم کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن انسانی نظام ہاضمہ کی خاصیت ہے کہ یہ سبزیاتی اور غیر سبزیاتی، دونوں طرح کی غذا ہضم کرسکتا ہے۔ اگر اللہ رب العزت یہ چاہتا کہ ہم (انسان) صرف سبزیوں ہی پر گزارا کریں تو وہ ہمارے نظام ہاضمہ کو اس قابل کیوں بناتا کہ وہ سبزیوں کے ساتھ ساتھ غیر سبزیاتی غذا کو بھی ہضم کرسکے۔

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں بھی غیر سبزیاتی غذا کی اجازت دی گئی ہے

الف: بہت سے ہندو ایسے بھی ہیں جو بڑی سختی سے سبزی خوری کی پابندی کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "ماس مچھی" کھانا، ان کے دھرم کے خلاف ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کی اپنی قدیم کتابوں میں لوگوں کے گوشت کھانے پر کوئی پابندی نہیں۔ انہی

قدیم کتابوں میں ایسے سادھو سنتوں کے واقعات بھی لکھے ہیں جو غیر سبزیاتی غذا کھایا کرتے تھے۔

ب: ''منوسمرتی'' نامی کتاب میں، جو ہندو قوانین کا مجموعہ ہے، باب نمبر 5 کے 30 ویں اشلوک میں لکھا ہے: ''کھانے والا جوان کا گوشت کھائے کہ جو کھانے کے لیے ہیں، تو وہ کچھ برا نہیں کرتا، چاہے وہ ایسا روزانہ ہی کیوں نہ کرے، کیونکہ ایشور نے خود ہی بنایا ہے کچھ کو ایسا کہ کھائے جائیں اور کچھ کو ایسا کہ کھائیں۔''

ج: اسی کتاب، منوسمرتی کے باب نمبر 5 کے اگلے اشلوک 31 میں لکھا ہے: ''قربانی کا گوشت کھانا صحیح ہے، یہ ایک ریت ہے جو دیوتاؤں کا حکم جانا جاتا ہے۔''

د: منوسمرتی کے اسی پانچویں باب کے 39 ویں اور 40 اشلوک میں ہے: ''ایشور نے خود ہی بنایا ہے قربانی کے جانوروں کو قربانی کے لیے، ...... تو قربانی کے لیے مارنا کوئی قتل نہیں ہے۔''

ہ: مہابھارت انوشاسن پروا کے 58 ویں باب میں دھرم راج یدھشٹرا اور بھیشم پتاما کے درمیان اس بات پر مکالمہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے دادا پر دادا کی روحوں کو شردھا (مردوں کی تقریب) کے دوران اطمینان بخشنے کے لیے کوئی کھانا بھینٹ کرنا چاہے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ وہ بیان کچھ یوں ہے:

''یدھشٹرا نے کہا: ''او مہاشکتی شالی، مجھے بتا کہ وہ کیا چیز ہے جسے، اگر اپنے پُرکھوں کی روحوں کو بھینٹ کروں، تو وہ کبھی ختم نہ ہو! وہ کیا بھینٹ ہے جو (اگر دی جائے تو) ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے؟ وہ کیا ہو کہ جو (اگر پیش کی جائے تو) لافانی ہو جائے''

''بھیشم نے کہا ''میری بات سن! اے یودھشترا، وہ بھینٹیں کیا ہیں جو کوئی شخص شردھا میں چڑھائے اور جو شردھا کے لیے اچھی ہوں اور وہ کیا پھل ہیں جو ہر ایک کے ساتھ جوڑے جائیں۔ تل اور چاول اور جو اور ماش اور پانی اور جڑیں اور

پھل ، اگر انہیں شردھا پر بھینٹ کیا جائے تو ، اے بادشاہ! تیرے پرکھوں کی آتمائیں ایک مہینے تک خوش رہیں گی۔ اور اگر تو مچھلیوں کی بھینٹ کرے گا تو تیرے پرکھوں کی آتمائیں دو مہینے تک خوش رہیں گی۔ (بھیڑ کے) گوشت کی بھینٹ انہیں تین مہینوں تک ، اور خرگوش (کے گوشت) کی بھینٹ چار مہینوں تک خوش رکھے گی۔ بکری کے گوشت کی بھینٹ سے وہ پانچ مہینوں تک سؤر کے گوشت (کی بھینٹ) سے چھ مہینوں تک خوش رہیں گے، اور پرندوں کا گوشت انہیں سات مہینوں تک خوش رکھے گا۔ ایک ہرن کا گوشت ، جسے پریشاتا کہتے ہیں ، اور گوایا کا گوشت دس مہینے تک ، اور بھینسے کے گوشت کی بھینٹ انہیں گیارہ مہینے تک خوش رکھے گی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ شردھا پر دی گئی ، گائے کے گوشت کی بھینٹ ایک سال تک باقی رہتی ہے۔ بھینٹ کے (گائے کے) گوشت کے ساتھ اتنا گھی ملایا جائے کہ وہ تیرے پرکھوں کی آتماؤں کے لیے قبول ہونے کے قابل ہو۔ دھرنا سا (ایک بڑے بیل) کا گوشت تیرے پرکھوں کی آتماؤں کو بارہ برسوں تک خوش رکھے گا۔ گینڈے کا گوشت ، جسے پرکھوں کی آتماؤں کو چاند کی اُن راتوں میں بھینٹ کیا جائے جب وہ پرلوک سدھارے تھے ، تو وہ گوشت انہیں ہمیشہ خوش رکھے گا۔ اور ایک جڑی بوٹی ، جو کلاسکا کہلاتی ہے ، اور کنچن پھول کی پتیاں ، اور (سرخ) بکری کا گوشت بھی ، جو بھینٹ کیا جائے ، ہمیشہ کے لیے خوشی دیتا ہے۔

تو اگر چاہتا ہے کہ تیرے پرکھوں کی آتمائیں ہمیشہ کے لیے شانت (مطمئن) رہیں تو تجھے چاہیے کہ لال بکری کے گوشت سے ان کی سیوا کر۔''

ہندو مت بھی دیگر مذاہب سے متاثر ہوا

اگرچہ ہندو کتابوں میں غیر سبزیاتی غذا کی اجازت دی گئی ہے ، لیکن ہندو مت کے ماننے والوں نے بعد میں دیگر مذاہب کا اثر قبول کیا اور سبزی خوری کا نظام اپنا لیا۔ ان دوسرے

مذاہب میں جین مت وغیرہ شامل ہیں۔

پودے بھی زندگی رکھتے ہیں

بعض مذاہب نے سبزی خوری کی پابندی صرف اس لیے بھی اختیار کی ہے کیونکہ ان کے غذائی قوانین میں زندہ چیزوں (جانداروں) کو مارنا بالکل ممنوع ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے جانداروں کو ہلاک کیے بغیر زندہ رہ سکتا ہے، تو میں وہ پہلا فرد ہوں گا جو زندگی گزارنے کا یہ طریقہ اختیار کرے گا۔ ماضی میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ پودے بے جان ہوتے ہیں۔ آج یہ ایک مسلمہ عالمی حقیقت ہے کہ پودوں میں بھی زندگی ہوتی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی یہ منطق کہ زندہ جانداروں کو مار کر کھانا غلط ہے، آج کے دور میں بالکل غلط ثابت ہوتی ہے، چاہے وہ خالص سبزی خور ہی کیوں نہ بنے رہیں۔

پودے بھی درد محسوس کر سکتے ہیں

وہ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ پودے درد اور تکلیف کو محسوس نہیں کر سکتے لہٰذا پودوں کو مارنا، کسی جانوروں کو مارنے کے مقابلے میں بہت ہی کمتر درجے کا جرم ہے۔ آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ پودے بھی درد محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن پودوں کی چیخ و پکار کو سننا، انسان کے بس میں نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی کان صرف ۲۰ ہرٹز سے لے کر ۲۰،۰۰۰ ہرٹز فریکوینسی تک کی صوتی لہریں سن سکتا ہے۔ مذکورہ دونوں حدود، انسان کے لیے ''سماعت کی حدود'' بھی کہلاتی ہیں۔ ان حدود سے کم یا زیادہ فریکوینسی والی (صوتی) لہریں انسان کا کان نہیں سن سکتا۔ ایک کتا ۴۰،۰۰۰ ہرٹز تک کی لہروں کو سن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کتوں کے لیے مخصوص سیٹی بجائی جاتی ہے تو اس کی آواز انسانوں کو سنائی نہیں دیتی، لیکن کتے اس آواز کو سن کر دوڑے آتے ہیں۔ اس سیٹی کی آواز کی فریکوینسی ۲۰،۰۰۰ ہرٹز سے زیادہ ہوتی ہے۔

ایک امریکی کسان نے بھی پودوں پر تحقیق کی۔ اس نے ایک ایسا آلہ بنایا جو پودے کی چیخوں کو تبدیل کر کے فریکوینسی کے اس دائرے میں لاتا تھا کہ جہاں انسان بھی انہیں سن سکیں۔ اسے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ پودا کس کس وقت پانی کے لیے روتا ہے۔ جدید ترین

تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ پودے خوشی اور غمی تک محسوس کر سکتے ہیں، اور وہ روتے بھی ہیں۔

(**عرضِ مترجم**: ترجمے کا تقاضا پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ بیان اُردو قالب میں منتقل کیا ہے۔ انتہائی معذرت کے ساتھ، پودوں کے رونے کی تحقیق کسی امریکی ٹیبلائٹ کی پیداوار ہے۔ سنجیدہ سائنسی لٹریچر اور تحقیقی مواد سے پتا چلتا ہے کہ ناموافق حالات یا ماحولیاتی دباؤ کے ردّعمل میں پودوں سے بعض مخصوص مرکبات کا اخراج ہوتا ہے۔ ماہرین نباتات انہی کیمیائی مرکبات کو ''پودوں کی چیخوں'' سے تشبیہ دیتے ہیں)

دو حسیات کم والی مخلوق کو قتل کرنا نچلے درجے کا جرم ہے

ایک بار ایک سبزی خور نے بحث کے دوران یہ دلیل پیش کی کہ پودوں میں دو یا تین حسیات ہوتی ہیں، جبکہ جانوروں کی پانچ حسیات ہوتی ہیں۔ لہٰذا (کم تر حسیات کی وجہ سے) پودوں کو مارنا، جانوروں کو مارنے کے مقابلے میں نچلے درجے کا جرم ہے۔ خدانخواستہ، ثم خدانخواستہ، اگر آپ کا کوئی بھائی ایسا ہو جو پیدائشی طور پر ہی بہرا اور گونگا ہو، یعنی جس میں دو حسیات کم ہوں۔ وہ بالغ ہو جائے اور کوئی اسے قتل کر دے، تب کیا آپ جج سے کہیں گے کہ آپ کے بھائی کے قاتل نے ایک کم تر درجے کا گناہ کیا ہے، اور اسی لیے وہ کم تر درجے کی سزا کا حقدار ہے؟ صرف اس لیے کیونکہ آپ کے بھائی میں پیدائشی طور پر دو حسیات کم تھیں؟ اس کے بجائے آپ یہی کہیں گے کہ قاتل نے ایک بے قصور کو، معصوم کو قتل کیا ہے، لہٰذا اسے سخت سے سخت سزا سنائی جائے۔

قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (سورۃ:۲، آیت:۱۶۸)

''لوگو! زمین میں جو حلال اور طیب چیزیں ہیں انھیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

مویشیوں کی زیادہ آبادی

اگر اس دنیا کا ہر انسان سبزی خور ہوتا، تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ دنیا میں مویشیوں کی تعداد حد سے زیادہ بڑھ جاتی، کیونکہ ان میں افزائش نسل اور تولید کا عمل خاصا تیز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے، جو تمام تر حکمت و دانائی کا سرچشمہ ہے، ان مخلوقات کی تعداد کو مناسب انداز میں محدود اور برقرار رکھنے کا راستہ دکھایا ہے۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں (سبزیوں کے ساتھ ساتھ) مویشیوں کا گوشت کھانے کی اجازت بھی دی ہے۔

چونکہ سب لوگ غیر سبزی خور نہیں، لہٰذا گوشت کی قیمت بھی مناسب ہے

مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ کچھ لوگ سختی سے سبزی خوری پر کاربند ہیں۔ لیکن انہیں بھی چاہیے کہ وہ غیر سبزی خوروں کو سفاک کہہ کر مذمت نہ کریں۔ دراصل، اگر ہندوستان کے سارے لوگ غیر سبزی خور بن جائیں تو موجودہ غیر سبزی خوروں کا بڑا نقصان ہوگا، کیونکہ ایسی صورت میں گوشت کی قیمت قابو سے باہر ہو جائے گی۔

۷۔ جانوروں کو ذبح کرنے کا اسلامی طریقہ بے رحمانہ ہے

سوال: مسلمان جانوروں کو ذبح کرتے وقت بے رحمانہ طریقہ کیوں اختیار کرتے ہیں؟ یعنی انہیں اذیت دے کر، آہستہ آہستہ اور تکلیف دہ انداز میں کیوں مارتے ہیں؟

جواب: مسلمانوں میں جانوروں کو مارنے کا طریقہ، یعنی ذبیحہ پر لوگوں کی بڑی تعداد اعتراض اُٹھاتی ہے۔

درج ذیل نکات سے ثابت ہوتا ہے کہ ذبیحہ کا اسلامی طریقہ نہ صرف مبنی بر انسانیت ہے، بلکہ یہ سائنسی اعتبار سے بھی بہترین ہے۔

جانور ذبح کرنے کا اسلامی طریقہ

"ذَكَّيتُم" جو فعل کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اس کا مادہ لفظ "زکوٰۃ" (زکاۃ) ہے، یعنی پاک کرنا۔ "تزکیہ" بھی اسی سے اخذ کیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں "پاکی" جانور ذبح کرنے کے اسلامی طریقے میں درج ذیل شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے:

الف...... جانور کو تیز دھار چیز (چھری) سے ذبح کیا جائے:

جانور کو تیز دھار چیز (چھری) سے، اور تیزی سے ذبح کیا جائے تاکہ ذبح ہونے میں جانور کو ہونے والا درد کم سے کم کیا جائے۔

ب...... نرخرہ، حلق اور گردن کی رگیں کاٹی جائیں:

"ذَبِيحَہ" ایک مخصوص لفظ ہے جس سے مراد حلق، نرخرہ اور گردن میں موجود رگیں کاٹنا ہے، اس طرح سے جانور کو ذبح کرنے کی وجہ سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کاٹے بغیر ہی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ج......خون کو بہادیا جائے:

جانور کے سر کو دھڑ سے جدا کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اس کا سارا خون پوری طرح سے بہادیا گیا ہو۔ اس طرح سے خون کی مکمل نکاسی کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ خون، جسم کے اندر رہ گیا تو یہ جرثوموں کی نشوونما کے لیے ایک اچھے واسطے (میڈیم) کا کام کرے گا۔ ریڑھ کی ہڈی ابھی بالکل نہیں کاٹنی چاہیے کیونکہ اس میں وہ اعصاب ہوتے ہیں جو دل تک جاتے ہیں۔ اگر اس مرحلے پر یہ اعصاب کٹ گئے تو دل کی دھڑکن بھی رُک سکتی ہے، جس کی وجہ سے رگوں کے اندر خون جما رہ جائے گا۔

جرثوموں اور بیکٹر یا کے لیے خون ایک اچھا واسطہ ہے

جرثوموں ، بیکٹر یا اور زہریلے مرکبات وغیرہ کی افزائش کے لیے خون ایک اچھا واسطہ ہے۔ لہٰذا، جانور کو ذبح کرنے کے اسلامی طریقہ میں سارا (یا بیشتر) خون نکال دینا حفظانِ صحت کے اُصولوں کے عین مطابق ہے، کیونکہ اس خون میں جراثیم ، بیکٹیریا اور زہریلے مادے ہوتے ہیں۔

گوشت زیادہ عرصے تک تازہ رہتا ہے

اسلامی طریقے کے مطابق کی گئی قربانی کا گوشت زیادہ عرصے تک تازہ اور کھانے کے قابل رہتا ہے، کیونکہ اس میں دوسرے طریقوں سے کاٹے گئے جانوروں کے گوشت کی بہ نسبت خون کی مقدار بہت ہی کم ہوتی ہے۔

جانور کو تکلیف محسوس نہیں ہوتی

گردن کی رگیں تیزی سے کاٹنے کی وجہ سے دماغ تک جانے والے ان اعصاب تک خون کا بہاؤ بھی رُک جاتا ہے جو درد کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا جانور کو درد کا احساس نہیں ہوتا۔ یاد رہے کہ (دورانِ ذبیحہ) مرتا ہوا کوئی جانور تکلیف کی وجہ سے جھٹکے نہیں لیتا ، بلکہ اس میں پھڑکنے، تھرکنے اور کانپنے وغیرہ جیسی کیفیت اس لیے ہوتی ہیں کیونکہ اس کے پٹھوں میں خون کی کمی واقع ہو چکی ہوتی ہے اور ان میں تناؤ بے قابو انداز سے گھٹتا بڑھتا ہے۔

۸۔ غیر سبزیاتی غذا مسلمانوں کو متشدد بناتی ہے

سوال: سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ انسان جو کچھ بھی کھاتا ہے، وہ اس کے طرزِ عمل پر اثر ڈالتا ہے۔ تو پھر اسلام مسلمانوں کو غیر سبزیاتی غذا کی اجازت کیوں دیتا ہے؟ حالانکہ جانوروں کا گوشت کھانے کی وجہ سے انسان متشدد اور غضب ناک (مزاج کا حامل) بن سکتا ہے۔

جواب:

صرف نباتات خور جانور کھانے کی اجازت ہے

میں اس بات سے متفق ہوں کہ انسان جو کچھ بھی کھاتا ہے، اس کا اثر اس کے طرزِ عمل پر ضرور پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں گوشت خور جانوروں، مثلاً شیر، چیتے اور تیندوے وغیرہ کا گوشت کھانے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ درندے ہیں اور متشدد بھی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایسے جانوروں کا گوشت ہمیں بھی درندہ صفت بنا دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں صرف وہ جانور کھانے کی اجازت ہے جو نباتات خور ہوں جیسے گائے، بکری، بھیڑ وغیرہ۔ یہ وہ جانور ہیں جو پُر امن اور فرمانبردار ہیں۔ مسلمان پرامن اور فرمانبردار جانوروں ہی کا گوشت کھاتے ہیں، اس لیے وہ بھی امن سے محبت کرنے والے اور غیر متشدد لوگ ہوتے ہیں۔

قرآنِ پاک فرماتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بری چیزوں سے روکتے ہیں

قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ [سورۃ:۷، آیت:۱۵۷]

"وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال

اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔ ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔"

﴿ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ﴾ [سورۃ:۵۹، آیت:۷]

"جو کچھ رسولؐ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دے اس سے رُک جاؤ۔ اللہ سے ڈرو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

مسلمانوں کے لیے رسول پاک (ﷺ) کا فرمان ہی انہیں قائل کرنے کے لیے کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ وہ بعض جانوروں کا گوشت کھائیں، جبکہ بعض دوسرے جانوروں کا گوشت کھالیا کریں۔

احادیث مبارکہ میں گوشت خور جانور کھانے سے روکا گیا ہے

صحیح بخاری اور مسلم میں موجود، متعدد مستند احادیث کے مطابق گوشت خور جانور کھانے کی ممانعت ہے۔ انہی میں سے ایک حدیث نبوی (ﷺ) کے مطابق، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے (حدیث نمبر ۴۷۵۲)، اور سنن ابن ماجہ کے تیرھویں باب کی احادیث نمبر ۳۲۳۲ تا ۳۲۳۴ کے مطابق، رسول پاک (ﷺ) نے درج ذیل چیزیں کھانے سے منع فرمایا ہے:

۱۔ جنگلی جانور، جس کے دانت نوک دار ہوں، یعنی گوشت خور جانور۔ یہ جانور بلی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں شیر، ببر شیر، چیتا، بلیاں، کتے، بھیڑیے اور لگڑ بھگے وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ کتر کر کھانے والے بعض جانور جیسے چھوٹے چوہے، بڑے چوہے، پنجوں والے خرگوش وغیرہ۔

۳۔ رینگنے والے بعض جانور مثلاً سانپ اور مگرمچھ وغیرہ۔

۴۔ شکاری پرندے جن کے پنجوں میں لمبے اور نوک دار ناخن ہوں (جیسے کہ عموماً شکاری پرندوں میں ہوتے ہیں) ان میں گدھ، عقاب، کوے اور اُلو وغیرہ شامل ہیں۔

ایسی کوئی سائنسی شہادت نہیں ہے جو کسی شک وشبہ سے بالاتر ہو کر یہ ثابت کر سکے کہ غیر سبزیاتی غذا کھانے کی وجہ سے کوئی پر تشدد بھی بن سکتا ہے۔

۹۔ مسلمان کعبہ کی عبادت کرتے ہیں

سوال: اگرچہ اسلام میں بتوں کو پوجنے کی سخت ممانعت ہے لیکن مسلمان کعبہ کی عبادت (پوجا) کیوں کرتے ہیں اور اپنی نمازوں کے دوران اس کے سامنے کیوں جھکتے ہیں؟

جواب: کعبہ ہمارے لیے قبلہ ہے، یعنی وہ سمت جس طرف مسلمان نماز کے دوران منہ کرتے ہیں۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ اگرچہ مسلمان، نماز کے دوران کعبہ کی طرف رُخ کرتے ہیں، مگر وہ کعبہ کی عبادت نہیں کرتے۔ مسلمان صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کے سامنے جھکتے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے:

﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ﴾ [سورۃ:۲، آیت:۱۴۴]

''اے نبیؐ! یہ تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو! ہم اسی قبلے کی طرف تمہیں پھیر دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔''

اسلام اتحاد و یگانگت کے فروغ پر یقین رکھتا ہے

مثلاً، اگر مسلمان نماز پڑھنا چاہیں تو بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگ شمال کی طرف منہ کرنا چاہیں، کچھ جنوب کی سمت، کچھ مشرق کی تو کچھ مغرب کی سمت۔ ایک اور سچے رب العالمین کی عبادت کے موقع پر مسلمانوں میں اتحاد و اتفاقِ رائے کے لیے انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، جب اللہ کی عبادت کریں تو ایک ہی سمت رُخ کر کے عبادت کریں...... یعنی کعبۃ اللہ کی طرف۔ اگر کچھ مسلمان کعبہ کے مغرب میں رہ رہے ہوں تو انہیں (اللہ کی عبادت کے لیے) مشرق کی طرف اپنا رُخ کرنا ہوگا۔ اسی طرح کعبے کے مشرق میں رہنے والے مسلمانوں کو مغرب کا رُخ کرنا ہوگا۔

کعبۃ اللہ، دنیا کے نقشے کا مرکز ہے

دنیا کا اوّلین نقشہ مسلمانوں نے تیار کیا تھا۔ ان کے تیار کردہ نقشوں میں جنوب اوپر کی طرف اور شمال نیچے کی طرف ہوتا تھا۔ کعبہ اس کے مرکز میں تھا۔ بعد ازاں مغربی نقشہ سازوں نے جب نقشے بنائے تو یہ ترتیب اُلٹ دی، یعنی شمال اوپر اور جنوب کو نیچے کر دیا۔ لیکن، الحمد للہ، تب بھی کعبۃ اللہ دنیا کے نقشے کے مرکز ہی میں رہا۔

کعبہ کا طواف، اللہ کی وحدانیت کا اظہار ہے

جب مسلمان مکہ کی مسجد حرام میں جاتے ہیں، وہ کعبہ کا طواف کرتے یا (کعبہ کے گرد) چکر لگاتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ایک اللہ پر عقیدے اور اُسی کی عبادت کی علامت ہے، کیونکہ جس طرح دائرے کا ایک ہی مرکز ہوتا ہے، بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی واحد رب ہے جو عبادت کے لائق ہے۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی حدیث

کعبۃ اللہ میں نصب سیاہ پتھر، یعنی حجرِ اسود کے بارے میں ایک حدیث ہے جو حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جلیل القدر صحابی حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے۔

صحیح بخاری، جلد دوم، کتاب حج، باب ۵۶ میں مروی حدیث نمبر ۶۷۵ کے مطابق، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو مخاطب کر کے فرمایا: ''میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو کسی کو فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تجھے چھوتے اور چومتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی تجھے کبھی نہ چھوتا (اور نہ ہی چومتا)''

لوگوں نے کعبہ پر کھڑے ہو کر اذان دی

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں لوگ کعبۃ اللہ پر کھڑے ہو کر اذان بھی دیا کرتے تھے۔ اُن سے پوچھیے جو مسلمانوں پر کعبہ کی پرستش کا الزام لگاتے ہیں؛ کہ بتوں کی پوجا کرنے والا کوئی شخص کیا کبھی اپنے (پوجے جانے والے بُت) کے اوپر کھڑا ہوتا ہے؟

۱۰۔ مکہ میں غیر مسلموں کے داخلے کی اجازت نہیں

سوال: مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں میں غیر مسلموں کو داخل ہونے کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

جواب: یہ سچ ہے کہ قانونی طور پر مکہ اور مدینۃ النبی ﷺ کے مقدس شہروں میں غیر مسلموں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ ذیل کے نکات میں اس پابندی کے پس پشت موجود، ممکنہ اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے۔

تمام شہریوں کو چھاؤنی (کنٹونمنٹ ایریا) میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی

میں ہندوستان کا شہری ہوں۔ لیکن پھر بھی مجھے (ہندوستان ہی کے) بعض پابندی والے علاقوں، مثلاً چھاؤنیوں میں جانے کی اجازت نہیں۔ ہر ملک میں کچھ نہ کچھ ایسے علاقے ضرور ہوتے ہیں جہاں ایک عام شہری داخل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً چھاؤنی (کنٹونمنٹ) کے علاقوں میں صرف وہی شہری جاسکتے ہیں جو فوج سے تعلق رکھتے ہوں یا پھر ملکی دفاع سے اُن کا کوئی تعلق ہو۔ اسی طرح اسلام بھی ساری دنیا اور تمام انسانیت کے لیے ایک آفاقی مذہب ہے۔ اسلام میں بھی دو شہر ایسے ہیں جو کسی چھاؤنی کی مانند نہایت اہم ہیں: مکہ اور مدینہ۔ ان شہروں میں صرف وہی لوگ جاسکتے ہیں جو اسلام پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کے دفاع میں شریک ہوں۔ یعنی یہاں صرف مسلمان ہی داخل ہوسکتے ہیں۔

کنٹونمنٹ ایریا میں داخلے کی پابندی کے خلاف ایک عام شہری کا احتجاج کرنا غیر قانونی ہوتا ہے۔ اسی طرح غیر مسلموں کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ وہ مکہ اور مدینہ میں غیر مسلموں کے داخلے پر پابندی کے خلاف کوئی اعتراض کریں۔

مکہ اور مدینہ میں داخلے کا ''ویزہ''

الف: جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے ملک کا سفر کرتا ہے تو پہلے اسے ویزا حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یعنی اس ملک میں داخل ہونے کا اجازت نامہ۔ ہر ملک کے اپنے قاعدے، قوانین اور ضروریات ہوتی ہیں جن کی مطابقت میں ویزا جاری کیا جاتا ہے۔ جب تک وہ تمام شرائط پوری نہ کر دی جائیں، تب تک اس ملک کے اہلکار ویزا جاری نہیں کرتے۔

ب: ویزوں کے اجرا کے معاملے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ ایک نہایت سخت گیر ملک ہے، خصوصاً جب تیسری دنیا کے باشندوں کو ویزے جاری کرنے کا معاملہ ہو۔ اس کی متعدد شرائط اور ضروریات ہیں جو ویزا کے حصول سے پہلے پوری کرنا لازمی ہوتی ہیں۔

ج: جب میں سنگاپور گیا، تو وہاں کے امیگریشن فارم پر یہ واضح طور پر لکھا تھا کہ منشیات کی سمگلنگ کرنے والوں کو سزائے موت دی جائے گی۔ اگر میں سنگاپور جانا چاہوں تو مجھے اُن کے قوانین کی پاسداری کرنا ہوگی۔ میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُن کے ہاں موت کی سزا ایک بے رحمانہ فعل ہے۔ مجھے صرف اُسی صورت میں وہاں جانے کی اجازت ملے گی جب میں ان کی شرائط اور ضروریات کی پاسداری کرنے کا اقرار کروں گا۔

د: مکہ یا مدینہ کا ویزہ، یعنی وہاں داخل ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ہونٹوں سے ''لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ'' کہہ کر اللہ تعالیٰ کے وحدہ لا شریک ہونے کا اقرار کیا جائے اور حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) کو اللہ کا رسول تسلیم کیا جائے۔

۱۱۔ سؤر کا گوشت حرام ہے

سوال: اسلام میں سؤر کا گوشت کھانے کی ممانعت کیوں ہے؟

جواب: اسلام میں سؤر کا گوشت کھانے کی ممانعت سے کم و بیش سبھی واقف ہیں۔ درج ذیل نکات میں اس پابندی کی کئی حوالوں سے وضاحت کی گئی ہے:

سؤر کا گوشت کھانے کی ممانعت قرآن میں

قرآن پاک میں کم از کم چار مقامات پر سؤر کا گوشت کھانے کی ممانعت آئی ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ ۲، آیت ۱۷۳، سورۃ ۵، آیت: ۳، سورۃ ۶، آیت: ۱۴۵، اور سورۃ ۱۶، آیت: ۱۱۵ میں اس حوالے سے احکامات وارد ہوئے ہیں۔

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ط ﴾

[سورۃ: ۵، آیت: ۳]

"تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سؤر کا گوشت وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا گیا ہو، وہ جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔"

قرآن پاک کی مذکورہ بالا آیات، مسلمانوں کو اس امر کے حوالے سے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں کہ سؤر کا گوشت کیوں حرام ہے۔

بائبل نے بھی سؤر کھانے کی ممانعت کی ہے

ممکنہ طور پر عیسائی اپنے ہی مذہبی صحیفے کے تو قائل ہوں گے۔ بائبل میں سؤر کا گوشت

کھانے کی ممانعت ''کتابِ احبار'' کے تحت اس طرح آئی ہے:

''اور سؤر کو، کیونکہ اس کے پاؤں الگ اور چِرے ہوئے ہیں، پر وہ جگالی نہیں کرتا۔ وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔ تم ان کا گوشت نہ کھانا اور اُن کی لاشوں کو نہ چھونا، وہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔''

[پرانا عہد نامہ۔ احبار، باب:۱۱۔ ۷ تا ۸]

کچھ ایسے ہی الفاظ کے ساتھ پرانے عہد نامے کی پانچویں کتاب ''استثناء'' میں سؤر کھانے کی ممانعت آئی ہے:

''اور سؤر تمہارے لیے اس سبب سے ناپاک ہے کہ اس کے پاؤں تو چِرے ہوئے ہیں پر وہ جگالی نہیں کرتا۔ تم نہ تو ان کا گوشت کھانا اور نہ اُن کی لاشوں کو ہاتھ لگانا'' [استثناء۔ باب:۱۴۔ ۸]

کچھ ایسی ہی ممانعت، پرانے عہد نامہ کی کتاب ''یسعیاہ'' کے باب نمبر ۶۵ اشعار ۲ تا ۵ میں بھی آئی ہے۔

سؤر کے گوشت کے استعمال سے کئی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں

اب آیئے غیر مسلموں اور خدا کو نہ ماننے والوں کی طرف۔ تو انہیں صرف عقلی دلائل، منطق اور سائنس کے ذریعے ہی قائل کیا جا سکتا ہے۔ سؤر کا گوشت کھانے سے کم از کم ۷۰ مختلف الاقسام بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ ایک شخص میں کئی طرح کے پیٹ کے کیڑے ہو سکتے ہیں مثلاً راؤنڈ ورم، پن ورم اور ہک ورم وغیرہ۔ ان میں سے ایک سب سے خطرناک ہے جو ٹائینا سولیئم (Taenia Soliam) کہلاتا ہے، اور جسے عام زبان میں ٹیپ ورم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت لمبا ہوتا ہے اور آنت میں رہتا ہے۔ اس کے انڈے (Ova) خون کی گردش میں شامل ہو کر جسم کے کسی بھی حصے میں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر یہ دماغ تک جا پہنچیں تو یادداشت کو شدید نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اگر یہ دل میں داخل ہو جائے تو دِل کے دورے کی وجہ بن سکتا ہے۔ آنکھ میں جا پہنچنے پر یہ نابینا پن کا باعث بنتا ہے۔ جگر میں گھس بیٹھے تو پورے جگر کا ستیاناس کر ڈالتا

ہے۔غرض یہ کہ اس کی وجہ سے جسم کے کم وبیش تمام اعضا غارت ہو سکتے ہیں۔ پیٹ میں پایا جانے والا ایک اور خطرناک طفیلیہ (Trichura Lichurasis) ہے۔

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ اگر سؤر کا گوشت اچھی طرح سے پکایا جائے تو (اِن کیڑوں کے) انڈے تلف ہو جائیں گے۔ امریکہ میں کی گئی ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ ٹرائی کیورا سے متاثر، چوبیس افراد میں سے بیس ایسے تھے جنھوں نے سؤر کا گوشت خوب اچھی طرح پکا کر کھایا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سؤر کے گوشت میں موجود انڈے، کھانا پکانے کے عمومی درجہ حرارت پر بھی نہیں مرتے۔

سؤر کے گوشت میں چربی بڑھانے والا مادہ ہوتا ہے

سؤر کے گوشت میں ایسے مادے بہت کم ہوتے ہیں جو عضلات (پٹھوں) کی نشوونما میں کام آتے ہوں۔ اس کے برعکس یہ چربی سے بھرپور ہوتا ہے۔ یہ چربی، خون کی نالیوں میں جمع ہوتی رہتی ہے اور آخرکار شدید تناؤ (ہائپر ٹینشن) اور دل کے دورے کی وجہ بن سکتی ہے۔ لہٰذا اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ ۵۰ فیصد سے زاید امریکیوں کو ہائپر ٹینشن کا مرض لاحق ہے۔

سؤر، دنیا کے غلیظ ترین جانوروں میں سے ہے

سؤر، دنیا کے غلیظ ترین جانوروں میں سے ایک ہے۔ یہ گندگی، غلاظت اور فضلے پر گزارا کرتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق، یہ بہترین مہتر ہے جسے خدا نے پیدا کیا ہے۔ وہ دیہات جہاں جدید طرز کے طہارت خانے (ٹوائلٹ) نہیں ہوتے، اور جہاں لوگ کھلے مقامات پر بیٹھ کر اجابت کرتے ہیں، وہاں لوگوں کی بیشتر غلاظت یہ سؤر ہی صاف کرتے ہیں۔

بعض صاحبان یہ کہہ سکتے ہیں کہ آسٹریلیا جیسے جدید ممالک میں سؤروں کی نسل خیزی اور نشوونما نہایت صاف ستھرے اور صحت افزا حالات میں کی جاتی ہے۔ اتنے صحت افزا اور محتاط ماحول کے باوجود جہاں سؤروں کو سؤر باڑوں کے اندر ہی (دوسرے جانوروں سے الگ کر کے) رکھا جاتا ہے۔ آپ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لیں کہ انہیں صاف ستھرا رکھیں، مگر یہ جانور

اپنی فطرت ہی میں غلیظ ہے۔ انہیں اپنی اور اپنے ساتھ کے دوسرے جانوروں کی غلاظت کھانے میں ہی مزا آتا ہے۔

سؤر سب سے بے حیا جانور ہے

اس تمام روئے زمین پر سؤر سب سے بے شرم جانور ہے۔ یہ وہ واحد جانور ہے جو اپنی شریک (Mate) کے ساتھ مجامعت کے لیے اپنے دوستوں کو دعوت دیتا ہے۔ امریکہ میں بہت سارے لوگ سؤر کا گوشت کھاتے ہیں۔ رقص و سرور کی بیشتر محفلوں کے بعد وہ اپنی بیویاں آپس میں بدل لیتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں ''تم میری بیوی کے ساتھ سو جاؤ میں تمہاری بیوی کے ساتھ سو جاتا ہوں۔'' اگر آپ سؤر کا گوشت کھائیں گے تو آپ بھی سؤر ہی کی طرح برتاؤ کرنے لگیں گے۔

۱۲۔ شراب کی ممانعت

سوال: اسلام میں شراب پینے کی ممانعت کیوں ہے؟

جواب: انسانی تاریخ و تہذیب کی باقاعدہ یادداشت شروع ہونے سے بھی بہت پہلے سے شراب انسانی معاشرے کے لیے ایک اذیت بنی ہوئی ہے۔ یہ لاتعداد انسانی جانیں لے چکی ہے، اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اسی کی بدولت دنیا بھر میں کروڑوں لوگوں کی زندگیاں نشانِ عبرت بن چکی ہیں۔ معاشرے کو درپیش متعدد مسائل کی بنیادی وجہ شراب ہی ہے۔ جرائم میں اضافے سے وابستہ اعداد و شمار ذہنی بیماریوں کی بڑھتی ہوئی شرح اور دنیا میں پھیلے ہوئے کروڑوں برباد گھرانے شراب ہی کی تخریبی طاقت کی خاموش یادگاریں ہیں۔

قرآنِ پاک میں شراب کی ممانعت

درج ذیل آیات مبارکہ میں قرآن پاک ہمیں شراب سے روکتا ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَـٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَـٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ﴾

[سورۃ:۵، آیت:۹۰]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کرو اُمید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔"

بائبل میں شراب نوشی کی ممانعت

بائبل کی درج ذیل آیات میں شراب نوشی کی مذمت ملتی ہے:

"مے مسخرہ اور شراب ہنگامہ کرنے والی ہے اور جو کوئی ان سے فریب کھاتا ہے (وہ) دانا نہیں۔"

[امثال۔ باب ۲۰، شعر:۱]

''اور شراب کے نشے میں متوالے نہ بنو۔'' [افسیوں۔ باب ۵، آیت: ۱۸]

شراب، ذہن کے گریزی مرکز کو کام کرنے سے روکتی ہے

انسانی دماغ کا ایک حصہ ''گریزی مرکز'' (Inhibitory Centre) کہلاتا ہے۔ اس حصے کا کام کسی انسان کو ایسے اُمور سے باز رکھنا ہے جنہیں وہ فرد غلط سمجھتا ہو۔ مثلاً ایک عام انسان اپنے بڑوں اور بزرگوں کے سامنے بیہودہ زبان استعمال نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو حاجت رفع کرنی ہو تو دماغ کا گریزی مرکز اسے لوگوں کے سامنے ایسا کرنے سے باز رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ایسی صورت میں طہارت خانے کا رُخ کرتا ہے۔

جب کوئی شخص شراب پیتا ہے تو اس کا گریزی مرکز خود ہی کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ عین یہی وجہ ہے کہ شراب کے نشے میں دُھت کوئی شخص ایسے طرزِ عمل میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اس کے عمومی مزاج سے قطعاً میل نہیں کھاتا۔ مثلاً شراب کے نشے میں مدہوش کوئی شخص بیہودہ اور غلیظ زبان استعمال کرنے میں کوئی شرم کوئی باک محسوس نہیں کرتا اور اپنی غلطی بھی نہیں مانتا، چاہے وہ اپنے والدین ہی سے مخاطب کیوں نہ ہو۔ بہت سے شرابی تو اپنے کپڑوں ہی میں پیشاب کر دیتے ہیں۔ نہ وہ ڈھنگ سے بات کر پاتے ہیں اور نہ ہی ٹھیک سے چل پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ نہایت شرمناک حرکتیں بھی کر گزرتے ہیں۔

زنا، عصمت دری، ہوس پرستی اور ایڈز کے واقعات شراب نوشوں میں بہت عام ہوتے ہیں

امریکی محکمہ دفاع کے ذیلی ادارے ''نیشنل کرائم وکٹمائزیشن سروے بیورو آف جسٹس'' کے مطابق، ۱۹۹۶ء کے دوران (امریکہ میں) ہر روز عزت لوٹنے کے ۲،۷۱۳ واقعات ہوئے۔ انہی اعداد و شمار سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عصمت دری کرنے والے لوگوں کی اکثریت یہ فعل بد کرتے وقت نشے کی حالت میں تھی۔ بالکل یہی بات دست اندازی کے واقعات کے لیے بھی درست ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق، ۸ فیصد امریکی ''انسیسٹ'' (Incest) میں مبتلا ہیں۔ مطلب یہ

کہ ہر بارہ یا تیرہ میں سے ایک امریکی، انسیسٹ میں مبتلا ہے۔ انسیسٹ کے تقریباً تمام واقعات شراب نوشی ہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، جن میں ایک یا دونوں افراد ملوث ہو جاتے ہیں۔

(**عرضِ مترجم**: انگریزی لفظ Incest کا درست اُردو لفظی ترجمہ کسی لغت میں موجود نہیں۔ تاہم اس کی وضاحت سے اس عمل کے گھناؤنے پن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے: ''ایسے نہایت قریبی رشتے کہ جن کے درمیان قانون اور مذہب کی رُو سے شادی نہ ہو سکتی ہو، ان کے درمیان جنسی تعلقات کو Incest کہا جاتا ہے۔'')

اسی طرح ایڈز نامی مہلک بیماری کے پھیلاؤ سے وابستہ اسباب میں ایک اہم وجہ شراب نوشی ہی ہے۔

ہر عادی شراب نوش ''معاشرتی مے نوشی'' ہی سے ابتدا کرتا ہے

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو شراب نوشی کے حق میں دلائل دیتے ہوئے خود کو ''معاشرتی مے نوش'' (سوشل ڈرنکر) قرار دیتے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے صرف ایک یا دو جام (پیگ) ہی پیے ہیں، انہیں خود پر اچھی طرح سے کنٹرول ہے اور وہ کبھی شراب پی کر مدہوش نہیں ہوئے۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ آج کے تمام عادی شراب نوشوں نے ماضی میں معاشرتی مے نوشی ہی سے ابتدا کی تھی۔ کوئی ایک عادی شراب نوش یا ''پیکڑ'' ایسا نہیں جس نے شراب نوشی کی ابتدا اس ارادے سے کی ہو کہ وہ آگے چل کر اس لت میں پڑے گا یا پیکڑ بنے گا۔ کوئی ایک معاشرتی مے نوش بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کئی سال سے شراب پیتا آ رہا ہے اور یہ کہ اُسے خود پر اتنا زیادہ کنٹرول ہے کہ وہ (شراب پی کر) ایک بار بھی مدہوش نہیں ہوا۔

اگر کوئی شخص نشے میں مدہوش ہو کر صرف ایک بار بھی کوئی شرمناک حرکت کر بیٹھے تو وہ ساری زندگی اس کے ساتھ رہے گی:

فرض کیجیے کہ ایک ''معاشرتی مے نوش'' اپنی زندگی میں صرف ایک بار (نشے کی حالت میں) خود پر کنٹرول کھو دیتا ہے اور مدہوشی کی حالت میں زنا یا انسیسٹ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

اگر اسے بعد میں اپنے اس عمل پر پچھتاوا بھی ہوتا ہے، تب بھی ایک نارمل انسان اس جرم کا احساس ساری زندگی اپنے ساتھ لیے پھرے گا۔ یعنی بدفعلی کا مرتکب اور اس کا شکار، دونوں ہی ناقابل تلافی انداز میں تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔

احادیثِ مبارکہ میں شراب نوشی کی ممانعت

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الف: سنن ابن ماجہ، جلد سوم، کتاب الخمر (باب ۳۰، حدیث: ۳۳۷۱):

"شراب تمام برائیوں کی ماں (ام الخبائث) ہے اور تمام برائیوں میں سب سے زیادہ شرمناک ہے۔"

ب: سنن ابن ماجہ، جلد سوم، کتاب الخمر (باب ۳۰، حدیث: ۳۳۹۲):

"ہر وہ چیز جس کی زیادہ مقدار نشہ کرتی ہو، اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔"

گویا یہاں چند قطروں اور چند گھونٹ کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

ج: صرف شراب نوشی کرنے والوں ہی پر لعنت نہیں کی گئی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ بھی ملعون ہیں جو شراب نوشوں کے ساتھ براہِ راست یا بالواسطہ معاملت رکھیں۔

سنن ابن ماجہ، جلد سوم، کتاب الخمر (باب ۳۰، حدیث: ۳۳۸۰) کے مطابق، حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا:

"اللہ کی لعنت نازل ہوتی ہے، لوگوں کے اُن دس گروہوں پر جو شراب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک وہ جو شراب کشید کرے، ایک وہ کہ جس کے لیے کشید کی گئی، ایک وہ جو اسے پیے، ایک وہ جو اس کی باربرداری کرے، ایک وہ کہ جس تک یہ پہنچائی جائے، ایک وہ جو اسے پیش کرے، ایک وہ جو اسے فروخت کرے، ایک وہ جو اس سے کمائی گئی دولت استعمال کرے، ایک وہ جو اسے خریدے اور ایک وہ جو اسے کسی دوسرے کے لیے خریدے۔"

شراب نوشی سے وابستہ بیماریاں

سائنسی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو شراب نوشی سے دور رہنے کی متعدد عقلی وجوہ ملیں گی۔ اگر دنیا میں اموات کی کوئی ایک سب سے بڑی وجہ تلاش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ شراب نوشی ہی ہے۔ ہر سال لاکھوں لوگ محض شراب نوشی ہی کی وجہ سے ہلاک ہوتے ہیں۔ مجھے شراب کے بُرے اثرات کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ان میں سے بیشتر سے تقریباً سبھی واقف ہیں۔ تاہم ذیل میں شراب نوشی سے وابستہ امراض کی ایک مختصر سی فہرست ضرور دی جارہی ہے:

۱۔ جگر کا سکڑاؤ (سروسس) شراب سے لاحق ہونے والی بیماریوں میں سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔

۲۔ دیگر امراض میں غذائی نالی کا سرطان، سر اور گردن کا سرطان، جگر کا سرطان (ہیپا ٹوما) اور معدے کا سرطان وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ غذائی نالی کی سوزش، معدے پر ورم، لبلبے پر ورم اور ہیپا ٹائٹس کا تعلق بھی شراب نوشی سے ہے۔

۴۔ کارڈیو مایو پیتھی، ہائپر ٹینشن، کورونری آرتھرو سکیلروسس، انجائنا اور دل کے دورے کا تعلق بھی بہت زیادہ شراب نوشی سے ہے۔

۵۔ اسٹروک، ایپوپلیکسی، فِٹس اور دوسری اقسام کی معذوریوں کا تعلق بھی شراب نوشی ہی سے ہے۔

۶۔ پیریفرل نیورو پیتھی، کورٹیکل ایٹروفی، اور سیر بیلر ایٹروفی جیسی معروف علامتوں کا ظہور بھی شراب نوشی کے طفیل ہوتا ہے۔

۷۔ حالیہ واقعات بھول جانے کے ساتھ ورنِک کورسا کوف سنڈروم، مختلف الاقسام معذوریوں کے ساتھ بول چال اور یادداشت کا پرانے واقعات تک محدود رہ جانے کی وجہ تھائی مین کی کمی ہے جو بہت زیادہ شراب نوشی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۸۔ بیری بیری اور دوسری خرابیاں بھی شراب نوشوں میں کمیاب نہیں۔حتی کہ انہیں پلا جرا بھی ہو جاتا ہے۔

۹۔ ڈیلیریم ٹریمنس ایک اور سنجیدہ پیچیدگی ہے جو شراب نوشوں میں کسی تعدیہ کے ظہور نو کے دوران آپریشن کے بعد واقع ہو سکتی ہے۔ یہ کیفیت شراب سے دور رہتے دوران، اسے چھوڑنے کے ایک اثر کے طور پر بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ یہ پیچیدگی بہت سنجیدہ ہے اور بسا اوقات اچھے مراکز صحت میں علاج کروانے کے باوجود بھی موت کی وجہ بن سکتی ہے۔

۱۰۔ پیشاب اور گردوں کے متعدد مسائل بھی شراب نوشی سے وابستہ ہیں جن میں مکسوڈیما سے لے کر ہائپرتھائیرائیڈزم اور فلورڈ کشنگ سنڈروم تک شامل ہیں۔

۱۱۔ خون پر شراب نوشی کے منفی اثرات کی فہرست بھی طویل اور متنوع ہے۔تاہم، فو لک ایسڈ میں کمی ایک ایسی علامت ہے جو کثرتِ مے نوشی کا سب سے عام نتیجہ ہے اور جو میکرو سائیٹک انیمیا کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ زیوز سینڈروم تین امراض یعنی ہیمولٹیک انیمیا ،یرقان اور ہائپرلاپیڈ یمیا کا مجموعہ ہے جو مے نوشوں کے تعاقب میں رہتی ہے۔

۱۲۔ تھرمبوسائٹوپینیا اور پلیٹیلٹس کی دیگر خرابیاں بھی شراب نوشوں میں عام ہیں۔

۱۳۔ عام استعمال ہونے والی دوا، یعنی ''فلیجل'' (میٹرونیڈازول) بھی شراب کے ساتھ نہایت برے انداز میں عمل کرتی ہے۔

۱۴۔ کسی بیماری کا بار بار حملہ آور ہونا، شراب نوشوں میں بہت عام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کثرتِ مے نوشی کے باعث ان کے جسم میں بیماریوں کے خلاف مزاحمت اور ان کا جسمانی دفاعی نظام نہایت کمزور پڑ جاتے ہیں۔

۱۵۔ سینے کے مختلف الاقسام تعدیے بھی شراب نوشوں میں بکثرت ہوتے ہیں۔ نمونیا، پھیپھڑوں کی خرابی (Abcess) ایمفی سیما اور پلمونری ٹیوبرکلوسس، شراب نوشوں میں بہت عام ہے۔

۱۶۔ بہت زیادہ شراب پینے کے بعد شراب نوش عموماً قے کر دیتے ہیں۔ کھانسی کا اعصابی

ردّعمل جو حفاظتی نظام کا کام کرتا ہے، اس دوران ناکام ہو جاتا ہے۔ اس لیے قے سے نکلنے والا مواد آسانی سے پھیپھڑوں تک جا پہنچتا ہے اور نمونیا یا پھیپھڑوں کی خرابی کا باعث بنتا ہے۔ بعض اوقات اس کا نتیجہ دم گھٹنے اور موت کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

۱۷۔ خواتین پر شراب نوشی کے منفی اثرات خصوصی تذکرے کے قابل ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین کو شراب نوشی کی وجہ سے سروسس کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ دورانِ حمل شراب نوشی سے رحم مادر پر شدید منفی اثرات پڑتے ہیں۔ طب کے پیشے میں ''فیٹل الکوحل سنڈروم'' سے وابستہ خدشات دن بدن بڑھتے ہی جارہے ہیں۔

۱۸۔ جلد کی بیماریاں بھی شراب نوشی کی وجہ سے ہو سکتی ہیں۔

۱۹۔ ایگزیما، ایلوپیشیا، ناخنوں کی ساخت کا بگڑنا، پیرونیشیا (ناخنوں کے اطراف کا تعدیہ)، اینگولر اسٹوماٹائٹس (منہ کے جوڑ میں سوزش) وہ عام بیماریاں ہیں جو شراب نوشوں میں پائی جاتی ہیں۔

شراب نوشی ایک ''بیماری'' ہے

طبی ڈاکٹر اب شراب نوشوں کے بارے میں کھل کر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شراب نوشی کوئی لت، کوئی نشہ نہیں بلکہ ایک بیماری ہے۔

اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن ایک پمفلٹ شائع کر چکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شراب ایک بیماری ہے اور یہ وہ واحد بیماری ہے جو:

❀ بوتلوں میں فروخت کی جاتی ہے۔

❀ جس کی تشہیر اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹی وی پر کی جاتی ہے۔

❀ جسے پھیلانے کے لیے دوکانوں کو لائسنس جاری کیے جاتے ہیں۔

❀ حکومت کے لیے آمدن کا ذریعہ بنتی ہے۔

❀ شاہراہوں پر بھیانک اموات کا سبب بنتی ہے۔

- گھریلو زندگی کو تباہ کرتی اور جرائم میں اضافہ کرتی ہے۔
- جس کی وجہ کوئی جرثومہ یا وائرس نہیں۔

شراب نوشی کوئی بیماری بھی نہیں............ یہ تو شیطان کی کاریگری ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و دانائی سے ہمیں اس شیطانی چرخے سے خبردار کیا ہے۔ اسلام ''دینِ فطرت'' کہلاتا ہے، یعنی ایسا دین جو انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اس کے تمام احکامات کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کی فطری حالت کا تحفظ کیا جائے۔ شراب نوشی اس فطری حالت سے انحراف ہے، جو کسی فرد کے علاوہ پورے معاشرے میں بگاڑ کی وجہ بن سکتا ہے۔ یہ (شراب) انسان کو اس کے مرتبے سے گرا کر اُسے وحشی جانوروں کی سطح پر لے آتی ہے شراب پینے کی سختی سے ممانعت ہے۔

۱۳۔ گواہوں کی برابری

سوال: کیا وجہ ہے کہ اسلام میں دو عورتوں کی گواہی، ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دی جاتی ہے؟

جواب:

دو عورتوں کی گواہی، ایک مرد کی گواہی کے برابر ہمیشہ قرار نہیں دی جاتی

قرآنِ پاک کی کم از کم تین آیات ایسی ہیں جو گواہوں کا تذکرہ ان کے مرد یا عورت ہونے کی صراحت کیے بغیر کرتی ہیں۔

الف: جب وراثت کی وصیت کرنے کا معاملہ ہو تو دو منصف (اہل) افراد کی بطور گواہ ضرورت ہوتی ہے۔ قرآنِ پاک کی سورۃ المائدہ، آیت: نمبر ۱۰۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝ ﴾

[سورۃ المائدہ۔ آیت: ۱۰۶]

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اس کے لیے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمہاری جماعت میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنائے جائیں، یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آ جائے تو غیر لوگوں ہی میں سے دو گواہ بنائے جائیں۔......"

ب: طلاق کے معاملے میں بھی دو ''عادل افراد'' کی بات کی گئی ہے:

﴿ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَّأَشْهِدُوا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝ ﴾ [سورۃ ۶۵۔آیت:۲]

''پھر جب وہ اپنی (عدت کی) مدت کے خاتمہ پر پہنچیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے (اپنے نکاح میں) روک رکھو یا بھلے طریقے پر اُن سے جدا ہو جاؤ اور دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو تم میں سے صاحب عدل ہوں اور (اے گواہ بننے والو!) گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے لیے ادا کرو۔......''

ج: فاحشہ عورتوں کے خلاف الزام کے سلسلے میں چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے:

﴿ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَّأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ ﴾ [سورۃ ۲۴۔آیت:۴]

''اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں اُن کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت بھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔''

پیسے کے لین دین میں دو عورتوں کی گواہی، ایک مرد کی گواہی کے برابر ہوتی ہے

یہ سچ نہیں کہ دو گواہ عورتیں ہمیشہ ہی ایک مرد گواہ کے برابر سمجھی جاتی ہیں۔ یہ بات صرف چند معاملات کی حد تک صحیح ہے۔ قرآنِ پاک میں ایسی تقریباً پانچ آیاتِ مبارکہ ہیں جن میں گواہوں کا تذکرہ ان کے مرد یا عورت ہونے کی صراحت کیے بغیر آیا ہے۔ اس کے برعکس، قرآنِ پاک کی صرف ایک آیت ایسی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ دو گواہ عورتیں، ایک مرد گواہ کے برابر ہیں۔ یہ سورۃ بقرہ کی ۲۸۲ ویں آیت ہے۔ یہ قرآنِ پاک کی طویل ترین آیت بھی ہے جو تجارتی کاروباری لین دین سے بحث کرتی ہے۔ اس آیت مبارکہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى ؕ ﴾

[سورۃ البقرہ۔ آیت: ۲۸۲]

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب کسی مقررہ مدت کے کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو اسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا) اور اسے اللہ، اپنے رب، سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کرا سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔ پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرالو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے......‘‘

دھیان رہے کہ قرآنِ پاک کی یہ آیت صرف اور صرف تجارتی، کاروباری (روپے پیسے کے) لین دین سے متعلق ہے۔ ایسے معاملات میں یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ دو فریقین آپس میں تحریری معاہدہ کریں اور دو گواہ بھی ساتھ لیں جو دونوں ترجیحاً مرد ہوں۔ اگر آپ کو دو مرد نہ مل سکیں تو پھر ایک مرد کی اور دو عورتوں کی گواہی سے بھی کام چل جائے گا۔

فرض کیجیے کہ ایک شخص کسی بیماری کے علاج کے لیے آپریشن کروانا چاہتا ہے۔ اس علاج

کی تصدیق کے لیے وہ چاہے گا کہ دو ماہر سرجنوں سے رائے حاصل کر لے۔ بالغرض اگر اسے دو سرجن نہ ملے تو اس کا دوسرا انتخاب ایک سرجن اور دو عام ڈاکٹروں (جنرل پریکٹشنز) کی رائے ہوگی (جو سادہ ایم بی بی ایس ہوں)۔

اس طرح، مالیاتی لین دین میں بھی دو مردوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسلام، مرد مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کے کفیل ہوں۔ چونکہ کفالت کے لیے روپیہ پیسہ کمانے کی ذمہ داری مرد کے کاندھوں پر ہے، لہٰذا اسے عورتوں کے مقابلے میں مالیاتی لین دین کے معاملات سے بھی بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ دوسرے راستے کے طور پر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطور گواہ لیا جا سکتا ہے، تا کہ اگر ان (عورتوں) میں سے کوئی ایک غلطی کرے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ قرآنِ پاک میں عربی لفظ ''تزیل'' استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب ''کنفیوز ہو جانا'' یا ''غلطی کرنا'' کے لیے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اس کا غلط ترجمہ کرتے ہوئے اسے ''بھول جانا'' بنا دیا ہے۔ لہٰذا، مالیاتی لین دین (اسلام میں) ایسی صرف ایک مثال ہے کہ جس میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

قتل کے معاملے میں بھی دو گواہ عورتیں، ایک مرد گواہ کے برابر ہیں

تاہم، بعض علما کی رائے میں عورت کا مخصوص اور فطری رویہ کسی قتل کے معاملے میں بھی گواہی پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ایسے حالات میں کوئی عورت، مرد کے مقابلے میں زیادہ خوف زدہ ہو سکتی ہے۔ اپنی اسی جذباتی کیفیت کی وجہ سے وہ ابہام (کنفیوژن) کا شکار ہو سکتی ہے۔ لہٰذا، بعض شارحین کے نزدیک قتل کے معاملے میں بھی، دو گواہ عورتیں ایک مرد گواہ کے برابر تصور کی جاتی ہیں۔ دیگر تمام معاملات میں ایک عورت کی گواہی، ایک مرد کی گواہی کے مساوی قرار دی جاتی ہے۔

قرآن واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ ایک گواہ عورت، ایک گواہ مرد کے برابر ہے

بعض علما ایسے بھی ہیں جو یہ اصرار کرتے ہیں کہ دو گواہ عورتوں کے ایک گواہ مرد کے برابر

ہونے کا اصول تمام معاملات پر اطلاق پذیر ہونا چاہیے۔ اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ قرآنِ پاک میں سورۃ نور کی آیت نمبر ۶ میں واضح طور پر ایک گواہ عورت کو ایک گواہ مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَيَدْرَاُ عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ○ ﴾

[سورۃ النور۔ آیات: ۹، ۸، ۷، ۶]

’’اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے ایک شخص شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام میں) سچا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنے الزام میں) جھوٹا ہو۔ اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اُس بندی پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ (اپنے الزام میں) سچا ہو۔......‘‘

حدیث کی قبولیت کے لیے حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی تنہا شہادت ہی کافی ہے

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) سے کم از کم ۲۲۲۰ احادیث مبارکہ مروی ہیں: جنہیں صرف حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی تنہا شہادت ہی کی بنیاد پر مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔
(ضروری وضاحت: یہ بات اس صورت میں درست ہے جب کوئی حدیثِ مبارکہ ’’حجیت حدیث‘‘ کے اصولوں (یعنی اصول روایت اور اصولِ درایت) پر بھی پوری اُترتی ہو۔ بصورت دیگر وہ حدیث چاہے کیسے ہی جلیل القدر صحابی سے کیوں نہ مروی ہو، لیکن اسے نخیر مستند یا

''ضعیف'' احادیث میں شمار کیا جاتا ہے۔مترجم) یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ایک عورت کی گواہی بھی قبول کی جاسکتی ہے۔

متعدد علما وفقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رویتِ ہلال (نیا چاند نظر آنے) کے سلسلے میں ایک (مسلمان) عورت کی گواہی بھی کافی ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ ایک عورت کی گواہی (بصورتِ رمضان) اسلام کے ایک ستون کے لیے کافی قرار دی جارہی ہے۔یعنی وہ مبارک مہینہ کہ جس میں مسلمان روزہ رکھتے ہیں۔گویا آمدِ رمضان جیسے ایک نہایت اہم معاملے مرد عورت اسے قبول کر رہے ہیں! اسی طرح بعض فقہا کا کہنا ہے کہ ماہِ رمضان کی ابتدا (رمضان کی رویتِ ہلال) کے لیے ایک گواہ جب کہ اختتام رمضان (شوال، عید الفطر کی رویتِ ہلال) کے لیے دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں بھی ان گواہوں کے مرد یا عورت ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے۔

بعض معاملات میں عورت کی گواہی کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے

بعض واقعات میں صرف اور صرف عورت ہی کی گواہی درکار ہوتی ہے جب کہ مرد کو بطور گواہ قبول نہیں کیا جاتا۔مثلاً، عورتوں کے مخصوص مسائل میں، یا کسی خاتون کی میت کو غسل دینے اور کفنانے وغیرہ میں بھی عورت کا گواہ ہونا ضروری ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ مالیاتی لین دین میں عورت اور مرد کی گواہی کے درمیان کے مابین عدم مساوات دینے والا فرق اس وجہ سے نہیں کہ اسلام میں مرد اور عورت کے مابین عدم مساوات ہے۔اس کے برعکس، یہ فرق صرف ان کی مختلف فطرتوں کی وجہ سے ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ اسلام نے معاشرے میں مرد اور عورت کے لیے مختلف ذمہ داریوں کا تعین کیا ہے۔

۱۴۔ وراثت

سوال: اسلامی قانون کے تحت، وراثت کے مال میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلے میں آدھا کیوں ہے؟

جواب:

۱۔ قرآنِ پاک میں وراثت کا ذکر:

قرآنِ پاک میں مال (بشمول منقولہ و غیر منقولہ جائیداد) کی حقدار وارثوں کے درمیان تقسیم کے حوالے سے بہت واضح اور تفصیلی رہنمائی کی گئی ہے۔

وراثت کے بارے میں رہنما خطوط، قرآنِ پاک کی درج ذیل آیاتِ مبارک میں بیان کیے گئے ہیں:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾

[سورۃ البقرہ، آیت:۱۸۰]

ترجمہ: ''تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتے داروں کے لیے معروف طریقے سے وصیت کرے یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾

[سورۃ البقرہ، آیت:۲۴۰]

ترجمہ: ''تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، اُن کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے وہ جو کچھ بھی کریں اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔''

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ○ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ○ ﴾ [سورۃ النساء، آیت: ۷ تا ۹]

ترجمہ: ''مردوں کے لیے اُس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔ خواہ تھوڑا ہو یا بہت۔ اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔ اور جب تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال سے اُن کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔ لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انھیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے، پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔''

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا

وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ ﴾ [سورۃ النساء، آیت:۱۹]

ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انھیں تنگ کر کے اُس پر مہر کا کچھ حصہ اُڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انھیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تمہیں تنگ کرنے کا حق ہے) ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔''

﴿ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ○ ﴾ [سورۃ النساء، آیت:۳۳]

ترجمہ: ''اور ہم نے اُس ترکے کے حق دار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو اُن کا حصہ انھیں دو۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔''

وراثت میں قریبی رشتہ داروں کا مخصوص حصہ

قرآنِ پاک میں تین آیات ایسی ہیں جو بہت جامع انداز سے وراثت میں قریبی رشتہ داروں کے حصے پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ آیتِ مبارکہ جو سورۃ النساء میں ہیں، اس طرح سے ہیں:

﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ

كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ٥ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْدَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْدَيْنٍ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْدَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ٥ ﴾ [سورۃ النساء، آیت: ۱۱ تا ۱۲]

’’تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے، اگر (میت کے وارث) دو سے زاید لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی (یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے) جبکہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کردیا جائے۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کردیے ہیں۔ اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔ اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا۔ اگر وہ بے اولاد ہوں ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا اک چوتھائی حصہ تمہارا ہے، جبکہ وصیت جو انہوں نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے۔ اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حق

دار ہوں گی ، اگر تم بے اولاد ہو ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا۔ بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو تم نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔ جبکہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہوا ادا کر دیا جائے ، بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔''

﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ ﴾ [سورۃ النساء، آیت:۱۷۶]

''اے نبیؐ! لوگ تم سے کلالہ کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا ، اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی ، اور اگر کوئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے، تا کہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

بعض اوقات ورثے میں عورت کا حصہ، اپنے ہم رتبہ مرد سے زیادہ ہوتا ہے

بیشتر واقعات میں ایک عورت کو وراثت میں مرد کی بہ نسبت آدھا حصہ ملتا ہے۔ اا

ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اگر مرنے والے کا کوئی براہِ راست بزرگ (والدین وغیرہ) یا براہِ راست وارث (بیٹا، بیٹی وغیرہ) نہ ہو لیکن اس کے ایسے سوتیلے بہن بھائی ہوں جو ماں کی طرف سے سگے اور باپ کی طرف سے سوتیلے ہوں، تو ایسے دو بہن بھائی میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔

اگر مرنے والے کے بچے نہ ہوں تو اس کے والدین، یعنی ماں اور باپ میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔ بعض معاملات میں عورت کو ترکے میں مرد سے دو گنا حصہ ملتا ہے۔ اگر مرنے والی کوئی عورت ہو جس کے بچے نہ ہوں اور اس کا کوئی بھائی یا بہن بھی نہ ہو، جب کہ اس کے لواحقین میں سے اس کا شوہر، ماں اور باپ رہ گئے ہوں تو (ایسی صورت میں) اس عورت کے شوہر کو ترکے کا آدھا حصہ ملے گا، عورت کی ماں کو ایک تہائی جب کہ باپ کو باقی کا چھٹا حصہ ملے گا۔ ملاحظہ فرمایئے کہ اس معاملے میں عورت کی ماں کا حصہ، اس کے باپ سے دو گنا ہو گا۔

ترکے میں عورت کا عمومی حصہ اپنے ہم مرتبہ مرد سے آدھا ہوتا ہے

ایک عمومی اصول کے طور پر یہ سچ ہے کہ، بیشتر معاملات میں، عورت کا ترکے میں حصہ مرد کی بہ نسبت آدھا ہوتا ہے۔ مثلاً

۱۔ وراثت میں بیٹی کا حصہ، بیٹے سے آدھا ہوتا ہے۔

۲۔ اگر متوفی بے اولاد ہو تو بیوی کو آٹھواں اور شوہر کو چوتھائی حصہ ملے گا۔

۳۔ اگر متوفی صاحب اولاد تھا تو بیوی کو چوتھائی اور شوہر کو آدھا حصہ ملے گا۔

۴۔ اگر متوفی کا کوئی (سگا) بزرگ یا وارث نہ ہو تو اس کی بہن کو (اس کے) بھائی کے مقابلے میں آدھا حصہ ملے گا۔

مرد کو وراثت میں دو گنا حصہ اس لیے ملتا ہے کیونکہ وہ گھرانے کی مالی کفالت کا ذمہ دار ہے:

اسلام میں عورت پر حصولِ معاش کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے جب کہ گھرانے کی مالیاتی

کفالت مرد کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کے رہنے سہنے، آمد ورفت، کپڑے لتے، کھانے پینے اور دوسرے تمام مالیاتی امور کی ذمہ داری اس کے باپ یا بھائی (یا بھائیوں) پر عاید ہوتی ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد عورت کی یہ تمام ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری اس کے شوہر یا بیٹے (یا بیٹوں) پر لاگو ہوتی ہے۔ اپنے گھرانے کی تمام تر مالی، معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسلام نے مرد کو پوری طرح ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس ذمہ داری کو نبھانے کی غرض ہی سے اسلام نے وراثت میں مرد کا حصہ عورت سے دوگنا مقرر کیا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ترکے میں ڈیڑھ لاکھ روپے چھوڑتا ہے اور اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے، تو اس میں سے پچاس ہزار روپے بیٹی کو، جب کہ ایک لاکھ روپے بیٹے کو ملیں گے۔

بظاہر یہ حصہ زیادہ لگتا ہے، لیکن بیٹے پر گھرانے کی ذمہ داریاں بھی ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے (ممکنہ طور پر) اسے ایک لاکھ میں سے اسی ہزار روپے صرف کرنے پڑ سکتے ہیں۔ یعنی وراثت میں عملاً اس کا حصہ بیس ہزار کے لگ بھگ ہی رہے گا۔ دوسری جانب، اگرچہ لڑکی کو پچاس ہزار روپے ملے ہیں، مگر اس پر اپنے اخراجات خود اُٹھانے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ساری رقم اس کے پاس بچ رہے گی۔ آپ کے خیال میں کیا چیز بہتر ہے۔ ترکے میں ایک لاکھ لے کر ان میں سے اسی ہزار خرچ کر دینا یا پچاس ہزار لے کر وہ ساری کی ساری رقم پس انداز کر لینا؟

۱۵۔ کیا قرآنِ پاک، اللہ کا کلام ہے

سوال: آپ یہ کیسے ثابت کریں گے کہ قرآن واقعی اللہ کا کلام ہے؟

جواب: یہ سوال بجائے خود ایک علیحدہ کتاب کا متقاضی ہے، جس کا جواب ان شاء اللہ آیندہ کسی کتاب میں دیا جائے گا۔

۱۶۔ آخرت، موت کے بعد زندگی

سوال: آپ آخرت یا مرنے کے بعد زندگی کا وجود کیسے ثابت کریں گے؟

جواب:

آخرت پر یقین کی بنیاد اندھے عقیدے پر نہیں

بہت سے لوگ اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو سائنسی اور عقلی مزاج رکھتا ہو، کس طرح موت کے بعد زندگی پر یقین کو قبولیت کا درجہ دے سکتا ہے۔ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ آخرت پر کسی شخص کا یقین، اس کے اندھے عقیدے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔

تاہم، آخرت پر میرا یقین عقلی دلائل کی بنیاد پر ہے۔

آخرت: ایک منطقی عقیدہ

قرآنِ پاک کی ایک ہزار سے زاید آیات ایسی ہیں جن میں سائنسی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ (اس کے لیے میری کتاب ''قرآن اور جدید سائنس: ''مطابقت یا اختلاف'' ملاحظہ فرمایئے) گزشتہ چند صدیوں کے دوران قرآن پاک میں بیان کردہ بہت سے حقائق دریافت ہو چکے ہیں۔ لیکن سائنس ابھی اتنی ترقی یافتہ نہیں ہوسکی ہے کہ قرآنِ پاک میں بیان کردہ تمام حقائق کی تصدیق کر سکے۔

اب ذرا فرض کیجیے کہ اگر قرآنِ پاک میں بیان کیے گئے اسی فیصد حقائق سو فیصد درست ثابت ہوگئے ہیں۔ باقی کے تقریباً بیس فیصد حقائق کے بارے میں سائنس نے کوئی واضح نتیجہ اخذ نہیں کیا ہے کیونکہ وہ (سائنس) ابھی تک اتنی ترقی یافتہ نہیں ہوسکی ہے کہ قرآن میں بیان کردہ باقی حقائق کو صحیح یا غلط ثابت کر سکے۔ اس محدود علم کے ساتھ، جو ہمارے پاس ہے، ہم پورے وثوق سے یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس بیس فیصد حصے کا بھی صرف ایک فیصد حصہ یا کوئی

ایک آیت ہی غلط ہے۔ لہٰذا، جب قرآن پاک کا اسی فیصد حصہ (عقلی بنیادوں پر) سو فیصد درست ثابت ہو چکا ہے اور باقی کا بیس فیصد حصہ غلط ثابت نہیں کیا جا سکا، تو منطق یہی کہتی ہے کہ وہ بیس فیصد حصہ بھی درست ہے۔

آخرت کا وجود، جسے قرآن پاک نے بیان کیا ہے، اسی بیس فیصد مبہم حصے میں شامل ہے جو منطق کی رو سے صحیح ہے۔

امن اور انسانی اقدار کا تصور، عقیدہ آخرت کے بغیر بے کار ہے

ڈکیتی اچھا عمل ہے یا برا؟ اس سوال کے جواب میں کوئی بھی نارمل اور متوازن شخص یہی کہے گا کہ یہ برا عمل ہے۔ لیکن اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ کوئی ایسا شخص جو آخرت پر یقین نہ رکھتا ہو، وہ کسی انتہائی طاقتور اور اثر ورسوخ والے مجرم کو کیسے قائل کرے گا ڈاکے ڈالنا ایک برائی، ایک گناہ ہے؟

فرض کیجیے کہ میں دنیا کا سب سے طاقتور اور اثر ورسوخ والا مجرم ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں نہایت ذہین اور منطقی شخص بھی ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ڈاکے ڈالنا بہت اچھا ہے کیونکہ اس سے مجھے اپنی پر تعیش زندگی گزارنے میں مدد ملتی ہے۔ لہٰذا، میرے لیے تو ڈاکہ زنی بہت اچھا عمل ہے۔

اگر کوئی میرے سامنے اس بات کے حق میں ایک منطقی دلیل بھی پیش کر دے (جو میرے لیے بھی یکساں طور پر قابل قبول ہو) کہ ڈاکہ مارنا برا ہے۔ تو میں فوراً یہ کام چھوڑ دوں گا۔ اس کے جواب میں لوگ عموماً درج ذیل دلائل دیتے ہیں:

الف۔ لٹنے والے شخص کو مشکلات کا سامنا ہوگا

بعض لوگ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ لٹنے والے شخص کو مشکلات کا سامنا ہوگا۔ یقیناً، میں اس بات سے اتفاق کروں گا کہ لٹنے والے فرد کے حق میں ڈاکہ زنی کا عمل بہت برا ہے۔ لیکن میرے لیے تو بہر حال یہ اچھا ہے۔ اگر میں ہزار ڈالر کی ڈکیتی ماروں تو میں کسی فائیو سٹار ہوٹل میں مزے سے کھانا کھا سکتا ہوں۔

ب: کوئی دوسرا آپ کو بھی لوٹ سکتا ہے

کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی دن کوئی دوسرا ڈاکو آپ کو بھی لوٹ سکتا ہے۔ لیکن میں تو خود بہت اثر ورسوخ والا مجرم ہوں اور میرے سیکڑوں باڈی گارڈ ہیں۔ تو پھر بھلا کوئی دوسرا مجھے کیسے لوٹ سکتا ہے؟ یعنی میں تو دوسروں کو لوٹ سکتا ہوں مگر مجھے کوئی نہیں لوٹ سکتا۔ ڈاکہ زنی ایک عام آدمی کے لیے تو پر خطر پیشہ ہوسکتا ہے مگر مجھ جیسے طاقتور اور بااثر شخص کے لیے نہیں۔

ج۔ پولیس آپ کو گرفتار کر سکتی ہے

ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ کسی نہ کسی دن آپ کو پولیس گرفتار کر لے گی۔ ارے بھئی پولیس تو مجھے گرفتار ہی نہیں کر سکتی! پولیس کے چھوٹے بڑے افسران سے لے کر حکومتی وزرا تک میرے پے رول پر ہیں۔ میرے نمک خوار ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ اگر کوئی عام آدمی ڈاکہ ڈالے تو وہ گرفتار کر لیا جائے گا اور ڈاکہ زنی اس کے لیے بری ثابت ہوگی۔ لیکن میں تو غیر معمولی طور پر بااثر اور طاقتور مجرم ہوں۔

مجھے کوئی ایک منطقی دلیل دیجیے کہ یہ عمل برا ہے اور میں ڈاکہ زنی چھوڑ دوں گا۔

د۔ یہ بغیر محنت کے کمائی گئی آمدنی ہے

ایک اور دلیل یہ بھی آسکتی ہے کہ یہ بغیر محنت کے یا کم محنت سے کمائی گئی آمدنی ہے جس کے حصول کے لیے بہت مشقت نہیں کی گئی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ڈاکہ زنی کی کمائی میں کچھ خاص محنت کیے بغیر اچھی خاصی رقم ہاتھ لگتی ہے۔ اور یہی تو میرے ڈاکے ڈالنے کی بڑی وجہ بھی ہے۔ اگر کسی شخص کے سامنے زیادہ پیسہ کمانے کا آسان اور باسہولت راستہ ہو اور وہ راہ بھی ہو کہ جس سے پیسہ کمانے میں اسے بہت زیادہ محنت کرنا پڑے، تو منطقی ذہن رکھنے والا کوئی بھی شخص آسان راستے ہی کا انتخاب کرے گا۔

ہ۔ یہ انسانیت کے خلاف ہے

بعض لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکہ زنی انسانیت کے خلاف ہے، اور یہ کہ ایک شخص کو دوسرے انسانوں کا خیال کرنا چاہیے۔ اس کا رد کرتے ہوئے میں یہ سوال کروں گا کہ ''انسانیت''

کھلانے والا یہ قانون کس نے لکھا ہے اور میں اس کی پاسداری کس خوشی میں کروں؟

یہ قانون کسی جذباتی اور حساس قسم کے انسان کے لیے تو اچھا ہو سکتا ہے لیکن میں منطقی انسان ہوں اور مجھے دوسرے انسانوں کی پروا کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

ف۔ یہ خودغرضانہ عمل ہے

کچھ لوگ ڈاکہ زنی کو خودغرضانہ عمل بھی قرار دے سکتے ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے کہ ڈاکہ زنی ایک خودغرضانہ عمل ہے لیکن میں خودغرض کیوں نہ بنوں؟ اسی سے تو مجھے زندگی کے مزے اُڑانے میں مدد ملتی ہے۔

ڈاکہ زنی کو برا عمل ثابت کرنے کے لیے کوئی منطقی دلیل نہیں

لہٰذا، ڈاکہ زنی کو برا عمل ثابت کرنے کی غرض سے دیے گئے تمام عقلی دلائل بے سود رہتے ہیں۔ ان دلائل سے ایک عام اور کمزور انسان کو تو قائل کیا جا سکتا ہے مگر مجھ جیسے طاقتور اور بااثر شخص کو نہیں۔ ان میں سے کسی ایک دلیل کا دفاع بھی عقل اور منطق کی طاقت پر نہیں کیا جا سکتا۔

لہٰذا، اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ دنیا میں بہت جرائم پیشہ افراد پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح دھوکہ دہی اور زنا جیسے جرائم، مجھ سے کسی شخص کے لیے اچھے ہونے کا جواز پا سکتے ہیں اور کوئی منطقی دلیل مجھے ان کے بُرا ہونے پر قائل نہیں کر سکتی۔

ایک مسلمان کسی طاقتور اور بااثر مجرم کو قائل کر سکتا ہے

چلیے، اب ہم جگہیں بدل لیتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ آپ دنیا کے طاقتور ترین اور بااثر مجرم ہیں جس کے پے رول پر پولیس کے سپاہی سے لے کر وزرا تک، سب موجود ہیں۔ آپ کے پاس اپنی حفاظت کے لیے ٹھگوں کی ایک پوری فوج ظفر موج ہے۔ میں ایک مسلمان ہوں جو آپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ عصمت دری، ڈاکہ زنی اور دھوکہ دہی وغیرہ برے اعمال ہیں۔

اگر میں وہی تمام دلائل (جو پہلے دیے جا چکے ہیں) ڈاکہ زنی کو برا ثابت کرنے کے لیے پیش کروں تو مجرم بھی اسی انداز سے جواب دے گا جیسے اس نے پہلے کیا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ مجرم ذہین ہے اور منطقی سوچ رکھتا ہے، اور اس کے تمام دلائل صرف اسی وقت صحیح ہوں گے جب وہ دنیا کا سب سے طاقتور اور بااثر مجرم ہو۔

ہر انسان انصاف چاہتا ہے

ہر ایک انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے انصاف ملے۔ حتیٰ کہ اگر وہ دوسروں کے لیے انصاف کا خواہش مند نہ بھی ہو تب بھی وہ اپنے لیے انصاف چاہتا ہے۔ بعض لوگ طاقت اور اثر ورسوخ کے نشے میں اس قدر بدمست ہوتے ہیں کہ دوسروں پر صعوبتیں اور تکالیف مسلط کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ اس وقت شدید اعتراض کرتے ہیں کہ جب خود ان کے ساتھ کوئی ناانصافی کی جائے۔ ان کے دوسرے لوگوں کی تکالیف اور صعوبتوں کی طرف سے بے حس ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ طاقت اور اثر ورسوخ کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں یہ طاقت اور اثر ورسوخ ہی ہے جو نہ صرف انہیں دوسروں کے ساتھ ناانصافی کرنے کے قابل بناتا ہے بلکہ دوسروں کو ان کے ساتھ ویسا ہی کرنے سے باز بھی رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ طاقتور اور انصاف کرنے والا ہے

ایک مسلمان کی حیثیت سے میں اس مجرم کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے وجود پر قائل کروں گا۔ (اس بارے میں دلائل علیحدہ ہیں۔) اللہ تعالیٰ آپ سے بھی کہیں زیادہ طاقتور ہے اور ساتھ ہی ساتھ، وہ منصف ترین بھی ہے۔ قرآنِ پاک میں آتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾ [سورۃ ۴، آیت: ۴۰]

”اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دو چند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ مجھے سزا کیوں نہیں دیتا؟

اور منطقی اور سائنسی شخص ہونے کے ناطے، جب اس کے سامنے قرآن پاک سے دلائل

پیش کیے جاتے ہیں تو وہ انہیں تسلیم کر کے اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر لیتا ہے۔ وہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ انصاف کرنے والا ہے، تو پھر وہ اسے سزا کیوں نہیں دیتا؟

ناانصافی کرنے والوں کو سزا ملنی چاہیے

ہر وہ شخص، جس کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہو، یقیناً یہ چاہے گا کہ ناانصافی کے مرتکب کو، اس کے مال و دولت اور معاشرتی مرتبے کا لحاظ کیے بغیر، سزا ملنی چاہیے۔ ہر نارمل انسان یہ چاہے گا کہ ڈاکو بدکار کو سبق سکھایا جائے۔ اگرچہ بہت سارے مجرموں کو سزا مل جاتی ہے لیکن پھر بھی ان کی ایک بڑی تعداد قانون سے بچنے میں کامیاب رہتی ہے۔ یہ لوگ بڑی پر لطف اور پر تعیش زندگی گزارتے ہیں، اور بسا اوقات بڑے اطمینان سے رہتے ہیں۔ اگر کسی طاقتور اور با اثر شخص کے ساتھ اس سے بھی زیادہ با اثر اور طاقتور شخص ناانصافی کرے تو وہ بھی یہی چاہے گا کہ اس زیادہ طاقتور اور زیادہ با اثر شخص کو (جس نے ناانصافی کا ارتکاب کیا ہے) سزا دی جائے۔

یہ زندگی آخرت کی امتحان گاہ ہے

دنیا کی یہ زندگی، آخرت کے لیے امتحان ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَّھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۝ ﴾ [سورۃ ۶۷، آیت:۲]

ترجمہ: ”جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔“

قیامت کے روز مکمل اور حتمی انصاف ہو گا

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ

اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○ ﴾ [سورۃ ۳، آیت: ۱۸۵]

ترجمہ: ''آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا، تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔''

حتمی انصاف، قیامت کے روز کیا جائے گا۔ مرنے کے بعد ہر شخص کو یوم حساب (روز قیامت) ایک بار پھر، دوسرے تمام انسانوں کے ساتھ زندہ کیا جائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی سزا کا کچھ حصہ اس دنیا ہی میں بھگت لے۔ لیکن سزا اور جزا کا آخری اور حتمی معاملہ تو آخرت ہی میں کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی لٹیرے یا بدکار کو اس دنیا میں سزا نہ دے لیکن اسے روزِ محشر میں اپنے ایک ایک عمل کا، ایک ایک گناہ کا حساب چکانا ہوگا اور وہ آخرت میں، موت کے بعد کی زندگی میں، اپنے ایک ایک جرم کی سزا پائے گا۔

انسانی قانون ہٹلر کو کیا سزا دے سکتا ہے؟

جنگ عظیم کے دوران ہٹلر نے لگ بھگ ساٹھ لاکھ یہودیوں کو زندہ جلوایا تھا۔ بالفرض، اگر پولیس اسے گرفتار بھی کر لیتی، تو قانون کی پاسداری کرتے ہوئے (انسانی قانون کے مطابق) عدالت اسے زیادہ سے زیادہ کیا سزا دے سکتی تھی؟ بہت سے بہت یہی ہوتا کہ اسے بھی کسی گیس چیمبر میں بند کر کے ہلاک کر دیا جاتا۔ لیکن یہ تو صرف ایک بے گناہ یہودی کو قتل کرنے کی سزا ہوتی ہے۔ باقی کے ۵۹ لاکھ ۹۹ ہزار ۹ سو ۹۹ یہودیوں کے قتل کی سزا اسے کس طرح دی جاسکتی تھی؟ اسے صرف ایک بار ہی (عملاً) سزائے موت دی جاسکتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ وہ ہٹلر کو جہنم کی آگ میں ۶۰ لاکھ سے بھی زیادہ مرتبہ جلا دے

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ ﴾ [سورۃ ۴، آیت: ۵۶]

"جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو ماننے سے انکار کردیا ہے۔ انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کردیں گے تا کہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں گے اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ چاہے تو ہٹلر کو جہنم کی آگ میں محض ۶۰ لاکھ مرتبہ نہیں، بلکہ لا تعداد بار جلا سکتا ہے۔

تصورِ آخرت کے بغیر انسانی اقدار یا اچھائی اور برائی کا کوئی تصور نہیں

یہ واضح ہے کہ کسی شخص کو تصورِ آخرت، یا موت کے بعد زندگی کے یقین پر قائل کیے بغیر اسے انسانی اقدار یا نیک و بد اعمال کے تصور پر قائل کرنا بھی ممکن نہیں۔ خصوصاً جب ان طاقتور اور با اختیار لوگوں کا معاملہ درپیش ہو جو نا انصافی میں پڑے ہوں۔

۱۷۔ کیا وجہ ہے کہ مسلمان مختلف فرقوں، مکاتبِ فکر میں تقسیم ہیں؟

سوال: جب سارے مسلمان ایک اور یکساں قرآن کی پیروی کرتے ہیں تو پھر مسلمانوں میں اتنے زیادہ فرقے یا مکاتبِ فکر کیوں ہیں؟

جواب:

مسلمانوں کو متحد ہونا چاہیے

یہ سچ ہے کہ آج کے مسلمان آپس میں ہی تقسیم ہیں۔ المیہ ہے کہ ان تفرقات کی اسلام میں ہرگز کوئی اجازت نہیں ہے۔ دینِ اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ اپنے ماننے والوں میں اتحاد و یگانگت کو برقرار رکھا جائے۔

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ﴾ [سورۃ ۳، آیت: ۱۰۳]

''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔''

وہ کونسی رسی ہے جس کی طرف اس آیت مبارک میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے، قرآنِ پاک ہی وہ رسی ہے۔ قرآن پاک ہی اللہ کی وہ رسی ہے جسے سارے مسلمانوں کو مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیے۔ اس آیتِ مبارکہ میں بھی دہرا اصرار ہے۔ ایک طرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی رسی کو ''مضبوطی سے تھامے رکھو۔'' تو دوسری طرف یہ ہدایت بھی ہے ''تفرقے میں نہ پڑو۔''

قرآنِ پاک میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾

[سورۃ ۴، آیت: ۵۹]

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقہ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔“

تمام مسلمانوں کو قرآن پاک اور مستند احادیث ہی کی پیروی کرنی چاہیے اور آپس میں تفرقہ ڈالنا نہیں چاہیے۔

اسلام میں فرقوں اور تقسیم کی ممانعت ہے

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾[سورۃ ۶، آیت:۱۵۹]

”جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے اور وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔“

اس آیت مبارکہ میں واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان لوگوں سے الگ رہنے کا حکم دیا ہے جو دین میں تقسیم ڈالتے ہوں اور اسے فرقوں میں بانٹتے ہوں۔

لیکن آج جب کسی مسلمان سے سوال کیا جائے ”تم کون ہو؟ تو عموماً کچھ ایسے جوابات ملتے ہیں: میں سنی ہوں، میں شیعہ ہوں وغیرہ، بعض لوگ خود کو حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی بھی کہتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں ”میں دیوبندی ہوں“

ہمارے نزدیک نبی ﷺ مسلم تھے

ایسے مسلمانوں سے کوئی یہ پوچھے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کون تھے؟ کیا وہ حنفی یا شافعی تھے؟ کیا وہ مالکی یا حنبلی تھے؟ نہیں! وہ مسلمان تھے، دوسرے تمام انبیائے کرام اور

رسولوں کی طرح کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے مبعوث فرمایا تھا۔

قرآنِ پاک کی سورۃ ۳، آیت : ۵۲ میں واضح کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مسلمان (مسلم) ہی تھے۔ اسی سورہ مبارکہ کی ۶۷ ویں آیت میں قرآنِ پاک بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کوئی یہودی یا عیسائی نہیں تھے، بلکہ وہ ''مسلم'' تھے۔

قرآنِ پاک ہمیں خود کو ''مسلم'' کہنے کا حکم دیتا ہے

الف۔ اگر کوئی بھی شخص ایک مسلمان سے سوال کرے کہ وہ کون ہے تو اسے جواباً یہ کہنا چاہیے کہ وہ مسلمان ہے...... حنفی یا شافعی نہیں۔ سورۃ فصلت کی ۳۳ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ ﴾ [سورۃ ۴۱۔ آیت:۳۳]

''اور اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔

ملاحظہ ہو یہاں قرآنِ پاک فرما رہا ہے ''کہو، میں ان میں سے ہوں جو اسلام میں جھکتے ہیں۔'' بالفاظِ دیگر، کہو: ''میں ایک مسلم ہوں۔''

ب۔ حضور نبی کریم (ﷺ) جب غیر مسلم بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے خطوط لکھواتے تھے، تو ان خطوط میں سورۃ آل عمران کی ۶۴ ویں آیت بھی شامل کرواتے تھے:

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ ﴾

[سورۃ آل عمران، آیت:۶۴]

''اے نبیؐ! کہو اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔

اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔"

اسلام کے تمام عظیم علما کا احترام کیجیے

ہمیں اسلام کے تمام عظیم علما کا، بشمول چاروں اماموں کے، لازماً احترام کرنا چاہیے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام حنبل رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ، یہ سبھی ہمارے لیے یکساں طور پر واجب الاحترام ہیں۔ یہ سب کے سب عظیم علما و محققین تھے اور اللہ تعالیٰ انہیں ان کی تحقیق اور دین کی انتھک محنت پر اجر عظیم عطا فرمائے (آمین)۔ اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ اگر کوئی شخص امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی تحقیق اور نقطہ نظر سے متفق ہو۔ لیکن جب یہ سوال کیا جائے "تم کون ہو؟" تو جواب صرف اور صرف "میں مسلمان ہوں" ہونا چاہیے۔

بعض لوگ (فرقوں کی) دلیل میں حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک حدیث پیش کرتے ہیں جو سنن ابوداؤد میں (حدیث نمبر ۴۵۷۹) روایت کی گئی ہے۔ اس حدیث میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے: "میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔"

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں میں ۷۳ فرقے بننے کی پیش گوئی فرمادی تھی۔ لیکن حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہرگز یہ نہیں فرمایا کہ مسلمانوں کو فرقوں میں بٹنے کے لیے سرگرم ہو جانا چاہیے۔ قرآنِ پاک ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم فرقوں میں تقسیم نہ ہوں۔ وہ لوگ جو قرآن پاک اور مستند احادیث کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں اور فرقے نہ بنائیں، وہی لوگ صحیح راستے پر ہیں۔

ترمذی شریف میں مروی ۱۷۱ ویں حدیث میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قول مروی ہے: "میری امت ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور وہ سب کے سب جہنم کی آگ میں جلیں گے، سوائے ایک فرقے کے۔"

صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نے اس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سوال کیا کہ وہ کون سا گروہ ہوگا (جو جنت میں جائے گا)، تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب دیا "صرف وہ جو

میری اور میرے اصحاب کی اتباع کرے گا۔"

قرآن پاک کی متعدد آیات میں "اللہ کی، اور اللہ کے رسول ﷺ کے اتباع کرو" کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایک سچے مسلمان کو صرف قرآنِ پاک اور مستند احادیث ہی کی پیروی (اتباع) کرنی چاہیے۔ وہ کسی عالم کے نقطہ نظر سے اتفاق بھی رکھ سکتا ہے، جب تک کہ وہ قرآنِ پاک اور احادیث صحیحہ (مستند احادیث) کی تعلیمات سے مطابقت میں رہیں۔ اگر (اس عالم کے) یہ خیالات (نقطہ نظر) اللہ تعالیٰ کے احکامات اور رسول اللہ (ﷺ) کی سنت کے خلاف ہوں تو ان میں کوئی وزن نہیں...... چاہے انہیں کتنے ہی بڑے اور جید عالم نے کیوں نہ پیش کیا ہو۔

اگر تمام مسلمان، قرآنِ پاک کا مطالعہ سمجھ کر ہی کر لیں اور مستند احادیث کی اتباع کریں تو ان شاء اللہ تعالیٰ یہ تمام اختلافات حل ہو جائیں گے اور ہم ایک بار پھر صحیح معنوں میں ایک متحدہ اُمتِ مسلمہ بن جائیں گے۔

۱۸۔تمام مذاہب ہی انسانوں کو راست بازی کی تعلیم دیتے ہیں تو پھر صرف اسلام ہی کی اتباع کیوں کی جائے؟

سوال: تمام مذاہب بنیادی طور پر اپنے پیروکاروں کو اچھے کام کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔تو پھر کسی شخص کو صرف اسلام ہی کی پیروی کیوں کرنی چاہیے؟ کیا وہ کسی بھی، دوسرے مذہب کی پیروی نہیں کرسکتا؟

جواب:

اسلام اور دوسرے بیشتر مذاہب میں اہم فرق

یہ صحیح ہے کہ تمام مذاہب ہی انسانیت کو راست بازی اور نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔لیکن اسلام اس سے بھی آگے تک جاتا ہے۔یہ نیکی و راست بازی کے حصول اور ہماری انفرادی و اجتماعی زندگیوں سے برائی ختم کرنے کے عملی طریقوں کی جانب ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے۔اسلام نہ صرف انسانی فطرت کو اہمیت دیتا ہے، بلکہ یہ انسانی معاشرے کی پیچیدگیوں کی طرف بھی متوجہ رہتا ہے۔اسلام ایک ایسی ہدایت ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کو انسان کے لیے ''دینِ فطرت'' بھی کہا جاتا ہے۔

مثال: اسلام صرف چوری چکاری رڈاکہ زنی کو روکنے کا حکم ہی نہیں دیتا، بلکہ اسے ختم کرنے کے عملی طریقے کی وضاحت بھی کرتا ہے:

الف:......اسلام چوری چکاری رڈاکہ زنی ختم کرنے کے عملی طریقے کی وضاحت کرتا ہے:

تمام بڑے مذاہب میں چوری چکاری رڈاکہ زنی کو برائی قرار دیا جاتا ہے۔اسلام بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے۔تو پھر دیگر مذاہب اور اسلام کی تعلیمات میں کیا فرق ہوا؟ فرق اس

حقیقت میں موجود ہے کہ اسلام صرف چوری چکاری کو برا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ وہ عملی طریقہ بھی بتاتا ہے کہ جس پر چل کر ایسا معاشرتی ڈھانچہ تخلیق کیا جائے کہ جس میں لوگ چوری چکاری/ڈاکہ زنی نہ کریں۔

ب:......اسلام میں زکوٰۃ کی وضاحت ہے:

اسلام نے زکوٰۃ دینے کا ایک واضح نظام بیان فرمایا ہے۔اسلامی قانونی کے مطابق ہر وہ شخص کہ جس کے پاس بچت کی مالیت ''نصاب'' (یعنی ۸۵ گرام سونا یا اتنی مالیت کے اثاثے) کے برابر یا زیادہ ہو، اسے ہر قمری سال میں اپنی اس بچت کا ڈھائی فیصد (۲.۵ فیصد) حصہ مستحقین کو دینا چاہیے۔اگر دنیا کا ہر امیر شخص ایمانداری سے زکوٰۃ دینے لگ جائے تو ساری دنیا سے غربت ختم ہو جائے گی۔کوئی ایک انسان بھی فاقے سے نہیں مرے گا۔

ج:......چوری/ڈاکے کی سزا میں ہاتھ کاٹنا:

اسلام میں یہ وضاحت بھی ہے کہ اگر کسی کے خلاف چوری/ڈاکے کا جرم ثابت ہو جائے تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔قرآنِ پاک نے سورۃ المائدہ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ ﴾ [سورۃ المائدہ، آیت:۳۸]

''اور چور خواہ عورت ہو یا مرد دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا، اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔''

غیر مسلم کہتے ہیں ''اکیسویں صدی میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ! اسلام تو بے رحمی اور سفاکی کا مذہب ہے!''

د:......نتائج تبھی ملتے ہیں جب اسلامی شریعت نافذ کی جائے:

امریکہ کو دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک تصور کیا جاتا ہے۔بدقسمتی سے یہی وہ ملک بھی ہے جہاں چوری اور ڈاکہ زنی وغیرہ جیسے جرائم کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔اب ذرا

فرض کیجیے کہ امریکہ میں اسلامی شریعت نافذ کر دی جاتی ہے، یعنی یہ کہ ہر امیر آدمی جو صاحب نصاب ہو، پابندی سے اپنے مال سے ۲.۵ فیصد زکوٰۃ ادا کرے (قمری سال کے مطابق) اور چوری/ڈکیتی کا جرم ثابت ہو جانے پر مجرم کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ کیا ایسی صورت میں امریکہ میں چوری/ڈکیتی کی شرح میں اضافہ ہوگا، کمی ہوگی یا کوئی فرق نہیں پڑے گا؟ فطری سی بات ہے کہ اس میں کمی واقع ہوگی۔ پھر یہ بھی ہے کہ ایسے سخت قانون کی موجودگی میں وہ لوگ بھی اس جرم سے باز رہیں گے جو مجرمانہ ذہن رکھتے ہوں۔

میں مانتا ہوں کہ آج دنیا میں چوری/ڈکیتی کی اتنی زیادہ وارداتیں ہو رہی ہیں کہ اگر تمام چوروں کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں تو ایسے لاکھوں لوگ ہوں گے جن کے ہاتھ کٹیں گے۔ تاہم، یہاں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ جس لمحے آپ یہ قانون نافذ کریں گے، اس کے ساتھ ہی چوری/ڈکیتی کی شرح میں کمی آ جائے گی۔ ڈکیتی/چوری کا ارادہ کرنے والا کوئی شخص، یہ کام کرنے سے پہلے کئی دفعہ سوچے گا کیونکہ اسے اپنے ہاتھ گنوانے کا خطرہ بھی ہوگا۔ محض سزا کا تصور ہی اکثر ڈاکوؤں/چوروں کی حوصلہ شکنی کرے گا۔ ایسے میں بہت ہی کم لوگ ہوں گے جو چوری/ڈکیتی کی ہمت کر پائیں گے۔ لہٰذا، صرف چند لوگوں کے ہاتھ کاٹے جانے سے لاکھوں کروڑوں لوگ ڈکیتی/چوری کے خوف سے بے نیاز ہو کر، امن اور چین کی زندگی گزار سکیں گے۔

لہٰذا اسلامی شریعت عملی ہے اور اس سے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

مثال: اسلام میں خواتین کی بے حرمتی اور عصمت دری حرام ہے، اسلام میں (عورتوں کے لیے) حجاب کا حکم ہے اور زنا کا جرم ثابت ہو جانے پر زانی کے لیے سزائے موت ہے:

الف:..... اسلام میں عورتوں کے ساتھ دست درازی اور عصمت دری روکنے کا عملی طریقہ واضح کیا گیا ہے:

تمام بڑے مذاہب میں عورت کی عصمت دری اور اس سے دست درازی کو ایک گھناؤنے گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلام کی تعلیمات بھی یہی ہیں۔ تو پھر اسلام اور دیگر مذاہب کی تعلیمات میں کیا فرق ہے؟ یہ فرق اس حقیقت میں ہے کہ اسلام صرف عورت کے احترام کی تلقین ہی پر اکتفا نہیں کرتا، یا دست درازی اور عصمت دری کو گھناؤنا جرم قرار دے کر خاموش نہیں ہو جاتا، بلکہ ساتھ ہی ساتھ واضح رہنمائی بھی فراہم کرتا ہے کہ معاشرے کو ان جرائم سے کس طرح پاک کیا جائے۔

ب:......مردوں کے لیے حجاب:

اسلام میں حجاب کا نظام ہے۔ قرآن پاک میں پہلے مرد کے لیے حجاب کا تذکرہ ہے اور پھر عورتوں کے حجاب پر بات کی گئی ہے۔ مردوں کے لیے حجاب درج ذیل آیت مبارکہ میں مذکورہ ہے:

﴿ قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ ﴾ [سورۃ:۲۴، آیت:۳۰]

’’اے نبیؐ! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔‘‘

جس لمحے کسی مرد کی نگاہ (نامحرم) عورت پر پڑے اور کوئی غلط سوچ یا بے حیائی کا خیال اس کے ذہن میں آئے، تو اسے فوراً اپنی نگاہ نیچی کر لینی چاہیے۔

ج:......عورتوں کے لیے حجاب:

عورتوں کے لیے حجاب کا تذکرہ درج ذیل آیت مبارکہ میں ہے:

﴿ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ [سورۃ:۲۴، آیت:۳۱]

''اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں آنچل ڈالے رہیں۔''......

عورت کے لیے حجاب کی وضاحت یہ ہے کہ اس کا جسم مکمل طور پر ڈھکا ہونا چاہیے۔ صرف اس کا چہرہ اور ہاتھ (کلائیوں تک) وہ حصے ہیں جو ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم اگر کوئی خاتون انہیں بھی چھپانا چاہیں تو وہ ان جسمانی حصوں پر بھی حجاب کر سکتی ہیں۔ البتہ بعض علمائے دین کا اصرار ہے کہ چہرہ بھی ڈھکا ہونا چاہیے۔

د:...... دست درازی سے تحفظ، حجاب:

اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لیے حجاب کا حکم کیوں دیا ہے؟ اس کا جواب قرآنِ پاک نے سورۃ الاحزاب کی درج ذیل آیتِ مبارکہ میں فراہم کیا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾ [سورۃ الاحزاب۔ آیت:۵۹]

''اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔''

قرآنِ پاک فرماتا ہے کہ عورتوں کا حجاب کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ باعزت اور پروقار حیثیت سے پہچانی جا سکیں۔ اور یہ کہ حجاب انہیں دست درازی سے بھی بچاتا ہے۔

ھ:...... جڑواں بہنوں کی مثال:

فرض کیجیے کہ دو جڑواں بہنیں ہیں جو یکساں طور پر خوبصورت بھی ہیں۔ ایک روز وہ دونوں ایک ساتھ گھر سے نکلتی ہیں۔ ایک بہن نے اسلامی حجاب کر رکھا ہے، یعنی اس کا پورا جسم ڈھکا ہوا ہے۔ اس کے برعکس دوسری بہن نے مغربی طرز کا منی اسکرٹ پہنا ہوا ہے، یعنی اس

کے جسم کا خاصہ حصہ نمایاں ہے۔ گلی کے نکڑ پر ایک لفنگا بیٹھا ہے جو اس انتظار میں ہے کہ کوئی لڑکی وہاں سے گزرے اور اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ یا دست درازی کرے۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ دونوں بہنیں وہاں پہنچیں گی تو وہ لفنگا ان میں سے کس کو چھیڑے گا؟ اسلامی حجاب والی لڑکی کو، یا منی اسکرٹ پہننے والی لڑکی کو؟ وہ لباس جو جسم کو چھپانے سے زیادہ نمایاں کریں، جنسِ مخالف کے لیے ایک طرح سے اس امر کی دعوت ہوتے ہیں کہ وہ چھیڑ چھاڑ دست درازی اور عصمت دری کریں۔ قرآنِ پاک نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ حجاب عورت کو دست درازی سے بچاتا ہے۔

ف:......زانی کے لیے سزائے موت:

اگر کسی (شادی شدہ) فرد کے خلاف زنا کا جرم ثابت ہو جائے تو اسلامی شریعت کی رُو سے اس کے لیے سزائے موت ہے۔ آج کے دور میں اتنی سخت سزا دینے پر غیر مسلم شاید بری طرح خوفزدہ ہو جائیں۔ بہت سے لوگ اسلام پر بے رحمی اور سفاکی کا الزام لگاتے ہیں۔ میں نے سیکڑوں غیر مسلم مردوں سے ایک عام سا سوال کیا۔ میں نے پوچھا: فرض کیجیے کہ، خدانخواستہ کوئی آپ کی بیوی، بہن یا ماں کی عصمت دری کرے اور آپ کو (اس مجرم کو سزا دینے کے لیے) جج مقرر کیا جائے، زانی کو آپ کے سامنے لایا جائے، آپ اسے کیا سزا دیں گے؟ اُن سب نے جواب دیا: ''ہم اسے سزائے موت دیں گے'' بعض لوگ تو انتہا پر چلے گئے اور کہنے لگے: ''ہم اس پر اتنا تشدد کریں گے کہ وہ مر جائے'' یعنی اگر آپ کی بیوی یا ماں کی عصمت دری ہو تو آپ اُس زانی کو مار ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن اگر کسی دوسرے کی ماں، بہن یا بیوی کی عزت لوٹی گئی ہو تو سزائے موت وحشیانہ قانون ہو گئی۔ یہ دوہرا معیار کیوں ہے؟

ق:......امریکہ میں عصمت دری کی شرح سب سے زیادہ ہے:

اب میں ایک بار پھر دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک، امریکہ کی مثال لوں گا۔ ایف بی آئی کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۵ء کے دوران امریکہ میں عصمت دری کے ۱۰۲،۵۵ (ایک لاکھ دو ہزار پچپن) واقعات درج ہوئے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ عصمت دری کی تمام

وارداتوں میں سے صرف ۱۶ فیصد ہی کی رپورٹیں درج کرائی گئیں۔ لہٰذا ۱۹۹۵ء کے دوران امریکہ میں عصمت دری کی وارداتوں کی اصل تعداد جاننے کے لیے ہمیں رپورٹ کی گئی تعداد ۶.۲۵ سے ضرب دینا ہوگا۔ اس طرح ہمیں ۶۴۰،۹۶۸ (چھ لاکھ چالیس ہزار نو سو اڑسٹھ) کی مجموعی تعداد ملتی ہے۔ یعنی ۱۹۹۵ء کے دوران امریکہ میں عصمت دری کی ۶۴۰،۹۶۸ وارداتیں ہوئیں۔ اگر اس تعداد کو سال کے ۳۶۵ دنوں پر تقسیم کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سال امریکہ میں ہر روز عصمت دری کی ۱،۷۵۶ وارداتیں ہوئیں۔

بعد ازاں ایک اور رپورٹ میں کہا گیا کہ امریکہ میں ہر روز عصمت دری کی ۱۹۰۰ وارداتیں ہوتی ہیں۔ امریکہ محکمہ دفاع کے ذیلی ادارے ''نیشنل کرائم وکٹمائزیشن سروے بیورو آف جسٹس'' کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق صرف ۱۹۹۶ء کے دوران امریکہ میں رپورٹ کیے گئے (عصمت دری کے) واقعات کی تعداد ۳ لاکھ ۷ ہزار (۳۰۷,۰۰۰) تھی۔ علاوہ ازیں، رپورٹ کی گئی وارداتیں بھی اصل وارداتوں کا صرف ۳۱ فیصد حصہ تھیں۔ یعنی اصل تعداد جاننے کے لیے ہمیں اس تعداد کو ۳.۲۲۶ سے ضرب دینا پڑے گا۔ حاصل ضرب ملنے پر پتا چلتا ہے کہ ۱۹۹۶ء کے دوران امریکہ میں عصمت دری کی وارداتوں کی اصل تعداد ۹۹۰،۳۲۲ (۹ لاکھ ۹۰ ہزار ۳۳۲) تھی۔ یعنی اس سال امریکہ میں روزانہ ایسی ۲،۷۱۳ وارداتیں ہوئیں۔

گویا ہر ۳۲ سیکنڈ بعد امریکہ میں عصمت دری کی ایک واردات ہوئی! شاید امریکہ کے زنا کار زیادہ دلیر ہوگئے ہیں۔ ایف بی آئی کی ۱۹۹۵ء والی رپورٹ میں مزید یہ بھی کہا گیا تھا کہ صرف ۱۰ فیصد زنا کار ہی گرفتار کیے جا سکے، یعنی عصمت دری کے اصل واقعات کے صرف ۱.۶ فیصد مجرم ہی قانون کی گرفت میں آئے۔ ان گرفتار شدگان میں سے بھی ۵۰ فیصد کو مقدمہ چلائے بغیر رہا کر دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عصمت دری کے صرف ۰.۸ فیصد مجرموں کو ہی مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے الفاظ میں یہی بات اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ (امریکہ میں) اگر کوئی شخص ۱۲۵ مرتبہ عصمت دری کا ارتکاب کرے تو اس بات کا امکان ہے کہ اسے صرف ایک بار ہی اس کی سزا مل پائے گی۔ بہت سے مجرم اسے ایک ''اچھا جوا'' سمجھتے ہیں۔

یہی رپورٹ مزید بتاتی ہے کہ مقدمات کا سامنا کرنے والے ۵۰ فیصد افراد کو ایک سال سے بھی کم کے لیے قید کی سزا سنائی گئی حالانکہ امریکہ کے قانون کے تحت، عصمت دری کا ارتکاب کرنے والے کی سزا سات سال قید با مشقت ہے۔ یہ مشاہدہ کیا گیا کہ جج صاحبان پہلی مرتبہ عصمت دری کے جرم میں گرفتار ہونے والے کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں، اس لیے انہیں کم سزا دیتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ ایک شخص ۱۲۵ مرتبہ عصمت دری کا جرم کرتا ہے اور پکڑا بھی جاتا ہے، تب بھی اسے ۵۰ فیصد تک یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اسے ایک سال سے بھی کم سزا ملے گی!

ک:...... اسلامی شریعت نافذ کردی جائے تو نتائج حاصل ہوتے ہیں:

اب فرض کیجیے کہ امریکہ میں اسلامی شریعت نافذ کر دی جاتی ہے۔ جب بھی کوئی مرد کسی نامحرم عورت پر نگاہ ڈالتا ہے اور اس کے ذہن میں بے حیائی کی کوئی سوچ در آتی ہے تو وہ فوراً اپنی نگاہ نیچی کر لیتا ہے۔ ہر عورت اسلامی احکامات کے مطابق حجاب کرتی ہے، یعنی سارا جسم ڈھانپ کر رکھتی ہے۔ اس کے بعد بھی، اگر کوئی شخص عصمت دری کا مرتکب ہو تو اسے سزائے موت دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سارے قوانین نافذ ہو جانے کے بعد امریکہ میں عصمت دری کی وارداتوں کی شرح میں اضافہ ہوگا، کمی ہوگی یا پھر وہ ویسی کی ویسی ہی رہے گی؟ فطری طور پر، اس کا جواب یہی ہوگا کہ ان وارداتوں میں کمی ہوگی، اور اسلامی شریعت کے نفاذ سے فوری نتائج حاصل ہوں گے۔

انسانیت کو درپیش مسائل کے لیے اسلام کے پاس عملی حل موجود ہیں

زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جائے، کیونکہ اسلام صرف الہامی پند و نصائح کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ انسانیت کو درپیش مسائل کے عملی حل بھی فراہم کرتا ہے۔ اسلام انفرادی اور اجتماعی، دونوں سطح پر مثبت نتائج دیتا ہے۔ اسلام بہترین ضابطہ حیات ہے، کیونکہ یہ ایک عملی اور آفاقی مذہب ہے جو کسی مخصوص رنگ و نسل یا شہریت کے لوگوں تک محدود نہیں ہے۔

۱۹۔ اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کے حقیقی اعمال میں بہت زیادہ فرق ہے

سوال: اگر اسلام دنیا کا بہترین مذہب ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ بہت سے مسلمان بددیانت، بے ایمان اور ناقابل بھروسہ ہوتے ہیں اور دھوکہ بازی، رشوت ستانی اور منشیات کی تجارت جیسے گھناؤنے کاموں میں ملوث ہوتے ہیں؟

جواب:

ذرائع ابلاغ نے اسلام کا چہرہ مسخ کر دیا ہے

الف: بے شک، اسلام ہی بہترین مذہب ہے لیکن عالمی ذرائع ابلاغ (میڈیا) مغرب کے ہاتھ میں ہیں جو اسلام سے خوفزدہ ہیں۔ یہ میڈیا ہی ہے جو اسلام کے خلاف باتیں نشر کرنے اور چھاپنے میں مسلسل مصروف رہتا ہے۔ یہ ذرائع ابلاغ اسلام کے بارے میں غلط معلومات پھیلاتے ہیں، غلط طور پر اسلام کا حوالہ دیتے ہیں، یا پھر اسلام کے نقطۂ ہائے نظر کو ان کے سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کرتے ہیں۔

ب: جب بھی کہیں کوئی بم پھٹتا ہے، جن لوگوں کو کسی ثبوت کے بغیر سب سے پہلے مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے وہ مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ یہی بات شہ سرخیوں میں بھی آ جاتی ہے۔ لیکن اگر بعد میں اس واقعے کا مجرم کوئی غیر مسلم ثابت ہو جائے، تو اس بات کو ایک غیر اہم خبر سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ج: اگر کوئی پچاس سالہ مسلمان مرد، ایک پندرہ سالہ لڑکی سے (اس کی اجازت لے کر) شادی کر لے تو یہ اخباروں میں صفحہ اوّل کی خبر بن جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی پچاس سالہ

غیر مسلم شخص، چھ سالہ معصوم بچی کی عصمت دری کرتے ہوئے پکڑا جائے تو اسے اندر کے صفحات میں ''مختصر خبروں'' کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔ امریکہ میں ہر روز عصمت دری کے اوسطاً ۱۳۷۶،۲ واقعات ہوتے ہیں، لیکن یہ خبروں میں صرف اس لیے نہیں آتے کیوں کہ یہ تو امریکی معاشرے کا چلن بن چکا ہے۔

ہر معاشرے میں کالی بھیڑیں ہوتی ہیں

میں کچھ ایسے مسلمانوں سے واقف ہوں جو بد دیانت ہیں، نا قابل بھروسہ ہیں، دھوکہ باز ہیں وغیرہ۔ لیکن میڈیا کچھ اس انداز سے مسلمانوں کی تصویر کشی کرتا ہے جیسے صرف مسلمان ہی ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ کالی بھیڑیں ہر معاشرے میں ہوتی ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں لیکن علانیہ یا پوشیدہ طور پر شراب نوشی بھی کرتے ہیں۔

مسلمان بطورِ مجموعی بہترین ہیں

مسلمان معاشرے میں ان کالی بھیڑوں کے باوجود، اگر مسلمانوں کا بطورِ مجموعی جائزہ لیا جائے تو وہ دنیا کا بہترین معاشرہ ثابت ہوں گے۔ مثلاً، مسلمان ہی دنیا کی وہ سب سے بڑی جماعت ہیں جو شراب سے پرہیز کرتے ہیں۔ اسی طرح، یہ مسلمان ہی ہیں جو دنیا میں (مجموعی طور پر) سب سے زیادہ عطیات دیتے ہیں۔ دنیا کا کوئی ایک معاشرہ بھی ایسا نہیں جو وقار و شرافت، بردباری، انسانی اقدار اور اخلاقیات کے ضمن میں مسلمانانِ عالم سے بڑھ کر کوئی مثال پیش کر سکے۔

کار کا فیصلہ ڈرائیور سے نہ کیجیے

فرض کیجیے کہ آپ نئے ماڈل کی ایک مرسڈیز کار کی خوبیوں خامیوں کے لیے اسے ایک ایسے شخص کو تھما دیتے ہیں جو گاڑی ڈرائیو کرنا نہیں جانتا۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص یا تو گاڑی سرے سے چلا ہی نہیں پائے گا، یا پھر ایکسیڈنٹ کر دے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ڈرائیور کی نا اہلی میں اس گاڑی کا کوئی قصور ہے؟ کیا یہ صحیح ہوگا کہ ایسے کسی حادثے کی صورت میں ہم اُس اناڑی

ڈرائیور کو الزام دینے کے بجائے یہ کہنے لگیں کہ وہ گاڑی ہی ٹھیک نہیں؟ لہٰذا کسی کار کی اچھائیاں جاننے کے لیے کسی شخص کو چاہیے کہ اس کے ڈرائیور کو نہ دیکھے بلکہ یہ جائزہ لے کہ خود اس کار کے خدوخال اور کارکردگی وغیرہ کیسے ہیں۔ مثلاً وہ کتنی تیز چل سکتی ہے، وہ اوسطاً کتنا ایندھن صرف کرتی ہے، اس میں حفاظت کے کتنے انتظامات ہیں، وغیرہ۔ اگر میں صرف دلیل کے طور پر یہ مان بھی لوں کہ سارے مسلمان بُرے ہیں، تب بھی ہم اسلام کا اس کے پیروکاروں کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ واقعی اسلام کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے بارے میں دیانتدارانہ رائے قائم کرنا چاہتے ہیں، تو آپ کو اسلام کے متعلق صرف قرآن پاک اور مستند احادیث ہی کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرنا ہوگی۔ یہی وہ دو ذرائع ہیں جن کی مدد سے اسلام کا صحیح مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کا تجزیہ اس کے بہترین پیروکار، یعنی حضرت محمد (ﷺ) کے ذریعے کیجیے

اگر آپ عملاً یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کوئی کار کتنی اچھی ہے، تو اس کا موزوں ترین طریقہ یہ ہوگا کہ وہ کار کسی بہترین ڈرائیور کو چلانے کے لیے دے دیجیے۔ اسی طرح اسلام کے بہترین پیروکار اور اسلام کی خوبیوں کو جانچنے کا بہترین پیمانہ صرف ایک ہستی ہے جو اللہ کے آخری نبی اور پیغمبر اسلام، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے سوا کسی اور کی نہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ، ایسے بہت سے ایمان دار اور غیر جانبدار غیر مسلم مؤرخین بھی ہیں جنہوں نے حضور (ﷺ) کو اس دنیا کا بہترین انسان تسلیم کیا ہے۔ ''تاریخ کی ۱۰۰ عظیم ترین شخصیات'' نامی کتاب کے مصنف مائکل ایچ ہارٹ نے اس کتاب میں حضور نبی کریم (ﷺ) کو انسانی تاریخ کی عظیم ترین شخصیت تسلیم کرتے ہوئے سب سے پہلے نمبر پر درج کیا ہے۔ (**ضروری وضاحت**:...... ہارٹ کی مذکورہ کتاب انگریزی حروفِ تہجی کی ترتیب میں ہے، لیکن مصنف نے حضور نبی کریم (ﷺ) کی ذاتِ مبارک کو اُس ترتیب سے الگ کر کے، سب سے پہلے بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی مصنف نے اس کی خصوصی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: ''محمد (ﷺ) کی شخصیت اتنی

پر اثر اور عظیم ہے کہ ان کا مرتبہ باقی تمام شخصیات سے بہت بلند ہے۔ اس لیے میں محمد (ﷺ) کا تذکرہ حروفِ تہجی کی ترتیب کو نظر انداز کر کے سب سے پہلے کر رہا ہوں۔)

اسی طرح متعدد غیر مسلم مؤرخین نے حضرت محمد مصطفیٰ (ﷺ) کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، جن میں تھامس کارلائل اور لامارٹین وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

۲۰۔ غیر مسلموں کو ''کافر'' قرار دیا جاتا ہے

سوال: مسلمان، غیر مسلموں کی توہین کرتے ہوئے انہیں ''کافر'' کیوں کہتے ہیں؟

جواب:

کافر کا مطلب مسترد کرنے / انکار کرنے والا ہے

لفظ ''کافر'' اصل میں عربی لفظ ''کفر'' سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے چھپانا، انکار کرنا یا مسترد کرنا۔ اسلامی اصلاح میں ''کافر'' سے مراد ایسا شخص ہے جو اسلام کی حقانیت کو چھپائے (یعنی لوگوں کو نہ بتائے) یا پھر اسلام کی حقانیت سے انکار کرے۔ ایسا کوئی شخص جو اسلام سے انکار کرتا ہو، اُردو میں غیر مسلم اور انگریزی میں Non Muslim کہلاتا ہے۔

اگر کوئی غیر مسلم خود کو غیر مسلمؔ یا کافر کہلوانا پسند نہیں کرتا، جو اصل میں ایک ہی بات ہے، تو اس کے احساسِ توہین کی وجہ اسلام کے بارے میں لاعلمی یا غلط فہمی ہے۔ اسے اسلامی اصطلاحات سمجھنے کے لیے صحیح ذرائع تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔ اس کے بعد نہ صرف اس کا احساسِ توہین ختم ہو جائے گا بلکہ وہ اسلام کے نقطہ نگاہ کو بھی صحیح طور پر سمجھ جائے گا۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک کی شہرہ آفاق کتابیں